ترجمے

افضال احمد سید

فہمیدہ ریاض

اجمل کمال

کراچی کی کہانی (۲)

شمارہ ۲۱ سرما ۱۹۹۶

ترتیب: اجمل کمال

آج

شمارہ ۲۱ سہ ماہی ۱۹۹۶
جنوری ـ مارچ ۱۹۹۶

منیجنگ ایڈیٹر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۴۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت
ایجوکیشنل پریس
پاکستان چوک، کراچی

رابطے کے لیے پتا:
اے ۱۶، سعدی مانشن، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰
فون: ۸۱۱۳۴۷۴۰
ای میل: aaj@biruni.erum.com.pk

بیرونِ ملک خریداری کے لیے پتا
محمد عمر میمن
۵۴۱۷، ریجنٹ اسٹریٹ، میڈیسن، وسکانسن ۵۳۷۰۵، یو ایس اے

کراچی کی کہانی (۲)

ریت حسام

شمس استھوبی　　شریف سور
لیاقت مسور　　نیکسٹر بھٹی　　سرین اسٹیفن
آصف شہار　　محسوب حال

تسنیم صدیقی

عارف حسن

فہمیدہ ریاض

کراچی

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

میرا وطن ملیر

وقت کے جادو کدہ میں تحلیل ہوتی صدی کے آخری برسوں، اس برس کے آخری مہینے، اس مہینے کے آخری دنوں کی بات ہے۔

بحیرہ عرب کے ساحل پر آباد، تیسری دنیا کے ایک غریب، بین الاقوامی مالی اداروں سے مستقل امداد خواہ ریاست کے ایک عظیم الجثہ شہر کے نو تعمیر اور شاندار ہوائی اڈے سے ایک جہاز علی الصباح، منہ اندھیرے سے پرواز کرنے والا ہے۔

اس میں بیٹھی ہوئی ایک عورت نے کس کر حفاظتی بیلٹ باندھ رکھی ہے۔ اس کے بغیر، اسے یقین ہے کہ وہ ایسی سیٹ ہی سے نہیں بلکہ جہاز سے بھی نیچے گر پڑے گی، اور شاید اس گول کرہ ارض سے پھسلتی ہوئی، زمین کی گرگریڑے میں ناکام، کہیں خلاؤں میں گم ہو جائے گی۔

برطانیہ جانے والی اس پرواز میں، جو آدھے گھنٹے کے لیے دوبئی میں رکے گی، بہت کم مسافر ہیں۔ عورت اپنے دفتر سے پندرہ دن کی چھٹی لے کر مہینہ بھر برطانیہ میں رہنے کی غرض سے جا رہی ہے۔ (چھٹی بڑھانے کی درخواست، بہ سبب علالت، وہ برطانیہ سے بھجوا دے گی۔)

وطن چھوڑتے ہوئے وہ کافی خوش ہو رہی ہے۔ شہر میں کئی برس سے بدامنی پھیلی ہے۔ فائرنگ ہوتی ہے اور لوگ مارے جاتے ہیں۔ چوریاں، ڈاکے، اغوا، غرض تمام پر تشدد جرائم یا واقعات اکتا دینے والی یکسانیت سے مسلسل ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی ان کی رفتار تیز اور کبھی سست ہو جاتی ہے۔ چند دنوں سے قتل کی وارداتوں میں تیزی آ گئی تھی۔ ہر روز اوسطاً سات آٹھ، سات آٹھ لوگ مارے جا رہے تھے۔ اس لیے وہ تشدد اور قتل و غارت گری کے شعلوں میں جھلستا ہوا شہر چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے تازہ ہوا کھانے کے خیال سے بہت خوش تھی، اس بات پر تو اور بھی خوش کہ جہاز کا رخ مغرب کی طرف تھا۔ گڈ اولڈ لنڈن! اس نے سوچتی ایک کھسایٹا جملہ دُہرایا (منہ پھیر کے شریف کی طرف، اللہ اکبر) اور لندن جانے کی نیت باندھ لی۔

زمین پر تیزی سے دوڑتا جہاز اب ہوا میں بلند ہو چکا تھا۔ نیچے شہر تھا، جو اس کی نظروں کے سامنے تیزی سے آڑا ترچھا ہو رہا تھا۔ گڑیا گھروں کی طرح چھوٹے پڑتے مکانوں، فلیٹوں میں بدلتی سڑکوں، کھجوروں کے مور پنکھوں اور ترچھے ساحلِ سمندر کو کھڑکی کے شیشے سے بغور دیکھتے ہوئے، جن پر دسمبر کے کمزور سورج کی پہلی کرنیں دمک رہی تھیں، عورت نے آنکھوں میں گرم پانی آتا محسوس کیا۔ اس نے شہر سے محبت اور سینے میں لاحاصل محبت کی شدید تکلیف محسوس کی، گویا کوئی تیز دھار خنجر سینے میں پیوست ہو اور کوئی اس دیکھا ہاتھ اسے نکالنے کی کوشش کرتا ہو۔ مگر یہ کیفیت ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں رہی۔ گرم آنسو اس کی آنکھوں میں خشک ہو گئے۔ اس کا دھیان کہیں اور لگ گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ انگلینڈ پہنچ کر کیا کیا کرے گی۔ اسے لینے کون آیا ہو گا، اور دیگر یہ کہ اسے جانے ملنی چاہیے۔

عورت کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ کی دو نشستوں پر ایر ہوسٹس نے نہ جانے کیوں (اتنی بہت سی خالی سیٹیں چھوڑ کر صرف اسی کے ساتھ کیوں؟) دو مسافر بٹھا دیے تھے جو کسی اور پرواز سے کراچی آئے تھے۔ ان میں سے ایک بڑے اشتیاق سے جھانک جھانک کر کھڑکی کے نیچے دور کہیں ڈگمگاتے شہر کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ نیچے لانڈھی نظر آ رہا ہے کیا؟ دبلے پتلے مسافر نے بڑے اشتیاق سے انگلی کا اشارہ کر کے پوچھا۔

عورت چکرا گئی۔ اتنی بلندی سے وہ لانڈھی کو کیسے پہچان سکتی تھی۔

نہیں تو ... پتا نہیں ... اس نے کہا۔ پھر ایک نظر اپنے ہم سفروں پر ڈال کر سوچا کہ کیا وہ لانڈھی سے آئے ہوں گے۔ عورت نے آنکھیں موند لیں۔ اچانک اسے خیال آیا۔ لانڈھی کا کیا مطلب ہے؟ اس نے سوچا کہ وہاں اب رہنے والے یہ بات مشکل سے جانتے ہوں گے کہ سندھی زبان میں لانڈھی کا مطلب کوئی صاف ستھرا، آرام دہ جھونپڑا ہے جو گاؤں کے راستے میں مسافروں کے آرام کرنے کے لیے بنایا گیا ہو۔ شاید، اس نے سوچا، صدی بھی پہلے، اس علاقے میں ایسی کوئی گھاس پھوس کی کٹیا ہو جہاں مسافر پل بھر آرام کرتے ہوں۔ اس نے ایک پرسکون راستے کا تصور کیا جہاں دو رویہ کھجوریں کھڑی ہوں اور جھاڑیوں میں کالے تیتر بولتے ہوں۔

لانڈھی ... اب شہر کا ایک خطرناک علاقہ، گولیوں کی بوچھاڑوں سے دھواں دھار۔

دور ہوتا گیا کراچی، مقتولوں کے خون سے چاپ چاپ نمبر! اور، وارداتوں کی کثرت اور اسرار پر بھو بچکا۔

وہ حفاظتی پیٹی کو تھوڑا سا ڈھیلا کر کے، کرسی کی پشت پیچھے کھسکا کر، آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر کے لیے سو جانے کی کوشش کرنے لگی۔

آنکھیں بند کیے کیے عورت نے تصور کیا ـــ نہ جانے کیوں یہ خیال اس کے ذہن میں آیا، شاید اس لیے کہ شہر کی حالت واقعی بہت خراب تھی ـــ گویا کوئی اس سے سوال کر رہا ہو

یعنی کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے؟

یہ ایسا سوال تھا جو دراصل اس سے کوئی نہ پوچھتا۔ اس شہر کے بارے میں لوگ سوال نہیں پوچھتے تھے بلکہ صرف تبصرہ کرتے تھے کراچی کی تو حالت اتنی خراب ہے، وغیرہ۔ مگر عورت کے تصور نے اس سے من چاہا سوال پوچھ لیا۔ (پورا تصور یہ تھا گویا کوئی اس سے انٹرویو لے رہا ہے۔)

عورت تصور میں اپنے تئیں ایک نہایت اہم اور معتبر شخصیت محسوس کرتے ہوئے مفصل جواب دینے کی کوشش کرنے لگی۔ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے اس نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا

دراصل یہ ایک پیچیدہ صورتِ حال ہے۔ ایک سطح پر تو ... کہا جاتا ہے کہ یہ ایجنسیوں کی لڑائی ہے

کیسی ایجنسیاں؟ اس کے جیو کے تصور نے سوال کیا، کیوں کہ حال ہی میں امریکہ سے آئی ایک

پاکستانی لڑکی نے حیرت زدہ ہو کر اسے بتایا تھا کہ وہ ایجنسیوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہے، دیگر یہ کہ اس کے لیے بات ہی ایک اسٹیٹ ایجنسی تھی۔ لہٰذا عورت نے بلاتامل وضاحت کی

بھی خفیہ ایجنسیاں جس کے ایجنٹ ہوتے ہیں

جیسے؟ انٹرویو کرنے والے نے دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ کچھ گڑبڑا گئی۔ ایجنسیوں کو حروف تہجی سے یاد کیا جاتا ہے ورنہ ہمیشہ انھیں گڈمڈ کر دیتی تھی۔ پھر بھی اس نے ہمت کر کے، حواس مجتمع رکھتے ہوئے (کیوں کہ وہ انٹرویو لینے والے پر ایسی حماقت زدگی اور کم علمی کو کسی قیمت پر فاش نہیں کر سکتی تھی) کہنا شروع کیا

بھی بہت سی ایجنسیاں لڑ رہی ہیں سی آئی اے ہے، آئی بی ہے، آئی ایس آئی ہے پھر کچھ جھجک کر اس نے اضافہ کیا، سی آئی ڈی ہے حالاں کہ یہ سوچ کر اسے شرمندگی ہو رہی تھی کہ اس قدیم ادارے کو کہیں برسوں پہلے ختم ہی نہ کر دیا گیا ہو۔

اس کے علاوہ اس نے کہا، ایم کیو ایم کے دو متحارب گروہ ہیں۔ پھر شیعہ اور سنی، سیاسی اور نیم سیاسی جماعتیں ہیں۔ اور پھر وہ کچھ رک گئی، اس احساس کے ساتھ کہ بات پوری نہیں ہوئی۔ پھر اس نے کہا پھر پولیس ہے، رینجرز ہیں، شہری ہیں اور اور امریکی ایجنٹ ہیں، ہندوستانی ایجنٹ ہیں، افغان ایجنٹ ہیں تو یہ سب یعنی نہ لڑ رہے ہیں

انٹرویو لینے والے نے قہقہہ لگایا۔ عورت ہنس رہی تھی۔ خود ہی تو لے رہی تھی وہ ایسا انٹرویو۔

لاحول ولا قوۃ، اس نے کہا، کیا بکواس کر رہی ہوں میں!

تو پھر، کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟

واللہ اعلم! عورت نے سر کھجایا۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا فائرنگ ہو رہی ہے۔ روز کتنے ہی لوگ مارے جاتے ہیں، دس مارو، دس مارو، ہر روز

اسے اپنے پڑوس کی مسجد پر حملہ یاد آیا۔

روانگی سے دو دن پہلے اس کے محلے کی مسجد میں اکٹھے آٹھ آدمیوں کو مارا گیا تھا۔ مرنے والے کہا جاتا تھا سپاہ صحابہ کے تھے۔ کیا مارنے والے یقیناً شیعہ رہے ہوں گے؟ اس سے پہلے شیعوں سے بھری بس میں بم پھٹا تھا۔ اخباروں میں روز ہی مرنے والوں کی تصویریں چھپتی تھیں اور حالاں کہ شہر کے لوگ مدت مدید سے ان اموات میں دل چسپی کھو بیٹھے تھے، پھر بھی کوئی کوئی شخص (مثلاً یہ عورت ہی) شہر کے معنے کو سمجھنے کی کوشش میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ مرنے والوں کا تعلق کس فرقے یا سیاسی جماعت یا لسانی گروہ سے ہے۔ بعض اوقات خبریں اس طرح ہوتیں

مرنے والوں میں دو ایم کیو ایم کے کارکن، ایک ایم کیو ایم حقیقی کا کارکن، تین شیعہ اور دو سنی ہیں۔

پڑھنے والے اس گورکھ دھندے کو حل کرتے۔ یہ بات ناقابلِ یقین تھی کہ شہر میں مدت سے یہی

سب کچھ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ ہلاک کرنے والے افراد نہ صرف ایم کیو ایم کے خلاف ہیں بلکہ حقیقیوں، شیعوں اور سنیوں کے بھی جانی دشمن ہیں۔ پھر وہ کھی کھی کر کے ہنستی   ارے نہیں بھئی آپس میں ایک دوسرے کو مار رہے ہیں لوگ!

کبھی لڑکپن میں وہ شمع معمے حل کیا کرتی تھی۔ یہ سب سے پہلے معمے تھے جن پر ہزاروں روپوں کے انعام ملتے تھے۔ اُس زمانے میں ہزاروں روپے بڑی بات ہوتے تھے۔ حروف تہجی کے الفاظ خانوں میں بھرے ہوتے تھے۔ شمع نامی رسالہ نئی دہلی سے نکلتا تھا اور پاکستان میں بکتا تھا۔ جس صفحے پر معما شائع ہوتا تھا اس کی پشت پر صحیح حل کے لیے کچھ سجھاؤ درج ہوتے تھے، ان کا دل چسپ اور خیال انگیز عنوان ہوتا تھا، اشارے۔

کراچی میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ بھی اب معما تھا۔ یوں ہی دل بستگی کے لیے لوگ اخباروں میں اشارے ڈھونڈتے، جب کہ صحیح حل پر کوئی انعام ملنے والا نہ تھا۔ بلکہ شاید صحیح حل کوئی تھا ہی نہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ یہ لاحل معما ہو جسے صرف بےوقوف بنانے کے لیے پیش کر دیا گیا ہو۔ لوگ برسوں دماغ پچی کرتے رہیں اور پھر پتا چلے   اوہو! ہمیں یوں ہی الو بنایا گیا۔

تھوڑی دیر میں فضائی میزبان چائے لے آتی ہے۔ ایک ٹرالی پر اخبار بھی ہیں۔ لڑکی اسے اخبار پیش کرتی ہے۔ خوشی سے تقریباً کپکپاتے ہوئے عورت نے اخبار لینے سے انکار کر دیا۔ وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ وہ پہلے سے جانتی تھی اخبار میں کیا لکھا ہو گا (وہی دو شیعہ، ایک ایم کیو ایم، شاید ڈیڑھ حقیقی، وغیرہ)، بلکہ اس لیے کہ اب وہ جاننا ہی نہیں چاہتی تھی، کم از کم مہینے بھر تو نہیں۔ ارے بھئی وہ باہر جا رہی ہے   کوئی یوں ہی تو نہیں، اس اکتا دینے والے مسلسل تشدد سے بچ کر ہی تو وہ جا رہی ہے   بلکہ (اس نے تفاخر اور تحقیر کی لہر میں ناک اٹھا کر سوچا) وہ جا چکی ہے۔ یہ بات اب ماضی بعید کی ہوئی کہ وہ کراچی میں تھی۔ اخبار کے بدلے وہ فضائی کمپنی کے رسالے میں   کم سن مسافروں کے لیے   کے عنوان سے چھپے بندروں اور طوطوں پر لکھے باتصویر مضامین پڑھنے لگی۔ مضمون بے حد معلوماتی تھے اور تصویریں بہت دلکش تھیں۔ چند ہی لمحوں میں وہ ان میں کھو کر رہ گئی اور سوچنے لگی کہ دوبئی اترنے پر محصول معاف دکان سے وہ اپنی نواسی کے لیے مخمل کا بندر خریدے گی، کرسمس کا تحفہ!

وہ کرسمس کا دن تھا۔ اس کی بیٹی، داماد اور نواسی اس جگمگاتے دن اسے لینے ہوائی اڈے پر آئے ہوں گے۔ فادر کرسمس کے بدلے مدر کرسمس آ رہی ہیں! اس کی بیٹی نے دور دراز ٹیلی فون پر خوشی سے چیخیں مارتے ہوئے کہا تھا۔ عورت خوشی سے مسکرانے لگی۔ دور کہیں، اجنبی دیس کے ہوائی اڈے پر، خوشی اس کا انتظار کر رہی تھی، ایک سجے ہوئے شہر میں، جیسے اسے اس کی آمد کے لیے خاص طور پر سجایا گیا ہو۔ اس وقت وہ مڑ کر نہیں جاننا چاہتی کہ کل کراچی میں کون کون مارا گیا، لانڈھی میں اور ملیر میں

ملیر تو وہ خود گئی تھی۔ حیرت! حیرت! وہ ملیر کیوں کر جا پہنچی؟

مقتول کے گھر تعزیت کے واسطے، جب کہ لاش ہسپتال سے لائی جا رہی تھی۔

اُن دنوں دو تین روز سے قتل کی وارداتوں میں تیزی تھی۔ اچانک ایک صبح اسے خبر ملی کہ جس دفتر میں وہ بیٹھتی تھی وہاں کام کرنے والا ایک کلرک مارا گیا ہے۔ کون تھا وہ؟ اسے اس کی صورت بھی یاد نہ آئی تھی۔ یہ خبر اس نے ٹیلی فون پر سنی تھی، اور اس کی عجیب تفصیلات۔

سرکاری دفتروں میں کام کرنے والے کم گریڈ کے زیادہ تر ملازم دفتری اوقات کے بعد، مہنگائی کے زمانے میں کسی طرح پورت کرنے کے لیے، کوئی اور بھی کام کرتے ہیں۔ یہ کلرک بھی ـــ جس کو زید، بکر یا عمر کہیے ـــ دفتر کے بعد نمکو بیچتا تھا۔ تلی ہوئی دالیں، مرمرے، سیو، پاپڑ، نمک پارے وغیرہ وہ پلاسٹک کی تھیلیوں میں اسٹیپل کے دھتیلے تار سے داب کے بند کر کے (تاکہ وہ ہوا اور نمی سے محفوظ رہیں) اپنی موٹر سائیکل پر لوگوں کے گھروں اور دکانوں میں پہنچایا کرتا تھا۔

واردات والے دن (مگر واردات والا تو ہر دن تھا! یعنی جس روز اُس کے ساتھ واردات ہوئی) زید، بکر یا عمر گھر نہیں پہنچا تھا۔ گھر والوں نے بہت دیر تک، یعنی اگلی صبح تک، انتظار کیا۔ جب وہ صبح تک گھر نہ پہنچا اور آسمان پر سفید اور سیاہ ڈورا نمودار ہو گیا، اور پھر وہ بھی پگھل گیا اور سورج مشرق سے جھما جھم طلوع ہو گیا، اور چڑیوں نے پچھواڑے میں اُگے امرود اور کیلے کے تین پیڑوں میں گانا اور چہچہانا بھی ختم کر دیا اور ان کے بدلے کراچی کے آسمان کی وہی شناسا چیلیں اور کوے چکر کاٹتے قسائی کی دکان کا رخ کرنے لگے جہاں دکان کے باہر پڑے چھیچھڑوں پر بلیوں سے لڑتی ہوئی چیلیں اپنے حصے پر جھپٹے مارتی ہیں، اور روشنی میں سب کچھ صاف نظر آنے لگا تو زید، بکر یا عمر کی بیوی نے پوری طرح دہل کر ملگجے، ملے دلے بستر پر سوتے دیور یا جیٹھ کو جگایا اور کہا۔

'وہ نہیں آئے۔

گھر والوں نے دفتر کھلنے کا انتظار کیا۔ ان کے گھر میں ٹیلی فون نہیں تھا۔ انھوں نے باہر کسی دکان سے دفتر فون کیا۔ انھوں نے استفسار کیا کہ کیا بات ہے، وہ دفتر سے گزشتہ رات گھر کیوں نہیں پہنچا؟ دفتر والوں نے حیرت اور پریشانی کے عالم میں بتایا کہ وہ تو دفتر کے وقت کے بعد سب لوگوں کے ساتھ گھر چلا گیا تھا۔ پھر کچھ توقف کے بعد انھوں نے مشورہ دیا کہ بھائی، حالات کچھ اچھے تو ہیں نہیں، خدا کرے سب خیریت ہی ہو، مگر آپ لوگ ذرا کسی ہسپتال میں بھی معلوم کر لیجیے۔ گھر والوں اور عزیز واقارب نے ہسپتالوں سے رجوع کیا۔ دس بجتے بجتے ایک ہسپتال میں زید، بکر یا عمر کی لاش کی شناخت ہو گئی، اور یہ خبر بارہ بجے نکلنے والے اخباروں کے دفتروں میں بھی پہنچ گئی۔ وہیں سے کسی نے ٹیلی فون پر اسے بتایا تھا کہ اس کے دفتر کا ایک آدمی بھی کل رات

بے تابی سے اس نے اپنے دفتر فون کیا تھا۔ وہاں اسے مزید تفصیلات بتائی گئی تھیں۔ یہ سب سن کر عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ وہ اس قدر کیوں رو رہی ہے۔ بہرصورت وہ روتی دھوتی دفتر چل دی تھی۔

دفتر کا نچلا اسٹاف تجہیز اور تکفین کے لیے بسوں میں ملیر جا چکا تھا۔ صرف ڈائرکٹر اور ان کے نائب بیٹھے تھے۔ وہ منتظر تھے کہ ہسپتال سے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش گھر آ جائے اور جنازہ اٹھنے والا ہو تو پھر وہ بھی ملیر جائیں۔ ملیر — جو پہلے شہر کے مضافات میں تھا۔

ملیر جاتے ہوئے وہ سڑک پر رواں ٹریفک کو دیکھتی رہی۔ یہ رکشا والے اور ٹیکسی ڈرائیور، اور ایسی گاڑیوں میں جاتے ہوئے لوگ، یہ سب جیسے کسی جنازے میں جا رہے تھے۔ ان کے چہرے سختی سے الم میں منجمد تھے۔ راستے میں اسے اور تفصیلات معلوم ہوئیں۔ لاش علی الصباح ہسپتال لائی گئی تھی۔ واردات شام کو ہوئی تھی جب زید، بکر یا عمر نمکو تقسیم کر کے گھر واپس جا رہا تھا۔ رات بھر لاش سڑک کے کنارے پڑی رہی تھی۔

راستے میں اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے ہم سفر ڈائرکٹر سے کہا، فلاں بھائی (جیسا کہ اس کے شہر کا قاعدہ تھا ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کا، جسے اس نے غیر شعوری طور پر اپنا لیا تھا)، آپ کو یاد ہے کئی برس پہلے یہاں ملیر میں ایک صاحب کے گھر ادبی محفل ہوتی تھی اس نے ٹوٹے ہوئے جملوں میں کہا۔ یاد میں ایک چھوٹے سے گھر کا ایک نیم تاریک کمرہ بجلی کے پیلے، مدھم بلب سے روشن ہو گیا۔ فرش پر بچھی دری، اس پر بیٹھے ہوئے لوگ۔ نظم یا افسانہ پڑھنے والے۔ سننے والوں کے تبصرے۔ اسے یاد آیا، کتنی کتنی دور سے جاتے تھے لوگ وہاں۔ وہ خود کتنی دور سے گئی تھی۔ تب دھوراجی کالونی میں رہتی تھی وہ۔ ڈائرکٹر صاحب ذرا دیر خاموش رہے۔ پھر ان کی ٹوٹی ہوئی سی آواز آئی۔

ہاں صاحب خوب یاد ہے۔ میں خود وہاں جاتا تھا۔

پھر ان صاحب کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ محفلیں ختم ہو گئی تھیں، عورت نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ آخری بار اس گھر میں وہ سب تعزیت کرنے گئے تھے۔

نہیں، ختم تو نہیں ہوئی تھیں۔ ان کی بیوی نے جاری رکھی تھیں، ڈائرکٹر صاحب نے کہا۔

کامریڈ تھے وہ صاحب، اسے مدھم سا یاد آیا۔ یہ ایک سوشلسٹوں کا حلقہ تھا۔ لینن اور مارکس کے نظریات پر وہاں طویل بحثیں چلتی تھیں۔

ایک موڑ کاٹ کر گاڑی ملیر میں داخل ہو گئی۔

علاقے میں مرگھٹ کا سا سناٹا تھا۔ اکا دکا دکانوں کے سوا تمام دکانیں بند تھیں۔ ڈرائیور فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ آگے جائے یا نہیں۔ یہ ایک فساد زدہ علاقہ معلوم ہو رہا تھا۔ سڑک پر ایک آدھ جگہ لوگ گچھا سا بنائے کھڑے تھے۔ وہ ان کی آنکھوں کو مشکوک نظر آ رہے تھے اور خود انہیں شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

تبھی انہیں سامنے سے ایک کھٹارا بس آتی نظر آئی جس میں چند مسافر بھی تھے۔ بس اسٹاپ پر نہ جانے کہاں سے ایک عورت آ کھڑی ہوئی۔ سڑک پر عورت اس کے آثار! انھوں نے ہمت کر کے آگے جانے کی ٹھانی۔

لاش ہسپتال سے یا تو آ چکی تھی یا وہاں سے روانہ کر دی گئی تھی، اُسے ٹھیک سے پتا نہ چل سکا کیوں کہ اسے گھر کے اندر عورتوں کی طرف بھیج دیا گیا۔ چھوٹی سی گلی انگنائی پار کر کے گھر تھا، عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی عورتیں۔ کسی نے اشارے سے اسے بتایا: یہ ان کی اماں اور وہ بیوی ہیں۔

بیوی تیس کے پیٹے میں رہی ہو گی۔ روتے روتے نڈھال، لاسی اور چھریری۔ اس کی ناک میں کیل چمک رہی تھی۔ موٹی ململ کا گلابی دوپٹا، ٹانگوں میں سفید لٹھے کا پھولا ہوا، چست پاجامے کی کھاپتی شکل جو گھٹنا کہلاتی ہے۔ ارے واہ! اس نے دل میں سوچ کر حیرت کی۔ یہ تو بالکل سونی پت یا ریواڑی کے کسی مسلماں محلے سے نکلی تصویر لگ رہی ہے، مومیائی ہوئی۔ پچاس برس میں ان گھروں کی اندرونی حالت جوں کی توں رہی کیا؟ مگر نہیں، یہاں پہلے گھر تھے کہاں، جھگیاں سی جھگیاں تھیں چند دہائیوں پہلے تک۔ اور اب ہر طرف پکے گھر کھڑے تھے۔ راستے میں وہ یہی تبصرہ کرتے آئے تھے، اس گنجی آبادی پر جو اب کھوکھراپار تک جا پہنچی تھی۔

کھوکھراپار ـــــ سرحد کی سرحد!

بیوی نے ہاتھ اٹھایا۔ کلائی میں کانچ کی چوڑیاں چھنکیں۔ اس کے زانو پر اسی چہرے مہرے کی تیرہ چودہ سالہ لڑکی سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ یہ زید، زکریا عمر کی بیٹی تھی۔ دو چھوٹے بچے وہیں کہیں دوسرے بچوں میں رُل کُھل رہے تھے۔ اب یہاں تک پہنچ کر عورت کو بالکل رونا وونا نہیں آ رہا تھا۔ اس نے چبا چبا کر تعزیتی جملے بھی کہہ دیے تھے۔ یہاں اسے رونا چاہیے، اس نے سوچا۔ اس قدر رقت انگیز سین ہے، اور اسے رونا نہیں آ رہا۔ وہ غور کر رہی تھی کہ مجمعے میں لوگ زیادہ تر اس بات پر زور دے رہے تھے کہ زید، زکریا عمر کا تعلق کسی سیاسی جماعت یا دھڑے سے نہیں تھا۔ باہر نکلنے پر معلوم ہوا کہ مردوں میں بھی یہی باتیں ہوئی تھیں۔ لوگوں کی ملی جلی رائے یہ بن رہی تھی کہ زید، زکریا عمر دراصل اُس روز ٹھیکے والوں سے وصولی کر کے آ رہا تھا۔ ڈاکوؤں نے اس پر حملہ کیا اور پیسے لے کر فرار ہو گئے۔ اس قتل کے پیچھے کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔

واپسی میں اس کے ہم سفر ڈائرکٹر صاحب نے بھی یہی رائے ظاہر کی تھی۔ کچھ نہیں صاحب، محض غنڈا گردی کی کارروائی ہے، پیسوں کے لیے۔

تعجب اس پر تھا کہ یہ بات سب کے لیے باعثِ اطمینان کیوں تھی۔ دیگر یہ کہ اس بات پر مقتول کے عزیز اتنے مصر کیوں تھے اور اس قدر جلد باری سے، جب کہ ابھی جنازہ ٹھنڈا بھی نہیں ہوا تھا، نسر کا سے جنازہ کو کیوں یقین دلانا چاہ رہے تھے کہ اس قتل کے پیچھے کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔

خیر، اس نے سوچا، یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ مقتول کے عزیز و اقارب ڈرتے ہوں گے۔ اگر کسی پر قتل کا الزام آتا ہے تو انتقامی کارروائی میں دوسروں کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جنازے میں شریک معتبر، بااثر، اعلیٰ افسر قسم کے لوگ اس بات پر کیوں مطمئن نظر آ رہے تھے کہ :

محض غنڈا گردی ہے، اور اس قتل کا اس شہر کے تار و پود میں پڑی سیاسی گرہ سے کوئی تعلق نہیں؟

اس بات میں عجیب سا اطمینان تھا۔ نہیں صاحب، محض غنڈا گردی ہے! اصرار اور محض پر تھا۔

کیوں؟

دوسری صورت میں سیاسی الجھاؤ اور اس کے ممکنہ حل کو فوکس میں لانا ناگزیر ہو جاتا تھا، اس لیے اس منطق پر قدم بہ قدم چلا جائے کہ

(۱) اس قتل کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں،

(۲) کسی قتل کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں،

(۳) ہم جو کوئی سیاسی رائے نہیں رکھتے، اور اس کا اظہار کرنے سے بھی اب پرہیز کرنے لگے ہیں تو ہم خصی نہیں ہو گئے،

(۴) اس قتل میں، یا کسی بھی قتل میں، ہماری کوئی ذمے داری نہیں۔

ایک محلے والا چالاکی اور عیاری سے مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا اور رازداری سے گویا ہوا

خوب صاحب، پیسوں کے لیے قتل کیوں کرنا ہو گا؟ جیب میں ان کی تین چار سو روپیوں سے زیادہ رقم نہ تھی۔ گولی بہت قریب سے ماری گئی ہے۔ قمیص کی جیب کے پاس خون کا معمولی سا داغ ہے۔ یہ تو اس نے سرگوشی میں کہا، کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے۔

کیا یہ مدحت اس قتل کو سیاسی ثابت کرنا چاہتا ہے؟ آنے والوں نے سہما کر سوچا تھا۔ خوف زدہ آنکھوں سے انھوں نے متحارب گروہوں کے اس گڑھ میں فاصلوں پر کھڑے لوگوں کے مشکوک گچھوں کو دیکھا تھا اور سرعت سے کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے تھے۔

راستے میں انھوں نے اس بات پر غور کیا تھا کہ زید، ذکریا عمر کیوں کر گولی کھا کر مرا۔ کئی امکانات تھے (۱) کہ یہ محض ایک ڈاکے جمع قتل کی واردات تھی، (۲) کہ وہ ایم کیو ایم کا تھا اور حقیقی والوں نے قتل کر دیا، (۳) کہ وہ حقیقی والوں کا تھا اور ایم کیو ایم نے مار دیا، (۴) شیعہ تھا، سنیوں نے قتل کر دیا، (۵) سنی تھا، شیعوں نے مار دیا، (۶) حالات خراب کرنے کے لیے بغیر نشانہ لیے چلائی گئی گولیوں کی زد میں یوں ہی آ گیا۔

زید، ذکریا عمر کو کس نے قتل کیا؟

اچانک آسمان پر بادل چھا گئے۔ عورت نے سندھ کے شاعر شاہ لطیف کی ایک نظم یاد کی جو انھوں نے کراچی پر لکھی تھی۔ کیا تب بھی کراچی تھا؟ ہاں، تب بھی تھا۔ ایک چھوٹا سا مچھیروں کا گوٹھ، کلاچی۔ وہاں ایک مچھیرا اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دن بھر سمندر میں مچھلیاں پکڑتے اور شام پڑے گھر لوٹتے۔ کہیں سے سمندر میں ایک مگرمچھ آ نکلا۔ اور پھر ایک دن وہ مچھیرا گیا تو گھر نہ لوٹا۔ یہی نظم تھی۔

کھانا تو کچھ نہیں آیا
شام پڑ گئی اور پھر رات
کھانا تو کچھ نہیں آیا

گاڑی کے بونٹ پر ٹپ ٹپ بوندیں گرنے لگیں۔

***

مسئلے کا حل

سیاسی مسئلہ حل کرنا ضروری نہیں ہوتا، فلاٹ پی کے سات چار پانچ میں بیٹھی عورت نے ذاتی، تقریباً نجی مشاہدوں پر مبنی ایک بھی، سنہرا نتیجہ اخذ کیا۔ مسئلے کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو کچھ عرصے بعد، آکسیجن کی کمی کے باعث، وہ مر جاتا ہے۔ پھر اس کی لاش گلنے سڑنے لگتی ہے۔ بدبو پھیلتی ہے۔ کیڑے مکوڑے گلا سڑا گوشت کھانے آ نکلتے ہیں۔ غرض جب تک مسئلہ خاک میں ملے، خوب گند پھیلاتا ہے۔

وہ اس نادر و نایاب نظری تشکیل پر خوش ہونے کی کوشش کرنے لگی، شہر میں ہر روز پابندی سے گرتی لاشیں یاد کر کے، جو اس شہر میں رہنے والوں کے وجودی نظاموں میں گرتی رہی تھیں۔ انتظامیہ تمام آثار و شواہد کے مطابق معدوم ہو چکی تھی، اور چند دنوں میں محسوس ہونے لگا تھا کہ کراچی کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے، جب کہ قتل و غارت گری کی قوتیں بلا جھجک یا روک ٹوک ہر طرف منڈلا رہی تھیں۔

اس شہر کی (ایک حد تک پوری ریاست کی) آبادی پر ٹھونسی ہوئی بے عملی (درحقیقت بے بسی) کی چبھن میں عورت نے اس طرح کی کئی سنہری عمرانی نظری تشکیلات پلو میں باندھ لی ہیں جن پر وہ کان لگائے خوش ہونے کی کوشش کر سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ سیاسی تنظیمیں مار کھانے سے ختم نہیں ہوتیں۔ اگر طویل عرصے تک کوئی سیاسی جماعت کچلی جاتی رہے (بقول سندھیوں کے، موچڑوں میں رہے) تو وہ مرتی نہیں بلکہ لولی لنگڑی، اندھی کانی یا گونگی بہری ہو جاتی ہے۔ پھر جب طاقت ور عناصر اسے اپنے کام میں لانا چاہیں تو وہ لکڑی کی ٹانگ یا کانچ کی آنکھ لگائے، پھدکتی ہوئی، میدانِ عمل میں آتی ہے۔ وہ پہلے جیسی باقی نہیں رہی ہوتی۔ دیکھنے والے کچھ ہی عرصے میں سمجھ جاتے ہیں کہ یہ اب اپنا ہی ایک بوجھ ہے، اپنے ماضی کا ایک مسخ خاکہ۔ پھر آپ اگر اسے حکمراں بھی بنا دیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس کی اصل طاقت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ حکمراں بن کر تو اور بھی بے ضرر ہو جاتی ہے۔

معجزوں کی یاد اس کے حیاتیاتی خلیوں میں سرایت کر چکی ہوتی ہے۔ متوقع حادثے سے بچنے کے لیے وہ ہمیشہ کھمبیوں سے منہ ڈھانپ کر بات کرتی ہے۔ متواتر مار کھانے کے بعد آپ اسے الزام نہیں دے سکتے۔ وہ جنات یا آسمانی طاقت سے بہرہ ور پہلوانوں کا گروہ نہیں تھا، محض فانی، اور انسانی کمزوریاں رکھنے والے لوگوں کی ایک سیاسی جماعت ہی تو تھی۔

ہوائی میزبان اس کے لیے ناشتہ لائی۔ عورت کا خیالی انٹرویو ادھورا رہ گیا۔

انٹرویو کا خیال دراصل اسے اس لیے آیا تھا کہ چند دن پہلے اخباروں میں مولانا عبدالستار ایدھی کا انٹرویو چھپا تھا۔ وہ کراچی سے پُراسرار طور پر لندن جا پہنچے تھے۔ ان کی بات غیر ملکی ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر بھی ہوئی تھی۔ ملک کے نامور، ہر طبقے میں محترم، عمر رسیدہ سماجی فلاحی شخصیت، وہ ایسے گھبراتی لہجے میں کہہ رہے تھے میرے کو قتل کرنے کا پلان ہے۔ پھر مزار بھی بہت بڑا بنائیں گے۔ پھر کہہ دیں گے کہ ایم کیو ایم نے یا کسی مذہبی جماعت نے مارا۔ ارے، میں کہتا ہوں یہ سب مت کرو۔ اس سے تو ڈائرکٹ آ جاؤ۔ بات یہ ہے بھائی کہ پاکستان میں سچ لکھا نہیں جا سکتا۔

پاکستان سناٹے میں آ گیا تھا۔ یہ کیا ہوا! اس نے تو بھانڈا ہی پھوڑ دیا۔ ناگفتنی بات کہہ ڈالی۔ لوگ دم بخود، منہ پھاڑے، دن بھر ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔ سب سے زیادہ مشکل اخبارات کی تھی جو آزادیِ اظہار کے اس جمہوری دور میں عاقلانہ اور فاضلانہ مقالات کے ذریعے عرصے سے کچھ نہ لکھنے کی سعی میں مصروف تھے۔ پھر لوگ ذرا کھانسے، گلا صاف کیا، کسمسائے۔ اخباروں نے مرے مرے لہجے میں کچھ تبصرہ کیا۔ ایک انگریزی اخبار نے اداریے میں لکھا مولانا نے ایجنسیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔

پھر بڑی سرعت سے اخباروں نے موضوع بدل دیا۔ وہ اس بدقسمت شہر کے روگ کی تشخیص سے گریزاں تھے جس کی بدامنی ضرب المثل بن چکی تھی۔ شہر کراچی پاکستان ہی کا سب سے بڑا نہیں، اپنی گنجان آبادی اور حیرت انگیز پھیلاؤ کے باعث دنیا کے بڑے شہروں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ ریاست کی معیشت کی شہ رگ، ریاستی خزانے کو سب سے زیادہ رقم فراہم کرنے والا، ملک کا سب سے زیادہ (درحقیقت واحد) جدید شہر، موٹر کاروں سے رواں، کسی بھی جدید کاروباری میگاپولس کی طرح غریب سے غریب اور مالدار سے مالدار شہریوں کا مسکن جس کی اب برسوں کی بے توجہی اور بدامنی سے اُدھڑی ہوئی سڑکوں پر سبھی منی بسوں اور بیتے برسوں کے کسی تہہ خانے سے ثابت و سالم اور صاف ستھری نکل آئی فوکس ویگنوں کے ساتھ ساتھ سالِ رواں کے ماڈل کی بی ایم ڈبلیو گاڑی بھی نظر آ سکتی ہے، جہاں ملک کے مہنگے ترین فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ساتھ ساتھ سستی ترین نہاری بھی میسر آ سکتی ہے، اور جہاں برسوں سے، کبھی تیز تواتر کے ساتھ اور کبھی رک رک کر، سڑکوں پر، محلوں پر گولیاں برسا کر بیک وقت متعدد مقتولوں کی لاشیں گرائی جاتی رہی ہیں۔ محلے محلے میں وارداتیں۔ ایسا زمانہ جب شہری سانس روک کر سوچتے تھے آج کس علاقے کی باری ہے؟ جس شہر کی خبریں پڑھ کر ــــ صرف خبریں پڑھ کر ــــ محفوظ

فاصلے پر واقع ملک کے دوسرے شہر اب لندن کرنے لگے تھے۔ (ملک کے امورِ خارجہ کے سیکرٹری بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں: "ہم تو کراچی کو اتنا جانتے ہیں کہ کوئی نہ جانتا ہوگا۔" غیر ملکی نشریاتی ادارے کے سامنے اعتراف کی مانند، گویا دنیا سے یا غالباً سماج سے چھپائے ہوئے اپنے شہر سے اس عشق کے اظہار پر تشدد کی لپیٹ میں آئے ہوئے شہری زار و قطار روتے اور ہنستے ہوئے!) جہاں ہمیشہ کرفیو رہتی ہے۔ جہاں سے لاشیں لوٹائی جاتی ہیں اور گجرات اور پشاور، جانے کہاں کہاں بھیجی جاتی ہیں۔ جہاں کے شہری بالکل ہیں محصور ہیں۔ جہاں مسلح لڑکوں کے ٹولے، اور شہریوں اور راہ گیروں پر بندوقیں تانے سپاہیوں کے ٹرک، یکساں دہشت پھیلاتے، سڑکوں سے گھوم رہے ہیں، جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔

پاکستان میں کیا سچ نہیں لکھا جا سکتا؟ عورت سوچتی ہے۔ کیا یہ کہ دہشت گردی کی وارداتیں حکومت کو متزلزل کرنے، بدلنے کے لیے، حالات کو ایک سیاسی جانب موڑ دینے کے لیے طاقتور اداروں کی جانب سے استعمال کی جا سکتی ہیں، جیسے کرسی کے نیچے سے قالین کھسیٹنے کے لیے جھٹکے دیے جائیں؟ (جیسے ہندوستان میں بعض اوقات ہندو مسلم فسادات کرا کے کیا جاتا ہے، یا جیسے اندرا گاندھی کے قتل کے بعد راجیو گاندھی کو فوری طور پر وزارت عظمیٰ کی گدی پر بٹھانے کے لیے مبینہ طور پر کانگریسیوں نے سکھ ہندو فسادات کروائے تھے؟) یا یہ کہ گو بظاہر ملک میں جمہوریت ہے (فری ورلڈ کی ایک اور کامرانی، مسلح آمریت کے دقیانوسی نظام سے نکال کر جمہوریت میں داخل کی ہوئی ایک اور شادماں ریاست، نئے عالمی نظام کے تاج میں نئے سرخاب کا پر، جس پر یورپ اور امریکہ کے حساس اور بارک دل انسانیت پرست مہذب حلقے سکون کا سانس لے سکتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کو مبارک باد دے سکتے ہیں)، مگر درحقیقت سابق جنرل اس فوجی جنرل کی ایک دن اچانک فضا میں دھماکا دار تحلیل کے باوجود ملک میں حکومت کسی سیاسی جماعت کے ہاتھ میں آئی نہیں ہے اور یہ کہ انتخابات کے متعدد بار انعقاد کے باوجود، جس کے بعد حکومتیں کرسی اقتدار پر بٹھائی اور اٹھائی اور پھر بٹھائی جاتی رہی ہیں مگر اس تمام اٹھک بیٹھک کے کھیل میں اصل قوت سور روپوش ہاتھوں میں ہے؟

کراچی کیوں تشدد کے بھاڑ جو میں جھکے میں سسک رہا ہے؟ اور اس کے شہری اس کے شہری کن حالات سے گزر رہے ہیں؟

کہا جا سکتا تھا، عورت نے سوچا، کہ آمریت سے جمہوری جدید ریاست بننے کا عمل ہموار نہیں ہوتا اور اس میں رکاوٹوں کا در آنا ناگزیر ہوتا ہے، مگر شاید، اس نے سوچا، یہی حالات اس قسم کے ہر ملک میں اس طرح اپنے عروج پر نہیں ہوتے جیسے اس کے اپنے وطن میں ہیں۔ او ممکن ہے تضادات بھی لازماً اتنے متنوع اور متعدد نہ ہوئے ہوں۔

اس نے دس میں بنگلادیش کا خیال آیا، جو طویل مدت بعد فوجی حکومت کے دور سے نکلا تھا، ایک تقریباً ایک قومی ریاست جو کسی لحاظ سے اس کے اپنے وطن سے بہتر صورت حال رکھتی تھی؛ جب کہ اس کا وطن کسی لاطینی امریکی یا نو آزاد افریقی ریاست سے زیادہ مماثل تھا جہاں آزادیِ اظہار ملنے تک اظہار کے

وسائل مسخ اور برباد ہو چکے تھے۔ خفیہ ایجنسیوں سے بھرے ہوئے، خوف زدہ، دولت مند مالکان کے یہ اخبارات سچ لکھنے سے معذور تھے۔ قومی زبان کے اخبارات، جنھیں ملک کی خواندہ آبادی کا بڑا حصہ پڑھ سکتا تھا، سنسرشپ کی طویل، ریاست کی تقریباً تمام زندگی پر محیط، روایت سے جاں بر نہ ہو سکے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اشاعت رکھنے والا اخبار تو ازلی و ابدی طاقت ور عناصر کی خوشنودی کا اتنا عادی تھا کہ اسے فسطائی رجحانات کی جہت کا مضبوط ترین ستون قرار دیا جا سکتا تھا۔ انگریزی اخبارات، جو آمریت کے اختتامی دور میں، حکومت پر نکتہ چینی کے لیے نسبتاً آزاد تھے، مقامی قارئین کی کم تعداد تک پہنچ سکتے تھے، مگر مغربی دنیا، خصوصاً امداد دینے والے ملکوں کے واسطے، جو اب امداد کے ساتھ حقوقِ انسانی کی رٹ لگا رہے تھے، اس ملک میں آزادیِ اظہار کے ضمن میں نمائشی جھروکے کا کام دے سکتے تھے، اپنے بہتر شعور اور روشن خیالی کے باوجود بے بس اور حد درجہ محتاط تھے اور ایک مشکل وقت سے گزر رہے تھے۔ ان کے لیے بھی یہ حقیقت ناگفتنی تھی کہ اصل طاقت کن عناصر کے پاس ہے۔ اس عیاری اور طاقت ور ہاتھ کے لیے انھوں نے، حیاداری کے ساتھ، اسٹیبلشمنٹ کی ترکیب اختراع کر لی تھی تاکہ پہلو بچا کر اس کا ذکر کر سکیں، یا کاہے کا ہے اس کو کوئی دردمندانہ مشورہ دے سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک مدت سے پڑھنے والے ان میں شائع شدہ تبصروں کیا رپورٹوں تک پر اعتماد کرنا چھوڑ چکے تھے اور انھیں محض یہ اندازہ لگانے کے لیے پڑھتے تھے کہ ان گشت ایجنسیوں کے ذریعے داخل (پلانٹ) کی گئی یہ خبریں کس خفیہ ادارے نے لکھوائی ہیں اور ان کی بنیاد پر آئندہ حالات کے کون سا رخ اختیار کرنے کی پیشین گوئی ہو سکتی ہے۔

ملک کی سیاسی جماعتیں جن کا مفاد سونے کی چڑیا، اس شہر کراچی، سے وابستہ تھا، گو صالح نہ تھیں، مگر ان کی کم شعوری یا نااہلی کو اس پس منظر میں دیکھنا ناگزیر تھا کہ کم از کم تیس برس کے طویل عرصے میں ظاہر یا پس پردہ آہنی طاقت ور ہاتھ نے عوامی حمایت رکھنے والی ہر سیاسی تنظیم کو زورِ طاقت کچلنے اور یہ سازباز، اندر ہی اندر گٹھ جوڑ، رسہ گیری، دھمکی، بلیک میل اور زرخریدے پر کٹھشار رکھنے کے مسلسل عمل کے ذریعے ـــــ اس سے قبل کہ وہ سنبھلے اور روبوتں ہاتھ کے پس پردہ اشاروں اور امداد کے بغیر کاروبارِ حکومت چلا سکے ـــــ اپاہج بنا دیا تھا اور برسوں اس بات کا پروپیگنڈا کیا تھا کہ دراصل یہی پوری قوم کے مفاد میں ہے۔ تیسری دنیا کے نو آزاد، عوام دوست نظام قائم کرنے کے لیے تڑپتی ریاستوں میں وہ ادارے جنھیں ماضی میں خود مغربی جمہوریتوں نے پالا تھا، اپنے تسلسل اور عام لوگوں کی ان تک نارسائی کے باعث اب ایسے قائم بالذات طبقے بن چکے تھے جن کے دانت معیشت کی رگِ گلو میں پیوست تھے اور جو نو آزاد ریاستوں کا ایک بالکل نیا قیاس (phenomenon)، ایک جدید مظہری وقوعہ تھے جو ابھی مغرب کی عمرانی کتب میں شامل نہیں کیے گئے تھے۔

مگر کراچی ہی کیوں؟ آخر یہ شہر اس ہولناک تشدد کا شکار کیوں ہو رہا ہے؟

کیوں کہ یہ سچ بھی لکھنا ہمت کی بات ہے کہ کراچی تیسری دنیا کے کسی عام سے ملک کا عام سا شہر نہیں تھا۔ یہ ایک خاص الخاص ملک کا خاص شہر تھا، دنیا کی دو بڑی ریاستوں کی رسّا کشی میں سامنے کا فریق

ہے کا اعزاز رکھنے والے ملک کا ایسا شہر جس پر سرد جنگ کو اختتام پذیر کرنے والی افغان جنگ اور اس کی خاطر مدد ماری میں کی گئی کچی تعمیروں کے ٹوٹ کر دھڑام سے زمین بوس ہونے کا تمام دھماکا خیز ملبہ برسوں سے گر رہا تھا، ایسا شہر جسے اس ملک کے جنگ جو حکمرانوں نے جرائم، تشدد اور مذہبی جنون کی تاریک جہالت کا زہریلا فضلہ پھینکنے کے لیے کوڑے دان کی طرح استعمال کیا تھا، جب کہ وہ خود ایک خواب خرگوش میں فتح و نصرت کے ڈنکے بجا رہے تھے۔ اور اس وقت جب وہ جرائم، تشدد اور تاریک جہالت کو کام میں لاتے ہوئے، دنیا کو یک قطبی (uni-polar) بنانے کی مہم میں جُٹے تھے (کیوں کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے)، یہ زہریلا فضلہ شہر کی نسوں میں رواں تھا۔

***

دوبئی کا درزی

عورت کے ساتھ والی نشستوں پر بیٹھے ہوئے مسافر لانڈھی سے نہیں آئے تھے۔ جیسا کہ اسے بعد میں معلوم ہوا، اور یہ معلوم کر کے اسے حیرت بھی ہوئی، وہ ہندوستان سے آئے تھے۔

اخاہ! تو کیا آپ وہاں پی آئی اے سے سفر کر سکتے ہیں؟ اس نے تعجب سے پوچھا تھا۔

کیوں نہیں، انھوں نے تُرت جواب دیا تھا۔ ایرانڈیا سے آدھی قیمت پر لے جاتے ہیں۔

اس کے برابر والی نشست پر ایک سانولی، سوکھی کاٹھ عورت بیٹھی تھی، تیز جامنی ساری اور گہرے سیاہ بالوں کا بڑا سا جوڑا جس کو بھگونے والے ناریل کے اصلی تیل کی تیز، کچی سانی مہک ان کی چائے اور کافی میں گھل رہی تھی۔ وہ آندھرا پردیش سے آئی تھی اور اب دوبئی میں کسی شیخ کے پاس آیا گیری کے لیے جا رہی تھی۔ اس کے برابر بیٹھا مرد الہ آباد سے دوبئی جا رہا تھا۔ دوبئی میں اس کا درزی کا کام تھا، جیسا کہ اس نے بتایا۔

آپ کبھی کراچی گئے ہیں؟ عورت نے اسے اتنے اشتیاق سے ہزاروں فیٹ کی بلندی سے لانڈھی کو پہچاننے کی کوشش کرتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

جی نہیں، درزی نے الہ آباد کی پختہ، الفاظ کے شستہ صوتی زیر و بم رکھنے والی اردو میں جواب دیا۔ بس ہوائی اڈے پر رکے ہیں، دو ایک گھنٹے کے لیے۔

تو آپ کے رشتے داروں کے یہاں؟

جی ہاں، دونوں چچا یہیں ہیں۔ لانڈھی میں رہتے ہیں۔ پارسال والدہ گئی تھیں۔

ویسے ہندوستان کے حالات اب کیسے ہیں؟ اس نے بے ساختہ پوچھا تھا، ایسا سوال جو ہر پاکستانی

ہندوستانی مسلمانوں سے پوچھتا ہے۔

جی ٹھیک ٹھاک ہیں اب تو، ڈرری نے کہا۔ وہ جو پہلے پریشانی سی تھی سو تو اب دب دبا گئی۔

تو اب عورت نے کچھ کول مول سا سوال کیا تھا، کچھ گڑبڑ نہیں آپ کی طرف؟

بالکل نہیں۔ دونوں ہندوستانیوں نے سر ہلایا۔ عورت آندھرا کی آپا کا اندرون ملک آمد کا کارڈ بھر رہی تھی (کیوں کہ آپا کو اردو یا انگریزی نہیں آتی تھی) اور اس وقت اس کے پاسپورٹ سے نقل کر کے اس کا مشکل سا تلیگو نام لکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ آندھرا کے کسی بالکل گمنام گاؤں میں پیدا ہوئی تھی اور یہ تارہ، یا نکور پاسپورٹ اسے حیدر آباد (دکن) سے ملا تھا جہاں ہو سکتا ہے وہ خاص اسی مقصد کے لیے گئی ہو۔ اس کے سوال کے جواب میں نہیں نہیں میں سر ہلاتے ہوئے وہ مسکرائی تو اس کے سفید دانت سیاہ لبوں میں چمکے۔ عورت کو اس کی نظروں میں امید بھری التجا دکھائی دی گویا کہتی ہو، ہندوستان میں ہندو مسلم جھگڑا بالکل نہیں ہو رہا، اے مسلمان عورت، تو میرا کارڈ صحیح صحیح بھر دے۔

دوبئی میں پتے کا خانہ بھر وانے کے لیے اس نے سفید پلاسٹک کی جالی کے تھیلے سے بڑے بڑے رنگین پھولوں والے ریشمی رومال میں بہت احتیاط سے لپٹا ہوا ایک کاغذ نکالا۔ شیخ کا نام اور پوسٹ بکس نمبر لکھوانے کے بعد کاغذ تہہ کر کے اس نے دوبارہ اُسی طرح احتیاط سے تھیلے میں واپس رکھ دیا۔

کیا اتنا کافی ہو گا؟ عورت نے کچھ تشویش سے پوچھا۔

جی ہاں، جی ہاں، بالکل کافی ہو گا، ڈرری نے فوراً کہا۔ وہ بڑی توجہ سے کارڈ بھر وانے میں اپنی ہم وطن انجان تلیگو عورت کی مدد کر رہا تھا۔ چند گھنٹوں کے سفر میں ان دونوں میں جیسے کوئی بندھن بندھ گیا تھا۔ عورت نے سوچا، دوبئی اترنے پر ڈرری کمال ذمےداری سے آپا کو بخیریت شیخ کے حوالے کرے گا۔

وہ کون تھی؟ کیا شادی شدہ تھی؟ کیا اس کے بچے تھے؟ عورت یہ سب کچھ آندھرا کی آپا کی زبان نہ جاننے کے باعث اس سے نہ پوچھ سکی۔

وہ ڈرری سے باتیں کرنے لگی۔ توقع کے عین مطابق، ڈرری خوش حال تھا۔ جی ہاں، دوبئی میں تین رشتےداروں کو کام پر لگا چکا تھا۔ بیوی بچے وہیں الہ آباد میں رہتے تھے، لیکن وہ خود ہر دو ایک سال بعد چکر لگا آتا تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کا چھوٹا بھائی بی کام میں پڑھتا ہے، اب وہ بھی اگلے سال دوبئی آ کر اس کا ہاتھ بٹائے گا۔

لیکن، ڈرری نے تحمل سے کہا، بی اے، ایم اے کیا ہوتا ہے بیگم صاحبہ! لاکھوں پڑھے لکھے جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ دو چار ایم اے پاس کو تو اس نے سکون سے کہا، خدا کے فضل و کرم سے میں خود اپنے پاس نوکری دے سکتا ہوں۔

ہمارا دوبئی کا ڈرری تعلیم کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا تھا۔

لیکن عورت نے چوں کہ جہاں جہ کے چکر میں پڑتے ہوئے بات آگے بڑھائی تھی، تعلیم

بھی تو ضروری ہے نا، یعنی روشن خیالی سمجھ بوجھ عقل و دانش وغیرہ کے لیے

دُرری مسکرانے لگا۔

عورت نے شرمندگی سے کہا، اس کے لیے آج کل ایک باقاعدہ اصطلاح ہے یعنی تربیت اور تعلیم کے لیے ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ ___ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما۔

پھر اس نے کہا، ہمارے وہاں کے ایک شاعر نے بھی ایسا ہی ایک شعر کہا ہے۔

کیا شعر کہا ہے؟ ارشاد، ارشاد!

بھلا یوپی کا آدمی اور شعر نہ سنا جائے!

عورت نے پاکستانی مزدور شاعر کا شعر سنایا

کاری گروں نے ماہوؤں کو زیر کر لیا
محنت کی آنچ کامدی استاد کھا گئی

واہ وا! بہت خوب! دُرری نے قہقہہ لگا کر داد دی۔ اس نے حبیب کو بتایا کہ وہ دوبئی میں اپنے یار دوستوں کے لیے الہ آباد کے شہرہ آفاق امرودوں کے کریٹ لے جا رہا ہے، اگر اسے خبر ہوتی کہ راستے میں اسے شعر سنانے والی ہم سفر ملے گی تو وہ ایک کریٹ اوپر ہی رکھ لیتا، اسے نذر کرنے کے لیے۔

گھبرائی ہوئی اور اپنے سانولے سوکھے وجود کی پوری قوت سے گھبراہٹ کو چھپاتی ہوئی تنگلو آپا کے برعکس، دُرری دوبئی کو لے کر پُرجوش تھا، مسرور اور پُراعتماد۔ آخر وہ وہاں دس بارہ سال سے رہ رہا تھا۔

پھر وہ عورت کو اپنے گھر کے قصے سنانے لگا۔

دیکھیے صاحب، حسد بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ ہم نے اپنے مکان کی مرمت کروائی ہے، دو تین کمرے چھت پر بھی بنائے ہیں۔ تو اب کی بار میرے وہاں ہوتے ہوئے پڑوسیوں نے ہماری شکایت کر دی۔ پہلے ان سے بہت اچھے تعلقات تھے، لیکن اس بار تھانے میں رپٹ لکھوا دی کہ ان کے گھر کی دوسری منزل سے مرد ہمارے گھر جھانکتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے، ان کی عورتیں شہر بھر میں تو گھومتی پھرتی ہیں۔

عورت غور سے دُرری کی بات سنتی رہی۔ گہرے سانولے رنگ کا، گٹھے ہوئے جسم والا، کھڑے نقش، چمکدار سیاہ آنکھیں۔ خوش حالی اس کے مس مٹہ ہونے کا یقیناً ایک سبب ہو گی۔ وہ ایک پرکشش مرد تھا، پینتیس چالیس کا رہا ہو گا۔ سال بھر یہ دوبئی میں کیا کرتا ہو گا؟ بیوی تو ساتھ رہتی نہیں۔ پھر اس نے سوچا ___ مگر آیائیں تو ہیں۔

دُرری نے اسے بتایا تھا، چھوٹا سا انتظام ہے دوبئی میں اپنا۔ خدا کے فضل سے سب کچھ ہے فرج، ایئر کنڈیشنر۔ ایئر کنڈیشنر کے بغیر تو رہا نہیں جاتا نا بڑی گرمی پڑتی ہے۔

عورت نے آپا پر نظر ڈالی۔ اسے جوش ملیح آبادی کی نظم تلنگن یاد آئی۔ سنگِ سیاہ میں تراشی

ہوئی، تھامے طوفاں سی جوانی، وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ تو وہ والی عورت نہ تھی، یہ دوسری طرح کی تلملی —— دبلے بدن میں کھسراہٹ محسوس کیے، کمائی کے لیے (کس کے لیے کمائی؟ ماں باپ کے لیے؟ چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے؟ بچوں کے لیے) دور دیسوں کو جاتی ہوئی، یوں اکڑی بیٹھی جیسے کوئی لام پر جاتا ہو۔

عورت دری سے یہ نہ پوچھ سکی تھی کہ اس کے پڑوسی ہندو تھے یا مسلماں۔ بعد میں اس نے سوچا کہ پوچھ لیتی تو اچھا ہوتا' اس طرح کچھ نظریاتی کلیوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسلمہ اصول تھا کہ مخلوط معاشروں میں ایک فرقے کی معاشی ترقی سے فرقہ واریت کی کھیتی میں بیج پڑتے ہیں۔ اگر دری کے پڑوسی ہندو تھے تب دری کے مکاں کی دوسری منزل انھیں باری مسجد کا شدت سے مخالف بنا سکتی تھی۔

ہندوستاں   ہندوستاں   تقسیم سے ستر کی دہائی تک، ایک غیر مختتم تسلسل   مراد آباد
میرٹھ   بلووں کا طویل سلسلہ   ہر ساں عیدگاہ کی مسلی، سلوٹیں پڑی دریوں پر جوتوں کے دھبے
دروازے پر عید کے لیے خریدے گئے نئے جوتوں کا ڈھیر   ایک بھاسا، کلاشنو کا جوتا   کوڑے کے
ڈھیر کے پاس پڑی ایک چھوٹی سی سفید کڑھی ہوئی ٹوپی

اور برسوں پہلے کراچی میں   رنچھوڑلائن کی تنگ، پیچ دار گلیوں میں سولجر بازار کے دائیں جانب، جہاں سن سینتالیس اڑتالیس کا شاندار سینما گھر لائٹ ہاؤس ابھی شفاف شیشے جڑی بلندی میں ہلکی دھوپ میں کھڑا جگمگا رہا تھا، چھ برس کا حلال ایک سہ منزلہ عمارت میں ایسے چھوٹے سے فلیٹ کے پیچھے دروازے پر کچھ خوف زدہ سا کھڑا حیرت سے ٹکٹکی باندھے برابر کی گلی کی طرف دیکھ رہا ہے جہاں ایک متروکہ مکاں کا تالا توڑا گیا ہے اور ساماں لوٹا جا رہا ہے۔

گلی میں شور ہے۔ چھینا جھپٹی میں لوگوں کے مال بکھر گئے ہیں، دامنوں کے چاک ادھڑ گئے ہیں۔

بیٹے، اندر آ جاؤ! بالکنی سے اس کی اماں پکارتی ہیں۔

یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ حلال چھوٹی سی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ہکلا کر پوچھتا ہے   یہ کیا ہو رہا ہے؟

کچھ نہیں، ساماں لوٹا جا رہا ہے۔ تم اندر آ جاؤ۔   اماں حلال کی بڑی بہن کو اسے اوپر لانے کے لیے بھیج کر باورچی خانے میں واپس چلی جاتی ہیں۔

لٹتے مکاں کے ساماں میں سے کسی ہندو بچے کی ایک چھوٹی سی گیند لڑھکتی ہوئی حلال کی گلی میں پہنچ جاتی ہے۔ حلال ڈرتے ڈرتے اسے اٹھاتا ہے۔ پھر جب اس کا اعتماد بحال ہوتا ہے تو وہ اسے مضبوطی سے تھام لیتا ہے۔ گھر میں آ کر وہ اماں کو گیند دکھاتا ہے۔

اماں، دیکھو! ہم نے بھی لوٹا!

مگر وہ پڑوسی ہندو ہے یا مسلمان، عورت یہ پوچھ نہ پائی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان تلگو آیا بیٹھی تھی، اور وہ اردو انگریزی بھلے ہی نہ سمجھتی ہو مگر لفظ ہندو تو ضرور سمجھ سکتی تھی۔ آیا کا لحاظ کرتے ہوئے وہ ایسا سوال نہ پوچھ سکتی تھی جس میں فرقہ واریت کا پہلو نکلتا ہو۔

تو کیا ہم اس قدر تکلف سے بیٹھے تھے؟ عورت بعد میں سوچتی ہے۔ شاید تکلف سے نہیں، تہذیب سے۔ سویرے کی پرواز میں جہاز کی نشستوں پر شانے سے شانہ جوڑ کر بیٹھے، ایسا لحاظ سلامت لیے، ہوا میں اُڑے جاتے تین مسافر

اور اگر ___ عورت نے دوبئی میں دونوں ہندوستانی مسافروں کو وداع کرنے کے بعد تینوں نشستوں پر اکیلے قبضہ جماتے ہوئے، ہاتھوں کے انگوٹھے اوپر تلے گھماتے ہوئے، پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سوچا تھا ___ اگر وہ پڑوسی مسلمان ہوتے تب؟ تب کیا بات ہوتا؟

مگر یہ بات وہ معلوم کر ہی نہ سکی تھی۔ وہ کسی بھی کلیے یا مسلمہ نظریے میں ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے تھے اور عورت کے تخیل میں ہمیشہ یوں ہی پہیلی بن کر رہنے والے تھے ___ عمرانی معلومات فراہم کرنے سے انکاری، ایک کھڑکی سے جھانکتے، ہنس کر اس کو چڑاتے صرف کچھ حاسد پڑوسی، جو نہ جانے ہندو تھے کہ مسلمان!

***

ناظم آباد نمبر چار میں علیم الدین اور کلیم الدین کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی کہ ان کے تحت الشعور میں سے گورکھ پور سے ٹیکم چند نکل کر آ وارد ہوا اور عجب طرح کے اشارے کر کر کے کچھ پوچھنے لگا۔ تنگ آ کر علیم الدین نے کہا نہیں بھائی ٹیکم چند، جداگانہ انتخابات کا مسلم لیگی مطالبہ کانگریس نے منظور نہیں کیا تھا۔ ۱۹۲۸ میں موتی لال نہرو نے اسے مسترد کر دیا تھا۔

نہرو ___ جو کشمیر سے آئے تھے، صدیوں پہلے۔ مغل حاکموں نے اُنہیں نہر کے پاس جاگیر عطا کی تو وہ نہرو کہلائے۔

سب لوگ کہیں نہ کہیں سے آئے ہیں اور کوئی بھی کہیں کا ازل الآباد سے رہنے والا نہیں ہے۔

انسانوں کے ہجوم گھوڑوں پر سوار، ہاتھیوں پر لدے، اونٹوں اور خچروں پر، ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں میں، صحرا اور سمندر اُلانگھتے جوق در جوق سفر میں ہیں اور ایک دوسرے سے جنگ و جدال میں مصروف ہیں ___ رزق حاصل کرنے کے لیے، پیٹ میں دو نوالے روٹی ڈالنے کے لیے، اور تن ڈھانپنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو مکان حاصل کرنے کے لیے۔ علاوہ ازیں ٹیپ ریکارڈر اور ٹیلی وژن، ایرکنڈیشنر اور بجلی سے چلنے والا تمام اٹرم کھٹرم سامان حاصل کرنے کے لیے انسانوں کے ہجوم بسوں اور ریل گاڑیوں میں، اونٹوں اور خچروں پر، چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور جہازوں میں، ایک مقام سے دوسرے مقام کی جانب

ہو کر رہے ہیں اور ایک دوسرے سے جدال و قتال میں مصروف ہیں۔

جس پر کلیم الدین گویا ہوا

اوہ! تو پھر ایسا کیوں نہیں کیا جاتا کہ بھئی، یہ ساری اشیا جن دکانوں میں بھری ہیں ان کو کیا نام کہ لوٹ لیا جائے اور یہ سب چیزیں برابر برابر تقسیم کر دی جائیں لوگوں میں۔ بجائے ایک دوسرے کو قتل کرنے کے، میرے خیال میں تو یہ زیادہ بہتر طریقہ ہو گا۔

یعنی کرۂ ارض پر مکمل طوائف الملوکی قائم کر دی جائے؟ علیم الدین نے استفسار کیا۔

نہیں نہیں، اس کا باقاعدہ نظام بنایا جائے۔ ایک تو یہ کہ زندگی سادگی سے گزاری جائے۔ انسانی ضروریات کیا ہیں، اس کی از سر نو تفہیم کی جائے۔ مثلاً ایئر کنڈیشنر ـــ کیا یہ جائز انسانی ضرورت ہے؟

نہیں، مگر جب غیر ایئر کنڈیشنر والا ہجوم ایک طبقے کے کتوں کو بھی ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں آرام کرتا دیکھتا ہے تو وہ بھی یہی سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جو امرا کو اور ان کے کتوں کو حاصل ہے۔

یہ تو صحیح ہے۔ طبقات بڑی گڑبڑ چیز ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں طبقات ہونے کے باعث سب سے زیادہ بدامنی اور خوں ریزی ہوئی ہے۔ تو طبقات ختم کر دیے جائیں!

ایسا ہوا تھا نا پیارے! سوویت یونین اور چین میں ایک اشتراکی معاشرہ قائم کیا گیا۔ !!مگر یہ بیسویں صدی کا آخر ہے۔ دنیا نے سوشلزم کو مسترد کر دیا ہے۔

وہ تو اس لیے کہ آزادی نہیں تھی ضرورت سے زیادہ نوکر شاہی آ گئی تھی اس نظام میں

جی نہیں! اس لیے کہ اشتراکی ملکوں کے عوام اپنے اشتراکی قومی ملکیت کے کارخانوں میں سے بھدے کپڑوں اور ناقص کلائی کی گھڑیوں سے نفرت کرتے تھے۔ اس کے بجائے وہ خوب صورت اور اعلیٰ تر جاپانی کپڑے اور گھڑیاں خریدنا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ سوئس چاکلیٹ کھانا چاہتے تھے۔

آہ! صرف ان چیزوں کے لیے! سننے والے نے کہا۔

ہاں! کہنے والے نے بتایا اور چند ردی کاغذ ہوا میں اچھالے۔ وہ گیا اشتراکی نظام ـــ صرف ایک سوئس چاکلیٹ کے لیے!

تو آدمی تو ایسا ہے!

ایسا ہے بھئی ایسا ہے!

علیم الدین رضوی اور کلیم الدین رضوی، سکنہ ناظم آباد نمبر چار، نے قوالی گائی اور دھمال ڈالا۔

***

برسوں پہلے کی بات ہے، کراچی میں ناگن چورنگی کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے قدم اچانک رک گئے۔ چورنگی پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مائیکروفون تھا اور وہ کچھ

قد ریسی کر رہا تھا۔ آس پاس سے کاڑیاں تو بغیر اس پر توجہ دیے گزر رہی تھیں، مگر چند پیدل چلنے والے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ وہ آدمی کہہ رہا تھا

سانبیو اور سہو! سندھیو اور مہاجرو! اور پنجابی پٹھان بلوچیو! چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہنے والو! بسوں میں سفر کرنے والو! ہمارے خواب کہاں کھو گئے؟

کہاں کھو گئے ہمارے شہرے جیسے ہمارے وطن پاکستان میں؟ جیسے جو ہماری آنکھوں کو سجائے رکھتے تھے۔ آدرش جن کی طاقت سے ہم پہروں بس اسٹاپ پر دھوپ میں کھڑے رہ سکتے تھے۔ اس دولت مند طبقے نے وہ خواب ہم سے چھین لیے۔ یہ لوگ اتنے مفلس تھے کہ انھوں نے مفلسوں کے خواب چرا لیے۔ ثروت اور عیاشی میں مصروف یہ لوگ ہمارے خوابوں کے جھوٹے دعوے دار بن چکے ہیں۔ یہ جیت سیٹر جیسا اور سپاہ کہ میں ہمارے خوابوں کا مالک رہا رہے ہیں۔ یہ انسانی حقوق کی انجمنیں بناتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کا طرز زندگی اس سرزمین پر سب سے کھلا ہوا مسئلہ ہے اور اس بدصورتی کو مٹا ڈالنا یہاں کے انسانوں کا جائز حق ہے۔

اس طبقے کی عورتیں عورتوں کے حقوق کی انجمنیں بناتی ہیں اور ایک لاکھ روپے کا جوڑا پہن کر نو لاکھ روپے کی موٹر کار میں بیٹھ کر ایک کروڑ روپے کی شادی کی تقریب میں شرکت کرتی ہیں۔ اور ہماری بیٹیوں کے معمولی جہیز پولیس اور ریسرچ کے ادھ کھلوں میں گھس کر چھین لے جاتے ہیں۔

ان امیر طبقے نے ہمارے خواب چرا لیے اور ان کے بدلے میں ایسے خواب ہماری آنکھوں کے سوتوں میں کسی زہریلے انجکشن کی طرح داخل کر دیے ـــ تمول اور ثروت کے عیاشی کے خواب۔ اب ہم وہی خواب دیکھ رہے ہیں اور ہاتھوں میں بندوقیں لیے ایک دوسرے پر فائر کر رہے ہیں، ایک دوسرے کی کھوپڑیاں پاش پاش کر رہے ہیں۔

قومی حقوق! قومی حقوق کیا ہیں؟ روٹی، کپڑا اور مکان ـــ یہی تو چاہیے انسان کو! اب اس کے ساتھ کار اور ایرکنڈیشنر اور بجلی سے چلنے والا جدید ترین سامان بھی شامل ہو چکا ہے۔ اسی لیے تو لڑ رہے ہیں ہم۔ جتھے اور گلے بنا بنا کر ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔

اور امیر طبقہ ایسی ساری ظاہری واویلا کے باوجود اس سے خوش ہے۔ وہ یہ صورتِ حال برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

ہمیں قومی حقوق کے ساتھ ایسے چرا لیے گئے خواب کی ضرورت ہے۔ اُس دنیا کی جو ہماری تھی اور جو برباد کر دی گئی۔ اتنی بری تو نہ تھی ہماری چھوٹی سی دنیا۔ اس میں ایک پیڑ تھا، اور ایک مختصر آنگن پر پھیلا ہوا سپید نیلا آسمان۔ ٹھنڈے پانی کی سراحی اور اس پر ڈھکا کٹورا۔ اس میں کتابیں تھیں اور علم کی پیاس تھی۔ اور ایک پرانی جائے نماز جس پر ہماری ماں یا باپ بغیر خوف خوار لعنے لگائے عبادت کر سکتے تھے۔ اور جوان لڑکیاں اور لڑکے جو سیاہ عبائیں پہنے بغیر، الف لیلہ کی رقاصاؤں کی طرح آنکھوں سے نیچے تک نقابیں اوڑھے بغیر، چھپے پہنے بغیر اور سروں پر مسخروں کے سے رنگ برنگے عمامے

مانڈے بعیر رہتے تھے، اور خدا کی جھوٹی قسم کھانے سے جھجکتے تھے۔

ہمیں ایسی جھجک کی بازیافت کی ضرورت ہے جو ہم سے چھین لی گئی ہے اور ہمارے ہاتھوں میں بندوقیں تھما دی گئی ہیں۔ اور اس قتل و غارت گری کو تقدس بخشنے کے لیے ہمارے شہروں کی شاہراہوں پر جا بجا اللہ اکبر اور ہوالصمد کے بڑے بورڈ آویزاں کر دیے گئے ہیں

وہ یہاں تک کہہ پایا تھا کہ ہجوم سے ایک غلغلہ اٹھا۔

چور چور چور! مارو! نکالو اسے!

ہجوم اس پر سڑے ہوئے ٹماٹر اور گندے انڈے برسا کر تتر بتر ہو گیا۔

اب اس شخص نے پینترا بدل کر دوبارہ تقریر شروع کی۔ اس نے مکّا لہرا کر کہا

مہاجروں کے حقوق کے لیے ہم خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے!

ہجوم سرعت سے جمع ہو گیا اور تالیوں کا ایسا شور بلند ہوا کہ آس پاس کی عمارتیں لرزنے لگیں۔

پھر اس نے لہجہ بدل کر کہا

ہم سندھیوں کے حقوق کے لیے آخری سانس تک جنگ کریں گے۔

حیدرآباد اور سکھر اور نواب شاہ اور پورے سندھ سے نعروں کا ایسا شور اٹھا کہ دھرتی دھمکنے لگی۔

مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیسوں!

وہ آدمی سندھیوں اور مہاجروں کا رہنما بن گیا۔

***

کراچی کے شہری

پہلے لوگوں نے ایک بےبسی محسوس کی۔

پھر وہ مزید قتلوں کا انتظار کرنے لگے۔

اس کے بعد مزید قتل ہوئے۔ یہ سب قتل متوقع تھے۔

کراچی میں لوگ دو تین برس سے ایک بڑے قتلِ عام کی توقع کر رہے ہیں ـــ حالاں کہ بیچ میں لوگ ایسی توقع بھول جاتے ہیں۔

کبھی انھیں لگتا ہے کہ قتل کی خبروں کا اب ان پر اثر نہیں ہو رہا۔ وہ کثیر التعداد قتل کی وارداتوں پر مذاق سا لینے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے سے آج کا اسکور پوچھتے ہیں۔

ان میں سے چند کہتے ہیں، قتل اور جرائم تو ہر شہر میں ہوتے ہیں۔

بڑے شہروں میں قتل اور جرائم زیادہ ہوتے ہیں۔
شکاگو میں بہت قتل اور جرائم ہوتے ہیں۔
کراچی کی آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔
یہاں کوئی تفریحی مقام نہیں۔ (اس لیے لوگ ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں؟)
اگر سڑکوں کی مرمت ہو جائے، اگر سیوریج سسٹم ٹھیک ہو جائے، تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

***

پیاز کے چھلکے

سال بھر سے ریاست کے دارالخلافے میں ایک افواہ گشت کر رہی تھی (گو یہ بات بڑی رازداری سے کہی جاتی تھی) کہ بااختیار قوتوں نے کراچی کے مسئلے کو حل کرنے کا ایک منصوبہ بنا لیا ہے۔ منصوبہ یہ تھا کہ چوں کہ کراچی کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور گھمبیر ہے، اور اسے حل کرنا صوبائی انتظامیہ کے بس کی بات نہیں، لہذا مختصر پیمانے پر تھوڑے بہت خون خرابے کے بعد کراچی کو وفاقی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ (دوسری صورت میں ـــ کہا گیا تھا ـــ بہت بڑے پیمانے پر خون خرابے کا خطرہ تھا۔) اس منصوبے کا کیا ہوا؟ کیا یہ چاروں طرف گرتی لاشیں ـــ چھ سات، چار پانچ، دو تین، ہر روز، اور کبھی زیادہ ـــ اسی منصوبے کی تکمیل کا حصہ ہیں؟ جیسے پرت در پرت، منصوبے کی پیاز کے چھلکے اترتے ہوں یا یہ منصوبہ مناسب نہ سمجھتے ہوئے بیچ ہی میں چھوڑ دیا گیا؟ یا یہ محض افواہ تھی، ایسا کوئی منصوبہ بنایا ہی نہیں گیا تھا؟

کراچی کے شہری یہ نہیں جانتے، صرف اندازہ لگا سکتے ہیں۔ صحیح معلومات حاصل کرنے کا ان کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ مسائل کے حل کی حکمت عملی خفیہ ہے۔ ایسے مضبوط صندوقوں میں بند، آرپار نظر آنا جن کی خصوصیت نہیں۔ وہ اندھیرے میں ہیں، اور صرف امید کر سکتے ہیں کہ بااختیار ہاتھ کی حکمت عملی درست ہوگی، تیر (اب کی بار) نشانے پر بیٹھے گا، اور یوں شاید سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس منصوبے کی افواہ جب کراچی میں پھیلی تھی تو بسنے والوں نے اطمینان تک محسوس کیا تھا۔ وہ ایک ناٹک کی طرح کھیلے جانے والے خون خرابے کو جو خفیہ ہاتھوں کے قابو میں ہو، قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئے تھے۔ مگر ذہنی طور پر تیار ہونا ایک بات ہے، سچ مچ کسی صورت حال سے گزرنا بالکل دوسری بات۔ اب جب کہ خون بہنا شروع ہو گیا تھا (اگر یہ اُس مشہورہ، یا مبینہ، ناٹک کا حصہ تھا!) تو وہ تلملا رہے تھے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خون ریزی ان کا، ملک کا، قوم کا، کراچی کا بھلا چاہنے والوں

کے (انہیں اتنا چاہنے والوں کے جتنا کوئی بھی نہیں چاہتا ہوگا) بہ قائمی ہوش و حواس سالے ہوئے کسی ایسے منصوبے کا حصہ شاید نہیں ہو سکتی جس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کیا شہر کے لوگ ایسے حالات خود ٹھیک نہیں کر سکتے؟

لیکن اس کا جواب ایک اَور حکمت عملی میں ہے؛ سن ۱۹۷۷ سے جاری و ساری اور سختی سے نافذ حکمت عملی جس کے ذریعے سے منظم طور پر عام لوگوں کو سیاسی عمل سے اور معاشرے کو کوئی بھی رخ دینے کی قوت سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ دہشت ناک فوجی حکومت کے طویل، اعصاب شکن برسوں نے لوگوں کو، بحیثیت ہوش مند شہری، معطل کر دیا ہے، ایک سطح پر، ان جانے میں، کسی مقام پر وہ ایسی صلاحیتوں سے دستبردار بھی ہو گئے ہیں۔ فوجی آمریت میں جلاوطن ہو جانے والے لوگوں نے پاکستان واپس آ کر ہاتھ پر ہاتھ دھری ایسی مخلوق کو دیکھا تھا جس کی آنکھیں برسوں صرف وی سی آر اور ٹیلی وژن دیکھتے دیکھتے چوکور ہو چکی تھیں اور جو صوفوں پر، کرسیوں پر، چٹائیوں پر دراز یہی کہہ رہی تھی کہ کچھ کروایا جا رہا ہے، کچھ کروایا جانے والا ہے، اور ایسی انتہائے معقولیت کی حالت سے بے خبر تھی۔

***

معیشت

اس شہر میں، مَیں اجنبی یوں تو نہ تھی میرے خدا
اس کی زمیں، اس کے فلک، اس کی ہَوا کو کیا ہوا؟
پہچان میں آتا نہیں، پہچان بھی پاتا نہیں مجھ کو کوئی
بدلا ہوا سارا سماں
ہے روشنی اتنی مگر کچھ بھی نظر آتا نہیں
گھر تھے یہاں
رہتے تھے جن میں کچھ مکیں
اک پیڑ تھا اس جا کھڑا
جھولا پڑا تھا ڈال پر
اک دوست رہتا تھا یہاں
کیوں مٹ گئے سارے نشاں؟
اب تو فقط ہر موڑ پر، ہر گام پر

فہمیدہ ریاض

بازار ہے، بازار ہے، بازار ہے

بازار میں ہر روز عید
سستی فروخت، فوری خرید
میلے دکانداروں کے ہیں
کیا شور سرکاروں کے ہیں
اشیا کا حسن ہے عیاں
چھ گاؤں کے صحن میں، جو شعلہ اٹھاتا ہو گرا
پھر شور اٹھا ناگہاں
لو لڑ پڑے گاہک سے
خنجر چھری پستول نکلے، بم پھٹا، پھیلا دھواں
دوڑا پولیس کا آدمی، سیٹی بجی
بازار کے اوپر تنا ہے آسماں نیلم جڑا
ابھری سمندر سے ہوا، نکلا ہے تارا شام کا
اور چاند سے پیلا پڑا
بازار کے اندر مگر فرصت کسے، دیکھے ادھر
ساگر کے تٹ تک چھا گیا، سانسوں کی حد تک آ گیا
جو ہر طرف بازار ہے
بازار ہے، بازار ہے

(۱۹۸۷ میں، جلاوطنی سے لوٹنے کے بعد، کراچی میں لکھی ایک نظم)

ارے احمق! بازار کو تم برا سمجھتی ہو؟ تم مارکیٹ اکانومی اور اس کی قوتوں کو کم گردانتی ہو؟ دراصل تمہیں معیشت کی سمجھ ہی نہیں تھی۔ بازار جتنا پھیلے، لوگوں کو اتنا زیادہ روزگار ملتا ہے۔ کیا کہا، سادہ زندگی؟ آدمی ایک تو سادہ زندگی چاہتا ہی نہیں، دوسرے سادہ زندگی سے تو معیشت منجمد ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر (بی بی سی اکنامک رپورٹ برائے چین) اگر ایک محلے کے لوگ ایک انڈا روز کھاتے ہیں تو اصراف کے لیے تین ہزار پانچ سو پندرہ مرغیاں پال لی جاتی ہیں۔ انہیں فوراً دو انڈے روز کھانے شروع کر دینے چاہییں، جس کے لیے سات ہزار تیس مرغیوں کی ضرورت ہو گی۔ اس سے ان کو دانہ کھلانے والوں کی آمدنی دگنی ہو جائے گی؛ علاوہ ازیں مرغیوں کی دیکھ بھال کرنے والوں، انڈے جمع کرنے والوں اور مرغی خانے صاف کرنے والوں کی تعداد بھی دگنی ہو جائے گی۔ یعنی روزگار میں اضافہ ہو گا۔

شہر (۱)

اب یہ جہاز لنڈن ہی جا کر رکے گا، عورت سوچتی ہے۔ ہاتھ بڑھا کر بتی بند کرتی ہے اور ہوائی میزبان کا دیا ہوا کمبل اوڑھ کر، تینوں نشستوں کے ہتھے اٹھا کر، سہاسا تکیہ لگا کر، آرام سے سونے کے لیے لیٹ جاتی ہے۔

بہت ہی دور رہ گیا کراچی۔ اس کے دماغ میں شہر کی تصویر گھومتی ہے۔

شہر جو بحیرۂ عرب کے کنارے لیٹا ہے، نقشے میں دیکھیے تو اس کی شکل ایک مچھلی کی دُم کی طرح دکھائی دیتی ہے جیسے باقی مچھلی پانی میں ڈوبی ہوئی ہو۔ اس منقسم دم کا شمالی حصہ لس بیلہ سے متصل کیرتھر پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ باریک ہوتا ہوا ختم ہوتا ہے جبکہ جنوبی حصہ سندھ کے میدانی علاقے میں گولائی میں پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح کراچی میدانی، زرخیز سندھ اور کوہستانی، سنگلاخ بلوچستان کے درمیان دھوپ میں لیٹا ہے، جنوب مغرب میں عرب ساگر کی نرم لہروں کی تھپکیوں میں ہلکورے لیتا، ایسے بادلوں بھرے ساحلی آسمان کے نیچے، نمکین، گیلی ہوا سے سدا ٹھنڈا اور کچھ چپ چپا۔ یہاں آپ کا پسینا آسانی سے نہیں سوکھے گا، اور اگر آپ کے بال لمبے ہیں تو وہ اس کی گیلی ہوا کے پہلے ہی جھونکے میں گھنگھریالے ہو جائیں گے اور نمکین دھوپ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کی جلد کی رنگت سنولا دے گی۔

یہاں کا پانی ہر ایک کو راس نہیں آتا۔ ۱۹۵۸ میں ملک میں مارشل لا لگانے کے بعد جب فیلڈ مارشل ایوب خاں یہاں آئے تو ان کا ہاضمہ مستقل طور پر خراب رہنے لگا۔ ملک کے دارالخلافے کو اس سمندری، گرم مرطوب علاقے سے (اور یہاں آ بسنے والے دبلے پتلے، سانولے، تیزی سے چر چر بہت زیادہ بولنے والوں کے شور مچاتے جنگل سے) نکال کر دور شمال میں اپنے گاؤں ریحانہ کے پاس بسانے میں فیلڈ مارشل ایوب خاں کی بد ہضمی کا بھی خاصا ہاتھ تھا۔

(یہ بات راقم الحروف کو ۱۹۶۲ یا ۶۳ میں ایوب خاں کی اُس وقت نوعمر صاحبزادی نے اُن کے پُرسکون گاؤں ریحانہ کی آبائی رہائش گاہ میں سنائی تھی۔ راقمہ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ مری اور ایبٹ آباد کی سیر و سیاحت کو گئی تھی۔ ساتھ پڑھنے والی ایک لڑکی ایوب خاں کی صاحبزادی کی دوست تھی۔)

بڑی طاقتوں کی میزوں پر دھرے نقشوں میں یہ عمان کی کھاڑی کے دہانے پر پھیلے پانیوں کے پار اپنے عین سامنے جڑواں شہر مسقط کو تاکتا اور ہاتھ ہلاتا نظر آ سکتا ہے، گرم پانیوں کے دہانے پر، جہاں سے تیل کی دولت سے مالامال مشرقِ اوسط کے وسائل تک رسائی سہل اور کم خرچ ہے اور خوش حال، پھلتے پھولتے بازار، زیادہ سے زیادہ چیزوں کی زیادہ سے زیادہ قیمت دینے کے اہل صارفین کی زیادہ سے زیادہ اور روز افزوں تعداد

اردو میں کٹ کٹ بولنے اور بولتے ہی رہنے والے مہاجرین (جیسا کہ بہت سے دوسری زبان بولنے والوں کو شکایت ہے) ۱۹۴۷ میں جس شہر میں پہنچے وہ ایک خوب صورت، صاف ستھری اور

مختصر سدرگاہ تھا، کو اُس وقت بھی یہ ایسی ماہیت میں وسیع المشرب تھا۔ یہاں ایران سے ہجرت کر کے سورت کی سدرگاہ پر اترنے اور پھر کراچی میں آ کر بس جانے والے پارسیوں اور ساہیوں کی کالونیاں آباد تھیں، بوہروں اور خوجوں کے محلے تھے، پرتگالی اثرو سعود میں عیسائیت اختیار کرنے والے رومن کیتھولک گوا سیوں کی بستیاں تھیں جن کے سائے ہوئے چرچ جا بجا ایستادہ ہیں۔ (پاکستان کا سب سے بڑا رومن کیتھولک چرچ کراچی میں ہے۔ اس کے برعکس، برطانوی راج کے زیر اثر عیسائی بننے والے پروٹسٹنٹ، عموماً بنجابی جاکروبوں، کا چرچ گو تعمیر میں شاندار ہے مگر اس کے ممبروں کی تعداد کراچی کے قدیم تر رومن کیتھولکوں سے کم ہے۔ سفید پوش روزگار کمانے والے ان کیتھولکوں کا ایک حسین جملا یہ ہے کہ کراچی کے امریکی اور برطانوی سفارت کار تیج تیوہار کے موقعے پر انھیں کی چرچ میں عبادت کرتے ہیں۔)

شہر کی پرانی گلیوں میں کھارادر کے آس پاس عبادات کے ناموں کی اکا دکا تختیاں آج بھی کہیں نظر آ سکتی ہیں (وہی ذات جو محمد علی نامی ایک عظیم سیاست داں کے ساتھ منسلک ہو کر مشرف بہ اسلام کیے جانے پر، یا اردوائے جانے پر، جانے حلقی سے لکھی گئی اور خواج بنی، مگر جسے اس نو مسلم، اپنی اصل میں گجراتی، ذات کے دوسرے افراد نے نہ اپنایا، ورنہ آج کتنے خواج گھومتے پھرتے! کیا آپ کو کبھی تعجب نہیں ہوا کہ برصغیر میں خواج ذات کا کوئی دوسرا سندھ نشر کیوں نہیں؟)

انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی قبضے میں آنے کے بعد بھی اس شہر کا کثیر قومی اور کثیر تہذیبی مزاج برقرار ہی رہا تھا جس میں یہاں رہنے والی ہندو آبادی اور اس سے تعداد میں بہت کم مسلم آبادی (جو یوں بھی اندرونِ سندھ کے علاوہ دوسرے ملحقہ علاقوں، کچھ، گجرات یا سوراشٹر سے آئی ہوئی تھی) کہیں جذب تھی۔ اسی لیے یہ شہر صرف سندھ کے دوسرے شہروں ہی سے نہیں بلکہ اس پورے خطے سے قطعی مختلف تھا جسے اب مغربی پاکستان کہا جا رہا تھا، اور اپنی ماہیت اور خمیر میں بحیرۂ عرب کے اس کٹے پھٹے ساحل پر دور ا نیچے اتر کر آباد عروس البلاد بمبئی سے زیادہ مماثل تھا۔

مگر ۱۹۴۷ کے آس پاس مذہبی فرقے کا شعور بڑھنے کے باعث (جیسا کہ پورے برصغیر میں، کہیں کم، کہیں زیادہ، کہیں جلد اور کہیں بدیر، ارتقا پا رہا تھا) سندھ میں بھی مسلمان اپنی مذہبی حیثیت پر اصرار کرنا شروع کر رہے تھے۔ سندھ کے بمبئی سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ اس شہر میں بتدریج رہائش اختیار کر رہے تھے۔ پچاس کے قریب برسوں میں ایک میگا پولس بن جانے والے اس شہر کی آبادی ۱۹۴۱ کی مردم شماری کے مطابق چار لاکھ نفوس کے لگ بھگ تھی۔ ۱۹۵۱ میں یہ آبادی گیارہ لاکھ ہو چکی تھی۔ قدیم آبادی سے بھی دُگنی تعداد میں یہاں آ کر بسے مہاجروں نے اس شہر کو پلک جھپکتے میں ایک مہاجر شہر بنا دیا تھا۔ ان میں بھاری تعداد اردو بولنے والوں کی تھی جو مہاجر کیمپوں سے نکل نکل کر شہر بھر میں پھیل رہے تھے؛ جن سے بن پڑا متروکہ مکانوں کے تالے توڑ کر ان پر قبضے کر رہے تھے، یا جھگیوں جھونپڑیوں میں رہ رہے تھے۔ پچاس کی دہائی تک کراچی میں آپ کو جا بجا جھگیوں جھونپڑیوں سے

بیٹھے پیدا نظر آسکتے تھے۔ ساٹھ کی دہائی تک یہ لوگ مکانوں، فلیٹوں میں منتقل ہو چکے تھے۔

دنیا بھر میں ہجرت کرنے والے گروہوں کی طرح، جو پرانے طور طریق، معاشرے اور عادات کی زنجیریں توڑ چکے ہوتے ہیں، یہ جمِ غفیر بھی اس سرزمین پر، یہاں کے قدیم بسنے والوں، پرانے طور طریق، عادات اور اقدار میں ہنوز بندھے باسیوں سے کہیں بڑھ کر، بہتر سے بہتر روزگار اور زندگی کے وسائل حاصل کرنے کی جدوجہد میں جٹا ہوا تھا۔ یہ لوگ بات بے بات پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے، ایک ایسے ملک کے باسی تھے جو نصف زمین پر اور نصف ان کے اپنے ذہن میں تھا۔

آنے والے برسوں میں اس نئے اپنائے ہوئے وطن کی طبعی حقیقت (مع اپنے باشندوں کے) ان کے تصوراتی وطن سے ٹکرانے والی ہے۔

فی الحال تو وہ مسلم لیگ میں ہیں، اور قائدِ ملت نواب زادہ لیاقت علی خان فضا میں مکا بلند کر رہے ہیں اور مہاجرین کے جمِ غفیر پاکستان زندہ باد کے پُرشور نعرے لگا رہے ہیں۔

آنے والے چند برسوں میں ہجرت کر کے آنے والے ہیولے جیسے انبوہ کے خط و خال نمودار ہونا شروع ہو جائیں گے، جیسے وقت کی رنگ بر تصویر کے بیچ نقش اُبھرتے ہیں۔ ان میں ایک ریوڑ کے بدلے افراد، گروہوں اور طبقوں کے نقوش قابلِ شناخت بننے لگیں گے۔ یہاں سے اردو کے دو بڑے اخبار جنگ اور انجام نکلیں گے۔ انگریزی کا اخبار ڈان جم جائے گا اور انگریزی مجلہ مرر نکلے گا۔ ہفتہ وار نمکدان اپنے قہقہہ آور کارٹونوں سمیت خودغرض سیاست دانوں کے پرخچے اڑائے گا۔ یہاں کا پریس مختلف آرا کا ترجمان ہو گا۔ اس شہر کے کسی کوچے میں ابراہیم جلیس پبلک سیفٹی ایکٹ کی مخالفت میں پبلک سیفٹی ریزر لکھیں گے اور حسن ناصر مزدوروں کو منظم کرنے کی تحریک کا آغاز کریں گے۔ اونچے تعلیمی اداروں میں ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن مضبوطی سے جڑیں پکڑے گی۔ یہاں مختلف سیاسی رجحانات ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے اور تصادم کا شور اُٹھے گا، جیسا کہ دنیا بھر کی سیاست میں ہوتا ہے۔ دور، شمالی ہندوستان کے ہرے بھرے میدانی علاقوں سے آئے ہوئے یہ لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے صحنوں میں، گھروں میں اور گھروں کے باہر، سر سبز پیڑ اور سبزی بوئیں گے اور دور دور تک خالی پڑے چٹیل، غیر آباد ریتیلے علاقوں میں کسی آنے والے زمانے کی ہریالی کا انتظام کریں گے۔

یہاں بنیں گے دھڑادھڑ اسکول اور کالج۔ ہجرت کر کے آنے والی اس شہری آبادی کے سامنے آگے بڑھنے کا صرف ایک راستا ہے ـــــ تعلیم۔ حتیٰ کہ گجرات میں جنما ایک مزدور، اے ایم قریشی، کراچی آ کر دولت کمانے کے لیے اسکول اور کالج ہی بنائے گا، جب کہ اس کا حیرت انگیز طور پر مماثل ہمزاد، حاجی مستان، بمبئی میں نام اور پیسہ کمانے کے لیے اسمگلنگ کرتا رہے گا ـــــ ہجرت کا ایک تحیر خیز ہشت پہلو!

۱۹۵۸ میں ملک میں مارشل لا نافذ کرنے کے بعد، درازقد، سرخ و سپید سربراہ مملکت جنرل ایوب خان دارالسلطنت کو کراچی سے اپنے گاؤں ریحانہ کے نزدیک لے گئے۔ انھیں کراچی اور کراچی کے باشندے کچھ خاص پسند نہ تھے۔ کلبلاتی آبادی کے روزانہ کے شور شرابوں اور مطالبوں سے اُکتا کر انھوں نے کہا تھا کہ اگر انھیں حکومت پسند نہیں تو جہاں چاہیں چلے جائیں، آگے تو سمندر ہے۔ (ان کے منہ سے نکلا یہ جملہ آناً فاناً مشہور ہو گیا تھا، اور آج تک اتنا مشہور ہے کہ وقتاً فوقتاً مہاجروں کے مسئلے سے تنگ آنے والے مذاق میں، طنز میں — اور کبھی سچ مچ — انھیں سمندر کا رخ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔) کچھ برس بعد جب ایوب خان نئی مسلم لیگ بنائیں گے، جو درحقیقت ان کی ذاتی مسلم لیگ ہوگی، تو کراچی کے باسی اس میں شامل نہ ہوں گے۔

مگر اس دور میں، جب کہ ان کے شہر میں صنعت کاری کا سلسلہ عروج پر ہے، ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں سے روزگار کی تلاش میں آنے والوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا ہے، اور ان کے ساتھ گنجان آباد پنجاب سے روزگار کاروبار کے لیے بہت سے نئے مواقع ڈھونڈتے لوگ ایک موٹی دھارا کی مانند انسانوں کے اس سمندر میں گر رہے ہیں۔

شہر، جسم میں اضافہ کرتا ہوا، کسی نامیاتی اکائی کی طرح اپنے ہی ریشوں کی افزائشی قوت سے نئے عضلات پیدا کرتا، اس کی نشوونما کرتا، اپنے ہی زور میں کسمساتا، پیچھے ہی پیچھے سرکتا جاتا شہر — جیسے سمندر میں نصف دھڑ غرق کیے نمکین پانی پیتی مچھلی ڈھیروں ڈھیر سرک کر باہر نکل رہی ہو جس کی پشت پر لوگ سندباد جہازی کی مانند کسی دور چلے جانے والے جہاز سے اتر پڑے ہوں۔

***

مسئلے کے پیٹ میں

اندرونِ سندھ سے سندھی کراچی میں پہلی بار ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں آئے — کلرکوں اور نائب قاصدوں کے کئی گروہ جو سستی آبادیوں میں کرائے پر ملنے والے فلیٹوں اور کوارٹروں میں رہنے لگے تھے۔ ان کے گول سروں اور گھنگھریالے بالوں والے چہرے اشتیاق سے چمکتے تھے۔ وہ جوش و خروش سے ہمارا کراچی کہنے لگے تھے۔ ماضی میں حکمرانوں اور حکمران طبقوں نے سابق مشرقی پاکستان کی عددی برتری ختم کرنے کے لیے ملک میں ون یونٹ نامی جو نظام نافذ کیا تھا، جس نے تمام خطوں کی صوبائی حیثیت ختم کر دی تھی، اُسے توڑنے کی طویل تحریک کے دوران سندھی قومیت کا شعور پروان چڑھ چکا تھا۔ اس جدید سندھی تصور میں جو سندھ تھا اس میں کراچی بھی شامل تھا۔ یہ ایک ٹھوس جغرافیائی

حقیقت بھی تھی؛ سندھ کے باقی زرخیز میدانی علاقے سے منسلک، یہ جغرافیائی لحاظ سے سندھ ہی کا حصہ تھا۔ برطانوی راج میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے اسے سندھ کا دارالحکومت بنانے کے لیے سندھیوں نے منظم اور کامیاب تحریک چلائی تھی، مگر پاکستان بننے کے بعد سندھی آبادی کراچی میں گزر نہ کر پائی تھی۔ ون یونٹ کے نظام میں سرکاری ملازمتوں پر پاکستان بھر کے ملازم کھنچے جاتے رہے تھے۔

۱۹۷۲ میں، جب ایک نیا دور شروع ہوا تھا تو سندھیوں کے داخلے کا بھی آغاز ہو رہا تھا، مگر یہاں آ کر وہ خود کو غیر سندھیوں کے سمندر میں پا رہے تھے۔ (ان کا سندھ کا تصور کراچی کی طبعی حقیقت سے ٹکرا رہا تھا، وقت کے ہاتھ نے جس کو ماضی سے قطعی مختلف بنا دیا تھا۔) اسی لیے ان کو گھرا نہیں، مگر ایک اُتھلا سا یقین تھا کہ کراچی سندھ کا حصہ ہے، کہ کراچی پر ان کا بھی حق ہے، اور اسی طرح کے چند ایک اور یقین

اتفاق سے راقم الحروف کا انھیں دنوں اس طبقے میں کافی اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان میں سے ایک ضلع کنڈیارو سے آیا تھا۔ اسے ایک پرائمری اسکول میں سندھی ٹیچر کی ملازمت ملی تھی، لیکن اس نے اپنے تئیں ہمیشہ ایک ادیب سی تصور کیا تھا۔ وہ ہر وقت بغل میں پروگریسو پبلشرز کے ہاں نہایت سستی ملنے والی تالستائی، دستوئفسکی یا گورکی کی کوئی کتاب دبائے گھومتا تھا اور، گو کہ وہ سندھی قوم پرست تھا جیسا کہ اس کی نسل کے فیشن کا تقاضا تھا، درحقیقت وہ خود کو روسی محسوس کرتا تھا اور روس جا کر بسنا چاہتا تھا۔ ایسے جیسے دوسرے کئی چھڑوں کے ساتھ وہ لیاقت آباد اور ناظم آباد کے درمیاں سندھی کلرکوں سے آباد کئی منزلہ گمنام سی عمارت میں رہتا تھا۔

ایک دفعہ میں نے ان لوگوں سے پوچھا تھا، بھئی، آپ لوگ گھر والوں کو کیوں نہیں بلا لیتے؟ باقاعدہ گھر بسا کر کیوں نہیں رہتے؟

اس پر انھوں نے معصوم اور بشاش قہقہہ لگایا تھا (جیسا کہ دیہات سے نئے نئے آنے والے سندھی کلرک لگاتے ہیں)، پھر ایک دوسرے کو چور نظروں سے تاکتے ہوئے کہا تھا۔

ادی، ادھر کا بھروسا ہی کیا۔ ابھی کل کو بھٹو کی حکومت چلی جائے تو ہم سب کان لپیٹے وری گوٹھ جا رہے ہوں گے۔

(اور ہوا بھی یہی۔ بھٹو حکومت کے خلاف ۱۹۷۷ کی پی این اے کی تحریک کے دوران سندھی کلرکوں کے فلیٹ کے نیچے رات رات بھر ڈھول بجائے جانے لگے۔ دو تین راتوں تک انھوں نے شہر کے خالی کر دینے کے اس صوتی مطالبے کی تاب سہی، پھر کان لپیٹ کر وری گوٹھ چلے گئے۔)

یا پھر کراچی میں وڈیرے آئے تھے، ایک گورنر یا وزیراعلیٰ اور چند وزرا، ڈبل گھوڑا بوسکی کی کس کساتی شلواروں اور قمیصوں میں ملبوس، گلوں میں سونے کی زنجیریں ڈالے اور سونے کی انگوٹھیاں پہنے، وہ اپنے باورچیوں اور نوکروں اور مصاحبوں کی پلٹنوں سمیت کراچی میں وارد ہوئے تھے اور قیمتی کاروں میں دندناتے پھرتے تھے۔ وہ دھڑا دھڑ اشتیاق سے مہاجر عورتوں سے شادیاں کرتے اور معاشقے لڑاتے، اونچی

آواروں میں شہوت بھرے قہقہے لگاتے، گفتگو کرتے ہوئے ایسی موٹی موٹی مونچھوں پر تاؤ دیتے اور اپنا بدن سہلاتے رہتے۔ ان کے مصاحب اور نوکر بھی ایسے شاہ سائیں کی شاہی کے نشے میں مست تھے۔

پی این اے کی تحریک کے دوران، جس کا رخ حیرت انگیز طور پر آخر ہی سے سندھی مخالف بن گیا تھا، میں نے چند مہاجر نوجوانوں سے سندھیوں کی مخالفت کا سبب پوچھا تھا۔ مختلف نجی اداروں، اخباروں اور چھوٹی موٹی دکانوں میں کام کرنے والے، موٹر سائیکلوں پر پورے خاندان کو بٹھا کر سیر کرنے والے ان محنتی، ہوشیار، متوسط طبقے کے نوجوانوں نے سندھیوں کا وہی حلیہ بتایا تھا جو اوپر وڈیروں کا تحریر ہے۔

مہاجر متوسط طبقے کو وہ صرف سندھی نظر آتے تھے، سندھی وڈیرے نظر نہیں آتے تھے۔ یہ نوجوان کراچی میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے، انہیں بالکل علم نہ تھا کہ ان کے اپنے آبائی وطن کے جاگیردار اور نواب بھی بالکل اسی حلیے اور انہیں عادات کے تھے اور ان میں اسی قدر رعونت بھری تھی۔

ان نوجوانوں نے سندھی کلرکوں اور ہیڈ کلرکوں اور خود کو روسی ادب سمجھنے والے پرائمری اسکول کے ٹیچر کو کبھی دیکھا تک نہ تھا، جو اگر چند برس یہاں رہ پاتے تو پیسے جمع کر کے اور دفتر یا بینک سے قرضہ لے کر موٹر سائیکل خرید سکتے تھے اور گود سے بچوں کو ملا کر، پورے خاندان کو ایک موٹر سائیکل پر سوار کر کے، انہیں شام کو کلفٹن پر ساحلِ سمندر کی سیر کرا سکتے تھے۔ وہ اتنے تتر بتر اور دبے دبے تھے ـــــ شہر کی بے گانگی اور خود اپنے نووارد وڈیروں کی رعونت سے اس قدر دبکے ہوئے ـــــ کہ ان کا نظر آنا ممکن نہیں تھا، بالکل اسی طرح جیسے شہوت بھرے اونچے اونچے قہقہے لگاتے وڈیروں کا دور ہی سے دکھائی دے جانا لازمی تھا جو مملکت کے اس شہر کے اولیں بڑے اور مستحکم متوسط طبقے میں پیوند نہیں ہو سکتے تھے۔

مگر حقیقت یہی ہے کہ اگر پہلے منتخب وزیر اعظم اپنے حلقہ میں بس نہ پاتے، رعونت بھرے وڈیروں کی کھیپ کراچی نہ لے آتے تو پہلی منتخب حکومت کے دور میں ہمارے، بظاہر سندھی قوم پرست مگر باطنی طور پر روسی ادیب، سندھی پرائمری ٹیچر کی موٹر سائیکل اور اس کے خاندان کی ساحلِ سمندر پر سیر کے امکانات موجود تھے۔ پھر شاید وہ روس جا کر بسنے کا ارادہ بھی ترک کر دیتا۔

***

مگر ہو گا نہیں ایسا

آنے والے برسوں میں ایم کیو ایم سی ـــــ مہاجر قومی موومنٹ ـــــ اور تمام مہاجر، جیسا کہ انگریزی اصطلاح ہے، فردِ واحد کی طرح اس میں شامل ہو گئے، اتنی بھاری عددی قوت کے ساتھ کہ ایسا کبھی

نے آنکھوں دیکھا اور نہ کانوں سنا۔

لوگ کہتے، ارے حالہ، ارے چچی جان، ارے دولہا بھائی، ایسا جوش، ایسی وفاداری، ایسا جذبہ تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا!

مارٹن کوارٹر میں اور حیدری میں اور محمود آباد میں بڑے بوڑھے سفید کرتوں میں لپ لپاتے، جھکی کمریں سیدھی کرتے ہوئے کہتے، بھئی واہ، کیا بات ہے! یہ اتحاد دیکھ کر تو قیام پاکستان سے پہلے کا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ ارے ایسے آگرہ میں، کانپور میں، بنارس میں مسلم لیگ کے جلسوں میں نظر آتا تھا یہ جوش اور ولولہ! یہ عزم یا تو تب دیکھا تھا یا اب دیکھ رہے ہیں۔

***

دیکھیے کہ مسلم لیگ نے ایسے مُردہ تن سے بچہ جَنا ہے! جھکن بھائی نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور چہل قدمی کرتے ہوئے کہا۔ جھکن بھائی امریکا سے چند ہفتوں کے لیے آئے ہوئے ہیں اور حیدری میں اپنی بڑی بہن کے گھر ٹھہرے اس وقت رات کے کھانے کے بعد ہواخوری کر رہے ہیں۔ پیٹ پر ہاتھ کیوں پھیرتے ہیں؟ بھئی یوں ہی، طمانیت کے اظہار کے لیے!

دیکھو بھئی، معاملہ تب بھی مائنارٹی کا تھا اور اب بھی وہی مسئلہ درپیش ہے۔ جھکن بھائی اپنے بھانجے اور بھانجی کو سمجھا رہے ہیں۔ مائنارٹی پراونسز کے مسلمان پریشان تھے کہ ہندوستان میں ان کی حیثیت کیا ہوگی، سو وہ یک جان ہو کر پاکستان کے حصول کے لیے کوشاں ہو گئے۔ پاکستان بن گیا۔ اب یہاں آ کر وہ دوبارہ مائنارٹی ہو گئے۔ اس طرح تحریک پاکستان چلانے والوں، اس ریل گاڑی کو اصل ایندھن مہیا کرنے والوں کی اولاد نے ایم کیو ایم بنائی۔ یہ لوگ اُسی جوش و خروش سے اب ایم کیو ایم کے حامی بن چکے ہیں۔ دراصل یہ مسلم لیگ کا دوسرا جنم ہے۔

اور نظریۂ پاکستان؟

'تو پیارے بیٹے، ہر نظریے کے تحت گروہی مفادات نظریے کی چھتر چھایا ڈھونڈ جاتے ہیں۔ یعنی آپ یہ کایا کلپ دیکھیے، اور اس پر غور کیجیے، کہ روٹی کپڑے اور آسائشوں کی ضرورت اجتماعی ہونے کے عمل میں کسی قلب ماہیت سے گزر کر اپنی مادی نجاست سے پاک ہو کر مقدس، بلکہ الوہی بن جاتی ہے۔ آدمی اپنے روٹی کپڑے کے حصول کی لڑائی کو بہ آسانی اللہ کے نام اور حکم پر جہاد سمجھنے لگتا ہے۔

جھکن بھائی امریکا میں رہتے ہیں اور مفادات کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں گھبراتے۔

تو فرض کیجیے کہ مہاجر اپنی نعرے بازی کے برعکس، اسلام اور پاکستان کے الوہی تصور کی خاطر نہیں آئے تھے، روٹی پانی کے لیے آئے تھے، تب کیا فرق پڑتا ہے؟ اکنامک مائیگریشن تو ایک بڑی حقیقت ہے۔ اب دنیا بھر میں حقیقت پسند سماجی ماہرین اسے ایک ویلڈ (valid)، ایک معقول وجہ

ہجرت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ اماں تم نے کیوبا سے امریکا آنے والے مہاجرین کا نہیں سنا؟

جھکس بھائی پہلے حیدر آباد کے کسی کالج میں نفسیات پڑھاتے تھے۔ اسکالرشپ پر امریکا گئے اور ڈاکٹریٹ کر کے واپس آئے۔ چند مہینوں میں انتظامیہ نے ان کا تبادلہ اندرون سندھ کسی انٹرمیڈیٹ کالج میں کر دیا۔ جھکس بھائی چپ چاپ امریکا ہجرت کر گئے۔ اب وہاں کسی کالج میں پڑھاتے ہیں۔ اس وقت وہ بجلی کی روشنیوں میں جگمگاتی، حیدری کی پان کی دکان سے پان خرید کر کلے میں دبا رہے ہیں۔ بس یہی نہیں ملتا انھیں میسے سوٹا ہیں، کھانے کے تمام مسالے اور درجنوں کے حساب سے لکھنوی کڑھائی کے کرتے اور سعید زاق علی گڑھ کٹ پاجامے تو وہ ہر سال منگوا لیتے ہیں۔

کیوبن مہاجرین جھکس بھائی کہتے ہیں، تو اب تو دنیا اتنی بدل گئی ہے کہ فیڈل کاسترو سوشلزم کے ان بھگوڑوں کی فوری گرفتاری اور واپسی کے بجائے بڑے غصے سے امریکا سے مطالبہ کرتے ہیں کہ انھیں وہیں رہنے دیا جائے۔ ارے بھئی، کھائیں کے کمائیں گے، اور کیا! بقول کسے کہ لینا ایک نہ دینا دو۔

تو باقی کے ملک سے بھی تو لاکھوں لوگ چلے آ رہے ہیں کراچی میں جھکس بھائی کے بھانجے نے بیزاری سے کہا۔ جھکس بھائی ہاتھ ہلاتے ہیں اور سمجھاتے ہیں۔

دیکھو بھئی، ۱۹۹۲ میں ہماری یونیورسٹی کے ڈیموگرافی سنٹر کی ایک رپورٹ چھپی تھی ــــ آپ لوگوں کو بھی پڑھنی چاہیے، فوٹو کاپی بھجوا دوں گا ــــ تو عالمی ماہرین نے پیش گوئی کی ہے کہ آنے والی دہائیوں میں روزگار کی تلاش میں آبادیاں بڑی لہروں کی صورت میں جنوب سے شمال کی طرف اور گاؤں سے شہروں کی طرف نقل مکانی کریں گی۔ اس کو تو کسی صورت روکا ہی نہیں جا سکتا، جھکس بھائی فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں، گویا کوئی کلاس لے رہے ہوں۔

جھکس بھائی کے بھانجے نے دوبارہ بیزاری سے کہا، اور سندھی کہہ رہے ہیں کہ اتنے مہاجر آ گئے، چھا گئے، کھا گئے سب کچھ!

بے شک، بے شک! جھکس بھائی عقل مندی سے سر ہلاتے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں، ایک ہی جھٹکے میں اتنی بڑی ڈیموگرافک تبدیلی پر مقامی لوگوں میں غم و غصہ تو پیدا ہونا ہی تھا۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ بھئی کوئی معمولی بات تو نہیں ہوئی تھی، ہندوستان کی تقسیم! اتنا بڑا جوں جرانا! آبادی کا اتنے بڑے پیمانے پر تبادلہ جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ میں تو کہتا ہوں انھوں نے بھانجے کے ہاتھ سے الائچی قبول کرتے ہوئے کہا، کہ سینتالیس میں ٹیلی وژن نہیں تھا، اور خبروں کی ترسیل کے لحاظ سے دنیا اتنی چھوٹی نہیں ہوئی تھی، ورنہ

ورنہ کیا؟

ورنہ؟ ارے بھئی، مثلاً اگر ٹی وی پہلے ہو گیا ہوتا، تو دنیا کے بڑے عبرت پکڑ کر اور سبق سیکھ کر ہندوستان کی تقسیم کبھی نہ ہونے دیتے۔ یعنی کوئی بات ہے! ایسی اکھاڑ پچھاڑ جس نے سماجیات کی تو، کیا

کہتے ہیں، ایسی تیسی کر دی۔ اور مائنارٹی پراونس کا مسئلہ جسے کہتے ہیں وہ حل ہی نہیں ہوا۔ یعنی وہ وہیں ہیں جہاں تھے، بلکہ اور بھی پیچھے چلے گئے۔

اب یہ ہے کہ کو ایگزسٹنس، یعنی ساتھ ساتھ، مل جل کر رہنا، نہایت اہم ماحولیاتی ضرورت ہے، بلکہ سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ کے لیے لازمی۔ علاوہ ازیں، دنیا بھر کے چھوٹے سے چھوٹے کلچر کی وائلڈ لائف کی طرح پریزرویشن کی جا رہی ہے، یعنی ملٹی کلچرازم۔

جیسا کہ گانا ہے، مل جل کے رہو اور پیار کرو، یہ چیز بھی خوب ہوتی ہے! شکیلہ نے کہا۔ جیکس بھائی کی یہ نوعمر بھانجی وی سی آر پر بہت انڈین فلمیں دیکھتی تھی اور اس وقت حیدری کی ایک دکان پر ٹکر ٹکر کرتی چوڑیوں پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

تو جیکس ماموں، آپ تو یہاں رہتے نہیں۔ آپ کے خیال میں ہونا کیا چاہیے؟

جیکس بھائی مشورہ مانگے جانے پر خوش ہوئے۔ ان سے پوچھا جاتا تو وہ حیدر آباد سندھ میں ایسے کالج کی انتظامیہ کو کالج میں ایک بڑا نفسیاتی علوم کا مرکز قائم کرنے کا مشورہ دیتے۔ شہری نفسیات، دیہی نفسیات، کاروباری اور زرعی نفسیات ___ الغرض پندرہ سیمینار کرواتے سال میں۔ پھر وہ امریکا نہ جاتے اور ان کا ہزاروں ڈالر ماہانہ کا نقصان ہوتا۔ خیر، پھر بھی انھوں نے کچھ سوچ کر مشورہ دیا۔

یعنی ہونا یہ چاہیے کہ سندھیوں کو یہ احساس دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ مہاجر تاعمر اور نسل در نسل یہاں مہمان یا دوسرے درجے کے شہری بن کر رہیں گے۔ سندھ اب عملاً دو لسانی صوبہ ہے۔ سو اس بات کو مان کر چلا جائے، دشمنی کا ماحول ختم کر کے کوشش کی جائے کہ سندھ کی ترقی میں مہاجروں کو شامل کیا جائے۔ اور مہاجروں کو بھی یہ احساس دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ کراچی کوئی اُن کی ایسی جاگیر ہے جس میں دو سندھی داخل ہوں تو وہ واویلا مچانا شروع کر دیں۔ کراچی کو سندھیوں کے لیے ممنوعہ علاقہ بنانے کی خواہش کو الوداع کہنا چاہیے۔

جیکس بھائی کا بھانجا غور سے ان کی عالمانہ باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا

مگر ہوگا نہیں ایسا!

پھر کیا ہوگا؟ جیکس بھائی نے منہ اٹھا کر سوال کیا۔

میرے خیال میں   ان کے صرف ایم بی اے پاس پاکستانی تجربہ کار بھانجے نے کہا، کہ پہلے ایک پر مار پڑی، اور دوسری کو حکومت دے دی گئی ___ برائے نام سہی، مگر مار سے محفوظ حیثیت۔ پہلی انتظار کرتی رہی کہ کب میری باری آئے۔ پھر پہلی کی باری آئی، اور دوسری پر مار پڑی، خاصی تگڑی مار۔ پہلی کو حکومت دے دی گئی ___ برائے نام سہی، مگر مار سے محفوظ حیثیت۔ تو آپ کے خیال میں اب دوسری کیا کر رہی ہے؟ اس نے جیکس بھائی سے پوچھا۔

کیا کر رہی ہے! واویلا مچا رہی ہے، اور کیا؟

وہ تو ہے مگر   بھانجے نے سوچتے ہوئے کہا، ساتھ ہی انتظار بھی کر رہی ہے۔ انتظار، کہ اب

میری باری دوبارہ کب آئے گی۔
جگنو بھائی نے کہا، اب تو مجھے اُس بلی کی کہانی یاد آ رہی ہے جو دو چوہوں میں پنیر تقسیم کر رہی تھی۔

***

شہر (۲)

پیچھے رہ گیا کراچی دس ہزار فیٹ کی بلندی پر اُڑتے ہوئے آپ سوچتے ہیں، پیارا کراچی اچھا کراچی آپ دل ہی دل میں شہر کے طمانچے کھائے گال سہلاتے ہیں۔ شہرِ محنت کشاں، جو ایسے مزاج میں اتنا نے پیار سے کہ سخت ترین مارشل لا میں بھی کسی فوجی راج کے محکوم ملک کا شہر نہیں معلوم ہوتا، جہاں افسرانِ بالا آتے ہوئے اس بات کے لیے تیار رہتے ہیں کہ کم از کم اِس شہر میں ان کے گریڈوں سے، افسر شاہی کی سیڑھی پر ان کے خاص الخاص مقام سے کوئی مرعوب نہیں ہوگا، جہاں لوگوں نے ایسی دنیائیں آپ بسائی اور آباد کی ہیں۔ اور آپ یاد کرتے ہیں سینے میں فخر کا اُبال جب آپ کبھی رات کے دو بجے (ایسے سفر سے، گیدڑوں اور بیورو کریٹوں میں غرق، خوابیدہ دارالسلطنت سے) وہاں پہنچے ہوں اور اسے بیدار اور روشن پایا ہو۔

جب فائرنگ سے شہر میں کثیر التعداد قتل ہونا شروع ہوئے تو دو ایک روز ہی میں شہر میں ایک غیر مرئی خطِ فاصل کھنچ گیا۔ شہر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا — غریب اور امیر حصوں میں۔ یہ غریب حصے تھے جہاں فائرنگ ہو رہی تھی، سڑکوں پر چکراتی لاشیں گر رہی تھیں، گلیوں سے جنازے اُٹھ رہے تھے۔
یہ خوش حال علاقے تھے — ڈیفنس سوسائٹی، کلفٹن — جہاں رونق میں کمی نہیں آئی تھی، سی ویو پر ریستورانوں میں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی، موٹر گاڑیوں کو پارک کرنے کی جگہ نہ تھی، جہاں کلاشنکوفوں کا دھواں نہیں، تِکّہ مرغوں اور تِکّوں اور تلے ہوئے جھینگوں کی بھاپ کے مرغولے اُٹھ رہے تھے۔

جس رات ہاؤسنگ سوسائٹی کے ایک گھر میں اکٹھے سات قتل ہوئے (پولیس چوکی سے چند گز کے فاصلے پر، جب کہ پاس طارق روڈ کا بازار رمضان کی ان آخری راتوں میں پوری طرح بیدار تھا) لالہ رخ صبح یہ خبر سن کر دوڑتی ہوئی پڑوس میں گئی۔ اس کی پڑوسن، صائمہ باجی، اس وقت گھر میں اکیلی تھیں، ان کے شوہر دو دن کے لیے دفتر کے کسی کام سے فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔ وہ ٹیلی فون پر کسی سے باتیں کر

رہی تھیں۔ لالی کے کان میں ماتوں کے جو ٹوٹے ٹکڑے پڑے ان سے اُسے اندازہ ہوا کہ وہ اسی واردات کے بارے میں بات کر رہی ہیں جو ان کے گھر سے صرف تین گلی پیچھے ہوئی تھی۔

فون رکھ کر صائمہ پلٹیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں عورتیں دہشت سے ٹھٹک گئیں۔

دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی، اس بار ذرا زور سے۔

کون کون ہے؟ گھر والی نے بلند آواز سے پوچھا۔

میں ہوں جی پلمبر، ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ محلے کا نلکے ٹھیک کرنے والا آیا تھا۔ کچن کی باورچی خانے کا نل کئی دن سے رِس رہا تھا۔ کل ہی تو انھوں نے لڑکا بھیج کر کہلوایا تھا کہ وہ کسی وقت آ کر دیکھ لے۔ اور اب لالہ رخ کے ساتھ کھڑی وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں، اس سوچ میں گم کہ دروازہ کھولیں یا نہ کھولیں۔ آخر انھوں نے پلمبر کو بلا لیا۔ وہ اسے نل دکھانے باورچی خانے میں لے گئیں۔

لالہ رخ گول کمرے کے وسط میں گم سم کھڑی رہی۔ جب صائمہ باورچی خانے سے نکلیں تو انھوں نے سوالیہ نظروں سے لالہ رخ کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا، باجی آج آپ نے سا ما ہماری گلی کے پیچھے کل رات یہ سب ہوا۔ یا اللہ! پورا روڈ جل رہا تھا۔ یہ کس وقت ہوا ہوگا؟ کسی کو خبر کیوں نہیں ہوئی؟

صائمہ ساری کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی گول کمرے میں داخل ہوئیں۔

کہتے ہیں گیارہ بجے وہ لوگ آئے تھے۔

تو یہ یہ کیا قصہ تھا؟ لالہ رخ نے انتہائی منتشر دماغ سے سوال کیا۔ شیعہ سنی؟ یا یا کچھ اَور؟

صائمہ باجی کا زرد پڑا ہوا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ انھوں نے چیخ کر کہا
تمھاں ہو رہی ہے شیعہ سنی کی لڑائی؟ آپ جانتی ہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، کون لوگ یہ قتل کر رہے ہیں۔ جیسے جانتی نہیں

لالہ رخ ہکا بکا رہ گئی۔ یہ حملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ گڑبڑاہٹ میں وہ میرا مطلب تھا باجی بدمزاجی، خاموشی سے صائمہ بیگم کے گھر سے نکل کر اپنے گھر آ گئی۔ گھر آ کر وہ گم سم اپنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی بہن نے اسے اس حالت میں دیکھ کر پوچھا

کیا بات ہے جانی؟ کہاں گئی تھیں؟

مَیں؟ اس نے چونک کر کہا۔ یہیں، پڑوس میں، صائمہ باجی کے یہاں۔

تو کیا بات ہو گئی؟ بہن نے پوچھا۔

کچھ نہیں۔ لالہ رخ بالکل گم سم تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ وہاں موجود نہیں ہے۔ اسے

ایسے چاروں طرف سناٹا پھیلتا محسوس ہو رہا تھا جس میں وہ کسی چڑیا کی آواز، دور کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی غراہٹ اور پنکھے کی کھڑ کھڑ اچانک سن سکتی تھی۔ بہت دیر تک وہ دم بخود بیٹھی رہی۔ پھر اس نے تاثر سے خالی آواز میں کہا

صائمہ باجی صائمہ سمجھتی ہیں کہ یہ قتل شاید میں نے کرائے ہیں۔

بلمسر کے جانے کے بعد صائمہ نے دروازہ بند کیا۔ صبح سے ان کے گھٹنے میں ہلکا ہلکا درد تھا جو اچانک شدت پکڑ گیا تھا۔ کچھ لنگڑاتی ہوئی وہ اپنے سونے کے کمرے میں آکر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے چاروں اطراف نظر ڈالی، خالی دیواریں، ہوا کے جھونکے سے سرسراتا پردہ، فرش پر بچھا پرانے قالین کا ٹکڑا۔ کمرہ خالی تھا۔ پچھلے گلیارے سے کوئی ٹین کھڑکھڑاتا ہوا گزرا۔ صائمہ بیگم دونوں ہاتھوں میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ بہت دیر اکیلے گھر میں بیٹھی روتی رہیں۔ پھر انھوں نے اپنی بہن کو فون کیا

مجھ سے تنہا رہا نہیں جاتا۔ مجھے آکر لے جاؤ۔

پھر بعد میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ دراصل قاتلوں کو ایک شیعہ کی تلاش تھی جو کہ مارا گیا۔ (مرنے والوں میں ایک شیعہ بھی تھا۔) دوسرا خیال یہ تھا کہ قتل کا مقصد شہر میں دہشت پھیلانا تھا۔ تیسرا خیال یہ تھا کہ یہ دراصل ڈاکے کی واردات تھی۔

پھر ایک دھند ہر طرف چھا گئی۔

جوں جوں تشدد کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا تھا وہ نابینا ہوتے جا رہے تھے — ایک اصطبل میں بند — ان کے درمیان ایک ہاتھی تھا اور وہ اس کے اُس عضو پر جو ان کے سامنے تھا ہاتھ پھیر پھیر کر ہاتھی کی شکل کی وضاحت کر رہے تھے، اور انھیں اس کی پروا نہ تھی کہ اس کے پیروں تلے وہ سب کچلے جا رہے ہیں، کیوں کہ ان کی آنکھوں پر اپنے اپنے موقف کی پٹی بندھی تھی۔

بات صرف اتنی نہ تھی کہ وہ لوگ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے — شہر کے ساتھ کی جانے والی ایک زبردستی، ایک ملاقات کے دوران وہ حقیقت جاننے کی خواہش سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ ہر وقوعے کو اپنی مرضی کا مطلب پہنا رہے تھے اور ہرگز جاننا نہیں چاہتے تھے کہ کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے۔

شہر ان گنت لکیروں میں تقسیم تھا جو ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اجتماعی ناگہانی میں خوف سے لرزتے ہوئے — تنہا — کسی سے جُڑ جانے کی اضطراری سعی میں ان کے اندر قدیم ترین گلے کی جبلت جاگ اٹھی تھی، جو فی الحال زباں کی بنیاد پر انھیں دوسروں سے جوڑ سکتی تھی۔

سندھی سندھی سے، اردو بولنے والا اردو بولنے والے سے، پٹھان پٹھان سے اور پنجابی پنجابی سے جڑا ہوا

نفرت اور انتقام کی آگ میں جھلستا ہوا شہر

ریاستی مشینری سچ بتانے سے قاصر یا گریزاں، ایسی ہی کسی توڑ مروڑ مہم میں غلطاں

جب مساجد کے اندر خوں ریزی شروع ہوئی تو سرکاری اداروں نے کہا مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ ہندو ہیں، بھارتی ایجنٹ!

کراچی کے گلی کوچوں میں لوگوں نے کہنا شروع کیا مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ ہندو ہیں۔ وہ سندھی پولیس جو اندرونِ سندھ سے کراچی لائی گئی ہے۔ سب ہندو ہے، کیوں کہ تمام سندھی ہندو ہیں، یہ بظاہر مسلمان بن گئے ہیں، راجہ داہر کی اولاد! ان کی نظر میں ہندو اس وقت تک ٹھیک طرح سے قابلِ نفرت نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ سندھی بھی نہ ہو۔

اس طرح پاکستان بنانے سے پاکستان میں بسنے تک کا ایک دائرہ مکمل ہوتا ہے۔

ریاست کی داغ بیل پڑنے کے ساتھ ہی جس سرکاری پالیسی کا زور شور سے اعلان اور پرچار کیا گیا، یوں تھی مسلمان کے لیے مسلمان کو قتل کرنا بری بات ہے۔ دوسرے لفظوں میں قتل کرنا بری بات نہیں؛ مسلمان کو قتل کرنا بری بات ہے۔

لوگوں نے ایک دوسرے کو کافر کہہ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔

اور سندھی! مبادا آپ انہیں فرشتہ سمجھیں۔

کراچی سے متعدد سندھی اخبار نکلتے ہیں۔ ایک آدھ مضمون کو چھوڑ کر ان کا لہجہ اس مصیبت زدہ شہر کے لیے نفرت اور حقارت ہی کا ہوتا ہے۔ صوبائی خود مختاری کے لیے تحریک چلانے کے باعث سرکاری ادراک کے مطابق برسوں تک غیر محبِ وطن اور بھارتی ایجنٹ وغیرہ کہلائے جانے والے سندھی ـــــ ان کا پڑھا لکھا طبقہ، ان کے دانش ور ـــــ اقتدار اور سرکاری قبولیت کی پہلی جھلک ملتے ہی ایک قلبِ ماہیت سے گزرتے ہیں اور سرکاری زبان میں بات کرنے لگتے ہیں۔ وہ مہاجر صوبہ بنانے کا ـــــ ملک سے علیحدگی کا نہیں، صرف صوبہ بنانے کا ـــــ مطالبہ کرنے والوں کو حکومت کا، بلکہ ریاست کا، باغی قرار دیتے ہیں، اور انہیں (کم از کم کئی ہزار نفوس کو) سرِعام پھانسی پر لٹکانے کے جواز میں آئین سے شقیں نکال سکتے ہیں۔ وہ تمام مہاجروں کو صرف دہشت گرد کے نام سے یاد کر سکتے ہیں، اور گو انھوں نے ابھی تک مہاجروں کو ہندوؤں کی اولاد نہیں کہا ہے (انہیں اس کا موقع نہیں ملا ہے) لیکن طویل مدت سے دیے جانے والے سرکاری بیانات کو ـــــ کہ مہاجروں کی نمائندہ جماعت دراصل ہندوستانی خفیہ ادارے را کی ایجنٹ ہے ـــــ وہ بتدریج سنجیدگی سے قرار واقعی قدر و منزلت دینے لگے ہیں۔ سندھی اتنے طویل عرصے تک معتوب رہے ہیں، اپنے خلاف زہر آلود بیانات سنتے رہے ہیں، کہ شاید وہ اپنے اوپر تھوپی گئی

اس حالت اور تاریکی کا جواب حالت اور تاریکی ہی سے دینا چاہتے ہوں۔ ایسے وطن میں بہتر اقدار کی جیت انھوں نے کبھی دیکھی ہی نہیں ہے۔

***

کراچی اور جرمن

برٹولٹ بریشٹ جرمن تھے، اور اڈولف ہٹلر بھی۔ نازی پارٹی کے لاکھوں ارکان اور حامی بھی جرمن تھے؛ پاکستانی، حتیٰ کہ ہندوستانی تک نہیں تھے۔

برٹولٹ بریشٹ اگر پاکستانی، اور کراچی میں رہنے والے مہاجر ہوتے، تو اپنی نظم یوں لکھتے

پہلے، بہت پہلے، سب سے پہلے
وہ پٹھانوں کے لیے آئے
(یہ غدار ہیں، علیحدگی پسند ہیں،
پختونستان بنانا چاہتے ہیں، ہندوستانی ایجنٹ ہیں)
میں پٹھان نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں اس کورس میں شامل ہوا
اور میں نے گایا
مارو پکڑو جانے نہ پائے

پھر وہ بنگالیوں کے لیے آئے
غدار علیحدگی پسند ہندوستانی ایجنٹ
میں بنگالی نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں نے گایا
مارو پکڑو جانے نہ پائے
نامنظور نامنظور بنگلادیش نامنظور

پھر وہ بلوچوں کے لیے آئے

غدار علیحدگی پسند ہندوستانی ایجنٹ
میں بلوچ نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں نے گایا
مارو پکڑو جانے نہ پائے

پھر وہ سندھیوں کے لیے آئے
غدار علیحدگی پسند سندھودیشی ہندوستانی ایجنٹ
میں سندھی تو خیر ہرگز نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں نے زیادہ جوش و خروش سے سُر اٹھایا
مارو پکڑو جانے نہ دینا

اب وہ میرے لیے آئے ہیں
غدار علیحدگی پسند ہندوستانی ایجنٹ
میں نہایت حیراں پریشاں کھڑا ہوں
اور سن رہا ہوں ایک کورس
سندھیوں، بلوچیوں، پٹھانوں، پنجابیوں کی آوازوں کا
کورس میں شامل ہونے والی تازہ تازہ، نوآموز، کمزور سی آوازیں
جنہیں ابھی ٹھیک سے غدار، ہندوستانی ایجنٹ کہنا بھی نہیں آیا
مگر پھر بھی وہ لوگ مشق کر رہے ہیں
دھڑکتے دلوں سے، امید بھری اُمنگ سے،
کہ ایک دن ان کی ادائیگی بے نقص ہو جائے گی

۱۹۹۶ تک، جب کہ مملکتِ خداداد اپنے استقرار کے انچاس برس پورے کر رہی ہے، ہر قوم کو باری باری غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دیا جا چکا ہے ـــــ ماسوا پنجابیوں کے۔

اب رہے پنجابی، تو اس قوم (قومیت؟) میں انفرادی طور پر تو ہندوستانی ایجنٹوں کی کمی نہیں۔ شاعر فیض احمد فیض، شاعر حبیب جالب، صحافی مظہر علی خاں، سیاست داں میاں افتخارالدین- یہ فہرست اتنی طویل تو یقیناً ہے کہ ان کی تعداد پاکستان میں بسنے والی کسی بھی قومیت کے انفرادی طور پر اعلان شدہ غداروں اور ہندوستانی ایجنٹوں سے بڑھ کر ہو گی، مگر ابھی تک پنجابیوں کو من حیث القوم غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار نہیں دیا گیا ہے۔ اب آگے چل کر دو ممکنہ صورت حالات ہو سکتی ہیں۔

(۱) بقیہ تمام پاکستانی قومیتیں ایک دن پنجابیوں کو کسی سیاسی تحریک کی بنیاد پر، یا کوئی دوسری گڑبڑ کرا کر، بہ حیثیت القوم غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دے دیں گی۔

(۲) دوسری قومیتیں اسٹیبلشمنٹ پر اس حد تک قبضہ نہ کر پائیں گی کہ پنجابیوں کو غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دے سکیں، لہٰذا اسٹیبلشمنٹ کے پنجابی افراد ہی باری باری دوسروں کو (ہر بار دوسرے دوسروں کی مدد سے) غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دیتے رہیں گے۔

واضح رہے کہ مندرجہ بالا دو امکانی صورت کے علاوہ یہاں تیسری صورت حال پیدا نہیں ہو سکتی۔ یا اگر آپ ایک ناقابلِ شکست رجائیت پرست ہوں تو اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کیا یہاں کوئی تیسری صورتِ حال پیدا نہیں ہو سکتی؟

اب رہا ہندوستان، تو ہندوستان تو بہت ہنس رہا ہوگا، ایمان سے، کبھی میں منہ چھپا چھپا کر، چپکے چپکے ہنستے ہوئے لوٹن کبوتر کی طرح زمین پر لوٹ رہا ہوگا اور ہنسی کے مارے آنکھوں سے بہتے پانی کو پونچھتے ہوئے کہہ رہا ہوگا۔

لو سالو، ہو رجُو یو! الگ تو ہم سے ہو گئے ہو تم، میاں بھائی! اب دیکھو کیسی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے ـــ یعنی باری باری ہر قومیت ہماری ایجنٹ!! ہاہاہا! قہ قہ قہ!

سالا بنیا مکار ہندو! ہم پر ہنستا ہے سالا دال خور

مگر ہندوستان ۱۹۹۵ میں ہنس نہیں رہا۔ شاید وہ کچھ خاص غور سے پاکستان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا، بلکہ تندہی سے ماتھے پر سیندور کا گھسا مارے، مذہبی جنونی سیاست کی طرف رواں دواں ہے۔
کیوں کہ کیوں کہ وہ پاکستان سے مختلف ہے ہی نہیں۔ بالکل اسی جیسا تو ہے ہندوستان!

***

لہو کا سُراغ

سمندر کے ساحل کلفٹن پر اونٹ کی سواری، پرانے شہر کے وسط میں بجلی چمکتی پٹریوں پر گھنٹی بجا بجا کر چلتی کھلونا سی ٹرام، اور سجی سجائی، دو گھوڑوں والی، کسی رتھ کی شان سے پکی سڑک پر ٹپ ٹپ کرتی جاتی وکٹوریا گاڑیوں کے علاوہ نعیم کی کراچی کی اولین یادوں میں ایک ململ بھری رات بھی تھی۔ اُس رات کوئی نہیں سویا تھا۔

نعیم کراچی سے چند گھنٹوں کے فاصلے پر حیدر آباد سندھ میں رہتا تھا اور ان دنوں کراچی اپنی پھوپھی کے پیر الٰہی بخش کالونی کے تین تنگ کمروں ایک دالان اور چھوٹے سے آنگن والے کوارٹر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس آنگن میں سلمانہ پھوپھی نے رات کی رانی اور چنبیلی کے جھاڑ لگائے تھے۔

پیر الٰہی بخش کالونی ـــــ جسے بعد میں سب صرف پی آئی بی کالونی کے نام سے جاننے لگے تھے ـــــ مہاجرین کی پہلی کھیپوں کے لیے عجلت میں تعمیر کی جانے والی مختصر اقامتی کالونیوں میں سے ایک تھی۔ دو رویہ کوارٹر، بیچ میں سڑک اور دکانیں جہاں بدایوں کے پیڑے اور آگرہ کے سیو اور ریوڑی گزک ملتی تھی۔ اور دہی بڑے بھی۔

دہی بڑے، ایسے نہیں جیسے اب ملنے لگے ہیں۔ سلمانہ پھوپھی ۱۹۹۵ میں کہتی ہیں، یہ تو دہی پھلکیاں ہیں، بیسن کی، وہ بھی نگوڑی میٹھی۔ یہ فریسکو والے اللہ جانے کیا بناتے ہیں! سلمانہ پھوپھی جانتی ہیں کہ اصلی دہی بڑے کیسے بنتے ہیں۔ اُرد کی دال کو رات بھر بھگوتے ہیں۔ دوسری صبح ہم پڑی دال کو سِل پر ہلکے ہاتھ سے پیستے ہیں کہ وہ بس ذرا دُردری ہو جائے۔ پھر ملاتے ہیں اس میں توے پر سینک کر ہتھیلی پر مسلا زیرہ، نمک اور موٹی پسی ہوئی کالی مرچ۔ چاہو تو ذرا سی لال مرچ بھی ملا دو۔ پھر بڑے بنا کر اچھی طرح بھاپ دیتے ہیں تاکہ نیم پخت ہو جائے۔ شامی کباب کی طرح دہی بڑے بناتے ہیں۔ پھلکیاں نہیں، تمہارے فریسکو جیسی۔ بڑے تو چپٹے ہوتے ہیں، چپٹے اور گول

اور تم بڑوں کو تل کر بغیر دہی کے یوں بھی کھلا سکتی ہو، وہ اپنی بیٹی نشاط بانو سے کہتی ہیں جو لب حسب باریک روپہلے گوٹے کی چٹکی بنا رہی تھیں۔ ان کی پتلی پتلی انگلیوں میں گوٹے کا فیتہ آن کی آن میں ایک خوب صورت، آرائشی، نفیس اور گراں قدر تر (value-added) شے میں تبدیل ہو رہا ہے۔ یہ چٹکی، کلی اور کرن پیر الٰہی بخش کالونی کی دکانوں میں فروخت ہوں گی۔

سلمانہ پھوپھی بیوہ ہیں۔ وہ آگرے سے پی آئی بی کالونی کیوں کر پہنچیں، یہ ایک دوسری داستان ہے۔ مگر عبدالقادر بھرانی کے موجودہ تصور کے برعکس ـــــ کہ ہندوستان سے پناہ گیر، جو اب اپنے آپ کو مہاجر کہنے پر مصر ہیں، بس یوں ہی، سندھ پر قبضہ کرنے کے لیے آ گئے تھے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ اقلیتی صوبوں میں مسلمان بھاری تعداد میں مارے بھی گئے تھے۔ سلمانہ پھوپھی اسی لیے پی آئی بی کالونی میں بیوہ پہنچی تھیں، اپنے شوہر اپنے بچوں کی حیثیت سے، ایک کٹی ہوئی ٹرین سے مہاجر کیمپ تک۔ انھوں نے کراچی پہنچ کر دھاروں روتے ہوئے باقاعدہ زمین کو بوسہ دیا تھا اور کہا تھا پ ا ک س ت ا ن۔

سن سینتالیس میں، شادی شدہ زندگی کے دس برس گزارنے کے بعد، یہاں پہنچی سلمانہ پھوپھی شادی سے پہلے آگرہ سے ایف اے پاس کر چکی تھیں۔ اب وہ پی آئی بی کے اسکول میں پڑھائیں گی اور اپنے بچوں، نشاط، مسرت اور احسن، کی پرورش کریں گی۔ (اور بڑے ہو کر یہ سب ایم کیو ایم ـــــ مہاجر

قومی موومنٹ ۔۔۔ میں بھرتی ہو جائیں گے!)

اُس ملگجی بھری رات سلمانہ پھوپھی کے گھر میں ان کے مہمان آئے چھوٹے بھائی، نعیم کے باپ، کے سوا کوئی مرد نہیں ہے۔

یہ ۱۹۶۵ ہے۔ جنرل ایوب خاں اور قائداعظم کی بہن فاطمہ جناح انتخابی حریف ہیں۔ اس کڑے مقابلے میں کراچی کے باسیوں نے ۔۔۔ مہاجروں کی اس پہلی بڑی لہر نے جو کراچی کی زمیں پر چھا گئی ہے ۔۔۔ فوجی جنرل پر جناح کی بہن کو ترجیح دی ہے۔ کراچی شہر نے جنرل ایوب خاں کی ایجاد کردہ بنیادی جمہوریت کے مراعات زدہ نظام تک میں بغاوت کی راہ نکالتے ہوئے فاطمہ جناح کو ووٹ دیا ہے۔

ایوب خاں بہرحال جیت گئے ہیں (کرسی نشیں فوجی جنرل ہار نہیں سکتے!) اور اب ان کے صاحبزادے مسمی گوہر ایوب کراچی والوں سے اس گستاخی کا انتقام لینے آئے ہیں، ایک جشن فتح منانے جس میں ان چرچرچرچر تیزی سے بولنے والے، پست قد، دبلے پتلے اور سانولے، اور برصغیر کے نہایت گرم حلقوں سے نازل ہونے والے سرکشوں کو سبق سکھلایا جائے گا۔

پی آئی بی کالونی میں رات کو حملے کا اندیشہ تھا۔ سب لوگ جاگ رہے تھے۔ محلے کے نوجوان گلیوں میں پہرہ دے رہے تھے۔ وہ گلی کے کھمبوں کے ساتھ کھڑے تھے اور ہاتھ میں آجانے والی کسی بھی چیز (لکڑی کے ٹکڑے، پتھر، چمچے، کفگیر) سے کھمبے بجا بجا کر ایک دوسرے کو بیدار رہنے کا پیغام دے رہے تھے۔

آواز سے نعیم کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس چھ سات برس کا لڑکا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ سلمانہ پھوپھی کے گھر کے سامنے والے کھمبے کے ساتھ سراج کھڑا تھا۔

او ہو ہے، تم اندر جاؤ! سراج نے کہا۔

سراج بھائی، میں بھی کھمبا بجاؤں گا۔

سراج ان کے اپنے کیسے کا لڑکا تھا۔ دو کوارٹر چھوڑ کر اس کا گھر تھا۔ سلمانہ پھوپھی اور اس خاندان کا ایک دوسرے کے گھر روزمرہ کا آنا جانا تھا۔ سراج نے نعیم کو ایک چھوٹا سا ٹی ٹی کا چاکلیٹ دے کر گھر میں واپس بھیج دیا تھا۔

لوٹتے ہوئے نعیم نے کھڑکی میں نشاط کی چھوٹی بہن مسرت کے دھانی دوپٹے کی جھلک دیکھی۔

تو مسرت آپا کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ کیوں؟ اس نے سوچا تھا۔ شاید وہ بھی کھمبا بجانا چاہتی ہوں۔

اس رات پی آئی بی کالونی پر حملہ نہیں ہوا تھا۔ مگر شہر کی زیادہ غریب آبادیوں، جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے مہاجروں پر حملہ ہوتا رہا تھا۔ مارنے والے مقامی نہ تھے، وہ ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں سے خاص طور پر لائے گئے اجنبی بتائے جاتے تھے۔ ان وارداتوں نے شہر کے غریب اردو بولنے والے علاقوں میں شدید سراس پھیلا دیا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر شاید نہ ملے، مگر اس ملک کی اصل تاریخ ایسی لافانی نظموں میں رقم کرنے والے شاعر فیض احمد فیض نے ان ہی کے بارے میں لکھا تھا

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سُراغ

قاتلوں کو کبھی پکڑا نہیں گیا تھا، نہ کسی پر فردِ جرم عائد کی گئی تھی۔

نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

سلمیٰ پھوپھی کا خاندان، نشاط بانو، مسرت بانو اور احسن، عصمت چغتائی کی کسی کہانی (مثلاً چوتھی کا جوڑا) سے سیدھا نکل کر آیا ہوا معلوم ہو سکتا ہے۔ نشاط بانو اسی طرح سر جھکائے پرانے سیکتی ہیں۔ مسرت دریچے میں کھڑی، نگاہیں جھکائے، کلائی میں چوڑی گھماتی ہے (جو سراج اُسے ہم آغوش کرتے ہوئے چٹخا دے گا)۔ وہ مسرت سے شادی نہیں کرے گا۔ اس کی اور میادی خالہ (اس کی اماں) کی نگاہیں نئے ملک میں سماجی حیثیت بنانے کی خاطر اونچے خاندانوں پر لگی ہیں (کرلاکی راجہ تورے سنگھے پر!) جلد ہی یہ پی آئی بی کالونی سے کہیں اور منتقل ہو جائیں گے۔ (ہاؤسنگ سوسائٹی؟ اس محلے کی تعمیر کے رموز کے لیے دیکھیے ہاؤسنگ سوسائٹی، از قرۃ العین حیدر۔) آئندہ برسوں میں سراج سی ایس پی کا امتحان دے کر ڈپٹی کمشنر تعینات ہو جائے گا، اور ایک بلندی کی جانب حرکت کرتی ہوئی (upwardly mobile) تازہ و توانا کلاس کا حصہ بن جائے گا۔

مگر چوں کہ کراچی کی پی آئی بی کالونی یوپی کا کوئی قدیم، ادبی روایتوں کی چھاؤں میں نیم خوابیدہ شہر نہیں ہے (اور یہ عصمت چغتائی کی کہانی نہیں ہے)، اس لیے نشاط بانو اور مسرت بانو کی شادیاں جلد یا بدیر ہو جائیں گی۔ نشاط کی شادی فرقان سے ہوئی جو کسی چھوٹی موٹی فرم میں کلرک تھے (حالاں کہ ان کے پاس ایم اے کی تین ڈگریاں تھیں اردو، اسلامیات اور تاریخ)۔ مسرت نے بی اے کر کے اسکول میں ملازمت کر لی اور گھر کا خرچ چلانے میں ماں کی مدد کرنے لگی۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے زمانے میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا اور بچوں کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنا اتنا سہل نہیں تھا۔ سلمیٰ پھوپھی صبح کے وقت مقامی اسکول میں پڑھاتی تھیں اور دوپہر کے بعد جہانگیر روڈ پر ٹیوشن سنٹر میں پڑھانے جاتی تھیں۔ احسن اسکول

کے بعد ڈرگ روڈ پر ایرفورس کے ہینگروں میں لوڈر کا کام کرنے لگا۔ لوڈر کا نیلا لباس وہ گھر میں بھی چھپا کر رکھتا تھا کہ کسی دوست کی نظر نہ پڑ جائے۔ اسے رات کی شفٹ میں کام مل گیا تھا۔ وہ اپنا یونیفارم تھیلے میں چھپا کر لے جاتا اور صبح کو اسی طرح سفید پوش لوٹتا جیسا کہ محلے کے لوگوں نے اسے دن کے وقت دیکھا تھا۔

پی آئی بی کالونی میں سلمانہ پھوپھی کا گھر وہ ہے جیسا یہ مکاں کسی عبادت گاہ کی طرح مقدس ہے۔ اس کے درودیوار سے محنتِ شاقہ کی مہک آتی ہے اور اس کے دسترخوان پر ماسوا رزقِ حلال کے اناج کا ایک دانہ بھی نہ رکھا گیا ہوگا۔

اس مختصر اور پاس پڑوس میں نہایت محترم خاندان پر چند برس بعد ایک ناگہانی آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ ایک رات ایرفورس کے ٹارمک پر جہاز سے سامان اتارتے ہوئے کسی ٹرک سے ایک بھاری بکس احسن کی پیٹھ پر آ گرا۔ احسن کو بے ہوشی کی حالت میں اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ آئی تھی۔

یہ خبر سن کر کنبے اور محلے والوں کے دل دہل گئے۔ بیوہ کا لال، یتیم اور نیک بچہ ـــــ اس کی صحت یابی کے لیے اپنے تو کیا غیروں تک نے جھولی پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگیں۔

احسن کئی برس چارپائی سے لگا رہا۔ صحت یاب ہونے کے بعد بھی وہ دوبارہ جسمانی مشقت کا کام کرنے کے قابل نہیں ہو سکا، مگر اس نے تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔

مسرت نے سات برس اس لیے شادی نہیں کی کہ وہ چارپائی سے لگے چھوٹے بھائی کا بوجھ ماں پر چھوڑ کر بیاہ نہیں رچا سکتی تھی۔ (جیسا کہ فلم وچن میں گیتا بالی کرتی ہے، حیرت، کہ زندگی بالکل فلم جیسی ہو سکتی ہے!) اس کے بعد ایک شریف خاندان کے برسرروزگار لڑکے سے اس کی شادی ہو گئی۔ لڑکے نے کراچی کے ایک انسٹیٹیوٹ سے ہوائی سفر کی ٹکٹنگ کا کورس کیا تھا۔ اسے سعودی ایرلائنز میں ملازمت مل گئی۔ کچھ دنوں بعد مسرت بھی اپنے میاں کے ساتھ جدہ چلی گئی اور اب ہر سال کراچی آتی ہے ـــــ تیں کول مٹول بچوں کی خوش و خرم ماں۔

سلمانہ پھوپھی نے کمال سادگی سے زندگی گزاری۔ اپنے لیے انھوں نے کبھی چاندی کا چھلا بھی نہ بنایا۔ صرف احسن کی شادی پر، احسن کے شدید اصرار پر، بہو کے زیوروں کے ساتھ انھوں نے اپنے لیے ایک سونے کا لاکٹ بنوایا تھا۔ یہی ان کی کل ذاتی جمع پونجی تھی، جو وہ ایک دن بہ خوشی ایم کیو ایم ـــــ مہاجر قومی موومنٹ ـــــ کو دے دیں گی۔

***

۱۹۶۵ میں سراج ــــ جو ایک رات پی آئی بی کالونی میں کھڑا گلی کا کھمبا گاڑ کر شمال مغربی سرحدی صوبے سے لائے گئے جشنِ فتح منانے والوں کے حملے سے اس مہاجر بستی کے بچاؤ کے لیے پہرہ دے رہا ہے اور دریچے میں کھڑی مسرت سے معاشقہ لڑا رہا ہے، اور جو مسرت سے شادی نہیں کرے گا اور سی ایس پی افسر بن کر آنے والے برسوں میں ڈپٹی کمشنر تعینات ہو گا ــــ اس وقت یہ بالکل نہیں جانتا کہ جنرل ایوب کی مخالفت کرنے والوں میں صرف کراچی کے اردو بولنے والے ہی نہیں، اس سے بہت دور، اندرونِ سندھ میں، شہداد کوٹ کے پاس ایک گمنام گاؤں میں رہنے والا اللہ ورایو بھی ان میں شامل ہے۔

اللہ ورایو ایک اسکول ٹیچر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ صاحب ڈنو حیدر آباد کے نور محمد ہائی اسکول میں سندھی پڑھاتا تھا۔ وہ عمر بھر حیدر آباد میں رہا اور صرف کسی کسی اسکول کی سالانہ تعطیلات میں گاؤں آتا تھا۔ یہ خبریں گاؤں تک اڑتی اڑتی پہنچی تھیں کہ حیدر آباد میں صاحب ڈنو نے ایک ہندوستانی سہیلی کر لی ہے، لیکن اس سے صاحب ڈنو کی کوئی اولاد بہر حال نہ تھی۔

اللہ ورایو کی ماں کبھی حیدر آباد نہ گئی، کچے مکان میں چھاج پھٹکتی، چکی پیستی، دودھ بلوتی تاہ بی بی سر پر کپڑے کی ایک دھجی کس کر باندھے سر اور نظریں جھکائے زندگی گزارتی رہی اور مٹی کے چولھے پر چاول کی سرخ روٹیاں سینک کر اللہ ورایو کو کھلاتی رہی۔

لیکن ۱۹۶۵ میں صاحب ڈنو ریٹائر ہو کر گاؤں آ پڑا ہے۔ سرطان اس کی آنتیں کھا رہا ہے۔ وہ چارپائی سے لگا اپنے شیر خوار پوتے سے کھیلتا ہے اور اللہ ورایو کو گالیاں دیتا ہے۔ (سترہ برس کی عمر میں اللہ ورایو کی شادی کر دی گئی تھی۔ آنے والے برسوں میں وہ چار بچے اَور پیدا کرے گا۔ اللہ ورایو کو کبھی ملازمت نہیں ملے گی۔)

صاحب ڈنو جنرل ایوب خان کے حق میں ہے۔ وہ کہتا ہے، اڑے پہلی بار تو ان مکڑوں [مہاجروں] کی کسی نے خبر لی ہے۔ اڑے خدا کی مار یہ تو ایک ٹڈی دَل ہے، آیا اور سب کچھ کھا گیا۔

لیکن باپ کی ڈانٹ سے بے پیار اللہ ورایو جنرل ایوب کی مخالف فاطمہ جناح کے انتخابی نشان لالٹین کے پوسٹر گاؤں بھر میں لگاتا پھر رہا ہے۔ کیوں بھلا؟ ایسی اس کی پارٹی کی مرضی ہے، جی ہاں، آپ کی جانی پہچانی، ہمیشہ معتوب (ہمیشہ زیرِ زمین) کمیونسٹ پارٹی کی۔

چار کتابیں سندھی، دس بارہ اردو اور ایک دو انگریزی کی پڑھ کر اللہ ورایو انقلابی ہو گئے ہیں۔ گاؤں کے اجتماعات میں وہ سندھی مصلح اور انقلابی حیدر بخش جتوئی کے زرعی سدھار کے حق میں تقریریں کرتا ہے اور گواں جلسوں میں وہ ایسی گونج دار سُریلی آواز میں سندھ کا مقبول گیت سندھی بولی قومی بولی گاتا ہے مگر قومی سوال کو لینن کے اس موضوع پر مضمون، جمہوریت، آمریت، فوجی راج مردہ باد اور سامراج وغیرہ کے تانے بانے میں کہیں گندھا ہوا دیکھتا ہے۔

آنے والے برسوں میں پمفلٹ بانٹنے کے معمولی سے جرم پر گرفتار ہونے اور کمیونسٹ کا ٹھپا

لگ جانے کے بعد اللہ ورایو کی قسمت پر مُہر لگ جائے گی۔ اسے کہیں نوکری نہیں مل سکے گی۔

برس بعد برس، بچوں کو بھوک سے بلکتا دیکھتے رہنے پر، دھیرے دھیرے انقلابی سے صرف ایک بے روزگار شخص میں تبدیل ہونے اور در در کی ٹھوکریں کھاتے رہنے پر اللہ ورایو نے شہداد کوٹ کے ایک کچے مکان میں گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔

یہ خبر حیدرآباد اور کراچی پہنچی تو پارٹی کے لوگ سکتے میں آ گئے۔ (کیوں؟ کیا وہ اس کی بے روزگاری اور بدحالی کی انتہا سے بے خبر تھے؟ — مگر وہ خود مستقل مار کھاتے رہتے تھے۔ بس وہ یوں ہی سکتے میں آ گئے، کیوں کہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔) پھر انھوں نے کچھ رقم جمع کر کے اللہ ورایو کی بیوہ اور بچوں کو بھجوائی جو اُن تک کبھی نہیں پہنچی۔ جوان مرگ سندھی انقلابی کی بیوہ اپنے بچوں سمیت اس کچے مکان سے کہیں جا چکی تھی۔ اس کے سختی سے پردہ دار میکے میں اسے پھر کوئی تلاش نہ کر سکا۔

شہداد کوٹ میں کہیں دفن ہے اللہ ورایو — سوندھی مٹی سے گُندھا پُتلا، مٹی کی امانت، مٹی کے حوالے۔

اللہ ورایو جو کبھی کراچی نہیں آیا، ایک سندھی نوجوان، اپنے لب پر ایک گیت اور آنکھوں میں ایک خواب لیے، ایک بے روزگار سندھی جو زندگی کے آدھے راستے میں ختم ہو گیا — تو اس کا ذکر اس داستان میں کیوں کیا جا رہا ہے؟

یہ ذکر تو بس یوں ہی کیا جا رہا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی تھا۔ وقت کے اس برسوں پر محیط دورانیے میں جہاں انسانوں کے سمندر میں تموج آتا ہے، تحریکوں کی لہریں اُٹھتی ہیں، اللہ ورایو، زمین کا فرزند، مٹی اور پانی سے ہوا اور آس پاس کی فضا سے رنگ و بو حاصل کرتے پودے کی مانند اُٹھا اور کسی ڈپٹی کمشنر کے لاپروائی سے جاری کیے حکم نامے کی چپیٹ میں آ کر، سرایافتہ اور روزگار سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو کر، مرجھایا اور خاک میں مل گیا۔ اپنی مہک، اپنے گیت اور اپنے خواب سمیت، سپردِ خاک!

نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

***

شاعر اور تاریخ

کراچی میں لالوکھیت اور گولی مار کی جھگیوں میں بسے مہاجرین (جو اُس وقت صرف غریب غربا کہلاتے تھے) کے قتلِ عام پر جب فیض صاحب نے یہ نظم لکھی تھی جس میں اس لہو کے بارے میں یہ مصرعے بھی تھے

نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا

اس وقت ان کے وہم و گماں میں بھی نہ ہو گا کہ آنے والے برسوں میں یہ لہو ایک پرچم ـــ ایم کیو ایم کے پرچم ـــ پر رقم ہو گا۔

شاعر تاریخ کو مستقبل میں غیر متوقع موڑ کھاتے سفر میں نہیں دیکھتا۔ وہ تو حال کے ایک لمحے میں آنسو بہاتے ہوئے، کرب کے عالم میں شعر جوڑتا ہے۔

مثلاً وہ مجمعے پر پولیس کی فائرنگ پر نظم لکھ دیتا ہے۔

شاعر تاریخ کے متوازی ایک لکیر کھینچتا ہے، متبادل امکانات کی لکیر۔

وقت کے بے شعور، اندھے ریلے میں شاعر اکیلا ہے۔ شاعر تاریخ نہیں، وہ ایسے شعور سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ شاید اسی لیے وہ تاریخ کے لیے بے مصرف نہیں ہو سکتا۔

***

آؤ بھاگ چلیں

جہانگیر روڈ پر ٹیوشن سنٹر کے پاس یوسف کو بس اسٹاپ پر کھڑے، رنگین آنچل لہراتی اور خوشبو میں لُٹاتی سلونی لڑکیوں کو چھیڑتے دیکھ کر سلمانہ پھوپھی اُسے ڈانٹتی ہیں۔

ارے جونی بخت! کیوں خاندان کے نام میں بٹا لگا رہا ہے!

گال دبائے ہنس کر بھاگتے یوسف کے کیسے کو سلمانہ پھوپھی آگرے سے جانتی ہیں۔ کئی بہنوں کا اکیلا، اس لیے لاڈلا، بھائی یوسف بہنوں کی زباں میں آوارہ ہو گیا ہے۔ یوسف کی ماں ملال سے کہتیں گھوڑے کو فلم لائن میں جانے کا شوق چرایا ہے۔ آگرے کے ایک پٹھان خانوادے کا چھیلا جوان جو اتنا خوبرو، پُرکشش تیز طرار اور منچلا ہے کہ جہانگیر روڈ کی کوئی دلکش ہستی اس سے بچی نہ

نہیں ہے، اور نہ کوئی لونڈا۔ وہ جھوٹ موٹ معاشقے لڑاتا ہے اور ان کے قصے یار دوستوں کو مِس مِس کر سناتا ہے۔

سب سے زیادہ مشکل اُسے جہانگیر روڈ کے پاس ایک پرانی بلڈنگ کے بالائی فلیٹ میں رہنے والی میمن حسینہ کلثوم سے عشق میں پیش آئی تھی۔ کیسی گدر گدری تھی گوری گوری کلثوم ___ ناک میں ہیرے کی کیل، بڑی بڑی بھوری آنکھیں۔ کبھی کبھی سیڑھیوں کی تاریکی میں اُس کے گدرائے بدن کو چھو سا لینے کا موقع ملتا، زیادہ تر تو بچاری خط و کتابت پر گزارا کرتی جو وہ ڈلیا میں رکھ کر سرمئی لیس کے بہانے بالکنی سے نیچے اتارتی تھی۔ نیچے کھڑا، جانے کب سے آلو ٹماٹر اٹھائے انتظار کرتا یوسف جھٹ سے خط اٹھا لیتا اور آلو یا گوبھی یا بینگن اپنے خط سمیت ڈلیا میں رکھ دیتا۔

ایک دفعہ اُس کا ایک خط پکڑا گیا۔ بھولے سے یوسف نے کلثوم کا خط اسکول کی کاپی میں رکھ دیا تھا۔ یوسف کے ابو جی نے میز پر رکھی کاپی اٹھائی تو خط فرش پر جا پڑا۔ انھوں نے خط پڑھا تو گھر بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ جو کچھ اس خط کی ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھا تھا اس میں کہیں بھاگ چلنے کا بھی ذکر تھا۔

اے مردود! لڑکی بھگا رہا ہے!

یوسف کے بڑے بھائی نے اس رات جوان جہاں لڑکے کو الٹا لٹکا کر چھڑی سے اس کی خوب مرمت کی۔ یوسف کی کمر پر ہلدی، دودھ ملا کر پٹی باندھی گئی۔ جوان بدن پر چھڑیوں کا کیا اثر ہوتا۔ بعد میں وہ ایسی بہن کے پیٹ میں منہ گھسیڑ گھسیڑ کر ہنستا رہا۔

اے چل ہٹ، بے شرم۔ یوسف کی بہن نے مارپیٹ چھپا لیا کترتے اور اُسے پرے دھکیلتے ہوئے نہایت دُکھ سے کہا۔ وہ تو وقت پر پتا چل گیا، ورنہ تو نے تو ہم سب کو تھانے میں بندھوا ہی دیا تھا۔

ڈھیٹ یوسف بہن کے پیٹ میں منہ گھسیڑ کر ہنسا اور اس نے لوٹتے ہنستا رہا۔ پھر اس نے بتایا۔

آپ کے سر کی قسم آپا، میرا کلثوم کو بھگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بھلا یہ عمر میں کیوں پالوں گا؟ اس بچاری نے تو مجھ سے بات پیت میں ملنے لے لیے لکھا ہے۔ اسے اردو ٹھیک سے نہیں آتی۔ مانگ لو بات کہتی اور لکھتی ہے۔

یوسف کی آپا نے پہلے تو دم بخود ہو کر سر پیٹ لیا۔ پھر تھوڑی دیر تک مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر سر دوپٹے کی آڑ لیتے ہوئے بہت دیر تک ہنستی رہیں جس کے بعد انھوں نے کہا۔

اے ہے! اردو نہیں آتی اللہ ماری کو!

زبان کے مسئلے سے پیدا ہونے والی اس چھوٹی سی الجھن کے سوا یوسف کی زندگی میں سیاست کا سرے سے دخل نہ تھا۔

اُس کی بہنوں کی آرزو تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے، مگر یوسف نے پڑھنا ترک کر دیا۔ عرصے تک رسیاں تڑانے کی کوشش کرتا یوسف آخرکار لاہور بھاگ گیا تھا۔ وہاں اس کی ہیرو بننے کی خواہش تو پوری نہ ہو پائی تھی مگر اس نے لاہور کی فلمی دنیا میں گھسنے کا ایک دوسرا راستا تلاش کر لیا تھا اور ہدایت کار شوکت حسین رضوی کی ٹیم میں شامل ہو گیا تھا۔ لاہور جا کر اس نے اپنا نام یوسف حسین زیدی رکھ لیا تھا۔ ہوشیاری کے کسی پیچیدہ چکر میں اس نے اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کیا تھا، یا ہو سکتا ہے کہ اس بات نے بالواسطہ اس خاص گروپ میں شامل ہونے میں اس کی مدد کی بھی ہو کیوں کہ شوکت حسین رضوی شیعہ تھے۔

لاہور میں یوسف کی شادی ہو گئی تھی۔ دراصل شادی اُسے کرنی پڑی تھی۔ لاہور پہنچ کر اس نے اپنے خاندان کے قدیمی ملازم کا پتا لگایا تھا جو وہاں ریلوے میں ملازمت کر رہا تھا اور ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا۔ یوسف نے اس کے گھر ڈیرا ڈال دیا جسے اس نے خوشی قبول کر لیا۔ مگر کچھ عرصے بعد جب یوسف کی سرمستیوں نے اس کی بیٹی کا پاؤں بھاری کر دیا تو رانگڑ بچے نے ایک رات قاضی بلا کر یوسف کی کنپٹی پر پستول رکھی اور چھوہارے تقسیم کیے۔ شادی کی خبر جب کراچی پہنچی تو کنبے میں کہرام مچ گیا۔ رحمت علی خان کے اکلوتے وارث کی شادی نوکرزادی سے!

نوکرزادی نے (جو بعد میں شمو بیگی کہلائیں) یوسف کا بڑا ساتھ دیا۔ چند برس بعد یوسف رلتا کھلتا اُس وقت کے مشرقی پاکستان میں ڈھاکا چلا گیا تھا۔ ملک کے اس حصے کی علیحدگی کے بعد یوسف کراچی اس حالت میں پہنچا کہ کسی حادثے میں اس کا چہرہ، جو کبھی نہایت پرکشش اور وجیہہ تھا، جھلس گیا تھا۔ اس کے ساتھ متعدد بنگالی نژاد اولادیں تھیں۔ ان میں سے دو کی ماں، ایک دلفریب بنگالن، ان کے ساتھ آئی تھی۔ مگر کچھ مہینے بعد اُسے کوئی اَور لے اُڑا۔

بنگالن کی رخصتی کے بعد شمو بیگی نے آنسو بہائے اور پونچھتے ہوئے سب بچوں کو سمیٹ کر کراچی کی ایک بستی میں گھر بسا لیا۔

اس دوران یوسف کے تمام رشتے دار جہانگیر روڈ کے کوارٹروں سے اٹھ کر ناظم آباد اور ہاؤسنگ سوسائٹی منتقل ہو چکے تھے۔ ان کی ایک بھانجی کے ڈاکٹر شوہر نے ممیاسسر کو اپنے دواخانے میں بٹھا دیا۔ چند مہینوں میں دواؤں کی شُد بُد حاصل کرنے اور انجکشن لگانا سیکھنے کے بعد یوسف نے ایک قبضہ کیے ہوئے اَدھے سے مکان میں کلینک کھول کر "ڈاکٹر یوسف علی خان" کی تختی آویزاں کر دی اور محلے والوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں مصروف ہو گئے۔

زندگی میں پہلی بار انھیں سیاسی جماعتوں میں شمولیت کے اقتصادی اور سماجی فوائد کا احساس ہوا تھا۔ مگر یوسف ـــــ اب ڈاکٹر یوسف علی خان ـــــ کی ایم کیو ایم میں شمولیت پر کسی نے غور تک نہ کیا تھا، کیوں کہ پورا محلہ، پورا ضلع، پورا شہر ایم کیو ایم میں یوں ہی شامل ہو چکا تھا۔

قوم یا قومیت کا تصور بھی یوسف میاں کے ذہن میں کچھ الجھ الجھ سا جاتا۔ سخت زندگی گزارنے کے

جب آیا بڑھاپا انہیں بار بار بیمار بھی ڈال دیتا۔ وہ چڑچڑاتے، پلنگ پر پڑے پڑے پکارتے۔

قوموں میں قوم تو پٹھان تھی [یعنی آگرے کے پٹھان]، ارے یہ مغل یہ مغل تو نام کے تھے۔ نوابوں کے پاس جوڑ تو کھٹکتے بھی نہ تھے۔ ارے ہم جانتے ہیں! ان کی عورتیں تو ارے موسلوں کے ساتھ ناچتی تھیں بھائی ساتھیوں کے ساتھ جاتی تھیں سمجھی ہو شمو؟ وہ چلاتے۔

دور بچھی چارپائی پر پرانے کپڑے پھیلائے، چھوٹے کپڑوں کو بڑا اور بڑوں کو چھوٹا بنانے کی مہم میں مصروف شمو بیگم بے خیالی میں قینچی چلاتے ہوئے کہتیں اللہ تعالیٰ سب اچھا کرے یا مولا مشکل کشا! اور پھر سے سوچنے میں مصروف رہتیں۔

جوانی کے اندر مہاراج یوسف میاں پر تیزی سے جھپٹا مارتا بڑھاپا ان کے قویٰ کو مضمحل کر رہا تھا۔ وہ موسلوں اور ساتھیوں کا تصور کرتے اور بدبخت مغل عورتوں کی مشتبہ حرکتوں پر دانت پیس پیس کر کچکچاتے۔ یوسف میاں شمو بیگم کی بے خیالی پر اور بھی جھنجھلاتے۔ کچھ سمجھتی تو ہے نہیں، کم عقل! وہ رہتے اور سخت روئی کے تکیے پر دائیں بائیں سر پٹختے۔ پھر لوٹ پوٹ کر آپ ہی آپ ٹھیک بھی ہو جاتے اور ایسا مطلب چلانے لگتے۔

۱۹۸۸ میں یوسف جو جہانگیر نگری کے پٹھان مہاجر فسادات کے دوران چھاتی میں گولی لگنے سے ہلاک ہو گئے۔ انہیں عباسی شہید اسپتال لایا گیا تھا۔ مرنے سے پہلے یوسف نے آنکھیں کھول کر پاس کھڑے، کسی سپاہی کی گود سے چمٹے، جوان بیٹے کو غور سے دیکھا تھا اور ایک ٹک، کھنکار آلود راستے سے کرتے ہوئے، مسکرا کر بدلی ہوئی آواز میں کہا تھا
آؤ بھاگ چلیں!

***

اس اسپتال میں احسن نہیں ہے۔ احسن نے کامرس میں گریجویشن کیا تھا اور اسے ایک بینک میں نوکری بھی مل گئی تھی۔ مگر بینکوں کے قومیائے جانے کے بعد سفارشی بھرتی پر اپنے اوپر تعینات کیے گئے ان پڑھ افسر سے بددل ہو کر اس نے خاموشی سے کمپیوٹر کی مرمت کا کورس کیا۔ (کسی بھی قسم کی محنت کو وہ یوں بھی بُرا نہیں سمجھتا تھا) اور تین ساتھیوں کے ساتھ مل کر گلشن اقبال میں ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کر لیا۔ احسن کے ساجھے دار یہاں شام کو کمپیوٹر پروگرامنگ کی کلاسیں لیتے ہیں۔ احسن اور اس کے تینوں ساتھی ایم کیو ایم کے پکے حامی ہیں اور گو وہ اس کے کسی عہدے دار سے زندگی میں کبھی ملے تک نہیں مگر وہ ہر بار اسی کو ووٹ دیں گے، اس جماعت کو جس نے، ان کے خیال میں، انہیں ایک [illegible] ایک ایسا تحفظ کا احساس دیا ہے، جو انہیں کسی دوسری جماعت سے نہ مل سکا تھا۔

اور نعیم، ہماری داستان کا وہ سات آٹھ سالہ بچہ کہاں گیا جو برسوں پہلے ایک ہلچل بھری رات میں پی آئی بی کالونی کا کھمبا بجایا کرتا تھا؟

نعیم ہمیشہ حیدر آباد میں نہیں رہا۔ ۱۹۷۹ میں شہر سے دور جام شورو منتقل کی جانے والی سندھ یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات میں داخلے کا فارم بھرنے کی کوشش میں پتلون اتارے جانے کے بعد ـــ جب کہ اس کی مقعد میں دو تین گلابی صحت مند عضو ہائے تناسل طاقت ور دھکوں کے ساتھ گھسنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کے سر پر جیئے سندھ کے نعرے گونج رہے تھے ـــ روتے ہوئے اور سر پٹکتے ہوئے اس نے کراچی چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور حیدر آباد کے ان گنت خاندانوں کی طرح اس کا خاندان بھی کراچی آ کر بس گیا تھا۔

کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر کے نعیم ٹورانٹو، یا اوٹاوا، یا واشنگٹن چلا گیا، جہاں وہ خوش حال ہے اور اچھا کھاتا کماتا ہے۔ آپ اس بات پر متعجب نہ ہوں کہ وہ ٹورانٹو یا اوٹاوا یا واشنگٹن ڈی سی میں ایم کیو ایم کا یونٹ صدر ہے۔

برسوں بعد آپ کا وہاں سے گزر ہوگا۔ ایم کیو ایم کے ٹورانٹو، اوٹاوا یا واشنگٹن ڈی سی میں اس خوش حال، مس کلر برس ایکزیکٹو اور ایم کیو ایم کے یونٹ صدر کے گھر کے گول کمرے میں بالہ کی منقش سندھی بیڑھیاں اور دیوار پر آرائش کے لیے لگائی سندھی اجرک آویزاں دیکھ کر آپ خاموشی سے آنکھیں پھیر لیں گے اور ایک بھی آنسو نہ گرانا چاہیں گے۔ آپ ان آنسوؤں کو واپس اپنے دل میں دھکیل دینا چاہیں گے۔ آپ اس پہیلی کا بھی کوئی حل معلوم نہ کرنا چاہیں گے کہ جنگہ بالائی سطح پر میرا کلچر اور تیرا کلچر کی کالم گلوچ اور نفرت بھری بحث جاری ہے، نیچے کہیں پاتال میں، ان جانے میں، مہاجروں کے وجود کا تہذیبی پہلو سندھ کے رنگ میں رنگ چکا ہے، اور یہ کہ پردیس میں وطن کی تہذیب کے نام پر ایم کیو ایم کے یونٹ صدر کو صرف بالہ کی منقش بیڑھی اور سندھی اجرک ہی کا خیال آتا ہے۔

***

مہاجر قومی موومنٹ

نچلے اور درمیانہ مہاجر طبقوں کے اس جمِ غفیر نے آخر کار اپنی نمائندہ، اپنی نام رکھنے والی سیاسی تنظیم بنالی۔ اور ایسے کہ کسی نے کبھی دیکھا نہ سنا۔ شاہراہوں پر رواں انسانوں کا سمندر، گلی کوچوں سے ابلتا ہوا

یہ کس قسم کی تحریک تھی؟

یہ ایسے طبقے اور ان حالات کی آئینہ دار ہی ہو سکتی تھی جن میں یہ وجود میں آئی۔ اس کی ناخوشگوار خصوصیات کسی اقتدار کی نگرانی میں پیدا ہوئیں تاکہ وقت ضرورت کام میں لائی جا سکیں۔ اختلاف رائے برداشت کرنا اس کی خصوصیت نہ تھی، مگر اس سے ٹوٹے ہوئے گروہ کو پالا پوسا، تاکہ وقت ضرورت (اس کی بار خود اس کے خلاف) استعمال میں لایا جا سکے۔ اس کے خوف اور احساسِ عدم تحفظ کو صرف بڑھا ہی سکتا تھا۔

اس کے وجود میں آنے کے بعد سے اب تک تمام تر انتخابی عمل ثابت کرتا ہے کہ یہ مہاجروں کی نمائندہ اور ایسے لیے منتخب کی ہوئی تنظیم ہے، جسکہ علیحدہ کیا ہوا گروہ کوئی قابلِ ذکر عوامی حمایت نہیں رکھتا۔ ایم کیو ایم گزشتہ کئی برسوں سے عتاب میں ہے مگر ایسا کوئی عوامی اشاریہ موجود نہیں جس سے اس حمایت کی مقبولیت میں کمی نظر آتی ہو۔

ایم کیو ایم اور نواز شریف کی مسلم لیگ کے اتحاد سے قائم کی ہوئی سابقہ صوبائی حکومت کا دور، جس میں انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے پیپلز پارٹی کے ایک منحرف (دراصل ٹھکرائے ہوئے) ممبر جام صادق علی کو سندھ کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا تھا، سندھ میں شدید بد نظمی اور بدامنی ہی کا دور کہا جا سکتا ہے جس سے کراچی بھی مبرا نہ تھا۔ سندھ تو اس حد تک ڈاکوؤں کے قبضے میں چلا گیا تھا کہ اس کا زرعی نظام تار تار ہو کر قبائلی ملکہ جانہ بدوش دور کی طرف مراجعت کر رہا تھا۔ ہزار برس سے زراعت کرنے والے معاشرے کے کسانوں نے کھیتی باڑی کرنی چھوڑ دی تھی اور تیزی سے ڈاکوؤں کے گروہوں میں شامل ہو رہے تھے۔ اس قسم کی خبریں عام تھیں کہ مثلاً ایک قبیلے کے گاؤں پر دوسرے قبیلے کے افراد کے ڈاکے کے بعد پہلے قبیلے نے پورے سندھ میں ہر جگہ دوسرے قبیلے کے لوگوں کو قتل کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کراچی میں بھی چوری، ڈکیتی، اغوا برائے تاوان کی وارداتیں انتہائی تواتر سے ہو رہی تھیں۔

آخر اسی دور میں دیہی سندھ میں فوجی مداخلت شروع ہوئی اور ابتدائی اکادکا غلطیوں کے بعد فوج سندھ کے دیہات کی صورت حال سنبھالنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کامیابی نے سندھ کے کسانوں کے دل موہ لیے جنھوں نے ملک کی تاریخ میں پہلی بار مسلح افواج کو اپنا، ہمدرد، دوست اور خیر خواہ سمجھا۔

لیکن کراچی میں صورت حال کیوں مختلف رہی؟ آپریشن کلین اپ شہر میں سکون اور اطمینان کی ایک بھی سانس لانے میں کیوں ناکام رہا؟ کس لیے یہ شہر آنسوؤں کا، سر پر اٹھتے شراروں کا، شکستہ شیشے کا، لاشوں کا شہر بنا رہا؟

شہر کی ایک بڑی سیاسی تنظیم معتوب ہے۔ اس کی بنائی ہوئی اذیت گاہیں ٹیلی وژن پر دکھائی گئیں۔ انھیں ختم کر دیا گیا۔

شہر کے لوگوں نے خوشیاں نہیں منائیں، منہ لٹکائے بیٹھے رہے۔

ہزاروں نفوس پر مشتمل ایک پوری تنظیم زیرِ زمین چلی گئی۔ شہر کی نچلے اور درمیانے طبقے کی آبادیوں نے انھیں اپنے اندر سمو لیا۔

ہزاروں گرفتاریاں ہوئیں۔ شہر میں ہولناک خبریں گشت کرنے لگیں۔ نوجوان گھبرو لڑکوں کے ہاتھ پیر توڑ دیے گئے ہیں؛ ان کی ٹانگیں چیر کر انھیں نامرد کر دیا گیا ہے۔

مہینوں راہ گیروں کو، سڑک پر چلتی موٹر گاڑیوں کو روک روک کر تلاشیاں لی جاتی رہیں، گویا دہشت گرد کار کی سیٹ کے نیچے یا بوٹ میں بند ہیں۔

کراچی ایک ذلیل کیا ہوا شہر بن گیا۔

جلد ہی یہ خبریں عام ہو گئیں کہ امن و اماں قائم کرنے والے ادارے اندھادھند گرفتاریاں کرنے لگے ہیں اور ہزاروں روپے لے کر رہا کرتے ہیں۔ شہر میں جرائم کی وارداتوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شہر کے کونوں کھدروں میں لاشیں ملنے لگیں، اذیت دے کر قتل کیے ہوئے لوگوں کی لاشیں۔

آپریشن کلین اپ کے پہلے برس میں شہر سے لڑکے غائب ہونے شروع ہو گئے۔ ان کی عمریں سترہ سے ستائیس برس تک کی بتائی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کراچی سے اٹھارہ ہزار لڑکے غائب ہو گئے۔

شاید اٹھارہ ہزار نہ ہوں، شاید یہ مبالغہ ہو۔

شاید نو ہزار ہوں، یا اس سے بھی کم۔

شاید پانچ ہزار ہوں۔

پانچ ہزار جوان لڑکے اپنے گھروں میں نہیں۔ کیا ان کے ماں باپ کو ان کے بارے میں علم ہو گا؟ کیا وہ جانتے ہیں کہ ان کا بیٹا کہاں ہے؟ کب لوٹ سکے گا؟

جس رات نہیں آتا ہوں میں
اس آنگن میں ہوتا ہے کوئی
اس بستر پر سوتا ہے کوئی
اس کمرے کی دہلیز پہ اپنا سر رکھ کر روتا ہے کوئی

(ساقی فاروقی)

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ مل رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

(حبیب جالب)

یعنی محلے محلے کی ناکہ بندی کرکے ہتھیاروں کے لیے گھر گھر تلاشی لی جانے لگی۔
یہ ہتھیار ـــــ برسوں کی مدت میں سرکاری طاقتوں کے عین سامنے پھیلائے ہوئے ہتھیار ـــــ کسی کو نہ مل سکے۔ ہتھیار دنیا میں آج تک کہیں بھی برآمد نہیں ہو سکے ہیں۔ ہاں، اگر وہ عوامی حمایت ختم ہو جائے جو ان ہتھیاروں کے استعمال کو جائز سمجھتی ہے تو کسی کے لیے بھی ان کا استعمال کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہتھیاروں کا استعمال اسی طرح ختم ہو سکتا ہے۔
مشرقی پاکستان میں ہم ہتھیار برآمد نہ کر سکے ـــــ ایک بہت بڑا جوا ہار کر کے بھی نہیں۔

کراچی ـــــ تیسری دنیا کا ایک شہر، سرد جنگ کے اختتام پر، سرد جنگ کا ملبہ جھیلتا۔ اپنے فائدے میں استعمال کرنے کے لیے ان حکمرانوں کی سرپرستی کا شکار حصوں نے اپنے معاشرے کی دھجیاں اڑا دیں، ایک ایسی سمجھ بوجھ کو جنم دیا جو منظم طور پر شہریوں کی مجرم سازی کو روا گردانتی ہے، ایسی تدبیروں کو تیر بہدف سمجھ سکتی ہے جس میں شہریوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر بھیڑیوں کی طرح شکار کرنے کے لیے چھوڑ دینا کسی مسئلے کا حل سمجھا جاتا ہو۔
اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ کراچی میں شہریوں کو ذمہ دار اداروں کی جانب سے دست بردوں سے خود نمٹنے کے لیے ہتھیاروں کی پیش کش کی گئی ہے، یہ سوچے بغیر کہ ان کا دیا ہوا ہر ہتھیار ایک نیا قاتل پیدا کرے گا۔
اس شہر میں کسی اسٹیج ڈرامے کی مانند کثیر التعداد قتل کیے گئے ہیں۔ شہر کے جو بیچ چیستاں ہیں شیعہ سنی مساجد میں قتل اسی نوعیت کی وارداتیں ہیں، کیوں کہ شہر میں کوئی شیعہ سنی تضاد موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں عالمی ذرائع ابلاغ بھی اس حد تک گمراہ ہوئے ہیں کہ مساجد میں قتل کی ان پراسرار وارداتوں کو سیکٹیرین کلیش کا نام دیتے رہے ہیں۔

ایم کیو ایم کی تنظیم جو اپنے طبقاتی مزاج اور اپنے وقت، اور اس پورے (سیاسی، معاشرتی) پس منظر کی عکاس ہے جس میں یہ وجود میں آئی، اگر آپ اس کا سر دیوار سے دے ماریں اور سرپلی، پھنکارتی سرگوشی میں کہیں
کس کے مشورے پر پارٹی بنائی تھی؟ ایجنسیوں کے مشورے پر؟
(سٹی کورٹ کے سامنے دبلے پتلے مہاجر لڑکوں کا گروہ بڑبڑایا ایجنسیوں سے ملتے ہو؟ ایجنسیوں کے آدمی ہو؟ انھوں نے عظیم طارق کی پٹائی پر، اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔)
تو پیٹنے والے کا چہرہ تمتما سکتا ہے۔ وہ پوچھ سکتا ہے انڈین نیشنل کانگریس کس نے بنائی تھی؟ مسلم لیگ کس نے بنائی تھی؟ انگریزوں نے؟ بلکہ شاید وہ ہکلاتے ہوئے یہ بھی پوچھ بیٹھے پی پی پی کس نے بنائی تھی؟ امریکیوں نے؟ جنہیں خوش کرنے کے لیے آپ کے بعد بعد بھٹو صاحب

نے معاہدہ تاشقند کی مخالفت کی تھی؟ امریکا کی مرضی تھی کہ اب ایوب خان کو ہٹایا جائے۔ مگر ان سب سیاسی جماعتوں کی اس وقت ضرورت بھی تھی ــــ عوامی ضرورت ــــ اسی لیے یہ بن کر اس قدر کامیاب رہیں۔

اس تنظیم کو ــــ لاکھوں عام شہریوں کی نمائندہ تنظیم کو ــــ کن قوتوں نے اذیت گاہوں کے قیام سے، قتل سے، خون سے، ہتھیاروں سے داغ دار کیا؟ اور لوگ اب بھی اسے کیوں نہیں چھوڑتے؟

کراچی میں اس جماعت کے قائم کیے ہوئے اذیت خانوں نے دوش بدوش سرکاری، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اذیت خانے بھی تھے جہاں اُس وقت کی معتوب پیپلز پارٹی کی نوجوان لڑکیوں کو ننگا کر کے ان کے نازک اعضا میں بجلی کے تاروں سے جھٹکے دیے جا رہے تھے۔ اس شہر میں، ایک وقت تھا کہ معتوب پیپلز پارٹی کے لوگ رات بھر سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔

پھر یہاں ایم کیو ایم کرسیوں پر بٹھائی گئی، گو اسے فیتے کاٹنے اور لوگوں سے ہاتھ ملانے کے علاوہ شہر یا صوبے یا ملک کے اہم معاملات کو اپنی سمجھ بوجھ سے حل کرنے کا اختیار نہ تھا۔

انھیں جلوس نکالنے کا اختیار تھا، سو انھوں نے فقیدالمثال جلوس نکالے۔ انھیں بدعنوانیوں کا اختیار تھا (یہ اختیار یہاں سب کو دے دیا جاتا ہے) سو ان کے ہتھیار بند، اسکوٹر سوار لڑکے (جنھیں سرکاری نگرانی میں برسوں سے ہتھیار بند بنایا جاتا رہا تھا) بھتا وصول کرنے لگے۔

انھیں قابو میں کرنے کے لیے قانون نافذ کرنے والے ہتھیار بند اداروں کو تعینات کیا گیا۔ نہایت قلیل عرصے میں وہ بھی بھتا وصول کرنے لگے۔

کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے؟ اور وہ کیا سچ ہے جو لکھا نہیں جا سکتا؟ عورت سوچتی ہے۔

یہ لکھا جاتا رہا ہے اور لکھا جا سکتا ہے کہ برسوں سے ظلم، دھونس اور سیاسی مخالفوں کو کچلنے کے لیے استعمال کیے جانے والے ریاستی ادارے اس قدر کھوکھلے ہو چکے ہیں کہ بحرانی صورت حال میں ان کا اوپری خول تک نظر نہیں آ سکتا۔ مزید برآں، ان بری طرح ناکارہ، ریاست کے دیمک چاٹے ہوئے اعضائے کار کے ذریعے ظلم، خوں ریزی اور دھونس کا خاتمہ مزید ظلم، خوں ریزی اور دھونس کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً شہر کی اکثریتی آبادی کے تعاون کے بغیر تو ہرگز نہیں۔ یہ حکمت عملی صرف گزشتہ دہشت گردی کو تازہ دہشت گردی سے خلط ملط کر کے جرائم اور خوں ریزی کی گتھی کو اَور بھی مضبوط، کھولی نہ جا سکنے والی گرہ میں تبدیل کرنے پر قادر ہے ــــ اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔

کراچی میں آپریشن کلین اپ اِسی لیے کامیاب نہیں ہوا۔

***

خون کی بوچھاڑ میں

چلچلاتی دھوپ میں اور ایسی گرمی میں کہ چیل گھونسلے میں انڈا چھوڑے، کراچی کے نواح میں مگرمچھوں کے تالاب کے پاس سناٹا ہے۔ سفید آسمان پر دور دور تک کوئی پرندہ اڑتا نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھار چلنے والے لُو کے گرم تھپیڑے سے تالاب کے کنارے اُگے سوکھے، خاکستری سنبل اور جھاڑجھنکاڑ ایک ساتھ زور سے طمانچہ کھاتے آدمی کی طرح جھک جاتے ہیں۔ دور دور تک نہ آدم ہے نہ آدم زاد؛ نہ کوئی اَور جاندار نظر آرہا ہے۔ حتیٰ کہ مگرمچھ بھی سوکھے پتوں اور گھاس پھوس سے بھرے تالاب کی تہہ لیے کے لیے اپنی خاکی سبز تھوتھنیاں پانی سے نکال کر بڑی بڑی نیم خوابیدہ آنکھوں سے چہار سُو پھیلی ویرانی پر نظر ڈالتے ہیں اور سُستی سے دوبارہ غڑاپ کی آواز کے ساتھ تھوتھنیاں اندر کر لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جسے گویا فطرت نے اپنے خاص الخاص مُوقلم سے کراچی کے جاری شب و روز کے پس منظر کے طور پر بنایا ہو۔

تالاب کا سبز کاہی پانی بالکل خاموش ہے۔ دفعتاً خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ چادرِ آب میں وسط سے چاک ہوتی ہے اور اس میں سے ایک پیرِ فرتوت برآمد ہوتا ہے۔ آن کی آن میں وہ بالوں سے پانی جھٹکتا، چلچلاتی دھوپ میں تالاب کے کنارے جا بیٹھتا ہے۔

جھاڑیوں کے پیچھے سے ایک بُڑھیا نکلتی ہے۔ اُس کی کمر خمیدہ ہے اور تار تار لباس میلا اور پیوندوں سے بھرا ہوا ہے۔ مچی مچی آنکھوں سے وہ زمین پر کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ دراصل روشنی اتنی زیادہ ہے کہ اُسے کچھ بھی سُجھائی نہیں دے رہا۔

معاً تڑخی ہوئی زمین پھٹی اور چار کالے کالے ننھے منے بُھتنے پُھدک کر باہر آ گئے۔ وہ بالکل مٹی کے پتلے لگ رہے ہیں۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں چمکاتے وہ ایک گھیرے میں بڑھیا کے اطراف قہقہے لگا لگا کر ناچنے اور گانے لگے

بڑھیا ری بڑھیا تو کیا ڈھونڈے، خون کی بوچھاڑ میں؟

بڑھیا نے کہا

بھورے بچو میں سوئی ڈھونڈوں، خون کی بوچھاڑ میں۔

بھتنے۔ سوئی سے کیا کرے گی، خون کی بوچھاڑ میں؟

بڑھیا سوئی سے تھیلی سیوں گی، خون کی بوچھاڑ میں۔

بھتنے تھیلی میں کیا رکھے گی، خون کی بوچھاڑ میں؟

بڑھیا۔ تھیلی میں روپیہ رکھوں گی، خون کی بوچھاڑ میں، خون کی بوچھاڑ میں، خون کی بوچھاڑ میں

بھتنے یہ سن کر غائب ہو گئے۔ اب بڑھیا پیرِ فرتوت کی جانب متوجہ ہوئی۔ نہ جانے اُسے سوئی ملی یا

نہیں! شاید ایک رنگ آلود سوتی مل تو گئی تھی جسے اس نے اپنے لباس میں اڑس لیا تھا۔ بڑھیا پیرِ فرتوت کے پاس آئی جو اب ایک گلاس سے کوئی مشروب پی رہا تھا۔ بڑھیا نے اپنا بایاں ہاتھ اُسے دکھا کر پوچھا۔

کیوں بڑے میاں، میری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟

بڑے میاں نے کھنکھار کر کہا کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟

پیسہ آئے گا، روکڑا؟ بڑھیا نے معصومی سے پوچھا۔

بڑے میاں شرمندگی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کچھ جھجک کر بولے

یہ کیا پوچھ رہی ہیں آپ؟ آپ تو ماشاءاللہ ادیبہ ہیں عالم فاضل۔

یہ سن کر بڑھیا پہلے ہنسی اور پھر روئی ـــــ یا شاید وہ پہلے روئی تھی اور پھر ہنسی تھی۔ پھر وہ پیرِ فرتوت کے پاس اپنی کدڑی بچھا کر بیٹھ گئی اور اس نے بڑے میاں سے کہا۔

چلیے جانے دیجیے ـــــ یہ میرا ذاتی اور قومی معاملہ ہے آپ یہ بتایئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے کراچی میں؟

بوڑھا دیر تک سورج کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے یوں آغاز کیا

محترمہ، میں یہ باتیں آپ تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔ خدا معلوم اب میری زندگی اور کے دن کی رہ گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ حقیقت کسی ایسے شخص تک پہنچ جائے جو اسے سمجھ سکے اور محفوظ کر لے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ نے تک اس تحریک کی داغ بیل میں نے ڈالی اور حالاں کہ مدت ہوئی میں اس سے جدا ہو چکا ہوں، اور تحریک تباہی کی طرف مائل ہے پھر بھی میں چند باتوں پر فخر کیوں کرتا ہوں۔

بتایئے، بتایئے، عورت نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ اُس کے دیدوں کے پیچھے پانی خارج کرنے والے غدود کا سماعت کی نسوں کا ایک غیر معمولی رابطہ اس طرح ہو گیا ہے کہ دو تین برس سے لفظ کراچی سنتے ہی یہ غدود متحرک ہو جاتے ہیں اور ڈھیلوں سے پانی جاری ہو جاتا ہے۔

بوڑھے نے بتانا شروع کیا

محترمہ، میں نے اس ملک کی سیاست کے خارزار کے چپے چپے کی دشت نوردی کی ہے۔ برسوں، بلکہ عمر بھر اسی صحرا کی خاک چھانی ہے۔ پیپ میں شامل نہیں رہا، جی ایم سید کے ساتھیوں میں نہیں رہا اور میں دیکھتا رہا کہ مہاجرین حب الوطنی رجعت پرست سیاسی جماعتوں کے ہم نوا رہے۔ ترقی پسند نعرے اجتماعی طور پر انہیں کبھی بھی اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ ۱۹۷۷ کے انتخابات میں یہ اُس نو جماعتی متحدہ محاذ کے ساتھ ہو گئے جسے نو ستارے کہا جاتا تھا

عورت کے ذہن میں ایک تصویر تازہ ہو جاتی ہے۔

یہ کراچی ہے۔ شہر کے مغربی مضافات میں پھیلے سائٹ کے صنعتی علاقے کی ایک ملٹی نیشنل کثیر القومی دوا ساز فیکٹری کے دفتر میں وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہے۔ اس دفتر اور کارخانے کا ایک

ایک فرد جماعت اسلامی کا حامی ہے۔ لیبارٹری کی طرف جاتی ہوئی دو نوجوان فارماسسٹ لڑکیاں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں۔ وہ جوش میں ہیں اور ہنس رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کہتی ہے ہم نے انہیں ہرا دیا۔ بھائی جان کہہ رہے تھے کہ مہاجروں کے دماغ اور پٹھانوں کی جسمانی قوت نے مل کر کام کیا ہے۔

اچھا، آخر آپ بھٹو کے خلاف کیوں ہیں؟ عورت نے ایک نوجوان، خوش پوش اور مستعد سیلز ایگزیکٹو سے پوچھا۔

وہ جلدی جلدی اُسے سمجھانے لگا۔ ابھی اس وڈیرا گردی سے تنگ ہیں ہم۔ یہ جو چلے آتے ہیں بھر گئے ہیں شہروں میں۔ دیکھیے میڈم، کپڑوں کی دکان پر جا کر دیکھیے۔ جس کپڑے کا ایک کوٹ سلوانے کی استطاعت حاصل کرنے کے لیے ہم نے عمر بھر محنت کی ہے، اس کے درجنوں سُوٹ یہ کس طرح خریدتے ہیں۔

ہُوں، تو معاملہ طبقاتی ہے، عورت دل میں سوچتی ہے۔

مگر شہر کے گلی کوچوں میں یہ طبقاتی نفرت لسانی اور نسلی رنگ اختیار کر چکی ہے۔ ولی خان کی قیادت میں کراچی کے پٹھان پیپلز پارٹی کے شدید مخالف بن چکے ہیں۔ سڑک پر سندھی چادر اجرک اوڑھنے والوں کے لیے کوئی رکشا ٹیکسی نہیں رکتی جسے کوئی پٹھان چلا رہا ہو

تو پھر آپ نے کیا کیا؟ عورت پیرزادہ قوت سے پوچھتی ہے۔

تو انتخابات کے بعد میں نے سوچا کہ لوگوں میں، عوام میں تحرک اندرونی تضادات کو تیز کرنے ہی سے آتا ہے۔ کٹھ ملاؤں سے مہاجروں کی جان چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے ـــ مذہبی جنون کے زہر کو قومی عصبیت کا زہر ہی مار سکتا ہے۔ لہذا میں نے ان نوجوانوں پر توجہ مرکوز کر دی جو کراچی کے گلی کوچوں میں جان ہتھیلی پر رکھ کر جلسے جلوس کرنے، ٹائر جلانے اور پُرجوش تقریریں کرنے کے باعث محلوں کے ہیرو بن چکے تھے۔

عورت کو یاد آتا ہے۔

۱۹۷۷ کے انتخابات کے بعد، دھاندلی کے الزام میں چلائی ہوئی تحریک ـــ جلوس پر فوج کی فائرنگ ـــ پہیا جام ہڑتال میں ٹرین روکنے کی کوشش ـــ احمد فراز کی مزاحمتی نظم

پٹریوں کی حمی پیپڑیاں جوں کی
کہہ رہی ہیں کہ منظر قیامت کے ہیں
کراچی کے گھر گھر میں اس نظم کی فوٹو اسٹیٹ نقلیں ـــ

خیر، تو میں نے اُن سے کہا کہ نوستارے تمہیں استعمال کر رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کی قیادت کسی مہاجر کے پاس کبھی نہیں آئے گی۔ بس تو آخر کار مہاجر طلبا تحریک کا آغاز ہوا۔ اور اس کی رہنمائی میرے ہی محلے کے ایک لڑکے نے کی

میں نے ترقی پسند نوجوانوں کو اس طرف لانے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ انکار کر دیتے تھے۔ کیا مہاجر مہاجر کر رہے ہیں؟ وہ کہتے۔ ہم تو بین الاقوامی، طبقاتی تحریک پر یقین رکھتے ہیں۔ میں ان کو سمجھاتا ـــــ میاں، تحریکیں نیک خدمات پر کامیاب نہیں ہوتیں۔ عوام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑنا ہوتا ہے، کسی زخم کو کریدنا ہوتا ہے۔ بظاہر چاہے وہ گھٹیا سی بات لگے، مگر اس کی آڑ میں، بلکہ اس کے سہارے، بڑے بڑے کام کیے جاسکتے ہیں

بوڑھے کی بات کی نصف سچائی عورت کے دماغ میں پگھلے سیسے کی طرح اترتی ہے

مگر کیا! بوڑھا کہتا ہے۔ یہ آتی ہے تنظیم بھئی ہم بیزار تھے پارٹیوں کی بدنظمی سے۔ ہم نے سوچا کہ تنظیم اتنی مضبوط ہونی چاہیے کہ کوئی کارکن اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ ایسا ہی تصور ـــــ منتخب ممبران اسمبلی اپنے گھر نہیں جاسکتے، اب وہ صرف تحریک کے لیے وقف ہو چکے ہیں۔ اُن کے گھر والوں پر بھی نظر رکھی جائے گی۔ اگر منتخب نمائندہ گمراہ ہو جائے تو اُس کے خاندان والوں کی خیر نہیں۔ بابا کو توڑا جائے

طبقاتی نفرت کا ایک مظہر ـــــ جو کسی کی سمجھ میں آنے سے پہلے، زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ مہذب، مہاجر افراد سے بھی نفرت میں تبدیل ہو گیا۔ ایک چھوٹے سے گھر میں مُرجھائے ہوئے، اُلٹے لٹکے ہوئے لوگ

بابا کو توڑو؟

کیوں؟ کیا چین میں ماؤ نے محنت کش طبقے سے نہیں کہا تھا کہ ان بڈھے رجعتی پروفیسروں کے سر پر جوتے مار مار کر ان کے فلسفے کی ہوا نکالو؟ بوڑھا ہنستا ہے۔ اب وہ دوسرا گلاس بھر رہا ہے۔ بھول گئیں چین کا ثقافتی انقلاب؟

مہاجروں کو سب سے زیادہ ناز اس پر تھا کہ وہ پاکستان بھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں پڑھے لکھوں کی شرح فی الحقیقت دوسری تہذیبی اکائیوں سے بڑھ کر تھی۔

اور تحریک نے ان کی ایک پوری نوجوان نسل کو تعلیم سے بیگانہ کر دیا ـــــ وہ جاہل ہو گئے۔ صرف نعرہ بازی، جلسے جلوس میں مشغول، جیسے مہاجر!

بوڑھا گلاس سے چسکی بھرتا ہے۔ کلچرل ریولیوشن کے دوران چائنا میں بھی یہی ہوا تھا۔ برسوں قوم کی قوم پڑھنے لکھنے یا کوئی بھی پیداواری کام کرنے کی جگہ ڈنڈے بجاتی گھومتی رہی تھی ـــــ اسی لیے بعد میں ملک میں اتنا بڑا قحط پڑا تھا۔

مہاجروں کو دوسری سیاسی جماعتوں پر اعتراض تھا کہ ان کی قیادت وڈیروں اور پیروں کے ہاتھ میں ہے۔

تحریک کے اپنے قائد وڈیرے تو خیر نہ بن سکے، مگر اس شہری، تعلیم یافتہ، روشن خیال جماعت کے سربراہ سُرعت سے پیر بن گئے۔ پاکستان کے اس جدید ترین شہر کے اندرونی گلی کوچوں میں بتوں،

پھولوں اور پتھروں میں ان کی مبارک شبیہ نمودار ہونے لگی۔
اور لاکھوں پڑھے لکھے، روشن خیال مہاجر ان باتوں کو یکسوئی کے ساتھ نظرانداز کرتے رہے۔

رنچھوڑلائن کے ایک شکستہ، تنگ و تاریک مکان کے صحن میں ایک جنازہ تیار رکھا ہے۔ اندر سے آہ و بکا کی آوازیں آ رہی ہیں۔ پانچ چھوٹے بچے ڈبڈبائی آنکھوں سے کھڑکیوں کے باہر جھانک رہے ہیں۔ صحن میں عزاداروں کا ہجوم ہے۔ ان میں سے ایک، جو مرنے والے کا دوست ہے، اس کے بڑے بیٹے کو گلے سے لگا کر بھرائی آواز میں کہتا ہے صبر کرو میرے بیٹے اور یہ نہ بھولو کہ اب اس خاندان کے والی وارث تم ہو ــــ تم اب میڈیکل کی پڑھائی جاری نہ رکھ سکو گے۔ تم کل ہی میرے پاس آؤ، میں تمھیں نوکری دلا دوں گا۔

۱۹۵۴ میں ایک سو اسی روپے ماہوار کی نوکری سے بالغ زندگی کا آغاز کرنے والا یہ لڑکا ــــ جس نے پاکستان کو بنتے ہوئے دیکھا اور جو اس میں اپنے ادارے کے اعلیٰ ترین افسروں میں شامل، دیس دیس گھوما ہوا ــــ اسلام آباد یا لاہور کے بنگلے کے نفاست سے سجے ڈرائنگ روم میں اپنے پائپ کی راکھ ایش ٹرے میں صاف کرتا ہے اور بے پروائی سے کہتا ہے

سب چلتا ہے اس تحریک نے ہمیں ہمارا تشخص دیا ہے۔ مہاجروں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ انھیں کسی نے پلیٹ میں رکھ کر نہیں دیا ــــ یہ ان کی ماہ و سال کی، شب و روز کی محنتِ شاقہ کا حاصل ہے۔ میں اس مقام پر کسی دڑ ہوس، کسی کوٹا سسٹم یا سفارش کے ذریعے نہیں آیا ہوں۔

مگر ــــ خدا نہ کرے ــــ کہیں وہ کراچی کی اُس چھوٹی سی بستی میں پہنچ جاتا، تو قائد کے روبرو، بلکہ ان کے مقبرے سے ملحق رہائش گاہ میں، اُسے مرنا سامنا ممکن نہ تھا

اماں کو توڑو!

اب عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر وہ منہ چلا چلا کر کہتی ہے

دانش ور دانش ور ادیب اور شاعر اب یاد آئے ہیں مہاجر ادیب اور دانش ور؟ پہلے کبھی ان کا خیال آیا؟ پہلے کبھی سوچا؟ حسن ناصر بھی مہاجر تھا جس نے لاہور کے قلعے میں اذیتیں جھیلتے ہوئے جان دی۔ کبھی اُس کا نام لیا؟ ابراہیم جلیس بھی مہاجر تھا جس نے ضیا مارشل لا میں فوجیوں کا قہر سہا ــــ اور جو اپنے معتوب اخبار کے دفتر میں، فوجی ہیڈکوارٹر میں، جھڑکیاں اور دھمکیاں سہنے کے بعد دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا

تحریکیں نیک ارادوں سے نہیں چلتیں، بوڑھا بڑبڑاتا ہے۔ جب تک تضادات کو ہوا نہ دی جائے عوام کے کسی خاص احساسِ محرومی پر فوکس

احساسِ محرومی ــــ بڑھیا بڑبڑاتی ہے، کبھی سندھ کے دیہات میں جا کر دیکھیں جہاں بے شمار لوگوں کو پانی تک نصیب

بوڑھا ہنستا ہے۔

اب ایسا ہوتا ہے کہ وہ اب ایسا دوسرا گلاس ختم کر رہا ہے۔ سماجی اکائیاں ایسی ہی محرومیوں کے نعرے لے کر چلتی ہیں — دوسروں کی نہیں۔ اب سندھی قوم پرستوں کو لیجیے۔ جن حقوق کو یہ اپنے قومی بلکہ انسانی حقوق کہتے ہیں، ان کے تصور کے کسی دوردراز ترین گوشے میں بھی، کیا یہ حقوق سندھ میں ہزاروں برس سے رہنے والے بھیل اور اوڈھ قوموں کے بھی ہیں؟ سندھ کے دیہات کی محرومیوں کا اپنے تمام زمانہ طالب علمی میں رونا رونے والے سندھی، اچھے گریڈ کی نوکریاں حاصل کرنے کے بعد، ڈاکٹر یا انجینئر بن جانے کے بعد، ان دیہات میں پھٹکتے بھی نہیں — وہ تو کراچی یا اسلام آباد میں رہنا چاہتے ہیں۔ یہ انسانی کمزوریاں ہیں، اور اجتماع کی کمزوریاں بھی ہیں۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر عورت نے پوچھا

اتنا اسلحہ ان کے پاس کہاں سے آیا؟

اسلحہ کراچی میں عام فروخت ہوا ہے — افغان جہاد کا منطقی نتیجہ!

اب عورت کی آنکھوں والے پانی کے عدود پھر سے متحرک ہو چکے ہیں۔

مگر یہ بہیمیت یہ درندگی مخالفین کے بدنوں میں ڈرل سے سوراخ کرنا وہ اٹک اٹک کر بول رہی ہے — انو کی شخصی! خود بھی اردو اسپیکنگ ہے نا، اسی لیے اس کے منہ سے یہ الفاظ اسی لیے بڑی مشکل سے نکل رہے ہیں۔ وہ یقین کرنا چاہتی ہے کہ یہ سب سچ نہیں ہے، مگر دل کی انتہائی تاریک گہرائیوں میں جانتی ہے کہ یہ سچ ہے۔

ایسا تو کوئی نہیں کرتا تھا! وہ روتے ہوئے کہتی ہے۔ آخر دوسری بھی سیاسی جماعتیں ہیں۔ یہ درندگی ان مہاجر لڑکوں کو کس نے سکھائی؟

ایسٹ پاکستان میں! وہ اچانک چونکی۔ ایسٹ پاکستان میں سب سے پہلے ایسا ہوا تھا۔ پہلے بنگالیوں نے اردو اسپیکنگ لوگوں کے ساتھ یہ کیا تھا — آنکھیں نکال لینا بدن کا سارا خون نچوڑ لینا

بوڑھا ہنسنے لگا۔ کھانس کر بولا ارے درندگی سیکھنے کے لیے کسی استاد کی ضرورت نہیں پڑتی!

آپ اپنی لکھی ہوئی کتاب دوبارہ خود پڑھیے، کبھی کبھی، دفتر میں اُس کے ایک دوست نے اس سے کہا تھا۔

کبھی اُس نے فسطائیت کی سماجی بنیادوں پر ایک جرمن نژاد نفسیات داں کی کتاب سے ماخوذ ایک مختصر جائزہ لکھا تھا۔ متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی اخلاقیات میں جس طرح لطف لینے کو گناہ سمجھا جاتا ہے، حصولِ مسرّت کے خلاف جو جذبہ ہے، وہ اسے ایک ایسی بوڑھی، روکھی پھیکی زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے جو اس میں سادیت پیدا کرتا ہے۔ سادیت کا دوسرا رُخ خودادیتی ہے۔ یہ دونوں مل کر اس طبقے کو

خطابیت کے لیے زرخیز میدان کی طرح بنا دیتے ہیں۔ یہ طبقہ ایک حاکم کے حکم پر سختی سے کاربند رہنے میں خود کو محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اس کتاب کا ماحصل یہی کچھ تھا۔ وہ اس نے خود لکھی تھی ـــ مگر مگر اس تھیسس کو کسی غیر مرئی ہیولے کے بارے میں لکھنا ایک بات تھی، اور اور اسے اپنے پڑوسیوں پر، ان دبلے پتلے انسانوں پر منطبق کرنا بالکل دوسری بات تھی، جو اب خود مار کھا رہے تھے جن کی مسخ کی ہوئی لاشیں شہر کے گلی کوچوں سے برآمد ہو رہی تھیں جن کے لیے اُس کا اپنا دل خون ہو رہا تھا جو طبقہ نہیں، جیتے جاگتے لڑکے تھے کسی کے بیٹے، کسی بہن کے بھائی، ہنستے ہوئے، گاتے ہوئے، سڑک پر بیچ بیچ چلتے ہوئے

اُسے وہ دن یاد آیا جب اچانک شہر میں سفید رنگ کے بے شمار بینر لگا دیے گئے تھے جن پر سُرخ الفاظ میں تحریر تھا جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے۔ تمام گلی کوچے اس خون جما دینے والے نعرے سے اس طرح ڈھک گئے تھے کہ کسی بلند عمارت سے دیکھنے پر شہر کسی زخمی کے مانند نظر آ رہا تھا جس کے تمام جسم پر خون سے رِستی ہوئی پٹیاں باندھ دی گئی ہوں۔

اُس دن شہر میں بے پناہ دہشت تھی۔ ایم کیو ایم کے باغی گروپ کے لوگ، جو بعد میں ایم کیو ایم حقیقی کے نام سے معروف ہوئے، چند دن پہلے ہی شہر سے غائب ہوئے تھے۔ لوگ خاموش تھے۔ شہر اس نعرے کے ہَول سے سہما رہا تھا موت کا موت کا موت کا حقدار ہے!

اُس دن موت اپنے سیاہ پَر کھولے ہوئے کراچی پر اپنی تاریک پرچھائیں ڈال رہی تھی۔

یہ فاشزم ہے! شاید اُس دن کچھ لوگوں کے دل چیخے ہوں۔ مگر ایم کیو ایم کی فقید المثال افرادی حمایت کے سامنے لب کشائی کی جرأت کسی کو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ حمایت جو کراچی کے غریب، نچلے متوسط طبقوں پر مشتمل تھی جو فلسفہ آرائیاں کرنے کی ـــ ان کے خیال میں عیاشی کی ـــ متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ طبقے، اور یہ محنت کش نیم خواندہ لڑکے ڈسپلن اور فاشزم میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔

کاریگروں نے بانوؤں کو زیر کر لیا
محنت کی آنچ کاغذی اسناد کھا گئی

مزدور طبقے کے ایک شاعر نے جب جوش اور جذبے میں یہ شعر لکھا تھا، تو کیا وہ سوچ بھی سکتا تھا کہ اس کا عملی مطلب یہ بھی نکل سکتا ہے، یہ بھی؟ جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے؟

اب بہت دیر ہو چکی تھی اور شام ہو جانی چاہیے تھی۔ اس سفید، جہنم کی طرح دہکتے ہوئے سورج کو اب تک ٹھنڈا پڑ جانا چاہیے تھا، مگر کسی طلسم کے باعث ایسا نہیں ہو رہا تھا اور سورج مستقل نصف النہار پر تھا۔

کراچی میں اُس روز کا اسکور سولہ تھا تین لاشوں کے ٹکڑے بوریوں میں بند ملے، دو پولیس کے سپاہی گولی کھا کر ہلاک ہوئے، ایک نالے میں ایسا آدمی ملا جس کی ٹانگیں کاٹ دی گئی تھیں، باقی کے

پولیس مقابلے میں مارے گئے۔

یہ کون کر رہا ہے؟ اُس نے ہواؤں سے، خلاؤں سے، ستاروں سے پوچھا۔

ان سب نے مستعدی سے جواب دیا اس تنظیم کے دو متحارب گروہ کر رہے ہیں۔

ان میں سے ایک گروہ کو سرکاری پُشت پناہی حاصل ہے؟

جی ہاں، کیوں کہ یہی ان کی مسلح قوت کو گلی کوچوں میں چیلنج کر سکتا ہے۔

پھر اس قوت کا کیا کیا جائے گا؟

یہ تو ابھی پتا نہیں   کچھ نہ کچھ حل سوچ لیں گے!

اگر اس تنظیم سے سیاسی صلح ہو جائے تو پھر اس کی مسلح قوت حرکت میں نہیں آئے گی ـــ یہ بھی تو ہو سکتا ہے؟

بہرحال   جیسا کہ آپ دیکھ رہی ہیں   یہ مناسب نہیں سمجھا گیا۔

اس تمام عمل سے ایک خاص کمیونٹی کے لیے پورے ملک میں جو نفرت پھیل رہی ہے، اور خود اس کے اندر جو احساسِ بے گانگی پیدا ہو رہا ہے، اس کے بارے میں کیا کہنا ہے؟

بُرے کام کا بُرا نتیجہ!

پورے پورے محلوں کے افراد کو قمیصیں اتروا کر، آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر تھانوں میں لے جانے سے کیا حاصل ہے؟

تو وہ بتاتے کیوں نہیں کہ اس تنظیم کے مسلح لڑکے کہاں چھپے ہوئے ہیں؟ خوف کے مارے چپ رہتے ہیں۔

صرف خوف کے مارے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کی عوامی حمایت اب بھی موجود ہو؟

ہو سکتا ہے   مگر اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

بلدیاتی انتخابات کروا کر کیوں نہیں دیکھ لیتے؟ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

اور اگر یہ جیت گئے تب؟ ہا ہا ہا! ایسی غلطی دوبارہ نہیں کی جا سکتی۔

اگر ـــ بالفرضِ محال ـــ یہ عوام میں اب بھی مقبول ہیں، تب لاکھوں شہریوں کی رضا کو جبراً کچلنا   جمہوری اقدام تو نہیں ہو سکتا۔

اگر لاکھوں شہری ایک فسطائی جماعت کے ہم نوا بن جائیں تو ہم کیا کریں!

اسے سیاسی عمل کا راستا فراہم کر کے، اس کے فسطائیت کے رجحان کو ختم کر کے، بحیثیت ایک سیاسی تنظیم کے رہنے دیا جائے ـــ کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟

خاموشی

خاموشی

خاموشی

یہ ہندوستانی ایجنٹ بن چکے ہیں۔
باری باری ـــ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ـــ سب ہندوستانی ایجنٹ ہے۔ اقتدار اور وسائل میں شرکت ملنے پر واپس پاکستانی ایجنٹ معاف کیجیے گا، پاکستانی بن گئے۔ تو کیا ان کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا؟

خاموشی
خاموشی
خاموشی

بہیمیت صرف نچلے متوسط طبقے کی میراث نہیں۔ شاید کسی کو یاد ہو ـــ چند برس پہلے، سترہ سندھی نوجوان پکڑے گئے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ یہ الذوالفقار کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے ایما پر مسلح تربیت لینے جا رہے تھے۔ بعد میں اُن میں سے چند کی لاشوں کے ٹکڑے بوریوں میں بند ملے تھے۔ لاشیں کئی دن پرانی تھیں اور بو چھوڑنے لگی تھیں۔ وہ کام تو مہاجروں کی تنظیم نے نہیں کیا تھا؟ سوال یہ ہے کہ تفتیش کے دوران لاشوں کے ٹکڑے کیوں کر ہو گئے؟

خاموشی
خاموشی
خاموشی

دہشت کے بدلے دہشت ـــ ربر کو ربر کاٹتا ہے۔ اسلحے کا مقابلہ اسلحے ہی سے کیا جا سکتا ہے!

اس پر عورت نے زور سے قہقہہ لگایا اور منہ پونچھتے ہوئے بوڑھے سے پوچھنے لگی
اور آپ کا کارنامہ کیا ہے؟
مہاجروں کو تشخص ملا۔ شیعہ سنی فسادات ختم ہو گئے۔ اور میں جانتا تھا کہ سندھی مہاجر ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہیں
ہوں تو مہاجر تشخص کو اور اتحاد کو ختم کرنے کے لیے ـــ ربر کو ربر کاٹتا ہے والے نظریے کے مطابق ـــ غالباً سنی شیعہ فسادات کرانے کی کوشش کی گئی تھی کراچی میں مگر کامیاب تو نہیں ہوئی؟
اب تو بوتل سے جن باہر آ گیا ہے
رہی یہ آخری بات کہ سندھی مہاجر اتحاد ـــ سو تو کسی دیوانے کی بڑ معلوم ہو رہی ہے۔ اب تو ان دونوں کی ایک دوسرے سے خاصی واضح دشمنی ہے۔
خیر دس برس تک تو کنٹرول میں رکھا اس جذبے کو
ان دس برسوں کے لیے یہ گلدستہ قبول کیجیے!

عورت نے بڑے میاں کو تازہ سُرخ گلابوں کا ایک گلدستہ پیش کیا۔

پھر دونوں تالاب میں واپس چھلانگ لگا کر غرق ہو گئے۔ تالاب کی سطح برابر ہو گئی۔ سورج اُسی طرح نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ایک مگرمچھ نے کاسی تھوتھنی نکال کر گرم ہوا میں سانس بھری۔

***

زنا بالجبر ــــ ہوا کہ نہیں؟

شہر میں سناٹا ہے اور ہڑتال ــــ کوئی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا، تمام دکانیں بند ہیں۔ اگر دکانیں کھولی جائیں، یا ایک محلے سے دوسرے محلے تک جانے کے لیے کسی سواری پر سفر کیا جائے، تو پتھراؤ ہو سکتا ہے، گولیاں بھی چلائی جا سکتی ہیں۔

ہو سکتا ہے یہ پتھراؤ اور فائرنگ وہ تنظیم کرے جس نے ہڑتال کی کال دی ہے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پتھراؤ اور فائرنگ اس تنظیم کی رقیب تنظیم یا حکومت کی خفیہ ایجنسیاں کروائیں تاکہ اس کا الزام ہڑتال کروانے والی تنظیم پر رکھا جا سکے۔

ایسا ہو سکتا ہے ــــ کیوں کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

ممکن ہے کئی دنوں ہفتوں مہینوں سے ایسا ہو بھی رہا ہو۔ کیوں کہ یہ شہر ایسا ہے جہاں عرصے سے ہو سکتا ہے کچھ بھی ہوتا رہا ہو۔

ایک شخص ہڑتال، یعنی شہریوں کی گھر میں نظر بندی، والے روز وی سی آر پر فلم دیکھ رہا ہے۔ ہندوستانی فلم ہے، ایک ڈاکو کی کہانی جس کا ایک بیٹا ڈاکو بنتا ہے اور دوسرا پولیس والا، جب کہ دوسرے بیٹے کو علم نہیں ہوتا کہ وہ ڈاکو کا بیٹا ہے اور ڈاکو بیٹے کو علم نہیں ہوتا کہ پولیس والا اس کا بھائی ہے۔ شخصِ مذکور کو یہ فلم ہزار بار دیکھی ہوئی لگتی ہے۔ پولیس کی بھرتی میں ایک حسین پولیس والی بھی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی بہانے بار بار پولیس یونیفارم اتار کر انگیا اور پنڈلیوں سے اونچا جگمگاتا لہنگا پہن کر ناچتی اور گانا گاتی ہے۔ پولیس والی ڈاکو کے اُس بیٹے سے محبت کرتی ہے جو پولیس والا ہے۔ وہ یونیفارم میں بھی پُرکشش لگتی ہے۔ خاکی پتلون اُس کی رانوں اور جانگھوں پر پھنسی رہتی ہے۔ شخصِ مذکور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ فلم میں جب ڈاکو باپ، پولیس والا بیٹا، پولیس والی اور ڈاکو بیٹا ایک دوسرے پر گولیاں چلا رہے ہوتے ہیں اور گاڑیوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا رہے ہوتے ہیں، تو انہیں چنداں خبر نہیں ہوتی کہ ان کے آپس میں کیا رشتے ہیں۔ مگر فلم کے انجام تک پہنچتے پہنچتے تمام اُلجھاؤ دور ہو جاتا ہے،

سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کس کا باپ، کس کا بیٹا اور کس کا بھائی ہے۔ باپ دونوں بیٹوں کو گلے سے لگا کر رو جاتا ہے۔

ہڑتال دراصل ریپ بالجبر کے ایک واقعے ــــ یا مبینہ واقعے ــــ پر احتجاج کے طور پر کی گئی ہے۔ اس لڑکی کا بھائی ایک معتوب تنظیم سے تعلق رکھتا ہے اور روپوش ہے۔ چند دن پہلے اخباروں میں ایک پندرہ سولہ برس کی روتی ہوئی لڑکی کی تصویر شائع ہوئی تھی اور ساتھ ہی یہ خبر کہ روپوش تنظیمی کارکن کی بہن کے ساتھ اہلِ خانہ کی موجودگی میں کسی افراد نے ریپ بالجبر کیا۔

دوسرے دن سے مخالف تنظیموں کی جانب سے ریپ کے الزام کی تردید شائع کی جانے لگی۔ چند ڈاکٹروں نے سرکاری طور پر لڑکی کا معاینہ کیا اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اندام نہانی یا پستانوں پر اجتماعی ریپ بالجبر کے نشانات دکھائی نہیں دے رہے۔ پھر لڑکی کا معاینہ ایک غیر سرکاری اسپتال میں کروایا گیا۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اندامِ نہانی کے پچھلے دائیں یا بائیں مقامات پر خراشیں اور سوجن ہے۔

اس سے تنظیم کے سربراہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ریپ ہوا ہے، جب کہ مخالف تنظیموں اور سرکاری وزراء نے یہ نتیجہ نکالا کہ ریپ نہیں ہوا ہے۔

شخصِ مذکور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا کہ جماع یا ریپ جیسے کام میں اتنے زیادہ عضلات، ہڈیاں، اعصاب، گوشت کے ریشے وغیرہ کام کرتے ہیں ــــ ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ بہر حال، وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ریپ ہوا یا نہیں۔ ایک بات جس کا ذکر (غیر سرکاری اسپتال کی) رپورٹ میں تھا، یہ تھی کہ اندامِ نہانی کا اندرونی پردہ پھٹ چکا ہے، لیکن اسے اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ زخم بھر نے لگا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ تخمینہ لگایا جائے کہ ایک صحت مند، پندرہ سولہ سالہ لڑکی کے بدن میں اس قسم کا زخم بھرنے میں کتنا عرصہ لگتا ہے ــــ ایک دن؟ اس سے زیادہ؟ ــــ جب کہ گوشت اور جوں کے ذرات اپنے فطری کام میں مگن ہوں

چند دن پہلے اخباروں میں شخصِ مذکور نے یہ خبر پڑھی تھی کہ زیرِ عتاب تنظیم کا ایک گرفتار کارکن کسی پوچھ گچھ کے سلسلے میں ایک کئی منزلہ عمارت کے بالائی حصے پر لے جایا گیا تھا جہاں سے اُس نے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔

یہ خبر پڑھ کر شخصِ مذکور کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک نوجوان نے اصول پسندی کے باعث پولیس کا مخبر بننے پر خودکشی کو ترجیح دی۔ مگر بعد میں آنے والی خبروں سے معلوم ہوا کہ اس نوجوان کو بالائی منزل سے نیچے پھینکا گیا تھا۔ اس انکشاف سے معلوم ہوا کہ نوجوان نے اصول پسندی کے باعث خودکشی نہیں کی تھی۔ بائیں، یہ کیا بات ہوئی؟ شخصِ مذکور نے سوچا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے دماغ نے اس انکشاف کو جذب کیا کہ اس گرفتار نوجوان کو کسی منزلہ عمارت کے بالائی حصے پر لے جایا گیا اور وہاں سے نیچے پھینک دیا گیا۔ اب کی بار شخصِ مذکور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور تصور ہی تصور میں یک مسوط حال لے کر اس کئی منزلہ عمارت کے نیچے جا کھڑا ہوا

اور کرنے والے نوجوان کو اس میں گھسیٹ لیا۔ نوجوان اس سے لپٹ گیا۔ مگر اس نے کہا کہ شکریہ ادا کرنے میں وقت نہ گنواؤ اور فوراً گھر جاؤ۔ نوجوان آنسو پونچھتا ہوا سکڑی سی گلیوں گلیوں دوڑ گیا۔ جب وہ ہانپتا ہوا گھر پہنچا تو اس کی ماں نے روتے روتے اُسے گلے سے لگایا اس کے بعد شخص مذکور کا تصور گند ہو گیا۔ وہ مزید تصور نہ کر سکا کہ گھر والوں نے اُسے پانی پلایا ہو گا یا دودھ پلایا ہو گا۔

تصور کے ختم ہو جانے پر اس نے حقیقت کا سامنا کرنے کی ٹھانی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ نوجوان مالائی میسر نہ کرنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔ خیال میں زندہ سلامت نوجوان کی جگہ اس کے سامنے ایک ہڈیاں ٹوٹی، کھوپڑی پھوٹی لاش پڑی تھی۔ اب تو وہ اور بھی رویا اور ماتم کرنے لگا اور سینے پر دوہتڑ مار مار کر ہچکیوں میں کہنے لگا ہائے، نوجوان لڑکے! کیسے تجھے پالا تھا ماں نے سینے سے لگا کر، پل پل تیری بلائیں لے کر۔ دروازے پر منتظر رہتے تھے گھر والے، اگر تو دیر سے آتا تھا۔ تیرے لیے کھانا ڈھانپ کر رکھتے تھے۔ منتیں کر کر کے تجھے کھلاتے تھے اگر تو کبھی کھانے سے انکار کرتا تھا۔ تیرا سر ذرا بھی دُکھنے لگتا تو پیار سے سر میں تیل کھپاتی تھی تیری بہن، یا تیری ماں یہی سر جو آج زمین پر پڑا ہے کھوپڑی کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی، خون میں تر، مٹی میں لتھڑا ہوا اور اس پر مکھیاں بیٹھتی ہوئیں۔

یہاں شخصِ مذکور نے سینہ کوبی بند کر کے، گردن لمبی کر کے، غور سے کھوپڑی کے اندر دیکھا۔ تو یہ ہوتا ہے کھوپڑی کے اندر؟ اس نے نہایت تحیر اور بے بسی کے عالم میں خود سے کہا۔ مگر وہ طبی سائنس داں تو نہ تھا کہ مزید تحقیق کرتا کہ آدمی کی کھوپڑی کے اندر کیا ہوتا ہے۔ وہ تو محض چھٹی یا ہڑتال کے دن وی سی آر پر ہندوستانی فلمیں دیکھنے والا ایک معمولی، عام شہری تھا۔ لہٰذا اس کا تجسس زیادہ دور تک نہ گیا۔ چند لمحے بعد اس نے دوبارہ مرنے والے کے اعزا کی خون بدلی اور سینہ کوبی کرنے لگا۔

لیکن اسی اخبار میں یہ خبر بھی تھی کہ ایک سر کٹے آدمی کی لاش ملی ہے جس کا عضوِ تناسل بھی کٹا ہوا ہے۔ لاش کی جیب سے یہ پرچی ملی ہے ایک مہاجر بہن کی بے حرمتی کرنے والے کا انجام۔

پہلے بھی چند لاشوں کی جیبوں سے اس مضمون کی پرچیاں برآمد ہوئی تھیں مخبری کرنے والے کا انجام۔

یہ خبریں پڑھ کر شخصِ مذکور مزید حیران اور پریشان ہو گیا۔ وہ کٹے ہوئے سر کو دھڑ سے اور عضوِ تناسل کو رانوں کے بیچ میں جوڑ کر پورا آدمی بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر وہ غور کرنے لگا کہ خوف کے باعث، یا تکلیف کے باعث، یہ عضوِ تناسل پورا تنا ہوا ہے یا کمھلایا ہوا اور ایک جانب ڈھلکا ہوا ہے جیسے فوطوں پر آرام کر رہا ہو۔ اس نے لاش کو پلٹا اور دیکھا کہ سر کٹے کی پشت پر کوئی زخم نہیں ہے۔ دونوں سرینوں کے درمیاں جہاں کولہے کی ہڈیوں کا جوڑ ہوتا ہے، وہیں سر کٹے کی ریڑھ کی ہڈی کا آخری نچلا سرا تھا۔ اُس نے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا ریڑھ کی ہڈی پر پھیر کر استخوانی زنجیر کی آخری کڑی کو اچھی طرح محسوس کیا۔ کہتے ہیں (شخصِ مذکور کو خیال آیا) کہ یہاں آدمی کی تمام قوت پوشیدہ اور خفتہ ہوتی ہے۔ پرانے زمانوں میں ہندوستانی ماہروں کا ایسا ہی خیال تھا۔ کہتے تھے کہ تپسیا یا مراقبے کے ذریعے یہ

قوت حکانے پر آدمی محیرالعقول طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یا تو وہ ولی بن جاتا ہے یا شیطان ـــــ واللہ اعلم!"

دوسری خبریں یہ تھیں کہ بوریوں میں بند کچھ لاشوں کے ٹکڑے ملے ہیں۔ دن بھر بوریوں میں بند رہنے کی وجہ سے لاشیں یا ان کے ٹکڑے کھس کھا گئے تھے۔ گوشت بالکل گُرجھا گیا تھا۔ شخص مذکور ٹکڑے جوڑ جوڑ کر آدمی بنانے لگا۔ کچھ ٹکڑے سانولے اور کچھ گندمی رنگ کے تھے۔ آخر اکتا کر اُس نے گندمی رنگ کے بُریدہ اعضا سیاہی مائل دھڑ کے ساتھ جوڑنے شروع کر دیے۔ پھر اس نے بازوؤں کی جگہ ٹانگیں اور ٹانگوں کی جگہ گردن یا کلائی لگا دی۔ پھر وہ اس کھیل سے اُوب گیا اور لاشوں کے ٹکڑوں کو واپس بوری میں بھر دیا۔

اب وہ پولیس کانسٹیبلوں کی لاشوں کی طرف آیا۔ وہ مونچھ دار پولیس والے اپنی وردیوں میں مرے پڑے تھے۔ دونوں کا سن تیس پینتیس سے کم تھا۔ اس نے ایک پولیس والے کی وردی اتارنی شروع کی۔ پہلے قمیص پتلون سے کھینچ کر باہر نکالی۔ پھر بٹن کھولے اور لاش کے سرہانے بیٹھ کر قمیص کو کھینچ کر سر سے اتار لیا۔ اندر سے ایک میلی سفید بنیان برآمد ہوئی۔ پسینے میں بھیگی اور خون سے داغدار بنیان اس نے ذرا کراہت سے کھینچ کر اتاری۔ پھر اس نے پتلون کی پیٹی کھولی۔ اب وہ لاش کی پائنتی کی طرف بیٹھا تھا۔ اس نے جوتوں کے فیتے کھولے، پھر جوتے اتارے۔ پولیس والے کے پیروں میں موزے بھی تھے۔ موزے اتار کر اس نے ایک طرف ڈال دیے اور باری باری دونوں ٹانگوں سے پتلون کے پائنچے کھینچ کر اتار دیے۔ اب لاش صرف ایک جانگیا پہنے پڑی تھی۔ شخص مذکور نے ایک کونے میں جا کر منہ چھپا لیا اور خوب ہنسا ـــــ اس نے طے کیا کہ وہ اس لاش کا جانگیا نہیں اتارے گا۔

اس نے جیب سے استرا نکال کر لاش کی مونچھیں مونڈ دیں۔ اب یہ لاش کسی بھی تیس پینتیس برس کے مرد کی لاش لگ رہی تھی۔ پھر وہ اندھیرے میں لاش کو اپنے کندھے پر ڈال کر تاریک کوٹھری سے نکلا اور ایک پیلی ٹیکسی میں پیچیدہ راستوں سے گزرتا ہوا اُس کئی منزلہ عمارت تک جا پہنچا جہاں پختہ فرش پر ایک نوجوان کی لاش پڑی تھی۔

شخص مذکور نے ننگی لاش زمین پر رکھی اور بالائی منزل سے گرنے والے کی لاش کندھوں پر اٹھا لی۔ یہ کام اس نے اتنی پھرتی اور مشاقی سے کیا کہ لاش پر ماتم کرنے والوں کو لاش کے بدل جانے کا پتا بھی نہ چل پایا۔ وہ اسی طرح سر پر خاک ڈالتے، سینے پر دوہتڑ مارتے، روتے اور بَین کرتے رہے۔

شخص مذکور ہڈیاں ٹوٹی لاش کاندھے پر ڈالے برق رفتاری سے اندھیری کوٹھری میں پہنچا۔ وہاں کئی دوسرے پولیس والے آ چکے تھے۔ انھوں نے اس سے پوچھا "کون ہو تم؟"

شخص مذکور نے بلاتامل جواب دیا "میں یہاں کا چوکیدار ہوں سر!"

"اچھا"، ایک پولیس والا بولا، "تو پھر تم بتاؤ ـــــ یہاں ہم نے دو کانسٹیبلوں کی لاشیں رکھی تھیں، اب صرف ایک ہے۔ دوسری لاش کہاں گئی؟"

یہ رہی سر، شخص مذکور نے کاندھے پر رکھی لاش زمین پر آہستہ سے لٹا دی۔

مگر اس کے کپڑے؟ انھوں نے اعتراض کیا۔

آیئے ہم اسے وردی پہناتے ہیں، اس نے جلدی سے کہا۔ وہ اس قدر مستعدی اور توجہ سے لاش کو کپڑے پہنانے میں منہمک ہو گیا تھا کہ پولیس والے چوں و چرا نہ کر سکے اور خود بھی وردی پہنانے اور جوتوں کے فیتے باندھنے میں اس کی مدد کرنے لگے۔ ہڈیاں ٹوٹی لاش وردی پہننے کے بعد بالکل پولیس والے کی لاش لگنے لگی۔ دوسرے پولیس والے اسے زخمی تعظیم سے اٹھا کر لے گئے۔

شخص مذکور تھوڑی دیر خاموش کھڑا رہا ــــ پھر رانوں پر ہاتھ مار مار کر اس قدر ہنسا کہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ حالاں کہ وہ ڈر رہا تھا اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے ہنسنے کی آواز بلند نہ ہو، مگر یہ خیال کہ اس نے ماتم کرنے والوں میں کھیلا کر دیا ہے، اسے ہنسی سے دیوانہ کیے دے رہا تھا۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ کئی منزلہ عمارت سے پھینکا جانے والا نوجوان تو مہاجر ہو گا ــــ اردو اسپیکنگ[1] ــــ اور یہ دوسری لاش نہ جانے کس کی تھی۔ کہیں پہچان نہ لی جائے۔ یہ خیال آتے ہی وہ چونک گیا اور کچھ بے چین ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی وہ اپنے تردد کی حماقت پر ہنسا اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ لاشیں بول نہیں سکتیں، اس لیے مرے ہوئے آدمی کے بارے میں سرِ مو اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ پنجابی تھا، سندھی تھا یا ــــ اردو اسپیکنگ۔

شخص مذکور اپنے کامیاب کھیل پر خوش ہو کر ہندوستانی فلم ری وائنڈ کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اصل زندگی بالکل ہندوستانی فلم جیسی ہی ہے، بلکہ اسی کی طرح کسی بار کی دیکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اتنے میں بجلی چلی گئی۔ وی سی آر کھٹاک سے رک گیا اور پنکھا بھی بند ہو گیا۔ شخص مذکور اخبار سے پنکھا جھلنے لگا۔ اخبار میں بس اسی طرح کی خبریں تھیں۔ اداریہ بھی اسی موضوع پر تھا کہ کراچی خون میں نہا رہا ہے۔ اس نے ایسا سر پیٹ لیا۔ بھاڑ میں جائے کراچی ــــ کیا دنیا میں اور کچھ بھی نہیں ہو رہا؟

وہ دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر اس نے پوری دلجمعی کے ساتھ آہستہ آہستہ یہ الفاظ اپنے منہ سے ادا کیے

کھڑکی ــــ کی ــــ جالی ــــ پھٹ ــــ گئی ــــ ہے۔

سڑک ــــ پر ــــ ایک ــــ بلی ــــ جا ــــ رہی ــــ ہے۔

پردہ ــــ ہوا ــــ سے ــــ ہل ــــ رہا ــــ ہے۔

میری ــــ فاختہ ــــ نے ــــ دو ــــ دن ــــ سے ــــ باجرا ــــ نہیں ــــ کھایا۔

لیکن وہ زیادہ دیر تک یہ جملے دہرا نہیں سکا۔ وہ واپس سونے کے کمرے میں آ گیا اور کتابوں کے طاق پر نظر دوڑانے لگا۔ اس نے اپنے لیے ہندوستانی تاریخ کی ایک کتاب چھانٹی، کیوں کہ وہ کوئی ایسی کتاب پڑھنا چاہتا تھا جس کا کراچی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اسے یقین تھا کہ کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے، کم از کم تاریخ کا تو

اس سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

بستر پر نیم دراز، تکیے کا سہارا لیے، رومال سے پسینا پونچھتے ہوئے وہ کتاب پڑھنے لگا۔ کسی انگریز مورخ کی تحریر تھی۔ اس نے کتاب جہاں سے کھولی تھی، اتفاق سے وہ کتاب کا ساتواں باب بنگال میں انگریز تھا۔

مغلوں کے دور میں ـــــ کتاب میں لکھا تھا ـــــ ہندوستانی کسان اُس زمانے کے یوروپی کسانوں سے بعض اعتبار سے بہتر حالت میں تھے۔ اچھا؟ شخص مذکور نے آنکھیں مل کر تعجب سے یہ سطریں دوبارہ پڑھیں۔ آگے لکھا تھا ان کے پاس کھانے کے لیے خوراک اُس زمانے کے یوروپی کسانوں سے زیادہ مقدار میں ہوا کرتی تھی۔

اٹھارھویں صدی کے آغاز میں بنگال کے صدی نواب سراج الدولہ نے کمپنی بہادر کو کلکتے سے نکال دیا۔ کلائیو مدراس سے بھاری فوج لے کر آوارد ہوا اور ۱۷۵۷ میں اس نے کلکتہ دوبارہ فتح کر کے میر جعفر کو تخت پر بٹھا دیا۔

اور یہاں ـــــ کتاب میں درج تھا ـــــ ہم کلائیو کی شخصیت کا دوسرا روپ دیکھتے ہیں۔ کریلا جنگ کا قابل رہنما، باصلاحیت سفارت کار، موقع ملنے پر لٹیرا بھی ثابت ہوا کلائیو نے اور کمپنی بہادر کے اہلکاروں نے میدان صاف پا کر خوش حال بنگال کا خون نچوڑنا شروع کر دیا۔ وہ صرف خزانہ ہی نہیں خالی کر رہے تھے، وہ دیہات کو بھی لوٹ رہے تھے۔ چند ہی برسوں میں بنگال برباد ہو چکا تھا اور کمپنی بہادر، اہلکاروں کی بے راہ روی کے باعث، دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی

تو پھر آئے وارن ہیسٹنگز۔ اب دیکھیے کہ ہیسٹنگز میں بھی نہایت اعلیٰ صلاحیتیں تھیں، مگر کیا ہوا کہ رفتہ رفتہ ان کے مزاج میں تلخی آ گئی۔ وہ نندکمار کے قانونی قتل میں برابر کے شریک رہے، بنارس کے راجا کو بہت تنگ کیا اور اودھ کی بیگمات کو ہراساں کرتے رہے۔ ان شکایتوں پر ان کے حریفوں کی بن آئی اور انھیں برطرف کر دیا گیا

پسینا پونچھتے پونچھتے شخصِ مذکور نے شدید غم و غصہ محسوس کیا۔ اس نے دل ہی دل میں کلائیو اور ہیسٹنگز کو گالیاں دیں ـــــ حرام زادے کتے کے بچے انھیں کیا حق پہنچتا تھا کیا حق لیکن وہ اس گرم کمرے میں رکھی سر کٹی لاش کا کیا کرے، یہ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

پسینا بہہ بہہ کر اس کی گردن سے قمیص کے اندر ٹپک رہا تھا۔ اچانک ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ اور پھر وہ بے تحاشا ہنسنے لگا۔ سر کٹے کا عضوِ تناسل بھی کٹا ہوا تھا۔ اس نے بےساختہ زانو پر ہاتھ مارا واہ استاد! یہ تو تم نے لاجواب کام کر دیا ـــــ سر کٹی اور عضوِ تناسل کٹی لاش! یہ تو بیچ مچ کا گھپلا تھا۔ آناً فاناً شخصِ مذکور نے لاش کو کاندھے پر ڈالا اور سرحد کی جانب چل پڑا۔

سرحد پر تعینات افسران نے اس سے پوچھا آپ اس سر کٹی لاش کو کہاں لے جا رہے ہیں؟ شخصِ مذکور ہنسی چھپا کر ہنسنے لگا۔ پھر اس نے کہا سرحدیار لوگوں کو الو بنانے۔ بھی دیکھیے

وہاں ہندو مسلمان کی پہچان بھی (ہاتھ سے کٹی ہوئی جگہ پر اشارہ کر کے) تو ہوتی ہے۔ پجامے کھول کھول کر دیکھنے میں بھی پجامے کھول کھول کر ۔۔۔ تو آپ آپ دیکھیے گا۔ ہندو مسلمان سکھ، تینوں کو الو بناؤں گا۔ ذرا اس لاش کو دیکھیے ۔۔۔ اس کا وہ ہی نہیں ہے! تو اب یہ ہے کیا؟ بس بالوں بھرا ایک سانولا سا لق ہندوستانی ۔۔۔ یعنی اب تو ہندوستان یا پاکستان بنگلہ دیش ہے نا ۔۔۔ تو ہم ہم اسے نندکمار کی لاش بھی ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ ذرا دیکھتے تو جائیے۔ خدا قسم وہ مزہ آئے گا کہ ہنستے ہنستے ہم پاگل نہ ہو جائیں تو میں مونچھ منڈا دوں گا۔ شخصِ مذکور نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا جو پسینے سے بھیگ کر اس کے ہونٹوں پر چپکی جا رہی تھیں۔

نندکمار؟ افسران نے حیرت سے پوچھا۔ وہ کون ہے؟

شخصِ مذکور نہیں جانتا تھا کہ نندکمار کون تھا اور وارن ہیسٹنگز اس کے قانونی قتل میں کیوں شریکِ کار رہا۔ انگریز مورخ نے یہ تفصیل نہیں لکھی تھی۔

اُس نے اُلجھ کر کہا ہوگا کوئی ۔۔۔ آپ کو اس سے کیا؟

سرحد پر تعینات افسران نے متانت سے کہا

آپ سرحد پار کے معاملات میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا۔ آپ کے نیک جذبات بہرحال اپنے وطن، اپنی قومیت، اپنی قوم پرستی کے حق میں تھے۔ لیکن اس طرف قدم رکھتے ہی آپ کی قوم پرستی، حب الوطنی اور قومی وفاداری پر فی الفور آنچ آ جائے گی۔

اب کی بار شخصِ مذکور ہنسا نہیں ۔۔۔ وہ رونے لگا۔ سر کٹے کے کٹے ہوئے، گم شدہ عضو کی جگہ پر ہاتھ پھیر کر اس نے کہا۔ یہ کہاں گم ہو گیا؟

ایک کھمبے کے سہارے نہ جانے کب سے ایستادہ، قوم، قومیت، قوم پرستی، قوام یا قمقمہ نامی، روئی کی وہ قدِ آدم گڑیا جس کے سفید دھاگے سے ٹنک پارے جیسی سیاہ آنکھیں اور سُرخ شہوت بھرے ہونٹ کڑھے تھے، جس کی روئی ٹھنسی بے تحاشا اُبھری ہوئی لذت خیز چھاتیوں کی سُرخ بھٹیوں سے وی سی آروں، فرجوں اور ایئر کنڈیشنروں اور پجیرو گاڑیوں کے دودھیا دھارے بہہ رہے تھے، اور جو کثرتِ استعمال سے سرینوں کے پاس بے طرح پھٹ گئی تھی اور ان چاکوں سے روئی نکل نکل کر زمین پر گر رہی تھی، اچانک شخصِ مذکور پر آ گری۔

شخصِ مذکور اچانک قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس نے گڑیا کے سیاہ دھاگوں سے بنے اُلجھے بالوں کا گچھا جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

تُو بتا سالی ۔۔۔ زنا بالجبر ہوا تھا کہ نہیں؟

***

کراچی میں کیا ہو رہا ہے (۱)

پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہم ایک مسلح آمرانہ نظام کے غیر مسلح، عوامی گروہوں کے نمائندہ جمہوری نظام میں تبدیل کیے جانے کی کوشش کے انتہائی تکلیف دہ، پرپیچ اور ناہموار رہانے کا نظارہ کر رہے ہیں؟ جب کہ پرانے نظام کے ستون لڑکھڑا کر ہمارے سروں پر گر رہے ہیں اور ہم گردن تک اور بکھاڑ ملبے میں دفن ہو رہے ہیں۔ جب کہ ماضی حال اور مستقبل کے طاقت ور ہاتھ معاشرے کو بےدردی سے ایسی ایسی طرف کھینچ رہے ہیں، جھنجھوڑ رہے ہیں، جیسے گرجتی ہوئی طوفانی ہوائیں کسی تناور درخت کو جھنجھوڑ کر جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔

اس جان لیوا کش مکش میں جیت کس کی ہوگی؟ کیا ان جمہوری رجحانات کی جو بے حد کمزور ہیں، جو ایک وقت کسی نورائیدہ بچے کی مانند بےطاقت اور کسی گرم و سرد رہانہ چشیدہ بڈھے کی طرح کریٹ میں؟ یا ماضی کا سر برآوردہ، فربہ عضلات والا آہنی ہاتھ ان پر غالب آجائے گا؟

خیالوں کی اڑان میں ایک خاموش، سرد، طویل رات میں بستر میں کروٹیں بدلتی عورت نے سوچا تھا۔ اور اس سمت سے دور، بالکل لاتعلق ایک آدمی ۔۔۔ پوری عمر کا آدمی ۔۔۔ رو رہا تھا۔

ارے! وہ حیران رہ گئی تھی۔ رو کیوں رہے ہیں؟

کچھ نہیں اس نے سرخ آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

اتنی اتنی بےروزگاری ہے

کیا؟ اس نے سونیکا سو کر کہا تھا۔

اور پھر وہ ایک نیند میں ڈوب گئی تھی، اور اس نے ایک بہت بڑے، گراں ڈیل، تیل کی سیاہ کیچڑ میں لتھڑے، بھاری پہیے کو حرکت کرتے دیکھا تھا جو آہستہ آہستہ نہ جانے کس طرف جا رہا تھا؛ اور جس کے نیچے ان گنت آدمیوں کی ہڈیاں پس رہی تھیں، کھوپڑیاں پھٹ کر مغز ابل رہے تھے، خون کے فوارے کالی کیچڑ میں ملتے جا رہے تھے؛ بازو، ٹانگیں، دھڑ، کٹ کٹ کر پہیے کے راستے کے ادھر ادھر پھسل رہے تھے۔

یہ کون لوگ ہیں؟ اس نے خواب میں کہا تھا، اور سوچا تھا کہ اس کے وطن میں ماضی، حال اور مستقبل کے ہاتھ کیا تین مختلف ہاتھ ہیں؟ یا یہ ایک ہی ہاتھ ہے جو وقت کے تین مقامات سے کسی طلسم کے طور پر نمودار ہو رہا ہے۔

***

کے سے کسور نوں نئیں پھڑ رہے، چودھری اکرام نے دردمندی سے کہا۔ اماں دا ایہا دھندا اوی ایہو ای سی۔ جسم دے مارک حصاں تے ڈرل کرنا، اکھاں تے دند کڈھ لینا۔ ایہو سب کم ایہہ کردے س۔ اماں دی ایسی دوائی دا اکو ڈور دے رئے آں، مور کجھ نئیں کر رہے بادشاہو!

پر چودھری صاب ایہہ تے باقاعدہ سیاسی تنظیم اے ایس دا ماس میں اماں دے مال مذاکرات

اووی کراں گے، خاطر جمع رکھو، انھوں نے دل جمعی سے تسلی دی۔

مذاکرات؟

آہو، کیوں نہیں کراں گے؟ او سی کجھ تسلی تے رکھو!

تے ایہہ لوکی

آہو آہو، ایسے ای تے مُنڈے میں ایہہ سب۔ بس برین واش کر دتا گیا اے۔ تے بالے مُس انڈیا دے پھندے وچ آ گئے میں۔ ضرور کراں گے مذاکرات اماں دے مال۔ پر ساڈھی پوریشن سٹرانگ ہونی چاہیدی اے ماں۔ اماں دا ملی ٹیسٹ وِکٹ ختم ہو جاوے تے فیر مذاکرات وی ہوں گے۔

سچا! سوال کرنے والوں نے امید بھری نظریں چودھری صاحب کے چہرے پر لگا دیں۔ پھر کجھ خیال آنے پر وہ روتی دھوتی آواز میں چوں چرا کرنے لگے۔

پر ویکھو ماں ایہہ گلاں تے تسیں شاید ہمیشہ توں کردے آئے او۔ اوہ جیہڑے ایسٹ پاکستان وچ سراراں، لکھاں قتل کیتے گئے س اووی تے ساڈے ایسے ای سدے س۔ بس برین واش ہو گئے س، تے فیر فیر انڈیا دے پھندے وچ آ گئے س فیر بلوچستان وچ پہاڑاں اتے بمباری کیتی گئی سی۔ ایس توں پہلے کئی بلوچ لیڈراں نوں پھانسی دے دتی گئی سی تے فیر ایہہ سب ایہہ وہ حرحرائے۔

ایسٹ پاکستان وچ تے ہندواں نے وڈی سازش کیتی سی۔ تے بلوچ سرداراں دا وی دماغ خراب کر دتا گیا سی۔ علیحدگی پسند ہو گئے س سب۔ تے باہروں امداد وی آوندی سی۔

یہ سن کر وہ سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ باہروں امداد؟ آخر دنیا ساڈی دشمن کیوں ہو گئی اے؟ روس ساڈا دشمن۔ انڈیا تے ہے ای دشمن۔ چین تے امریکہ دوست میں، تے او تاریخ دے زیادہ تر حصے وچ اک دوجے دے دشمن۔ عرب ساڈا ساتھ نئیں دیندے۔ وقت پوے تے امریکہ مدد نئیں کردا۔ تے ایسے وطن آلے واری واری پاگل پن دا شکار ہو جاندے میں۔ ساڈے دشمن اماں دی خفیہ امداد کردے میں۔ آخر کیوں؟ اساں دنیا دا کیہہ لگاڑیا اے؟

یہ سن کر چودھری صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ انھوں نے آہ بھر کر کہا سچ کہندے او یارو۔ او کیا سوہنا تے پروقت کہیا سی غالب نے یارب زمانہ مینوں مٹاوندا اے کیس لئی۔ ایس لوحِ جہاں دی میں تکا ہوئی کیوں نہ کر دیاں

***

کراچی میں کیا ہو رہا ہے (۲)

لیاقت آباد کی ایک بلند و بالا، کئی منزلہ عمارت کی آڑ سے پیلا ماہتاب نکلا۔ (واہ! اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب! اسرار الحق مجاز یاد آ رہے ہیں۔) یہی ماہتاب، کچے سونے کا سا، بادلوں کے سفید ٹکڑوں سے آنکھ مچولی کھیلتا، معصوم نگاہوں سے سارے شہر کو دیکھ رہا ہے۔

اس دن اس عمارت میں پانچ (یا چھ، یا سات؟) مسلح افراد نے گھس کر اکٹھے دس قتل کیے تھے۔ یہ قتل کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے اُس شعبے کے دفتر میں ہوئے تھے جو جائیدادوں کی فروخت اور مالکوں کی تبدیلی وغیرہ کا اندراج کرتا ہے اور جائیدادوں کے ٹیکس وصول کرتا ہے۔ شعبۂ ہذا میں دس افراد تڑ تڑ تڑ آناً فاناً مقتول ہو گئے۔

کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا (قوالی)۔

جائیدادیں مکانات دکانیں محل دو محلے مٹی، گارا، اینٹیں، پتھر زمین زمین۔
زمین کے بیٹے زمین کے بھائی زمین کے باپ، معشوق، گاہک دلال زمین کے چچا، بھتیجے
زمین کے ماموں زمین کے مالک زمینوں کے مالک صاحبِ جائیداد

رات کو قومی ٹیلی وژن پر کہا گیا کہ یہ تو معتوب لسانی تنظیم کی کارستانی ہے۔ بلکہ شام ہی کے اخباروں میں چشم دید گواہوں کی زبانی قاتلوں میں سے چند کے نام بھی شائع ہو گئے جنہیں اخباروں میں شائع شدہ (داخل شدہ؟) خبر کے مطابق علاقے کے دکان داروں نے پہچان لیا تھا۔

بہتے ہوئے آنسو تھم نہ سکے، کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا (قوالی)۔

یہ قتل کس نے کیے؟

کیا قومی ٹیلی وژن کی خبر درست ہے؟ کیا علاقے میں تنظیمِ ہذا کے لڑکوں نے بھتا وصول نہ ہونے کے باعث یہ قتل کیے؟

ایسا ہونا عین ممکن ہے۔ حالاں کہ مورچوں میں آنے کے بعد سے تنظیم ہذا کے لڑکے زیادہ تر دفاعی لڑائی لڑے ہیں۔ مگر اس طویل عرصے میں غیر حل شدہ مسئلے کی معروضی صورت حال ایک کایا کلپ سے بھی گزر چکی ہے۔ شہر کے علاقوں کے خالص مقامی گروہی مفادات، اور قتل در قتل در قتل کے باعث ذاتی انتقامی جذبات بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ قتل بھتا نہ دینے کی سزا ہوں۔

عین ممکن اور بھی بہت کچھ ہے۔ جیسا کہ سڑک پر ایک سنکی اُدھڑوٹ نے اول فول بکتے ہوئے کہا

کہ اماں سوئی کی دوا کرو! اگر وہ قاتل ایسے ہی زور آور ہیں تو دہشت نہیں ہو گی ان کی؟ اسی علاقے کے دکانداروں نے موقعے پر نام بھی بتلا دیے؟ اور وہ کیا کہتے ہیں کہ اخباروں میں بھی آ گئے؟ شام کی شام؟ آئیں؟ میاں یہ گولیاں کسی اَور کو دینا ہم بھی گندم کھاتے ہیں

تو پھر یہ قتل کس نے کیسے ہو سکتے ہیں؟

اُس دن کراچی میں کل اٹھارہ قتل ہوئے تھے۔

***

آسمان کتنا حسین ہے، اور چاند کس قدر خوب صورت! لہٰذا فٹ پاتھ پر ایک پاگل، یا نیم پاگل، یا پاگل ہوتے ہوئے آدمی نے چاند کو بڑی دیر تک بہت غور سے دیکھا۔ نظر اٹھا کر ہر طرف دیکھیں تو کراچی آپ کو ایک پاگل، جنونی عورت سا نظر آئے گا جس کے بال منہ پر بکھرے ہوئے ہیں اور جس نے منہ پر خون مَل لیا ہے اور جو چاند کی طرف منہ اٹھائے کسی مادہ بھیڑیے کی طرح چنگھاڑ رہی ہے۔ مگر اس پاگل، یا نیم پاگل، یا پاگل ہوتے ہوئے بوڑھے نے نظر اٹھا کر چار طرف نہ دیکھا بلکہ اپنی نظریں مضبوطی سے چاند پر جمائے رکھیں۔ سنہرا ماہتاب آسمان کی گہری نیلی، دوات میں بھری روشنائی کے رنگ کی وسعتوں میں تیر رہا تھا۔ اتنے خطرناک حالات میں بھی، چاند کے بلند ہوتے ہی، جب رات ٹھیک چلی، بوڑھا فٹ پاتھ پر کیوں؟ دراصل اس کے پاس جانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یعنی یہ رہتے ہی یہاں ہیں۔ آپ انھیں نہیں جانتے، مگر میں جانتی ہوں۔ ان کا نام رئیس میاں ہے۔ طارق روڈ کے بالکل عقب میں جو بازار ہے، جہاں سوئی سے لے کر بکرے تک فروخت ہوتے ہیں، وہیں یہ ایک ریڑھی پر پلاسٹک کے برتن اور کھلونے بیچتے ہیں۔ صبح کے وقت یہیں سجاد پہلوان کی دکان پر ناشتہ کر لیتے ہیں۔ ایک جمعے کی بَرفراغت صبح، سجاد پہلوان کی دکان سے بچوں کے لیے حلوہ پوری بندھواتے ہوئے میری ان سے بات چیت ہوئی تھی۔

پتا چلا کہ رئیس میاں سابق مشرقی پاکستان سے آئے ہیں (جہاں وہ گورکھ پور، مشرقی یوپی سے گئے تھے)۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان کے تمام رشتے دار، بیوی، بیٹے، بہو، پوتے پوتیاں، وہیں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (کیوں؟ کیسے؟ یہ سب پوچھنے کا تو موقع نہ تھا۔) سو وہ سر پر میلی دوپلی ٹوپی منڈھے اور کھلے پائنچوں کا پاجامہ کرتا پہنے، ایک اکیلی جان ہی کراچی وارد ہوئے، اور اب اپنی ریڑھی ہی پر رہتے ہیں۔

لہٰذا اس رات بھی سنسان گلی میں، جب تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں اور کتنے ملیاں بھی مٹھائی کے دونے چاٹ کر ادھر اُدھر سو چکے تھے اور بازار میں تبدیل ہو جانے والے اس سابقہ رہائشی علاقے کی، تجاوزات کی بھرمار سے نہایت تنگ اور پُرپیچ گلیوں میں باقی بچے بالائی منزل کے مکانوں کی بتیاں نہ جانے کب کی گُل ہو چکی تھیں، بوڑھا اپنی ریڑھی پر پیر پسار کر لیٹ گیا اور میلے بازار پر کبھی کے تعال

سے، یکتے رہی ماہتاب کو دیکھتا رہا، یہاں تک کہ سنہری چاندنی اس کی بوڑھی آنکھوں میں تحلیل ہو گئی اور وہ کبھی بند ہو گیا۔

تب اسے علم ہوا کہ دراصل چاندنی اس کی آنکھوں میں نہیں کھلی بلکہ وہ خود چاندنی میں تحلیل ہو گیا ہے اور ایک ایسے مقام پر ہے جہاں ہر طرف ٹھنڈی، دلکش سنہری روشنی پھیلی ہے۔ وہ ایک بہت بڑے لق و دق میدان میں کھڑا ہے۔ دور دور تک سنہری زمین پھیلی ہے۔

کیا یہ کراچی ہے؟ رئیس میاں نے مدھم سانسیں لیتے ہوئے پوچھا۔

فضا میں پروں کی ہلکی پھڑپھڑاہٹ نے ان کو جواب دیا ہاں، یہ کراچی ہے ـــــ آج کا کراچی، جو کل کا کراچی ہے گا۔

بوڑھے نے آنکھوں پر زور ڈال کر پہچاننے کی کوشش کی، لیکن طویل و عریض میدان دوسرے میدانوں میں پھیلنے لگے۔ رئیس میاں کو محسوس ہوا کہ وہ کسی آواز سے تیز رفتار برقی سواری میں فاصلوں پر سے گزر رہے ہیں اور کہیں کہیں پہچان پا رہے ہیں کہ وہ ضلع ملیر سے لانڈھی، کورنگی، گُزری، نارتھ کراچی، گلشن، سبزی منڈی سے گزر رہے ہیں جہاں چاندنی کے میدان در میدان خالی پڑے ہیں۔ آخر ایک سنہرے میدان میں اُن کا را کٹ رک گیا۔ سفید براق سے اسپ تازی کو رئیس میاں نے ایک آہنی میخ سے باندھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ میدان کے ہر دو کناروں پر چند جھونپڑیاں سی ہوئی ہیں۔

رئیس میاں نے پاس جا کر دیکھا۔ یہاں طبقۂ اُمات میں سے کوئی نہ تھا۔ صرف مسلح مرد تھے۔

آپ کون ہیں؟ رئیس میاں نے لجاجت سے استفسار کیا۔ ان میں سے ایک نے سرخ آنکھوں سے انہیں گھورا اور بیٹھی ہوئی آواز میں کہا تم سے مطلب؟ پھر اُس نے دھمکایا اپنا راستا لے بڈھے!

تبھی پولیس کی ایک جیپ وہاں آ کر رکی۔ جیپ میں سوار پولیس افسر نے شترمرغ کی طرح گردن لمبی کر کے جھانکا اور شفقت سے جھونپڑی کے مکینوں سے مخاطب ہو کر کہا کیوں بھئی، ٹھیک ٹھاک تو ہو نا؟

جی سائب، بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ کا کرم ہے جناب! جواب ملا۔

ٹھیک ہے تو پھر ہم چلتے ہیں۔ کوئی پریشان کرنے کی کوشش کرے تو ہمیں بتانا۔ اس کے بعد جیپ دھول اڑاتی اسٹارٹ ہوئی اور فراٹے بھرتی شہر کے بارونق علاقوں میں جا پہنچی۔ پھر وہ کئی جیپوں میں بدل گئی اور کئی پُرتمکین عمارتوں کے سامنے رُکی جہاں باوقار تعمیراتی اور دیگر کاروباری اداروں کے بورڈ لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی پر بھی قبضہ گروپ یا لینڈ گریبر ایسوسی ایٹس کے نام کی تختی آویزاں نہیں تھی، مگر نام میں کیا رکھا ہے! تعاون کو مانا نہ تو یہ ادارے کسی بھی مد میں دے سکتے ہیں۔

زمینوں پر قبضہ اس طرح بھی کیا جا رہا ہے۔ زمین کے ٹکڑے کی آؤٹ پوسٹ پر مسلح افراد کی

جھونپڑیاں بنوا دی جاتی ہیں۔ قبضہ کرنے والے مالدار اور طاقتور افراد ہیں جو تنخواہ دار مسلح افراد تعینات کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

کون لوگ زمینوں پر قبضہ کر رہے ہیں؟ عورت نے اُلٹی سانسوں کے ساتھ آہستہ سے پوچھا۔
اُس رات پہلے ماہتاب کو تکتے ہوئے وہ پھر ہوائی جہاز میں جا بیٹھی تھی جہاں اُس نے ایک انوکھی اسٹوریو دیا تھا اور اس سوال کو صدیاں کی طرح دُہرایا تھا کہ کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟ لیکن اب یہ جہاز لندن جانے کے بجائے چاند کی طرف اُڑا جا رہا تھا، اور چاند پر پہنچ چکا تھا۔
اُسے یہیں سے لگا کر جواب دینے والے بوڑھے نے، جو شاید خدا تھا، اس سے کہا
قبضہ کرنے کے لیے قوت بازو استعمال کرنے والے ہتھیار بند معمولی حیثیت کے لوگ ہیں۔ یہ قتل کرنے اور قتل ہو جانے پر آمادہ ہیں۔ یہ کروڑوں روپے نہیں کماتے، مگر رقم ان کو بھی خاصی ملتی ہے۔

کیا یہ کراچی کے لوگ ہیں؟ عورت نے پوچھا۔
اب تو کراچی کے ہیں، بوڑھے نے آنکھیں مچکاتے ہوئے کہا۔ الگ الگ علاقوں میں الگ الگ قبضہ گروپ کام کر رہے ہیں ــــ ماڑی پور میں بلوچ ہیں، کورنگی اور مہاجر کیمپ میں (حیران نہ ہونا) بنگالی یہ کام کر رہے ہیں۔ جہاں جہاں ان کا تسلط ہے وہاں ایم کیو ایم حقیقی یا الطاف بھائی کا نام لینے والے مصروف کار ہیں۔
ہُوں عورت نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی سندھی نہیں ہیں قبضہ گروپ میں؟
بوڑھا ہنسا۔ (کیا وہ خدا تھا؟) ہیں تو سہی اس نے کہا۔ گلشن اقبال سے گلستانِ جوہر تک قبضہ گروپوں میں مخلوط لوگ ہیں پنجابی ہیں، پٹھان ہیں، اور ان میں سندھی بھی ہیں۔ وہ اس دھندے میں آہستہ آہستہ شامل ہو رہے ہیں۔ وہ پھر ہولے سے ہنسا۔

تو کراچی میں یہ بھی ہو رہا ہے؟ عورت نے چاند پر استقامت سے نظریں جما کر کہا۔
ہاں، یہ بھی، کسی نے جواب دیا۔ کہیں زیادہ سفاکی کے ساتھ کیوں کہ افراتفری اور سیاسی بدامنی کے زمانے میں سرواردات سیاسی مخالف گروہ کے سر آسانی سے تھوپی جاسکتی ہے
پھر ڈرگ مافیا ہے جو غیر ممنوعہ ہتھیاروں کی فروخت کا کام بھی کر رہا ہے، بڑے میاں نے کہا۔
ہُوں عورت اب پھر ایک دوسرے زمانے میں جا پہنچی۔
جوانی امیر نگری اور قصبہ کالونی میں پٹھان مہاجر فسادات سے کراچی خون میں نہا گیا ہے۔ یہ ٹکراؤ لسانی صرف دکھائی دے رہا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈرگ مافیا

نے پورے شہر کو یرغمال بنا لیا ہو، کیوں کہ بعض واقعات اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔
اس طرح کی تین رپورٹیں وہ اُس انگریزی اخبار کو بھیج چکی ہے جس میں ان دنوں وہ کام کر رہی ہے۔ چوتھے دن ٹیلی فون پر دور، بہت دور سے اخبار کے ایڈیٹر کی آواز
بی بی، آپ یہ لفظ ڈرگ مافیا اب نہ لکھیے۔
کیوں کیوں ایڈیٹر صاحب؟ اس کی حیرت
بھئی یہ پشاور سے ڈرگ مافیا سے لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ پٹھانوں کو قصوروار ٹھہرا رہی ہیں۔
خاموشی اس کے ہاتھ میں ٹیلی فون کا پلاسٹک کا ٹھنڈا ریسیور
سمجھ گئیں نا بی بی؟
ہتھیار اور منشیات شہر کی شہ رگ میں رواں پیسا، بہت زیادہ پیسا کروڑ؟ دس کروڑ؟ یہ تو معمولی رقمیں ہیں۔ اس سے بہت زیادہ۔ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو کچلنے کے لیے ہتھیار جو فروخت بھی ہوتے ہیں۔
کیسی رکاوٹ؟ جب کہ یہ روزِ محشر ہے اور عالم لگا بھی۔ اور جب کہ کل سورج کے طلوع ہونے کا کسی کو یقین نہیں اور آج جتنا پیسا بنایا جا سکتا ہے وہ بنانا لازمی ہے۔ ہتھیاروں سے لدے ہوئے ٹرک علاقہ غیر سے سفر کی ابتدا کرتے اور چاندی کی چھتر چھایا میں پورے صوبہ سرحد، پورے صوبہ پنجاب اور پورے صوبہ سندھ سے گزر کر کراچی میں ہتھیار مطلوبہ مقام تک پہنچاتے رہے ہیں۔ ان کو کہیں نہیں روکا گیا ہے۔ کہتے ہیں ساڑھے تین لاکھ میں ہتھیاروں سے لدا ٹرک بہ حفاظت گھر تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ توڑے دار بندوقیں نہیں، جدید ترین ماؤزر، ٹی ٹی، کلاشنکوف، بم، حتیٰ کہ دورمار میزائل بھی۔
آپ کو یقین نہیں آتا؟
کراچی میں لڑکوں نے میزائلوں سے نشانوں پر گولے برسائے ہیں۔ نشانہ لگانا ابھی اُنھیں نہیں آتا۔ پھینکتے کہیں تھے اور گولا کہیں جا گرتا تھا۔ زیادہ تر ان کا نشانہ رینجرز اور پولیس تھانے تھے، مگر گولے انھوں نے کہیں اَور برسائے۔
کیوں کہ کراچی میں یہ بھی ہوتا رہا ہے بوڑھے نے کلام جاری رکھا۔ مبینہ طور پر مبینہ یہ ہے کہ حقیقی کے لڑکے ایم کیو ایم کے لڑکوں کو قتل کر رہے ہیں۔ باقی سب بھی مبینہ ہے۔
اس صورتِ حال میں وہ ذاتی دشمنوں یا جن سے کبھی تُوتکار ہوئی ہو اُن کو بھی قتل کر رہے ہیں۔ کیوں کہ جب ہتھیار اٹھارہ انیس برس کے لڑکے کے ہاتھ میں ہے تو وہ بادشاہ ہے اور اپنی مرضی سے کسی کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ وہ بھتا وصول کر رہے ہیں اور بھتا نہ دینے پر بھی قتل کر رہے ہیں۔
رینجرز اور پولیس (یہ بھی مبینہ ہے) ایم کیو ایم کے لڑکوں کو اذیت پہنچا کر قتل کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ اَور بھی کسی کو مار دیں تو پوچھنے والا کون ہے؟ مبینہ طور پر یہ بھی بھتا وصول کر رہے ہیں۔ گھروں

میں گھس کر لوٹ مار کر رہے ہیں۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کر رہے ہیں۔ اتنے چھوٹے لڑکوں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے جو چودہ پندرہ برس کے تھے۔ یہ نامعلوم مقامات پر رکھے گئے ہیں۔ (مبینہ طور پر) رہا کرنے کی رقم پچیس ہزار روپے سے شروع ہوتی ہے۔

دراصل ہے سو یہ اکتا دینے والی طویل فہرست ہے بوڑھے نے کہا۔ ایم کیو ایم الطاف گروپ کے لڑکے (مبینہ طور پر) حقیقی کے لڑکوں اور پولیس اور رینجرز کو قتل کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بھی بھتا وصول کر رہے ہیں اور بھتا نہ دینے پر قتل بھی کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ذاتی دشمنوں یا جن سے کوئی تُوتکار ہوئی ہو اُنھیں بھی قتل کیا جا سکتا ہے۔

اور یہ سب، یعنی پولیس۔ رینجرز، ایم کیو ایم حقیقی اور مجاہری، اپنے ان ایجنٹوں اور کارکنوں کو بھی قتل کر رہے ہیں جو ان کے کام کے نہ رہے ہوں یا خطرناک بن چکے ہوں۔ ان کے نام پتے یہ ایک دوسرے کو فراہم بھی کر دیتے ہیں۔ قتل کرنے والے متحارب وں میں رفتہ رفتہ ایک طرح کا رازدارانہ تعاون پیدا ہو گیا ہے۔ کیوں کہ بھتے ـــ موٹی موٹی رقمیں ـــ اس گھومتے چکر کا مرکز ہیں۔ لہذا کچھ تمہارا کچھ ہمارا کی بنیاد پر، جو کہ گروہی مفادات کے تعاون کی بنیاد ہے اور جس کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہیں

اس پر ایک آدمی ندیاں میں چلایا کیا بک رہے ہو کیا بکواس کر رہے ہو؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے یہ جھوٹ ہے جھوٹ جھوٹ جھوٹ سب سے جھاگ اگلتا وہ اپنے بال نوچنے لگا۔

کیا جھوٹ ہے؟ بوڑھے نے تھکاوٹ سے پوچھا۔ یہ کہ اس شہر کے ساتھ اس کے باسیوں کے ساتھ، اس قدر گھناونا، بدتر در بدتر جنوں سے تر، سازش اور سفاکی سے غلیظ، مکروہ جرم مہینوں، برسوں سے کیا جا رہا ہے؟

ہاں'

اور کوئی کچھ نہیں کہتا؟'

ہاں!

اس پر انگریزی کے ایک صحافی نے انگریزی میں نہایت تیز رفتاری سے کہا اور یہ سب کچھ اس لیے آسانی سے ہو رہا ہے کہ ایم کیو ایم، پی پی پی اور اسٹیبلشمنٹ میں سمجھوتا نہیں ہو رہا۔

اس پر اس کے رخساروں پر تین چار چانٹے مارے گئے۔ جُپ سالا سمجھوتے کا بچہ۔ ہمارا دھندا مندا کرنے آ گیا۔ چلے آتے ہیں ٹھیکے دار۔ نہ کھیڈساں نہ کھیڈن دے ساں کے مصداق

بھئی ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہے ـــ اس سے فیض یاب کیوں نہ ہوا جائے؟ اور یہ دریا ہمیشہ، یا کم از کم چند برس اور، کیوں نہ بہتا رہے؟

اسی دریا کے کنارے کھڑے میں سندھی بھی۔ نئے سے جوان یہ بھی ہوے ہیں۔ لٹھے کی کاٹ قمیصیں پہنے، کاندھوں پر اجرک ڈالے، اپنی دھرتی کی مٹی اور مکھن کی مہک سے سوندھے، حیرت سے

تموں کے اس بہتے دریا کو دیکھ رہے ہیں۔ اتنا پیسا؟ اس میں ان کا حصہ کہاں ہے؟ ہتھیار تو وہ بھی چلا سکتے ہیں وہ کسی سے کم تو نہیں مرد کے بچے ہیں!

مگر کراچی میں وہ کیسے بھتا وصول کر سکتے ہیں؟ بھتے کا بھی ایک حلال جواز تراشا جاتا ہے ــــ اسے پروٹیکشن منی کہا جاتا ہے۔ تو یہاں وہ کس کو پروٹیکٹ کرنے کا سوانگ کیسے رچائیں؟ لیکن حیدر آباد میں، جہاں سندھی بھی ۵۰ فیصد ہیں، انھوں نے نے ہتھیار سندھیوں کو پروٹیکٹ کرنا شروع کر دیا ہے اور وافر مقدار میں سندھیوں سے بھتا وصول کر رہے ہیں۔

رات گئے ایک اکیلی، سنسان گلی میں ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے بیمار زرد روشنی میں ایک چھریرا پولیس والا، جس کی پتلی کمر کسی موٹی پیٹی میں بل کھا رہی ہے، گلے میں کلوری دبا کر راکٹ سے سگریٹ سلگاتا ہے اور مخمور نگاہیں آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے ماچس پھینک کر گنگناتا ہے

ہم کو دعائیں دو ارے ہم کو دعائیں دو تمہیں قاتل بنا دیا آ آ آ ہم کو

***

جوں بالیدہ چہرے والی عورت چاند کی طرف دیکھتے ہوئے مادہ بھیڑیے کی مانند زور سے چنگھاڑی اور سنسان گلی گونج گئی۔

کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟

کراچی میں کل کے طبقات کی بنیاد رکھی جا رہی ہے، جو موجودہ قتل و غارت میں تمہاری نظروں سے اوجھل ہے۔ اس دھکم پیل میں، اس گھمسان میں جو درندہ کی طرح ایک لاوارث شہر کو بھنبھوڑ رہا ہے، کل کا طبقہ اشرافیہ جنم لے رہا ہے۔ وہ لوگ جو آج داؤں مار لیں گے انہیں کے جاندان کل صاحب حیثیت ہوں گے۔ اشرافیہ میں سے نام اور دائیں شامل ہوں گی یا نکور بالائی طبقہ پیدا ہوگا۔

کراچی میں کوئی نئی بات نہیں ہو رہی، انسانی معاشرے نے طبقات بننے کی کہانی دہرائی جا رہی ہے۔ پرانے اشرافیہ نے جاگیریں اور ملیں اخلاقیات پر مضامین لکھ کر حاصل نہیں کی تھیں۔ یہ کھیل جوں ریزی کے کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔

کراچی سہما ہوا کراچی جوں میں نہایا ہوا شام کے اخباروں میں مقتولوں کی تصویر کرسی سے لڑھکتا ہوا کوئی آدمی جیسے مکر کر رہا ہو، اداکاری کرتا ہو مرنے کی، قتل ہونے کی

بوڑھے نے اسے اپنے سینے سے لگا کر سختی سے بھینچا اور کہا سو
وہ بس سی لیٹی رہی، چاند کو گھورتی۔ پھر بوڑھے نے کہا

انسان میں اور دوسرے جانوروں میں فرق یہ ہے کہ ایک دوسرے کا کوتت بھنبھوڑنے سے پہلے اور بعد میں آدمی واویلا بہت کرتا ہے، ندامت کے آنسو بہاتا ہے۔ آئے ہائے! یہ ہم نے کیا کیا! (اکثر کہتا ہے یہ تم نے کیا کیا!) انسانیت کا خون کر دیا! ننھے ننھے بچوں کو آگ کے شعلوں میں پھینک دیا! (ایسے دس سے خون پونچھتے ہوئے) عورتوں کے اندام نہانی میں سنگینیں تار دیں۔ پھوٹ پھوٹ رونا سسکیاں جب کہ اس کا آدھا دماغ زمان و مکاں کے کسی بھی منطقے میں ٹھہرائے گئے حریف کو نیچا دکھانے کا تازہ تگڑم سوچ رہا ہوتا ہے سالے تیری منڈیا نہ جب تک رگڑ دوں خاک میں

پھر متعدد قتل کرنے کے بعد جیسی ہوئی ایسے جسے کی روٹی ـــ یا ایسی روٹی جس پر اس کے خیال میں دراصل اس کا حق تھا ـــ کھانا اسے اچھا بھی نہیں لگتا۔ یہ ابھی تک خون میں تر ہوتی ہے۔ وہ اسے اگل اگل کر کھائے گا۔ زمین پر لوٹیں لگائے گا۔ درختوں پر جھولا ڈال کر جھولے گا۔ بارش میں نہائے گا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہے گا آہ! دھنک کس قدر حسین ہوتی ہے! اس پر کچھ شعر لکھے گا

ہم عورت نے کہانی سنتے سنتے ہنکارا بھرا اور ایک لمبی، ٹھنڈی سانس لی۔ اسے دارالسلطنت میں کی کسی اپنے دوست سے گفتگو یاد آئی۔

وہ کرسی میں سمٹا بیٹھا تھا۔ اس نے کہا صرف کراچی ہی کیوں؟ پوری دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ بوسنیا کو دیکھیے۔ یہ نام نہاد اکیسویں صدی نسلی تنازعات، خوں ریزی اور تعصب سے عبارت ہو گی۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر اضافہ کیا

کراچی کے لیے روتی کیوں ہیں بزدلوں کی طرح؟ اس کے بدلے ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟ کیا وہ بالکل برباد نہیں ہو جائیں گے؟

کیا وہ بالکل برباد ہو جائیں گے؟ عورت نے مسحور ہو کر دہرایا۔

یقیناً! اس کے دوست نے کہا۔ پھر وہ خاموش ہو گیا۔

عورت سوچ میں پڑ گئی۔ آیا اسے بزدلوں کی طرح کراچی پر رونے کے بدلے (بہادروں کی طرح) ہندوستان کے مسلمانوں پر رونا چاہیے؟ مضبوطی سے نظریں اس طرف جمائے رکھنی چاہییں؟ یقیناً یہ زیادہ محفوظ بات تو ہے۔ اس نے کرسی پر دیر سے خاموش بیٹھے، بہت تنہا لگتے اپنے عزیز بار کسی دوست پر نظر ڈال کر سوچا۔ ملکی متحارب لوگوں کے عتاب سے اسی طرح بچا جا سکتا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کی بھی یہی رضا ہے کہ لکھنے لکھانے والے کراچی کی گندی بحث میں الجھنے کے بجائے ملک اور مسلمانوں کے خلاف بیرون ملک کی جانے والی بڑی بڑی سازشوں پر خامہ فرسائی کریں۔

مگر عورت کو تو کراچی واپس آنا تھا اور ایک مادہ بھیڑیے کی جنکھاڑ سننی تھی۔

لہٰذا اس نے اپنی نظریں اس رات کے پہلے ماہتاب پر گھسا دیں جہاں رئیس میاں ~ بانکات سے تھے۔

پنجابی سندھی مہاجر

وہ ایسی سانسوں میں بڑبڑائی۔ اور اچانک وہ کسی دوسرے زمانے میں جا پہنچی۔ غالباً ۱۹۶۸ یا ۱۹۶۹ کی ایک کالی گھپ، اماوس کی رات ایک ریل گاڑی پوری آواز سے رات کی سیاہ تاریکی میں داخل ہوئی اور دھڑدھڑاتی ہوئی اندھیرے میں سے گزرنے لگی۔ اس کے ایک ڈبے میں دو نوجوان لڑکیاں خوف سے لرز رہی ہیں۔ انہیں حیدر آباد سندھ کے قریب، سندھو ندی کے کنارے سی سستی جام شورو جانا ہے۔ یہ لڑکیاں کس قوم یا قومیت کی ہیں؟ آپ انہیں کچھ بھی کہہ سکتے ہیں ___ ماں مہاجر اور باپ پنجابی۔ یہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ سندھ یونیورسٹی میں سندھی قوم پرست طلبا تحریک کا زور ہے۔ چند دن پہلے یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں میں سندھی قوم پرستوں نے اشتعال میں آکر ایک پنجابی آبادگار کے گھر پر حملہ کر دیا تھا۔ خبر تھی کہ اس گھر کی جوان لڑکی کے ساتھ زنا کر کے اس کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش لٹکا دی گئی تھی، اس طرح کہ اس کے پوشیدہ عضو میں ایک کھردری لکڑی ٹھنسی ہوئی تھی۔

لڑکیوں کے ساتھ اس ڈبے میں اتفاقاً ایک فوجی جوان بھی ہے۔ اس نے لڑکیوں کو بہ حفاظت ان کے گھر تک پہنچانے کا وعدہ کیا ہے۔ اندھیرے کو چیرتی جاتی، دھڑدھڑاتی اس ریل گاڑی کی اندرونی روشنی کی لکیر میں ان دو نصف پنجابی نصف مہاجر نوجوان لڑکیوں کے لیے ایک فرشتے سے کم نہ تھا یاک فوج کا جوان، جس نے انہیں بہ حفاظت گھر تک پہنچایا۔

پھر وہ ریل بھی گزر گئی اور کراچی میں ایک دن طلوع ہوا۔ بھٹو حکومت کے خلاف پی این اے کی تحریک کے زمانے کا ایک دن۔ اس دن کی روشنی میں کراچی کے ایک علاقے بہادر آباد میں بھٹو مخالف مقامیوں نے ایک بوڑھے سندھی کو ہلاک کر کے اس کی لاش چوراہے پر لٹکا دی تھی۔ بہت دیر تک وہ لاش جھولتی رہی۔

پھر اُس نے لسانی فسادات دیکھے جن پر چلتے سگریٹوں سے جیسے مہاجر یا جیسے سندھ لکھا تھا۔

اُسے کراچی کے سندھی مخالف لسانی فسادات یاد آئے۔ سندھ کی اسمبلی میں لسانی بل پاس ہوا تھا اور کراچی میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا لیاقت آباد کے ایک چھوٹے سے مکان کی بالائی منزل پر ایک بڑے میاں باورچی خانے میں گھسے بڑی سی دیگ میں پانی اُبال رہے ہیں۔

ارے اتنے پانی کا کیا کیجیے گا؟ اس نے پیار سے پوچھا۔

بڑے میاں اتنے ضعیف ہیں ___ کمر دوہری، تن کا ایک ایک بال سفید ___ سفید جھک کر تا پہنے۔

ارے بھئی یہ پانی وہ پوپلے منہ سے بولے، پھینکیں گے کھولتا ہوا پانی کیا نام کہ پولیس ؟ اور یہ۔ انھوں نے پاس رکھا پسی مرچوں کا بڑا سا ڈبا دکھایا۔

عورت ہنسنے لگی۔ چاندنی میں اُسے اسی ہنسی کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ اس کے گھر کی نچلی منزل سے چمپا اور چنبیلی کی مہک تیرتی ہوئی اوپر آنے لگی۔

***

کراچی میں کیا ہو رہا ہے (۳)

جب معتوب سیاسی تنظیم کے رکن، سابق بلدیاتی کاؤنسلر کو کراچی کے ایک شہر سے پرے محلے سے گرفتار کیا گیا تھا تو یہ متوقع نہ تھا کہ اس کی لاش دوسرے ہی دن اسپتال پہنچا دی جائے گی۔ (کئی مہینوں سے اس عمل میں دو تین دن کا وقفہ پڑنے کا معمول تھا۔) پولیس رپورٹ میں درج تھا کہ متوفی پر حراست میں دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ دل کا دورہ ایک وبا کی طرح گرفتار شدگاں میں پھیل چکا تھا اور نوجوان لڑکے حراست میں دل کے دوروں کا شکار ہو رہے تھے۔

پوسٹ مارٹم کے بعد فوراً لاش واپس لے گئی۔ مگر اسپتال میں موجود عینی شاہدوں اور چند ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ متوفی کے پورے جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ اخباروں میں آنے والی دیگر رپورٹوں میں درج تھا کہ اس کی ایک آنکھ بھی غائب تھی۔

یہ پڑھ کر کراچی میں رہنے والا ایک دردمند شخص سر تھام کر بیٹھ گیا کیوں کہ اسے متلی ہونے لگی تھی اور اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ آنکھ نکال لی! آنکھ نکال لی! یہ الفاظ اس کے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ اس کے ذہن میں یہ عجیب سا خیال بھی آیا کہ اُس رات جب لوگ اپنے گھروں میں آرام سے سو رہے تھے، ایک شخص کی آنکھ نکالی جا رہی تھی۔ اس خیال سے وہ پوری رات سو نہ سکا۔

دوسرے دن کے اخبار میں پولیس کی جانب سے متوفی پر اذیت کرنے کی تردید شائع ہوئی۔ پولیس نے بیان دیا کہ لاش پر اذیت کے نشان پہلے سے موجود تھے۔ وہ معتوب سیاسی تنظیم کے عقوبت خانے میں خود اُنھیں کے ہاتھوں اذیت کا شکار ہوا تھا۔ اپنے اوپر تشدد کروا کے وہ گرتا پڑتا لڑکھڑاتا سڑک پر جا رہا تھا کہ گرفتار ہو گیا، اور تب حراست میں اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ مر گیا۔

یہ تردید پڑھ کر دردمند شخص کی خاک تسلی نہ ہو سکی۔ بار بار ایک ہی خیال اس کے دل کو کچوکے دیتا رہا، کہ جب اس پر اتنا تشدد ہو چکا تھا تو وہ کم بخت عقوبت خانے سے نکلا ہی کیوں، اور اس حالت میں پیدل آخر کہاں کے لیے چل پڑا، رکشا ٹیکسی ہی کر لی ہوتی۔ لہٰذا پھر وہ پوری رات نہ سو سکا، اور رات بھر اس کے ذہن میں ایک شخص بہت سے منھ پھاڑے، گھٹی گھٹی آواز میں کراک جیسوں کے ٹکڑے حلق سے

نکالتا رہا۔ ایک نشتر اُس کی آنکھ کا ڈھیلا نکالتا رہا اور وہ آنکھ نکلنے کے ساتھ کرسی سے ٹیڑھا ہو کر اوپر اٹھتا چلا گیا۔

بہر حال، تیسرے دن کے اخباروں میں آیا کہ لاش پہلے ایک رفاہی ادارے کے حوالے کی گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب لاش ان کے پاس لائی گئی تو اس پر تشدد کے نشان تھے اور آنکھ میں گولی ماری گئی تھی جو کھوپڑی کی پُشت سے پار ہو گئی تھی۔

یہ پڑھ کر دردمند شخص پرسکون ہوا۔ اس نے سوچا کہ لاحول ولاقوۃ! میں تو سمجھا تھا کہ آنکھ نکالی گئی ہے۔ اب پتا چلا کہ اس میں تو گولی ماری گئی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا، اور اس رات وہ آرام سے سویا۔

***

جس سہ پہر آمنہ بیگم کے گھر ٹیلی فون آیا تھا کہ ان کی بہن کو فیڈرل بی ایریا کے کسی اسپتال میں داخل کیا گیا ہے، ان کا دل ڈوبنے لگا۔ فون پر مشکل اسپتال کا پتا لے کر انھوں نے بٹوا سنبھالا اور گھبرائی ہوئی پڑوس کے گھر جا پہنچیں۔ دستک دی تو عمران نے دروازہ کھولا۔ وہ انھیں اسپتال لے جانے کو تیار ہو گیا۔ دلاسا دینے کی خاطر اس کی ماں بھی آمنہ بیگم کے ساتھ ہو لیں۔

آمنہ بیگم کا پڑوسی، چوبیس پچیس سالہ جوان انھیں گھر کی کار میں اسپتال لے چلا۔ اس نے پہلا ہی موڑ کاٹا ہو گا کہ سپاہیوں کا ایک ٹرک سامنے آ گیا۔ عمران نے ایکسلریٹر سے پیر ہٹا کر وہیل کو تیزی سے بائیں جانب گھمایا۔ پہیوں کی چیخ کے ساتھ گاڑی لہرائی اور سڑک کے وسط میں آ گئی۔ مگر عمران زیادہ دور نہ جا سکا۔ سپاہیوں کے ٹرک نے تیزی سے پلٹ کر اس کا راستا روک دیا۔

پھر انھوں نے عمران کو گاڑی سے کھینچ کر باہر نکالا اور غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ اُسے بری طرح مارنا شروع کر دیا۔ جس پر کے گھم! اگر ٹکرا جاتی تو؟

پچھلی سیٹ پر بیٹھی دونوں عورتوں کی ہائیں ہائیں اور چیخ پکار چند لمحوں کے بعد ختم ہو گئی۔ وہ خاموش بیٹھی تھر تھر کانپتی رہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو خاموشی سے بہتے، ان کی ناک اور ٹھوڑی اور تھرتھراتے ہونٹوں سے نیچے ٹپکتے رہے۔

سڑک پر حوا بیچے والا بیٹھا تھا۔ عمران کو بری طرح مار کھاتا دیکھ کر اس نے منھ پھیر لیا اور حوا بیچے کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ تھپڑ کی اور ٹھوکر کی ہر آواز کے ساتھ اس کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی گئی اور ہاتھوں کی موٹی، بوڑھی رگیں اُبھرتی گئیں۔

پاس سے گزرنے والی کسی شہری کی کار نے لمحہ بھر کو رفتار دھیمی کی، پھر تیزی سے گلی سے چلی گئی۔

مار کھانے کے بعد عمران گاڑی میں بیٹھا۔ ہوش حواس مجتمع کر کے وہ گلی سے باہر نکلا۔ بڑی سڑک پر آ کر اس نے محلے کی کریانے کی دکان کے سامنے گاڑی روکی۔ دکان دار اُسے پہچان کر اس کی طرف بڑھا۔ ارے، تمھاری یہ حالت! واقعے کی نوعیت اُسے سمجھائی گئی۔ دکان دار کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ خاموشی سے اندر جا کر پانی کا گلاس لایا۔ عمران نے ہاتھ کی آڑ لے کر دانتوں سے نکلنے والے خون کی کلی کی اور ٹشو پیپر سے منھ صاف کیا۔ حال ٹھیک کر کے تھوڑی دیر بعد وہ ماں اور پڑوس کی منھ بولی خالہ کو لے کر اسپتال روانہ ہو گیا۔

پھر عمران بھی کہیں چلا گیا ___ کہاں؟ کون جانے!

**

اختر حمید خاں

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین اکمل کمال

جینے کا ہُنر

مجھے اپنے گناہوں کی یہ سزا ملی ہے کہ لمبی عمر پاؤں اور ہولناک واقعات ہوتے ہوئے دیکھوں۔ ایک نوجوان آئی سی ایس آفیسر کی حیثیت سے میں نے بنگال کے ہولناک قحط اور انگریز سرکار کی انتظامیہ کے زوال کا مشاہدہ کیا۔ ۱۹۴۷ میں جامعہ ملیہ دہلی میں ایک استاد کی حیثیت سے مجھے مغل ثقافت کے وارث مسلمانوں کو شکست و ہزیمت سے دوچار ہوتے دیکھنا پڑا۔ تقسیم کے نتیجے میں دہلی سے پانچ لاکھ مسلمانوں نے ہجرت کی اور دس لاکھ ہندو اور سکھ شہر میں آ گئے، چند ہفتوں میں شہر بالکل بدل کر رہ گیا۔ ۱۹۵۰ میں میں ہجرت کر کے کومیلا، مشرقی پاکستان، گیا اور وہاں بیس برس کے عرصے میں پاکستان کے شیدائیوں اور ماننے والوں کی اکثریت کو، بنگالی مسلمانوں کو، دشمنوں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ میں نے اُن تمام دہشت ناک واقعات کا، مشرقی پاکستان کے ختم ہونے کا اور بہاریوں کے قتلِ عام کا مشاہدہ کیا۔ اور میری سزا اب بھی جاری ہے۔ کبھی کبھی میں شیخ سعدی کا ایک شعر دُہراتا ہوں، جنھوں نے سو برس کی عمر پائی اور بہت سے المناک واقعات دیکھے جن میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی بھی شامل تھی

مس ام دیده ما مادیدنی لے

رادے نہ مادر کاشکے اسے مرا

لیکن یہ تمام المناک واقعات شیخ سعدی کو قنوطیت یا کلبیت کا شکار نہیں بنا سکے۔ بلکہ ان کی توجہ اور نصیحت کا رخ زندوں کی طرف رہا جو تمام المیوں کے باوجود اپنی زندگی کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ مجھے امید ہے کہ میں نے بھی یہی سبق سیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ایک بہت بڑی تبدیلی کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ بہت سی پرانی چیزیں مر رہی ہیں، چاروں طرف تنزل اور موت کے آثار ہیں۔ لیکن مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ بہت سی نئی چیزیں پیدا بھی ہو رہی ہیں زندگی اور ترقی کے نشانات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

۲

تقریباً ساٹھ سال پہلے، ۱۹۳۶ میں، میں انڈین سول سروس میں شامل ہوا اور نو سال تک ایک فرض شناس افسر کے طور پر کام کرتا رہا۔ پھر میں نے اپنے فکر پسند مزاج کو دیکھتے ہوئے افسر کے بجائے استاد بننے کا فیصلہ کیا۔ چند سال میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے جامعہ ملیہ میں، جو ایک گاندھیائی ادارہ تھا، کام کیا۔ ۱۹۵۰ میں کومیلا جانے کے بعد میں آٹھ سال کومیلا کالج کا پرنسپل رہا۔ ۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ کے عشروں میں مجھے امریکی استادوں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے اپنے انگریز، گاندھیائی اور امریکی استادوں کے احسان کا ہمیشہ پاس رہا ہے۔ اس کے بعد میں خوش قسمتی سے کچھ تجرباتی (پائلٹ) پروجیکٹوں میں شریک رہا، جہاں ایک محقق کے طور پر میں نے اپنے استادوں کے سکھائے ہوئے سبق سے کچھ آگے جانے کی کوشش کی۔

حکومت پاکستان نے فورڈ فاؤنڈیشن کی مدد سے دیہی ترقی کی دو اکیڈمیاں قائم کی تھیں، ایک پشاور میں اور دوسری کومیلا میں۔ ۱۹۵۸ میں مجھے کومیلا اکیڈمی کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ اکیڈمی نے ۱۹۵۹ میں کام شروع کیا۔ اکیڈمی کو کومیلا تھانے کے ۱۰۰ مربع میل کے علاقے اور اس کی حدود میں آنے والے ۳۰۰ گاؤوں کو تحقیق اور تجربے کے لیے ایک طرح کی لیبارٹری بنانے کی اجازت دی گئی تھی۔ تحقیق سے پتا چلا کہ آبپاشی، دریا کے بندوں اور سڑکوں کے نظام کی نئے سرے سے تعمیر سب سے اہم ضرورت ہے۔ کھال (آبپاشی کے نالے) ریت سے اٹ گئے تھے اور بند ٹوٹ رہے تھے، جس کی وجہ سے سیلاب میں زبردست تباہی ہوتی تھی۔ لارڈ کارنوالس کا متعارف کرایا ہوا زمینداری نظام، جو کسی حد تک ان کھالوں اور بندوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا، پاکستان بننے کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ سرکاری محکمے یہ کام کرنے کے اہل نہ تھے۔ اس لیے نئے ادارے قائم کرنے اور تعمیر نو کے نئے طریقے وضع کرنے کی ضرورت تھی۔ کومیلا تھانے میں سال بھر کی تحقیق کے بعد دیہی تعمیر کا پروگرام وضع کیا گیا

(۱) تھانا کاؤنسل اور یونین کاؤنسلوں کو کھال، بند اور سڑکیں تعمیر کرنے کے لیے پانچ سالہ منصوبے تیار کرنے کی تربیت دی گئی۔

(۲) کاؤنسلوں کو ہر سال ان منصوبوں اور اسکیموں پر عمل کرنے کے لیے مالی گرانٹ دی جاتی۔

(۳) انجینیروں اور اکاؤنٹنٹوں کو مقرر کیا گیا کہ مقامی پروجیکٹ کمیٹیوں کو تربیت دیں، اور یہ کمیٹیاں کسی ٹھیکے دار کے بغیر عام لاگت سے دو تہائی خرچ پر اور بہت تیز رفتاری سے تعمیر کا کام مکمل کرتیں۔

(۴) دیہی تعمیر کے اس کام سے نہ صرف تھانے کا انفرااسٹرکچر بہت تیزی سے بحال ہو گیا بلکہ بہت سے بے زمین مزدوروں کو روزگار بھی ملا۔

(۵) زمین کی سطح پر اور زیرِ زمین پانی کی کثیر مقدار کو استعمال کرنے کے لیے روایتی آبپاشی کے طریقے کے ساتھ ساتھ پمپ اور ٹیوب ویل بھی نصب کیے گئے۔ تاہم، ان کا انتظام یونین کاؤنسلوں کے بجائے ان کا پانی استعمال کرنے والوں کے سپرد کیا گیا تاکہ وہ خود ان کی دیکھ بھال کریں اور ان کے اخراجات برداشت کریں۔

تحقیق کے نتیجے میں سامنے آنے والا دوسرا اہم ترین مسئلہ چھوٹے کسانوں کی بدحالی کا تھا۔ ان میں سے نوّے فیصد کسان پانچ ایکڑ سے کم زمین کے مالک تھے۔ زمین کی پیداوار کم تھی اور سیلاب اور فصل کے کیڑوں سے ہونے والا نقصان بہت زیادہ تھا' اس کے علاوہ تاجر اور مہاجن ان کا بے پناہ استحصال کرتے تھے۔ چھوٹے کسانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے دو سطحی کوآپریٹو کا نظام تیار کیا گیا۔ گاؤوں میں کسانوں کے چھوٹے کوآپریٹو بنائے گئے اور تھانے کی سطح پر ایک مرکزی ایسوسی ایشن اور بینک قائم کیا گیا۔ یہ مرکزی نظام نہ صرف کسانوں کو ضروری قرض دیتا بلکہ انھیں بچت کر کے حصص خریدنے، زراعت کے نئے طریقے سیکھنے اور اپنانے اور آبپاشی کا بندوبست سنبھالنے کی تربیت بھی فراہم کرتا۔ تھانا ایسوسی ایشن پیداوار کی فروخت اور زرعی صنعتوں کے فروغ کے لیے بھی کوشش کرتی۔

پہلا مسئلہ ـــ یعنی کھال، بند اور سڑکیں تعمیر کرنے کا مسئلہ ـــ مقامی کاؤنسلوں نے دیہی تعمیر کے ذریعے بہت خوبی سے حل کیا۔ دوسرا مسئلہ ـــ یعنی چھوٹے کسانوں کی حالت بہتر بنانے کا مسئلہ ـــ کوآپریٹو نے اتنی ہی خوبی سے حل کیا۔ ان دونوں اداروں کو ملا کر تھانا ٹریننگ اینڈ ڈویلپمنٹ سنٹر (TTDC) کی شکل دی گئی اور اسے سرکاری محکموں کے پہلو بہ پہلو قائم کر دیا گیا۔ اس کی عمارت میں تھانا کوآپریٹو ایسوسی ایشن کے علاوہ زراعت، جانوروں کے علاج، ماہی گیری اور صحت عامہ کی تربیت کا مرکز بھی تھا۔ سرمئی گاؤوں کے نمائندے ـــ کاؤنسلر، کوآپریٹو کے منتظم، کسان، استاد، مسجدوں کے امام، منتظم عورتیں، دائیاں ـــ بڑی تعداد میں یہاں آ کر تربیت حاصل کرتے۔ یہ مرکز ہمہ گیر دیہی ترقی کی علامت بن گیا۔

اس تجرباتی پروجیکٹ میں چار سادہ اصول مدِنظر رکھے گئے۔

(۱) سب سے پہلے تحقیق کے ذریعے صورتِ حال کا مکمل تجزیہ کیا گیا۔

(۲) پھر دو عوامی اداروں ـــ یونین کاؤنسل اور کوآپریٹو ـــ کو فعال کیا گیا، انھیں ذمے داریاں سونپی گئیں اور تعاون فراہم کیا گیا۔

(۳) پروجیکٹ کے سرکاری افسروں کو استاد، تربیت دینے والے اور تعاون کرنے والے کا کردار دیا گیا۔

(۴) گاؤں کے فعال افراد کو مکمل تکنیکی رسائی فراہم کی گئی۔

بہت کم عرصے میں کومیلا تھانے میں حیرت انگیز نتائج کا مشاہدہ کیا گیا۔ وہاں ہونے والا عملی تجربہ تربیت کی ایک عمدہ بنیاد بنا۔ ۱۹۶۰ میں اسی قسم کے مراکز ۱۴ تھانوں میں قائم کیے گئے۔

۱۹۷۰ تک ان میں سے ۲۵۰ میں قائم کیے ہوئے مراکز مضبوط بنیادوں پر مستحکم ہو چکے تھے۔ ہارورڈ کے مشیروں اور ورلڈ بینک کی شراکت کے باعث ہمہ گیر دیہی ترقی کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ ورلڈ بینک کے مشیروں نے یہ پروگرام انڈونیشیا میں متعارف کرایا جہاں ۱۹۶۴ سے اس پر مسلسل عمل ہونے کی بدولت دیہی منظر بالکل بدل چکا ہے۔

۳

اپریل ۱۹۷۱ میں مجھے کومیلا سے اکھڑ کر موجودہ پاکستان میں آنا پڑا۔ پہلے دو سال میں نے فیصل آباد اور کراچی یونیورسٹی میں پڑھایا، اور اس کے بعد دو سال پشاور کی دیہی اکیڈمی میں کام کیا جہاں میرے دوست شعیب سلطان خان نے کومیلا کے خطوط پر داؤدزئی پروجیکٹ شروع کیا تھا۔ مگر مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ نئے پاکستان میں دیہی ترقی کا یہ طریقہ بے مصرف قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اب، ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جانے پر، مجھے خود کو بے کار شے کے طور پر کونے میں پھینک دیے جانے کا کوئی ملال نہ ہوا۔ مجھے اس کونے میں سے امریکا کی مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی نے اٹھایا اور ڈویلپمنٹ کا استاد بنا دیا۔

چند سال بعد میں تدریس سے تھک کر کراچی لوٹ آیا تاکہ اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن مطالعے اور غور و فکر میں بسر کروں۔ لیکن جب بی سی سی آئی فاؤنڈیشن کے آغا حسن عابدی نے مجھے اورنگی میں ایک اور پائلٹ پروجیکٹ شروع کرنے کی ترغیب دی تو میں مزاحمت نہ کر سکا۔ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ (OPP) ایک اعتبار سے کومیلا اکیڈمی سے بالکل مختلف تھا۔ یہ ایک غیر سرکاری ادارہ تھا جس کا انحصار ایک اور غیر سرکاری تنظیم کی جانب سے ملنے والی قلیل مالی امداد پر تھا، جبکہ کومیلا اکیڈمی کو حکومت، ہارورڈ کے مشیروں، مشی گن یونیورسٹی اور فورڈ فاؤنڈیشن کا تعاون اور مالی اعانت حاصل رہی تھی۔ شروع شروع میں اورنگی پروجیکٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کسی عملے، دفتر، رابطوں اور ذریعوں کے بغیر، اور محض ایک ٹوٹی پھوٹی جیپ کے ساتھ، میں کومیلا اکیڈمی کے سربراہ کی نسبت رابنسن کروسو سے زیادہ مشابہ تھا۔ لیکن ایک اور اعتبار سے اورنگی پروجیکٹ اور کومیلا اکیڈمی میں گہری مماثلت بھی تھی، دونوں ایک ہی اصول پر عمل کرتے تھے۔ پہلے سیکھنا اور پھر سکھانا۔

سب سے پہلے میں نے پروجیکٹ کی غیر سرکاری حیثیت کی محدودات کو اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی۔ او پی پی (OPP) کے پاس کسی قسم کا اختیار نہیں تھا۔ یہ ادارہ مشاہدہ اور تحقیق کر سکتا تھا لیکن اسے مشورہ دینے یا کوئی چیز نافذ کرنے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔ یہ صرف رضاکارانہ بنیاد پر لوگوں کو منظم کر سکتا تھا۔ یہ نہ تو سرکاری محکموں کی جانب سے دی جانے والی سہولتوں کا متبادل پیش کر سکتا تھا اور نہ عوامی نمائندگی کا اختیار کاؤنسلروں سے اپنے ہاتھ میں منتقل کر سکتا تھا۔

پھر میں نے اپنی مکمل ناواقفیت کو تسلیم کیا۔ میں کراچی میں کبھی نہیں رہا تھا، میں یہاں ایک اجنبی تھا۔ یہ مہانگر کومیلا کے چھوٹے سے شہر سے بہت مختلف تھا۔ چناں چہ سب سے پہلے میں نے خود کو تعلیم دینے کا فیصلہ کیا۔ کئی مہینوں تک میں اپنی ٹوٹی پھوٹی جیپ میں اورنگی بھر میں گھومتا پھرا، گلیوں کو دیکھا اور لوگوں، سرکاری افسروں، کاؤنسلروں، لابیوں کے نمائندوں، انجمنوں کے سربراہوں سے باتیں کیں۔ خوش قسمتی سے میں اپنے کام میں بالکل آزاد تھا؛ مجھے اپنے کسی اعلیٰ افسر کو جواب دہی نہیں کرنی تھی۔ رفتہ رفتہ میں نے جانا کہ اورنگی میں کس قسم کے لوگ رہتے ہیں، ان کے مسائل کیا ہیں، وہ خود ان مسائل کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، ان کے لیے کیا کِیا جارہا ہے اور وہ خود اپنے لیے کیا کچھ کررہے ہیں۔

اورنگی کراچی کی سب سے بڑی کچی آبادی ہے۔ یہ شہر کے وسط میں واقع کوئی پس ماندہ محلہ (slum) نہیں ہے بلکہ شہر کے مضافات میں ۲۵ سال پہلے بسی قائم ہونے والی بستی ہے۔ اس کی آبادی کا تخمینہ دس لاکھ لگایا جاتا ہے جس میں ہندوستان سے آنے والے مہاجر، بنگلادیش سے آنے والے بہاری، شمالی علاقوں سے آنے والے پٹھان، پنجابی، سندھی اور بلوچ شامل ہیں۔ ان کی اکثریت مزدور طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ ۱۹۸۹ میں کیے جانے والے ایک سروے کے مطابق یہاں ۱۱۰ محلے یا سیکٹر، ۷۶۴۳ گلیاں اور ۹۴۱۲۲ مکانات ہیں۔ ہر سال مزید لوگ یہاں آکر نئے مکان بنارہے ہیں۔ یہاں کے لوگ اپنی ووٹ کی طاقت اور سڑکوں کی طاقت کا پورا احساس رکھتے ہیں۔ جگہ جگہ انجمنیں اور تنظیمیں قائم ہیں، لوگوں میں دباؤ ڈال کر سہولتیں حاصل کرنے کا طریقہ بہت مقبول ہے، مطالبات زور شور سے کیے جاتے ہیں اور محرومیوں کی شکایت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

سرکاری محکموں کے پاس نہ اتنے وسائل ہیں اور نہ اہلیت کہ ان مطالبوں کو پورا کرسکیں۔ ان کی فراہم کی ہوئی سہولتیں نہایت نامناسب ہیں۔ ایک غیرسرکاری تنظیم، او پی پی، سرکاری اہلکاروں کی اہلیت یا صلاحیت بہتر بنانے کا کام اپنے ذمے نہیں لے سکتی تھی اور سرکاری محکموں پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایک اور تنظیم کی کوئی ضرورت نہ تھی کیوں کہ ایسی بے شمار انجمنیں اور تنظیمیں پہلے سے اس کام میں مشغول تھیں۔ چناں چہ او پی پی نے اپنے لیے ایک نیا کردار دریافت کیا۔

تحقیق سے معلوم ہوا کہ اورنگی کے لوگ اپنی حالت بہتر بنانے کے لیے زیادہ تر کام خود ہی کررہے ہیں۔ اورنگی کے تمام مکان ـــ تقریباً ۹۵ ہزار مکان ـــ کسی ڈویلپمنٹ اتھارٹی یا بلڈنگ فنانس کارپوریشن کی مدد کے بغیر تعمیر کیے گئے ہیں۔ ۵۰۹ پرائیویٹ اسکول اور سیکڑوں علاج کے مراکز لوگوں نے خود قائم کیے ہیں، جبکہ ۷۵ اسکول اور دو اسپتال حکومت نے بنائے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کا تقریباً تمام انتظام پرائیویٹ طور پر کیا گیا ہے۔ گھروں میں بنے ہوئے ہزاروں کارخانے اور چھوٹے کاروبار لوگوں کو روزگار فراہم کررہے ہیں۔

او پی پی نے لوگوں کی ان کوششوں کو بہتر بنانے اور وسعت دینے کی غرض سے ایک معاون

ادارے کا کردار ایساے کا فیصلہ کیا۔ تکنیکی ماہروں اور سماجی تنظیم کے کارکنوں پر مشتمل ایک مختصر سا عملہ بھرتی کیا گیا جس کا کام لوگوں کو سماجی اور تکنیکی رہنمائی فراہم کرنا تھا۔ بعد میں چھوٹے کاروبار کے لیے قرضے فراہم کرنے کے لیے ایک ٹرسٹ بھی قائم کیا گیا۔

اورنگی کے لوگوں کا ردعمل اتنا ہی بھرپور تھا جتنا کومیلا کے لوگوں کا۔ تین پروگرام شروع کیے گئے گندے پانی کے نکاس کا کم لاگت کا نظام تعمیر کرنا، صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیم دینا اور گھریلو کاروبار کو فروغ دینا۔ پہلے دو پروگراموں میں او پی پی کی طرف سے صرف تکنیکی اور سماجی رہنمائی کی گئی، جبکہ تیسرے پروگرام میں چھوٹے کاروبار کے لیے قرضے بھی فراہم کیے گئے۔

۱۹۸۹ میں، جب او پی پی نے اپنی تحقیق شروع کی، دوسری کچی آبادیوں کی طرح اورنگی بھی گندے پانی کا نکاس نہ ہونے کے باعث نہایت بری حالت میں تھا۔ اس صورتِ حال سے لوگوں کی صحت اور مکانوں کی مضبوطی کو سخت خطرہ لاحق تھا۔ او پی پی کے انجینئروں نے سب سے پہلے کام کی لاگت کم کرنے کے طریقے دریافت کیے۔ اگلے مرحلے میں سماجی کارکنوں نے لوگوں کو آمادہ کیا کہ جس طرح انھوں نے اپنے مکان خود بنائے ہیں، اسی طرح نکاس کا نظام بھی خود ہی تعمیر کریں اور گلیوں میں نکاس کی لائنوں کو اپنے مکان ہی کی توسیع سمجھیں۔ اس سماجی اور تکنیکی رہنمائی کے ذریعے اورنگی کے باشندوں نے، کسی مالی امداد یا قرضے کی سہولت کے بغیر، ۱۹۸۱ سے ۱۹۹۳ تک نکاس کا پورا نظام اپنے خرچ پر اور اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا اور خود ہی اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی جیب سے ۵ کروڑ ۵۴ لاکھ ۱۴ ہزار ۱۷ روپے خرچ کر کے ۴۸۵۰ گلیوں میں نکاس کی زیرزمین لائنیں، ۳۸۳ سیکنڈری ڈرینیں اور ۴۷ ہزار ۸۸ فلش لیٹرینیں تعمیر کیں۔ اس کام کے نتیجے میں گندے پانی سے پیدا ہونے والی بیماریاں بہت کم ہو گئیں اور مکانوں کو ہونے والا نقصان رک گیا۔

اس کامیاب پروگرام کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر لوگوں کو تکنیکی اور سماجی رہنمائی فراہم کی جائے تو وہ نکاس کے پورے نظام کا ۸۰ فیصد حصہ خود بنانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ سرکاری محکمے کے ذمے باقی ۲۰ فیصد کام ـــــ یعنی مین ڈرینیں اور واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ ـــــ تعمیر کرنے کا کام رہ جاتا ہے۔ عوام اور حکومت کے درمیان اس شراکت سے نکاس کا جدید نظام قائم کرنے کی لاگت بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس طرح کچی آبادیوں کا ایک نہایت سنگین مسئلہ آسانی سے اور کم وقت میں حل کیا جا سکتا ہے۔

او پی پی کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ اورنگی میں بیماریوں کی کثرت کی دو بڑی وجہیں ہیں نکاس کے نظام کا نہ ہونا اور لوگوں میں حفظانِ صحت کے جدید اصولوں سے ناواقفیت۔ چنانچہ ۱۹۸۵ میں صحت کا پروگرام شروع کیا گیا جس میں ناخواندہ اور نیم خواندہ گھریلو عورتوں کو صحت کے اصولوں اور بیماریوں کی روک تھام کی تربیت دی جاتی تھی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر کی نگرانی میں چار لیڈی ہیلتھ وزیٹروں نے اورنگی کی عام بیماریوں کی روک تھام کے لیے چھ مہینے کے ایک کورس کا بندوبست کیا، بچوں کو حفاظتی ٹیکے

لگانے، خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے متعارف کرانے اور غذا، بچوں کی دیکھ بھال اور گھروں میں سبزیاں اگانے کی تربیت فراہم کی۔ کورس کے سلسلے میں ہر چھ مہینے بعد گلیوں سے ۸۰ کارکن عورتیں منتخب کی جاتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے گھر پر ہونے والے اجتماع میں پڑوس کے گھروں کی دس سے بیس تک عورتیں شریک ہوتی ہیں۔ اس پروگرام پر بھی لوگوں کا ردعمل اتنا ہی پرجوش رہا ہے جتنا نکاس کے پروگرام پر۔ اس کے نتائج سے اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگی میں بیماریوں کی صورت حال خاصی بہتر ہوئی ہے۔

ہمارا یقین ہے کہ کچی آبادیوں میں صحت کی تعلیم بھی اتنی ہی موثر ثابت ہوتی ہے جتنا نکاس کے نظام کی تعمیر۔ اس تعلیم کا خرچ بھی بہت کم ہے ۴ ہوتا ہے۔ ٹیمیں سال بھر میں چار ہزار خاندانوں کو بیماریوں کی روک تھام، خاندانی منصوبہ بندی، بچوں کی دیکھ بھال اور گھر میں سبزیوں کی کاشت کی تربیت دے سکتی ہیں، اور فی خاندان صرف ۱۲۵ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ یہ پروگرام نہایت مقبول ہے۔ عورتیں ان ٹیموں کا گرموشی سے خیر مقدم کرتی اور دھیان سے ان کی باتیں سنتی ہیں۔ اس کے اثرات بھی بہت دیرپا ہوتے ہیں۔

تحقیق سے ایک اور اہم شعبے ـــــ یعنی مہنگائی اور بے روزگاری کا مقابلہ کرنے ـــــ میں لوگوں کی خودانحصاری کی زبردست صلاحیت کا انکشاف ہوا گلی گلی کھلے ہوئے ہزاروں گھریلو کارخانے اور کاروبار، گھروں کو ورکشاپوں میں تبدیل کر لینے کا عمل، معاشی سرگرمی میں عورتوں کی عملی شراکت۔ محتاط مشاہدے کے بعد او پی پی کی تحقیق اس نتیجے پر پہنچی کہ گھریلو کاروبار کی توسیع روزگار اور پیداوار میں اضافے کا سب سے تیزرفتار اور کم خرچ طریقہ ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے غیررسمی کاروباری اداروں کی پیداوار اور خدمات کی مانگ لامحدود تھی، اور ان کے لیے سستی لیبر کثیر تعداد میں موجود تھی۔ صرف سرمائے کی قلت تھی، اور باقاعدہ بینک انہیں قرضے کی سہولت دینے کو تیار نہ تھے۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ستمبر ۱۹۸۷ میں ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا۔ ٹرسٹ نے بینکوں سے، کسی رعایت کے بغیر، اور بینکوں کی مروجہ شرائط اور شرح سود پر قرض حاصل کیا۔ لیکن گھریلو کاروباری یونٹوں کو قرض دیتے وقت رہن وغیرہ کی شرط عائد نہیں کی گئی، صرف دو افراد کی شخصی ضمانت طلب کی گئی۔ ٹرسٹ کو احساس تھا کہ آج کل دیانت داری کا معیار خاصا گر چکا ہے، مگر پھر بھی اسے امید تھی کہ قرض داروں کے محتاط انتخاب اور نگرانی کے ذریعے ڈوبنے والے قرضوں کا تناسب کم رکھا جا سکے گا اور یوں رفتہ رفتہ قابلِ اعتماد قرض داروں کا ایک حلقہ وجود میں آ جائے گا۔ چوں کہ ٹرسٹ کو اپنے مالکان کو منافع ادا نہیں کرنا تھا، اور نہ لوگوں کے ڈپازٹوں کی دیکھ بھال کرنی تھی، اس لیے وہ اپنے روپے کو نسبتاً نرم رکھ کر بینکوں کی نسبت زیادہ خطرہ مول لے سکتا تھا۔

ٹرسٹ نے محتاط انداز میں اپنا کام شروع کیا اور اپنی غلطیوں سے سیکھا؛ اس نے قرض داروں کی پوری نگرانی کی اور اپنے حسابات کمپیوٹر کے ذریعے مرتب کیے۔ اس نے پہلے سال ۱۱ لاکھ ۷۰ ہزار

روپے، دوسرے سال ۱۱ لاکھ دس ہزار روپے، تیسرے سال ۱۹ لاکھ ۷۰ ہزار روپے، چوتھے سال ۳۲ لاکھ ۸۰ ہزار روپے، پانچویں سال ۶۱ لاکھ ۷۰ ہزار روپے اور چھٹے سال ۹۴ لاکھ ۸۰ ہزار روپے کے قرضے جاری کیے۔ اس چھ سال کی مدت میں ۱۷۶۴ گھریلو یونٹوں کو ۲ کروڑ ۴۲ لاکھ ۱۰ ہزار روپے کے قرضے دیے گئے جن کا تعلق ۳۹ مختلف پیشوں سے تھا اور جن میں تقریباً پندرہ ہزار لوگ کام کرتے تھے۔ ڈوبنے والے قرضوں کی مالیت ۵ لاکھ ۹۲ ہزار روپے (یعنی کل قرضوں کا تقریباً ڈھائی فیصد) رہی۔ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ۶۰ ہزار روپے کی قسطیں وصول ہوئیں، جس میں سود کی رقم ۱۵ لاکھ ۶۰ ہزار روپے تھی۔ ٹرسٹ نیشنل بینک، حبیب بینک اور فرسٹ ویمن بینک سے لیے ہوئے قرضے مکمل طور پر ادا کر چکا ہے اور اب اس کے ذمے کسی بینک کی رقم واجب الادا نہیں ہے۔ عطیات کے طور پر وصول ہونے والے ایک کروڑ ۴۵ لاکھ ۵۰ ہزار روپے ٹرسٹ کے فنڈ میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

چوں کہ قرضوں کے اس پائلٹ پروجیکٹ کا مقصد چھوٹے گھریلو یونٹوں کے لیے قرض کا ایک خود کفیل نظام دریافت کرنا تھا، اس لیے ٹرسٹ ڈوبے ہوئے قرضوں کی نوعیت اور مالیت کی بہت غور سے نگرانی کرتا ہے اور اس کی روشنی میں قرض داروں کے انتخاب اور قرضوں کے استعمال کی نگرانی کے طریقِ کار کو بہتر بناتا رہتا ہے۔ چھ سال پہلے جب یہ سلسلہ شروع کیا گیا، خیال یہ تھا کہ وفاداری اور دیانت داری کی روایات معدوم ہو چکی ہیں۔ پہلے سال بہت سی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ اب ڈوبنے والے قرضوں کی ممکنہ مالیت کی پیش گوئی کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ تقریباً ۳۰۰ وفادار قرض داروں کا ایک حلقہ بھی بنتا جا رہا ہے جو قرض کی واپسی میں سستی دکھانے والوں پر زور ڈالتے ہیں۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ قرضوں کے ڈوبنے کی تین وجوہ ہوتی ہیں بے ایمانی، نااہلی اور بدقسمتی۔ واپس نہ آنے والے قرضوں کا ہر تین مہینے بعد جائزہ لیا جاتا ہے اور انھیں حساب سے خارج (write off) کرنے میں غیر ضروری تاخیر نہیں کی جاتی۔ قرض ادا نہ کرنے والے ۱۱۰ یونٹوں میں ۴۰ بے ایمان اور ۳۲ نااہل نکلے جبکہ ۲۹ کسی بدقسمتی (موت، شدید بیماری وغیرہ) کے باعث قرض ادا نہیں کر سکے۔

میں نے مختلف خطوں سے اورنگی میں آ کر بسنے والوں کو محنت اور جوش سے اُسی طرح بھرا ہوا پایا جیسے معاشی بہتری کی تلاش میں نئے علاقوں میں جانے والے تمام لوگ ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے چار بنیادی مسائل — مکان (اور نکاس)، صحت، تعلیم اور روزگار — نہایت بہادری سے اپنے بل پر، اور کسی سرکاری امداد کے بغیر، حل کیے ہیں۔ شہروں کے یہ آبادکار صرف پُرجوش اور محنتی ہی نہیں، باوسیلہ بھی ہیں۔ ان کی کفایت شعاری انھیں بچت کرنے اور منافع بخش کاروبار میں لگانے کی ایک حیران کن صلاحیت بخشتی ہے۔ وہ اپنی استعمال کی ہوئی ہر چیز — زمین، مکان اور سہولتوں — کی قیمت ادا کرتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کی ادا کی ہوئی رقم سرکاری خزانے میں نہیں پہنچتی بلکہ رشوت لینے والے سرکاری اہلکاروں کے دلالوں کے ہاتھ میں جاتی ہے۔ اگر کراچی کی مختلف بستیوں میں رہنے والوں

سے سرکاری افسروں، سیاسی مجرموں، دلالوں اور علاقے کے غنڈوں کی زبردستی وصول کی ہوئی رشوت اور بھتے کی رقم کا صرف دس فیصد بھی عوامی حوالے میں جائے تو ہماری حکومت کو آئی ایم ایف سے اتنے قرضے نہ لینے پڑیں۔ او پی پی کے پروگراموں کی کامیابی سے ظاہر ہے کہ اورنگی والوں میں انتظامی صلاحیت کی بھی کمی نہیں ہے۔ معاشی ترقی اور سماجی استحکام دونوں کی بنیاد مفید روزگار پر ہوتی ہے۔ کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ غنڈا گردی اور لوٹ مار میں اضافہ بڑی حد تک بےروزگاری کا نتیجہ ہے؟ جن توانائیوں کا رخ تعمیری سرگرمی کی طرف نہ موڑا جا سکے وہ کینسر کے خلیوں کی طرح سماج میں تباہی پیدا کرنے لگتی ہیں۔

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ بستی کے رہنے والے، دیہات سے شہروں میں آنے والے، اکیسویں صدی کے پُرامید شہری، خود کو تباہ نہیں کرنا چاہتے؛ اس کے برعکس وہ زندہ رہنا اور پھلنا پھولنا چاہتے ہیں۔ وہ کفایت شعار، محنتی، ہوشیار اور باوسیلہ ہیں۔ وہ محنت کش اور پیداوار کرنے والے لوگ ہیں، طفیلی اور بیٹھ کر کھانے والے نہیں۔ وہ بھیک اور رعایتوں، مفت مراعات اور مفت کے مکانوں کے طلب گار نہیں، وہ بھکاری اور سماج کا بوجھ نہیں۔ انھیں صرف تکنیکی اور سماجی رہنمائی درکار ہے، انھیں صرف رشوتوں اور بھتوں کی وصولی سے تحفظ اور تھوڑا سا امن چاہیے۔

۴

۱۹۸۷ میں اورنگی میں زبردست لسانی فسادات پھوٹ پڑے اور مہاجروں اور پٹھانوں نے ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ پولیس کا کردار اس معاملے میں کہیں غیر جانبدار تماشائی کا اور کہیں خوف زدہ ثالث کا رہا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ میں دونوں فریقوں کے خوفناک نعرے سن کر دہشت زدہ رہ گیا۔ یہ (علیگڑھ کالونی کا قتلِ عام) تو صرف ٹریلر تھا! — ہم مر کر ساتھ نہیں رہ سکتے! — وی سی آر بیچو، کلاشنکوف خریدو! گلیوں اور محلوں میں مورچے بننے لگے اور مسلح گشت کیے جانے لگے۔ میں لوگوں کی جنگی صلاحیت دیکھ کر حیران ہو گیا۔ لیکن جب میں نے لڑنے والوں سے بات چیت کی تو مجھے پتا چلا کہ یہ لوگ ایسے ہی پاکستان کو بیروت بنانے کی درحقیقت کوئی خواہش نہیں رکھتے۔ انھوں نے ہمارے امن کے نعرے پر فوراً لبیک کہا، جو شیراز کے خواجہ حافظ کے شعر پر مبنی تھا جنھوں نے خود تشدد کی ہولناکی کا ایسی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔

درختِ دوستی بنشاں کہ کامِ دل بہ بار آرد
نہالِ دشمنی بر کن کہ رنج بےشمار آرد

ایک فرض شناس اور ہمدرد اسپیشل ریلیف کمشنر مسطور الحسن نے جلے ہوئے مکانوں کو تیزی سے دوبارہ تعمیر کرا کے اور لُٹی ہوئی دکانوں کا فوری معاوضہ ادا کر کے دونوں طرف کے زخموں پر مرہم رکھا۔ بہت جلد لوگوں کی توجہ کا رخ انتقام سے تعمیرِ نو کی طرف مڑ گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں لڑنے والی دونوں برادریاں دوبارہ شیر و شکر ہو چکی تھیں۔

۵

اورنگی میں اپنا کام مستحکم کرنے کے بعد او پی پی اپنی سرگرمیوں کا دائرہ آس پاس کے گوٹھوں تک پھیلانا چاہتی تھی، لیکن ہمارے محدود وسائل مانع تھے۔ پھر اچانک فسادات اور تشدد کے واقعات نے ہمیں دھکیل کر دلدار گوٹھ میں پہنچا دیا۔ ۱۹۹۰ میں حیدر آباد میں پیش آنے والے کسی واقعے کے جوابی ردعمل میں اورنگی میں واقع ایک بلوچ کالونی پر حملہ کیا گیا اور ۶۸ مکان جلا دیے گئے۔ بلوچوں نے جان بچا کر دلدار گوٹھ میں اپنے عزیزوں کے پاس پناہ لی۔ او پی پی نے ایسا ہی کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا جو ۱۹۸۷ کے مہاجر پٹھان فسادات کے دوران اختیار کیا تھا۔ کمشنر کراچی کے تعاون سے او پی پی نے تباہ شدہ مکانوں کی مرمت کی اور بلوچوں کو واپس لا کر ان کے مکانوں میں آباد کیا۔ ریلیف کے اس کام کے سلسلے میں ہمارا دلدار گوٹھ جانا ہوا جہاں وڈیرا اللہ بخش اور اس کے عمزاد محمد حسین سے میری دوستی ہو گئی۔

وڈیرا اللہ بخش نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اخبار نویسوں کی تحریروں نے مجھے بتایا تھا کہ وڈیرے بے تحاشا دولت اور جبر و ظلم کی بھیانک علامت ہوتے ہیں۔ مجھے اللہ بخش میں ایسی کوئی خصوصیت دکھائی نہ دی۔ وہ اپنی دولت یا طور طریقوں کے اعتبار سے گوٹھ کے دوسرے معمر لوگوں سے کسی بھی طرح مختلف نہ تھا۔ اسے قبائلی رواج کے مطابق گوٹھ کا سربراہ چنا گیا تھا۔ اس میں اپنے گوٹھ والوں کی حالت کے بارے میں حقیقی فکرمندی محسوس ہوتی تھی، اور وہ سب اس کا مشورہ مانتے تھے۔ بعد کے معاملات میں ہم نے اسے مکمل طور پر قابلِ اعتماد پایا۔

میری تمام زندگی دیہی ترقی کے کام میں گزری ہے۔ میں کومیلا، داؤدزئی اور گلگت کے دیہات میں کام کر چکا ہوں۔ چنانچہ جب میں دلدار گوٹھ پہنچا تو قدرتی طور پر میں نے ماہرانہ تجسس کے ساتھ ارد گرد نظر دوڑائی۔ مجھے بتایا گیا کہ دو سو سال پہلے رند بلوچ قبیلے کے لوگ پانی کے چشموں کے پاس آٹھ گوٹھوں میں آباد ہوئے تھے۔ دلدار گوٹھ انہیں آٹھ میں سے ایک ہے اور اورنگی سے مغرب کی سمت دس کلومیٹر دور واقع ہے۔ علاقے کی زمین بنجر ہے، بارش بہت کم ہوتی ہے، اور مکئی اور باجرے کی غیر یقینی کاشت ہوتی ہے۔ مویشی پالنا لوگوں کا بنیادی ذریعۂ معاش ہے۔ لیکن درخت کم ہیں اور چرائی زیادہ ہونے کی وجہ

سے بہرہ بھی تقریباً غائب ہے۔ گوٹھ کے بہت سے لوگ اور بکی جا کر روزی کماتے ہیں اور دودھ یا چارا بیچتے یا گدھا گاڑی چلاتے ہیں یا مزدوری کرتے ہیں۔ اس طرح کے کاموں سے وہ بھوکے مرنے سے تو بچ جاتے ہیں لیکن عزت کے حال سے نہیں بچ پاتے۔

جب میں نے گوٹھ والوں سے پوچھا کہ اُن کی حالت کیوں کر بہتر ہو سکتی ہے تو انھوں نے فوراً جواب دیا کہ انھیں تنخواہ دار ملازمت اور پانی کی نہر کی ضرورت ہے۔ یہ بات بالکل چاند کی فرمائش کرنے کے مترادف تھی۔ انھیں کوئی بھی کافی تعداد میں تنخواہ دار ملازمتیں یا پانی کی نہر فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میری بوڑھی آنکھیں ان کی سرزمین میں ایسی عظیم صلاحیت دیکھ رہی تھیں جسے وہ خود نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایسا دیکھا مواسطہ ان تک پہنچانے کی کوشش کی۔

دیکھو، تمھارے گوٹھ کے ستر خاندانوں کے پاس سات سو ایکڑ زمین ہے۔ کراچی کی عظیم مارکیٹ تمھارے بالکل قریب واقع ہے جہاں عمارتی لکڑی، پھلوں، سبزیوں اور دودھ کی لامحدود مقدار کھپ سکتی ہے۔ تمھارے مرد اور عورتیں اس زمین سے یہ سب کچھ پیدا کر سکتے ہیں، اچھا منافع کما سکتے ہیں اور دولت مند ہو سکتے ہیں۔ کیوں نہیں ہو سکتے؟

انھوں نے کہا، کچھ اگانے کے لیے پانی کہاں ہے؟'

میں نے کہا، یہ تو بچ ہے کہ ہم یہاں نواب شاہ کی طرح گنا یا چاول نہیں اگا سکتے۔ لیکن چشموں کا پانی تو موجود ہے، اور اگر تم اسے کفایت شعاری سے استعمال کرو تو درخت اور چارا اگایا جا سکتا ہے۔

کفایت شعاری سے استعمال کرنے کا کیا مطلب ہوا؟

اس کا مطلب ہے پاس کے چشمے سے گدھا گاڑی کے ذریعے پانی لانا اور ہر پودے کو پیالی بھر پانی دینا، جیسے چھوٹے بچوں کو دودھ دیا جاتا ہے۔ چھوٹے پودوں کو بس اسی جڑیں نم رکھنے کے لیے ذرا سا پانی درکار ہوتا ہے۔ جوں جوں پیڑ بڑے ہوتے جاتے ہیں، وہ اپنی ضرورت خود پوری کر لیتے ہیں، تمھاری زمین کو زرخیز کرتے ہیں، تمھارے جانوروں کو خوراک دیتے ہیں اور تمھیں دولت مند بنا دیتے ہیں۔

یہ سن کر اللہ بخش اور محمد حسین پہلے تو حیرت میں پڑ گئے۔ لیکن بہت دیر کی گرما گرم بحث کے بعد محمد حسین گدھا گاڑی میں پانی لا کر پودوں میں ڈالنے کا طریقہ آزمانے کو تیار ہو گیا۔

ٹھیک ہے، پانی تو ہم چشمے سے لا سکتے ہیں۔ لیکن جب تک زمین ہموار نہ کی جائے اور اس کے گرد باڑ لگا کر بکریوں کو روکا نہ جائے، یہاں کوئی پودا یا سبزی کیسے اگائی جا سکتی ہے۔ اور ان کاموں کے لیے ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے۔ اور نہ اچھی گائیں خریدنے کے لیے پیسہ ہے۔

اورنگی چیریٹیبل ٹرسٹ اس مسئلے کو اسی طرح حل کر سکتا تھا جیسے اس نے اورنگی کے گھریلو کاروبار کرنے والوں کو قرض دے کر اُن کا مسئلہ حل کیا تھا۔ میں نے کہا، ٹرسٹ تمھیں باڑ لگانے اور گائیں خریدنے کے لیے قرض دے دے گا، بشرطے کہ تم ماہانہ قسطیں ادا کرنے کا وعدہ کرو۔

لیکن، اس نے قطعی لہجے میں کہا، ہم اپنی زمینیں رہن نہیں رکھیں گے۔

ٹرسٹ ایسی کوئی شرط نہیں لگاتا۔ اگر اللہ بخش اور ایک اور معتبر آدمی تمھاری ضمانت دینے کو تیار ہوں تو تمھیں قرضہ مل سکتا ہے۔

میں نے محمد حسین کو اوپی پی کی نرسری میں آکر ۱۶ قسم کے جنگلی درختوں، ۱۴ قسم کے پھل دار درختوں، آٹھ طرح کی سرزمین میں اگنے والی جھاڑیوں اور گھاسوں کو دیکھنے کی دعوت دی جن سے اس کی سرزمین سونے کی کان میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ اس نے نرسری آکر یہ پیڑ پودے دیکھے۔ ہمارے سماجی کارکنوں حفیظ آرا بیگم اور اکرام جیوماں سے بھی اس کی اطمینان بخش بات چیت ہوئی۔ فروری ۱۹۹۱ میں اس نے ۲۵ ہزار روپے قرضہ لیا۔ پھر تو اُسے، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے، دھن سوار ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا، "آپ نے تو مجھے جیسے ہیروئن پلا دی ہے۔ دن رات میرے دماغ پر اپنے باغ ہی کا خیال سوار رہتا ہے۔" اس کی بیوی نے حفیظ آرا بیگم سے شکایت کی، "تم لوگوں نے میرے آدمی پر کیا جادو کر دیا ہے؟ وہ گھر پر رہتا ہی نہیں۔ اس نے اپنا پلنگ بھی اپنے پودوں کے پاس بچھا لیا ہے۔"

قرض کی رقم اور اپنی بچت کو ملا کر اس نے چار ایکڑ زمین کے گرد باڑ لگائی اور درخت اور چارا اگانے لگا۔ اس نے گائیں بھی اور خریدیں۔ پہلے پہل چھوٹے چھوٹے پودوں پر اس کی پیار بھری دیکھ بھال کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ ان میں سے کئی مرجھا کر ختم ہو گئے۔ پھر ایک خاندانی جھگڑے نے اسے تقریباً تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس کے ایک بھتیجے نے دوسرے بھتیجے کو قتل کر دیا اور معاملے کو دبانے کے لیے محمد حسین کو کافی پیسہ خرچ کرنا پڑا۔ لیکن وہ اپنے کام پر ڈٹا رہا۔ اب اس کا باغ بڑھ رہا ہے۔ اب اس کے پاس ۸۰ ناریل، ۵۰ چیکو، ۴۰ کھجور، ۱۵ انار اور بہت سے جنگلی درخت ہیں۔ اس نے چارا بھی اگا لیا ہے اور ڈھائی من دودھ روزانہ بیچ رہا ہے۔ اس نے، اپنے خاندانی سانحوں کے باوجود، قرض میں سے پندرہ ہزار روپے واپس کر دیے ہیں۔ وہ ایک چھوٹا پمپ بھی لگانا چاہتا ہے، لیکن ٹرسٹ اس وقت تک نیا قرضہ نہیں دیتا جب تک پچھلا قرضہ ادا نہ ہو جائے۔

بہت جلد دوسرے لوگوں نے بھی محمد حسین کی مثال پر عمل شروع کر دیا۔ ان میں پہلا دودا خان تھا۔ اس کے پاس مویشیوں کا سب سے بڑا گلہ پہلے سے موجود تھا۔ اب اس نے درخت، چارا اور سبزیاں اگانے کا فیصلہ کیا۔ دودا خان نہایت عمدہ انتظامی صلاحیت کا مالک ہے۔ اس نے زیرِ زمین چشمے تک پائپ اتارا اور پمپ لگا کر اپنی ضرورت کا پانی حاصل کر لیا۔ اس نے چار ایکڑ کے گرد اپنے لیے اور چار ایکڑ کے گرد اپنے بھائی کے لیے حد بندی کی، لیکن وہ اپنے مشروط طریقے سے کام کرنے کا قائل ہے، اس نے باڑ لگانے کے بجائے پتھروں کی چہار دیواری تعمیر کی اور مویشیوں کے لیے صاف ستھری ناندیں بنائیں۔ دودا خان نے مارچ ۱۹۹۲ میں ۵۰ ہزار روپے قرض لیے اور انھیں اپنی بچت میں ملا کر اپنا باغ اور باڑا تیار کرنے پر صرف کیا۔ اپنی دہقانی ہوشیاری اور محنت کے بل پر اب وہ خوش حال ہے۔ مئی ۱۹۹۳ تک، صرف ۱۴ مہینے کے عرصے میں، وہ ۱۵ ہزار روپے کی قسطیں ادا کر چکا ہے۔ ایک اور قسط کے ساتھ اس کا سود بھی ادا ہو جائے گا۔ اس کے باغ میں ۱۱۷ ناریل، ۱۰۰ کھجور، ۵۰ چیکو اور ۱۲ انار کے

پیڑوں کے علاوہ بہت سے کیکر، سفیدے، بیر اور املی کے درخت ہیں۔ وہ ہر روز پانچ من دودھ شہر بھیجتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ پچھلے موسم میں اس نے اپنی مرچیں بیچ کر گیارہ ہزار روپے کمائے۔
ٹرسٹ سے جوکھیو گوٹھ کے رسول بخش اور عبدالغنی، رئیس گوٹھ کے رحیم بخش اور بہت سے دوسرے لوگوں نے قرضہ حاصل کیا اور اسے اپنی زرعی اور تجارتی سرگرمیوں میں اضافے کے لیے استعمال کیا۔ قرض نے کسانوں کو اپنی پیداوار اور تجارت بڑھانے کا حوصلہ دیا۔ بقرعید کے موقعے پر گوٹھوں کے کسان اندرونِ سندھ سے جانور لا کر انھیں کچھ ہفتے کھلاتے پلاتے اور پھر شہر میں بیچتے ہیں۔ ان موسمی تاجروں کو سودخوروں سے قرض لینا پڑتا تھا اور اس کے عوض بھاری سود کے علاوہ آدھا منافع بھی ان کے حوالے کرنا پڑتا تھا۔ مئی ۱۹۹۳ میں ۲۲ بلوچوں نے اس کام کے لیے ٹرسٹ سے کل ۵۶ لاکھ پانچ ہزار روپے کا قرضہ لیا اور جون ۱۹۹۳ کے پہلے ہفتے میں پوری رقم، مع ۹۶۸۵ روپے (۱۰.۷ فیصد) سود کے، ادا کر دی۔ وہ ایسے معاملے کی پوری رقم بتانے میں آناکانی کر رہے تھے، لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ ان کا خالص منافع ۲۰ فیصد سے کم نہیں رہا ہوگا۔ کسی بینک کو ان بلوچوں سے بہتر قرض دار نہیں مل سکتے۔

او پی پی نے اپنے تجربے کا دائرہ اور نگی کے آس پاس واقع گوٹھوں تک ۱۹۹۰ میں وسیع کیا۔ پہلے دو برس یہ تجربہ صرف دو گوٹھوں ـــــ بلوچوں کے ولدار گوٹھ اور سندھیوں کے سہراب جوکھیو گوٹھ ـــــ تک محدود رہا، مگر ۱۹۹۲ میں نیشنل رورل سپورٹ پروگرام کے تعاون سے اسے ۲۲ گوٹھوں تک پھیلا دیا گیا ہے۔ اس تین سالہ تجربے سے گوٹھوں کی یہ صورت حال ظاہر ہوئی
کراچی میں ایک نے حد وسیع صارفوں کی مارکیٹ موجود ہے، اور گوٹھ اب سڑکوں، ٹرانسپورٹ اور مواصلات کے ذریعے شہر سے منسلک ہیں۔ گوٹھوں کے ارد گرد کی زمین میں جنگل اور پھلوں کے درخت اور گائے بھینسوں کے لیے چارا اگانے کی صلاحیت موجود ہے۔ ہر گوٹھ میں ہوشیار اور جسمانی لحاظ سے مضبوط کسان موجود ہیں جو ان امکانات کو عمل میں لا سکتے ہیں۔ انھیں تھوڑی سی مالی اور تکنیکی امداد درکار ہے، اور کسٹیومر مارکیٹ اور گوٹھوں کی زمین کی پیداواری صلاحیت کے درست علم کی ضرورت ہے۔ سب سے زیادہ ضرورت ان کسان تاجروں کو قرضے کی ہے جو یہ بینکوں سے مروجہ شرحِ سود پر، مگر بغیر فیتے اور رشوت کی مداخلتوں کے بغیر، حاصل کر سکیں۔ انھیں رہنمائی یا قرض فراہم کرنے کے لیے نہ تو بیرونی امداد کی ضرورت ہے نہ رعایتوں کی، نہ مختص کی ہوئی رقموں کی اور نہ افسروں کی فوج کی۔ رہنمائی دراصل دوطرفہ تعلیم کا ایک ارزاں طریقہ ہے اور قرض فراہم کرنے کا سلسلہ خود کفیل ہو سکتا ہے۔ کراچی کے ارد گرد کے ہر علاقے کے لیے جنگلی درخت اگانے اور مویشی پالنے کا ایک منصوبہ، جس کا بندوبست کسان تاجروں کے ہاتھ میں ہو، اس علاقے کی ترقی کا سب سے تیز رفتار اور کم خرچ نسخہ ہے۔
اس سلسلے میں پروجیکٹ کی پہلی ترجیح کسانوں کے گروپ قائم کرنا نہیں بلکہ باصلاحیت کسانوں کو

منتخب کر کے انہیں رہنمائی فراہم کرنا ہے تاکہ وہ خود کو باوسیلہ تاجروں میں اور اپنی زمین کو کراچی کی مارکیٹ کے لیے عمارتی لکڑی، پھلوں اور دودھ کے فراہم کنندہ علاقے میں تبدیل کر سکیں۔ پروجیکٹ مالی امداد یا رعایتیں نہیں بلکہ تکنیکی رہنمائی اور قرض فراہم کرتا ہے۔ پروجیکٹ کا انتظامی بوجھ بہت کم ہے، صرف تین کارکن، اپنے دیگر فرائض کے ساتھ ساتھ دیہی ترقی کے اس پروگرام پر بھی کام کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک برس کی مدت میں یہ کام ۲ گوٹھوں سے ۲۲ گوٹھوں تک پھیل گیا ہے اور اس سلسلے میں کسانوں کے اجتماع منعقد کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آس پاس کے گوٹھوں کے باشندوں نے اس نئے کام کو ہوتے ہوئے غور سے دیکھا اور اپنے بل پر یہی کام خود بھی شروع کر دیا۔ انہیں قائل اور آمادہ کرنے کی کوشش نہیں کرنی پڑی۔ آج قرضے کی بہت سی درخواستیں غور کے لیے موجود ہیں۔ پروجیکٹ کی پالیسی احتیاط سے آگے بڑھنے اور نئے قرضے جاری کرنے سے پہلے پچھلے قرضوں کی واپسی کی صورت حال کو غور سے جانچنے کی ہے تاکہ وفادار قرض داروں کا حلقہ قائم ہو جائے اور وہ نئے قرض داروں کے لیے ضمانت فراہم کر سکیں۔

۳۱ مئی ۱۹۹۳ تک کل ۱۴۱ دیہی قرضے جاری کیے گئے ۱۹ زمین اور پانی کے وسائل کی ترقی کے لیے، ۸۷ دودھ دینے والے جانوروں کی پرورش کے لیے، اور ۳۵ تجارت کے لیے۔ قرضوں کی تیز رفتار واپسی ہوشیار، محنتی اور کفایت شعار کسانوں کی حالت میں بہتری کا واضح ثبوت ہے۔ ۷ ۲ لاکھ ۲۷ ہزار پانچ سو روپے کے قرضوں میں سے ۱۴ لاکھ ۶۴ ہزار نو سو روپے لوٹائے جا چکے ہیں جس میں ایک لاکھ ۶ ۷ ہزار دو سو ۷ ۳ روپے کا سود شامل ہے۔ اب تک ڈوبنے والے قرض کی کوئی مثال سامنے نہیں آئی ہے۔ قرض کی قسط وصول کرنے کے لیے پروجیکٹ کے کسی کارکن کو گوٹھ میں جانا نہیں پڑتا، بلکہ قرض دار خود دفتر میں آ کر قسط جمع کراجاتے ہیں۔ نگرانی سے معلوم ہوا ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے، تجارتی سرگرمیاں پھیلی ہیں اور کسانوں نے منافع کمایا ہے۔ پانچ گوٹھوں میں، جہاں درخت اگانے کے لیے قرضے جاری کیے گئے تھے، عمارتی لکڑی کے ۱۳۲۸ ۱ اور پھلوں کے ۱۰۰۶۶ درخت لگائے گئے۔

ایسے گوٹھوں کی زرخیز زمین کو دیکھتے ہوئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کراچی کے لوگ دودھ اور مکھن بیرونی ملکوں سے منگوائیں، جبکہ یہ زرخیز زمین پیڑوں اور گھاس کی، اور گایوں بھینسوں کی پرورش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے اور ہوشیار اور محنتی کسان تاجر ہماری ضروریات پوری کرنے کو تیار ہیں، انہیں صرف تھوڑی سی رہنمائی اور تھوڑا سا قرض چاہیے۔ جانور پالنے کے سلسلے میں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ سات ہزار سال پہلے دنیا میں پہلی بار ماتھی، بیل اور بھینس کو وادیِ سندھ ہی میں سدھایا گیا تھا۔ اور جنگل اگانے کے سلسلے میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بابر نے اپنی تزک میں اٹک کے قریب گینڈوں کے شکار کا حال بیان کیا ہے۔

۶

بہت عرصہ پہلے میں نے یہ ضرب المثل سنی تھی کہ یقین کے زور پر پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں۔ معاشیات کے میدان میں یہ یقین کوئی کام شروع کرنے، خطرہ مول لینے، دقتیں اٹھانے، نقصان برداشت کرنے اور منافع کمانے کی صلاحیت کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ عام لوگوں کے درمیان کام کرنے کے عمل میں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ یہ صلاحیت کیسے کرشمے دکھا سکتی ہے۔ اس کی ایک مثال لیجیے — پاکستان کے جو محنتی لوگ ملک سے باہر گئے ہیں، انھوں نے کس طرح خود کو اور اپنے ملک کو خوش حال کیا ہے؛ اگر ان کی بھیجی ہوئی رقمیں نہ ہوتیں تو ہمارا ادائیگیوں کا توازن، جو خاصا خراب ہے، بالکل تباہ ہو چکا ہوتا، اور ان کے کثیر سرمائے کے بغیر ہمارے شہر اتنی ترقی نہ کر پاتے۔ اس صلاحیت کی ایک اور مثال اُن لوگوں کی ہے جو اپنے دیہات میں پڑے سڑتے رہنے کے بجائے جاگیرداری سماج کی زنجیریں توڑ کر شہروں کا رخ کرتے ہیں، مضافاتی بستیاں تعمیر کرتے ہیں، غیر رسمی سیکٹر کو وسعت دیتے ہیں اور درحقیقت ایک نئے عوام دوست سماجی نظام کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ملک سے باہر یا دیہات سے شہروں کی طرف آنے والوں کی انفرادی کوششوں کی کامیابیوں کا موازنہ ہمارے قومی منصوبوں کی ناکامیوں سے کیجیے۔ اس واضح فرق کا سبب کیا ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سرکاری اہلکار ہمارے عام لوگوں کی نسبت کمزور یقین کے مالک ہیں؟

ہمارے حکمران آئے دن بے گھر غریبوں کے لیے مکانات تعمیر کرنے کے وعدے کرتے ہیں۔ ترقیاتی ادارے بڑے بڑے منصوبوں اور بھاری بجٹوں کے اعلانات کرتے ہیں۔ یہ تین باتیں لازماً پیش آتی ہیں اول، مکانوں کی تعمیر دس دس بیس بیس سال تک چلتی رہتی ہے؛ دوم، غریب لوگ ان مکانوں کی قیمت ادا نہیں کر پاتے؛ اور سوم، یہ مکان خوش حال لوگوں اور سٹے بازوں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف کچی آبادیوں میں ہزاروں محنت کش لوگ اس دوران، کسی سرکاری محکمے کی مدد کے بغیر، اپنے لیے خود مکان تعمیر کر لیتے ہیں؛ اس سلسلے میں انھیں دلالوں کی قانونی یا غیر قانونی امداد اور ٹھیلے والوں کی تکنیکی اور مالی اعانت حاصل ہوتی ہے۔ صرف اورنگی میں، پچھلے پچیس برسوں میں ایک لاکھ کے قریب مکان اسی طرح تعمیر کیے گئے ہیں اور ان مکانوں میں مزدور، کاریگر، چھوٹے تاجر، کلرک، دکاندار اور ٹھیلے والے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے حکمران ہر روز بے روزگاروں کو روزگار دینے کے وعدے کرتے ہیں اور اس سلسلے میں عظیم منصوبوں کا اعلان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ایک ایسا وعدہ ہے جس کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ ایک طرف تو بدعنوانی اور بدانتظامی کے باعث ہماری معیشت تباہ ہوتی چلی جا رہی ہے؛ اور ہمارا رسمی سیکٹر اگر سکڑ نہیں رہا تو تیزی سے ترقی بھی نہیں کر رہا۔ دوسری جانب بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث روزگار کے طلبگاروں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ سفارشیوں کو

ملازمتیں دینے کے باعث صورتِ حال میں اور زیادہ بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ سرکاری محکموں، کارپوریشنوں، بلدیاتی اداروں، بینکوں اور فیکٹریوں میں اہلکاروں کی تعداد کا بوجھ لغویت کی حد تک بڑھ چکا ہے اور اس کے لیے منافع بخش کاروبار کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ ہر طرف کام کیے بغیر تنخواہ لینے کی ذہنیت کا دور دورہ ہے۔ تناسب اور توازن کا شعور غائب ہے کیوں کہ وزیر کی کوتاہ بینی توجہ مکمل طور پر پڑھے لکھے بے روزگاروں پر مرکوز رہتی ہے، اور وہ اس نہایت چھوٹی سی اقلیت کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیے رہتا ہے۔ سرکاری بیانات اور اخباروں کے شوروغوغا سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ لاکھوں سے مزدوروں کو روزگار فراہم کرنا نہیں بلکہ چند ہزار کالج گریجویٹوں کو تنخواہ دار ملازمتیں دلوانا ہے، چاہے کسی بھی طریقے سے کیوں نہ ہو۔

محنت کش طبقے کے لوگوں نے جس طرح سرکاری مکانوں کی تعمیر کا انتظار کیے بغیر اپنے مکان خود بنا لیے ہیں، اُسی طرح وہ سرکاری روزگار کا بھی انتظار نہیں کرتے بلکہ اپنا روزگار خود پیدا کر لیتے ہیں۔ اورنگی میں ہم نے مشاہدہ کیا کہ مہنگائی اور بے روزگاری کا مقابلہ کرنے کے لیے محنت کشوں کے خاندان چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں اور کاروبار قائم کر لیتے ہیں، اپنے گھروں کو ورکشاپوں میں تبدیل کر لیتے ہیں اور عورتیں مردوں کے ساتھ مل کر گھر کا روزگار پیدا کرنے میں برابر کا حصہ لیتی ہیں۔ یہ گھریلو کاروبار کراچی کی وسیع مارکیٹ سے پوری طرح پیوست ہیں۔ سستی لیبر اور اوپر کے اخراجات نہایت کم ہونے کی بدولت وہ کاروبار میں کامیابی سے مسابقت کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر ہمیں ان کی بے پناہ انتظامی صلاحیت نے متاثر کیا۔ اورنگی ٹرسٹ کی طرف سے قرضے دے کر ہمیں ان کی دیانت داری پر بھی کوئی شک نہ رہا۔ اگرچہ ہم نے اورنگی میں قائم گھریلو یونٹوں کی تعداد کا سروے نہیں کیا ہے، ہمارا اندازہ ہے کہ اس طرح کے دس ہزار یونٹ کام کر رہے ہیں۔ ٹرسٹ ابھی ان میں سے ۲۰ فیصد تک بھی نہیں پہنچ سکا ہے۔ ٹرسٹ کے قرض دار یونٹوں میں سے ۳۵۵ یونٹ مکمل طور پر عورتوں کے زیرِ انتظام ہیں۔

اس میں کسی شبے کی گنجائش نہیں کہ محنت کش طبقے کے لوگ محنت کی عادت اور کاروبار کی صلاحیت کی تربیت زندگی کے سخت گیر مدرسے میں حاصل کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہم گریجویٹوں کو (جن میں میں بھی شامل ہوں) کالج کی تعلیم نازک مزاج بنا دیتی ہے۔ ہم محفوظ، مراعات یافتہ اور آرام دہ ملازمتوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہم سختیاں اٹھانے اور خطرہ مول لینے سے ڈرتے ہیں۔ ہم مفت کی روٹی کھانے کے دلدادہ ہیں۔ مفت کی روٹی کی رغبت ہی ہماری بدعنوانی اور بدانتظامی کی بنیادی وجہ ہے۔

ہمارے تجربے اور تحقیق کی بنیاد پر اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے محنت کش خاندانوں میں کاروباری صلاحیت اور امنگ وافر مقدار میں موجود ہے۔ لیکن ہمیں مزید خوشگوار حیرت اس بات پر ہوئی کہ ہمارے قرض داروں میں کالج کے گریجویٹ بھی تھے جو وقت اٹھانے، محنت کرنے اور خطرہ مول لے کر گھریلو کاروبار قائم کرنے کو تیار تھے۔ میں ان میں سے چند کے مختصر حالات پیش کرتا ہوں۔

محمد جمیل گلشنِ بہار، سیکٹر ۱۶، اورنگی میں رہتا ہے۔ وہ بہاری یعنی بنگلادیش سے آیا ہوا اردو

ہونے والا مہاجر ہے۔ اس نے ۱۹۷۶ میں بی اے پاس کیا اور ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر اسے ملازمت نہ ملی۔ اسے اپنے گھر کے آٹھ افراد کا پیٹ پالنا تھا۔ اس نے چند سو روپے حاصل کیے اور سبزیاں بیچنے لگا۔ وہ ہر صبح چار بجے سبزی منڈی جا کر مال لاتا ہے۔ اس کے گھر کی عورتیں سبزیوں کو دھوتی اور چھانٹ کر الگ الگ کرتی ہیں۔ ۱۹۹۱ میں جمیل نے اورنگی ٹرسٹ سے چھ ہزار روپے قرض لیے تاکہ اپنا کاروبار بڑھا سکے۔ اب اس کی روزانہ آمدنی دو سو روپے ہے۔ جولائی ۱۹۹۳ تک جمیل اپنے قرض کی اصل رقم میں سے چار ہزار روپے اور سود کے سات سو روپے ادا کر چکا تھا۔

محمد طفیل سیکٹر ۱۴ ای اورنگی میں رہتا ہے۔ اس نے ۱۹۸۹ میں بی اے اور اس کے بعد ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ اسے کوئی ملازمت نہ ملی۔ اس نے پہلے تین مشینوں پر پلاسٹک کی مصنوعات بنانے کا کام شروع کیا لیکن یہ کام چل نہ سکا۔ فروری ۱۹۹۱ میں اس نے ٹرسٹ سے ۱۰ ہزار روپے قرض لے کر گیس کے سلنڈر بیچنے کا کام شروع کیا جو خاصا منافع بخش ثابت ہوا۔ دوپہر تک وہ وکیل کے طور پر کام کرتا ہے اور دوپہر کے بعد اپنی دکان چلاتا ہے۔ اس نے اصل رقم کے پانچ ہزار روپے اور سود کے ۱۶۰۰ روپے ادا کر دیے ہیں۔

محمد عالم سہراب جوکھیو گوٹھ، گڈاپ، میں رہتا ہے۔ اس نے ۱۹۹۰ میں بی اے کیا اور تنخواہ دار ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ اس کے باپ نے، جس کے پاس ایک ہوٹل اور دو ٹرک ہیں، اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی مگر محمد عالم کو یہ کام گھٹیا معلوم ہوتا تھا۔ تاہم بعد میں اس کے خیالات بدل گئے۔ اس نے ہوٹل کے گاہکوں کو چائے اور کھانا دینا اور ٹرک چلانا سیکھ لیا۔ ۱۹۹۳ میں محمد عالم نے اپنے ایک ٹرک کی ری کنڈیشنگ کے لیے ۵۰ ہزار روپے کا قرضہ لیا۔ اب وہ ٹرانسپورٹر اور ہوٹل منیجر کا کام خوشی سے کر رہا ہے۔ اس کی آمدنی بڑھ چکی ہے۔ چھ مہینے میں اس نے ۱۷ ہزار روپے اصل رقم اور ۳ ہزار روپے سود ادا کر دیا تھا۔

رئیس سلیمان بہاری مارکیٹ میں رہتی ہے۔ وہ ہندوستان سے آنے والے مہاجروں میں سے ہے۔ اس نے ۱۹۷۶ میں ایم اے کیا اور شادی کر کے پاکستان آ گئی۔ اس کا شوہر بے روزگار تھا۔ رئیس نے بیوٹیشین اور ٹیلرنگ کی تربیت حاصل کی اور اپنے گھر میں بہت چھوٹے پیمانے پر کام شروع کر دیا۔ نومبر ۱۹۹۲ میں اس نے اورنگی ٹرسٹ سے رنگ رنگ سلائی مشین اور بیوٹی پارلر کے لیے قرضہ لیا۔ اب اس کے پاس آرڈروں اور گاہکوں کی بڑی تعداد ہے۔ وہ ایک اسکول کی صبح کی شفٹ میں استانی کے طور پر بھی کام کرتی ہے۔ اس کے شوہر نے فوٹوگرافی کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس نے اپنے قرض کے تین ہزار چار سو روپے اور سود کے پانچ سو روپے ادا کر دیے ہیں۔

مدر جمال نے ۱۹۸۹ میں بی اے کیا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اس لیے اپنی ماں اور پانچ بہن بھائیوں کا خیال رکھنے کی ذمے داری اسی پر آئی۔ اسے ملازمت نہ ملی، چنانچہ اس نے بیوٹیشین کی ٹریننگ لی اور جون ۱۹۹۱ میں ٹرسٹ سے

۱۵ ہزار پانچ سو روپے قرض لے کر گھر ہی میں بیوٹی پارلر کھول لیا۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ اب اس کا بیوٹی پارلر خوب چل نکلا ہے۔ اس کی آمدنی سے اس نے اپنی دو بہنوں کی شادی کردی ہے۔ وہ اپنے قرض میں سے ۱۴ ہزار ۳ سو روپے اور سود کے دو ہزار آٹھ سو روپے ادا کر چکی ہے۔

رضواں میر سیکٹر ۲ ای اورنگی میں رہتا ہے۔ ۱۹۸۳ میں اس کے باپ کے انتقال کے بعد اس کا خاندان غریب ہو گیا۔ اس کی حوصلہ مند ماں سلائی کر کے کسی طرح گھر کا خرچ چلاتی رہی۔ بعد میں اس کی سب سے بڑی بہن سلسلہ ایم اے کر کے لیڈی ہیلتھ وزیٹر بن گئی۔ رضواں نے ۱۹۸۹ میں بی ایس سی کیا اور کوئی اچھی ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ جہاں پر اس نے اپنے ایک اور گریجویٹ دوست کے ساتھ مل کر اپنے گھر میں چمڑے کے بے کار ٹکڑے جوڑ کر بٹیں بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ کھول لیا۔ جولائی ۱۹۹۱ میں رضواں نے ٹرسٹ سے ۴۵ ہزار روپے قرض لے کر ایک کمرہ بنوایا اور کچھ اور مشینیں خریدیں۔ اس کا کاروبار خوب پھیل گیا اور اب دس کل وقتی مزدوروں اور محلے کی آٹھ جز وقتی کارکن عورتوں کو روزگار فراہم کر رہا ہے۔ اس کے کارخانے میں ہینڈ بیگ اور پرس تیار ہوتے ہیں۔ رضواں کے دو چھوٹے بھائی کالج میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ سلائی کا بھی کام کرتے ہیں۔ رضواں قرض کے ۱۱ ہزار ۸ سو ۵۰ روپے اور سود کے ۴ ہزار پانچ سو بیس روپے ادا کر چکا ہے۔

محمد احمد اورنگی کے سیکٹر ۵ ای میں رہتا ہے۔ اس کی ماں ایک ہوشیار عورت ہے جس نے او پی پی کی درخواست پر ۱۹۸۴ میں عورتوں کا پہلا ورک سنٹر قائم کیا۔ پہلے پہل اسے اپنے قدامت پرست ہمسایوں کی طرف سے لعن طعن اور طنز واستہزا کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کے عزم کی بدولت یہ سنٹر نہ صرف تجارتی طور پر کامیاب رہا بلکہ اس نے دوسری سفید پوش گھریلو عورتوں کے لیے مثال بھی قائم کی۔ نو برس کے عرصے میں اورنگی بھر میں سلائی کے سینکڑوں مرکز کھل گئے۔ زاہدہ بیگم کا سنٹر ایک دومنزلہ مکان میں قائم ہے اور تقریباً سو عورتیں وہاں کام کرتی ہیں۔ اس کا منجھلا بیٹا احمد اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران بھی اس کاروبار میں سرگرمی سے شریک رہا۔ بی اے کرنے کے بعد اس نے کل وقتی طور پر سنٹر کا انتظام سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک ہوشیار ماں کا ہوشیار بیٹا ہے۔ زاہدہ بیگم کو سنٹر کی سلائی مشینیں خریدنے کے لیے ۵۷ ہزار روپے کا قرضہ دیا گیا تھا۔ وہ ۲۳ ہزار روپے لوٹا چکی ہے۔ پھر اس نے مکان کی دوسری منزل بنوانے کے لیے ۶۵ ہزار روپے کا قرضہ لیا جس میں سے ۴۴ ہزار روپے کی اصل رقم اور ۵ ہزار روپے سود ادا کر چکی ہے۔

جوں جوں ہمارا کام آس پاس کے گوٹھوں میں پھیل رہا ہے، وہاں بھی ہمیں باہمت گریجویٹ نوجوان ملتے جا رہے ہیں۔ سہراب جوکھیو گوٹھ کے محمد عالم کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں عبدالغنی جوکھیو بھی ملا۔ وہ گریجویٹ ہے اور کراچی کے ایک دفتر میں پی آر او کے طور پر ملازم ہے، لیکن اب بھی گوٹھ ہی میں رہتا ہے۔ ستمبر ۱۹۹۱ میں اس نے اورنگی ٹرسٹ سے ۲۰ ہزار روپے قرض لیے اور اپنی بچت کے ۲۵ ہزار روپے ملا کر اپنے کنویں کو گہرا کیا اور اس پر ایک پمپ لگا لیا۔ پہلے اسے اور

اس کے گوٹھ والوں کو پیسے کا پانی خریدنا پڑتا تھا؛ اب وہ پانی کنویں سے حاصل کرتے ہیں۔ عبدالغنی نے عمارتی لکڑی کے درخت، پھل دار پیڑ اور سبزیاں اگانی شروع کر دی ہیں۔ اس سے اسے خاصی آمدنی ہوتی ہے جو پیڑوں کے بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔ اس نے اپنا پورا قرض، مع ۳ ہزار ۷ سو ۱۲ روپے سود کے، چکا دیا ہے۔

آخر میں ایک بزرگ سماجی کارکن، فقیر جوکھیو گوٹھ کے پسندیدہ فقیر، کے دو بیٹوں کا ذکر کروں گا۔ یوسف کو ایم بی بی ایس کرنے کی آرزو تھی، جو پوری نہ ہو سکی۔ وہ صرف بی اے کی ڈگری حاصل کر سکا۔ جہاں جہ اس نے ہومیوپیتھی سیکھی اور ایک میڈیکل اسٹور کھول لیا۔ مارچ ۱۹۹۱ میں اس نے ٹرسٹ سے دس ہزار روپے قرض لے کر اپنی دکان کو وسیع کیا۔ وہ پورا قرض، ۱۶۲۵ روپے سود سمیت، لوٹا چکا ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی رسول بخش بھی گریجویٹ ہے۔ وہ بھی گوٹھ ہی میں رہتا ہے۔ اس نے عمارتی لکڑی اور پھلوں کے درخت لگائے ہیں اور سبزیاں اور پان اگا رہا ہے۔

زندگی کا سخت گیر مدرسہ ہمارے محنت کش طبقے کے لوگوں کو محنت، ہوشیاری اور کفایت شعاری سکھاتا ہے۔ دوسری طرف ہماری کالج کی تعلیم ہمیں آرام پسند اور مفت کی روٹی کا شوقین بنا رہی ہے۔ افسوس کہ یہ نجات کا راستا نہیں ہے۔ ہمیں اپنے محنت کشوں کی پیروی کرنی چاہیے، کیوں کہ ان کا اختیار کیا ہوا محنت، ہوشیاری اور کفایت شعاری کا راستا ہی نجات کا راستا ہے۔ یہ اچھا شگون ہے کہ کچھ گریجویٹوں نے بھی ان کی پیروی کی ہے؛ ہمیں امید کرنی چاہیے کہ اَور لوگ بھی یہی راستا اختیار کریں گے۔

۷

اخبار پڑھنے کی لت کے شکار دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی روایت اور جدیدیت کی روزمرہ خوراک لیتا ہوں جس کے منطقی نتیجے میں مجھے بھی مروّجہ ذہنی انتشار — یعنی شناخت کا بحران — حاصل ہوتا ہے۔ تب مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں یا تو احمق ہوں یا بدتر بن چکا ہوں۔ تاہم اپنی ہوش مندی کو برقرار رکھنے کے لیے میں ہر روز اورنگی کے محنت کشوں کے پاس جاتا ہوں۔ ہمارے اونچے طبقے کی طرح، ہمارے حیرت زدہ نظریہ پسندوں کی طرح، وہ لوگ بھی ایک عظیم تبدیلی کے عمل سے گزر رہے ہیں، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے ذہنوں میں کسی انتشار کا گزر نہیں ہے۔

میں پندرہ برس سے ان لوگوں کا مشاہدہ کر رہا ہوں، اور ان کے لیے میری تحسین بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ زندہ رہنے کے فن میں زبردست مہارت رکھتے ہیں۔ وہ خواب آلود آنکھوں والے نظریہ بازوں سے نہیں بلکہ اپنی انسانی جبلتوں سے رہنمائی حاصل کر کے ماضی اور حال کا ایک ہم آہنگ امتزاج پیدا کر رہے ہیں۔ انھیں کسی بیرونی کلچر سے نگل لیے جانے یا اپنی شناخت کے گم ہو جانے کا کوئی خطرہ محسوس

نہیں ہوتا۔ کسی مضبوط پیڑ کی طرح ان کی جڑیں مٹی سے پیوست ہیں اور ان کی شاخیں مغربی ہواؤں کو خوش آمدید کہتی ہیں۔

اورنگی کے لوگوں نے ورثے میں تین بنیادی روایتیں پائی ہیں مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی۔ دراصل یہ ایک ہی کلچر کے تین مختلف رخ ہیں۔ اس وقت یہ پرانا کلچر ایک جدید شہر کے زبردست دباؤ میں زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لوگوں کا حسبی ردعمل ایسی پرانی اقدار کو بیک وقت باقی رکھنے اور ان کی شکل تبدیل کرنے کا ہے تاکہ ماضی اور حال دونوں سے ان کا رشتہ برقرار رہے، تاکہ وہ مروجہ معنوں میں قدامت پرست یا جدیدیت پرست بننے سے محفوظ رہ سکیں، تاکہ وہ احمق بننے یا سدروں میں تبدیل ہو جانے سے بچ سکیں۔

مذہبی روایت لوگوں کا رشتہ کائنات کے خالق سے، غیبی قوتوں سے اور ایسے ساتھی انسانوں سے جوڑتی ہے۔ ان لوگوں کے لیے مسجد روحانی اور سماجی قوت کے مرکز کے طور پر آج بھی اتنی ہی زندہ ہے جتنی ماضی میں تھی۔ سب سے قائم ہونے والے سیکٹر میں ایک مسجد بنائی جاتی ہے اور اس میں ایک امام کو مقرر کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۲ کے ایک سروے سے معلوم ہوا تھا کہ گزشتہ تیرہ سال کے عرصے میں مقامی کمیٹیوں نے ۱۶۸ مسجدیں تعمیر کیں، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ان سب کے امام علاقے کے باہر سے بلوائے گئے تھے۔ بظاہر اورنگی کے لوگوں کو یہ متبرک پیشہ اختیار کرنے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔ اماموں کا روحانی رہنماؤں کی حیثیت سے احترام کیا جاتا ہے لیکن سیاسی رہنماؤں کے طور پر انہیں ووٹ نہیں ملتے۔ مدرسوں کو ثواب کی خاطر خوب چندے دیے جاتے ہیں، لیکن خود اپنے بچوں کو لوگ اسکول ہی بھیجنا پسند کرتے ہیں۔

اپنے آباواجداد کی طرح اورنگی کے لوگوں نے روحانی قوتوں سے اپنا رشتہ برقرار رکھا ہے اور کسی مشکل کا سامنا ہونے پر وہ انہیں سے رجوع کرتے ہیں۔ جب کسی بچے کو ٹائیفائڈ ہوتا ہے تو اس کی ماں اس کی صحت یابی کے لیے دعا مانگتی ہے۔ لیکن ایک بارک سا فرق محسوس کیا جاسکتا ہے ماں دعا بھی مانگتی ہے اور بچے کو ڈاکٹر کے پاس بھی لے جاتی ہے۔ ہماری لیڈی ہیلتھ ورکرز بتاتی ہیں کہ باخواندہ پٹھان عورتیں تک ہماری ہیلتھ ٹیموں سے بیماریوں کی روک تھام اور بچوں کی پیدائش کے درمیاں وقفہ بڑھانے کے طریقے بہت شوق سے سیکھتی ہیں۔ روحانی قوتوں اور دعاؤں سے ان کا رشتہ جدید حفظان صحت اور ضبطِ تولید سیکھنے میں قطعی مانع نہیں ہوتا۔ اورنگی میں روحانی رشتہ لوگوں کو ان مشکلات کا سامنا کرنے کی قوت اب بھی فراہم کرتا ہے جو انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ سماجی رشتے، جو احسان اور بھائی چارے کے مذہبی تصورات کی پیداوار ہیں، اب بھی خاندانوں، گلیوں اور محلوں کو جوڑے رکھتے ہیں۔ لیکن یہ روحانی یا سماجی رشتے بنیادی طور پر مذہبی نوعیت کے ہونے کے باوجود اورنگی کے لوگوں کے جدید زندگی کے طور طریقے اپنانے کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ اس کے برعکس، ان رشتوں کی بدولت ان کی زندگیوں میں نئے حالات کا سامنا کرنے کے لیے زیادہ لچک آجاتی ہے۔

خاندان کے رشتے اورنگی میں ہمیشہ کی طرح مضبوط ہیں۔ دوسرے طبقوں اور برادریوں کے برعکس، ابھی ان میں شکست و ریخت کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ متحد خاندان کسی بھی برادری کے لیے ایک بڑا اثاثہ ہوتے ہیں۔ اورنگی میں خاندانوں کے اندرونی اتحاد نے نئی بستیاں آباد کرنے اور انہیں رفتہ رفتہ بہتر بنانے کے عمل میں بہت اہم حصہ لیا ہے۔ اورنگی کی گلیوں میں گاؤں کی اجتماعی روح نئے سرے سے زندہ ہو گئی ہے۔ اسی اجتماعی روح کے بل بوتے پر اورنگی کی ہزاروں گلیوں کے رہنے والوں نے نکاس کا ایک پورا نظام اپنے خرچ پر اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا ہے اور اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جب تعمیر کے اس عظیم کام کے دوران لوگوں نے اپنے کم مایہ ہمسایوں کی مالی امداد کی۔ اس طرح مذہبی روایت کے پیدا کیے ہوئے خاندانی اور سماجی رشتوں نے نکاس کا جدید نظام اپنانے میں اورنگی کے لوگوں کی مدد کی۔

کوئی بھی مشاہدہ کرنے والا ذرا سی توجہ سے دیکھ سکتا ہے کہ مذہبی روایت سے برآمد ہونے والے چار اخلاقی اصولوں ـــــ محنت، کفایت شعاری، احسان اور انکسار ـــــ کی اورنگی میں (ظاہر ہے کہ عمومی طور پر) اب بھی پاسداری کی جاتی ہے۔ ہماری روایت کاہلی پر جفاکشی کو، شان و شوکت پر سادگی کو، خودغرضی پر احسان کو اور تکبر پر انکسار کو ترجیح دیتی ہے۔ اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اورنگی کے لوگ سخت محنت کرتے ہیں، سادہ زندگی گزارتے ہیں، اپنے ساتھی انسانوں سے حسنِ سلوک کرتے ہیں اور عیاشی اور بدمعاشی سے دور رہتے ہیں۔ ان خوبیوں نے انہیں اس قابل کیا ہے کہ انھوں نے کفایت شعاری سے کام لے کر اپنے مکان، اپنا نکاس کا نظام، اپنے اسکول، اپنے اسپتال خود بنائے ہیں اور اپنی ٹرانسپورٹ کا خود بندوبست کیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، میکس ویبر کی پروٹسٹنٹ اخلاقیات کے اصولوں کی طرح، اورنگی کے لوگوں کے مذہبی اخلاقی اصولوں نے ان کے مضبوط خاندانی رشتوں سے تقویت حاصل کر کے ان ہزاروں گھریلو صنعتوں اور تجارتوں کو جنم دیا ہے جن کے ذریعے سے وہ مہنگائی اور بے روزگاری کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

بڑے شہر کی صنعتی تہذیب کے دباؤ نے، جسے اورنگی کے باشندوں نے بھی خوشی اپنایا ہے، اور ہماری بدانتظامی کی شکار معیشت کی پیدا کردہ بے پناہ مہنگائی نے اورنگی کے معاشرے میں عورت کے کردار کو ڈرامائی طور پر بدل دیا ہے۔ پرانے پدرپرست طریقے سے زندگی گزارنا اب ناممکن ہو گیا ہے۔ ان لوگوں نے پردہ نشیں محتاجوں کے بجائے آزاد معاشی کارکن بننے کے عمل میں اپنے گھر کی عورتوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اورنگی کی گھریلو صنعتوں میں عورتیں اکثریت نہیں تو ایک بہت بڑی اقلیت کے طور پر حصہ لے رہی ہیں۔ یہ عورتیں صرف کارکن یا مزدور ہی نہیں، اپنے کاروبار کی خود مالک بھی ہیں۔ اس کے علاوہ لڑکیاں پہلے سے کہیں زیادہ بڑی تعداد میں اسکول میں پڑھ رہی ہیں۔ ۱۹۸۹ میں کیے گئے ایک سروے سے معلوم ہوا کہ اسکول کے ۸۰ ہزار طلبا میں ۳۶ ہزار (یعنی ۴۵ فیصد) لڑکیاں ہیں۔ اسکول کے ۲۳۸۹ استادوں میں سے ۱۶۴۶ (یعنی ۶۸ فیصد) استانیاں ہیں۔ مزید یہ کہ اورنگی کے

۸۷ فیصد اسکولوں میں مخلوط تعلیم رائج ہے۔

میں نے ان باروزگار عورتوں، ان استانیوں، ان طالبات کا بڑی احتیاط سے مشاہدہ کیا ہے۔ بلاشبہ یہ عورتیں ہمارے معاشرے کا ایک بالکل نیا مظہر ہیں۔ وہ میری ماں کی طرح پردہ نشیں نہیں ہیں۔ عملی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے باوجود انھوں نے پرانی تہذیب کے نسوانی وقار کو قائم رکھا ہے۔ وہ میری ماں کے برعکس نہ چادر اوڑھتی ہیں نہ چاردیواری میں قید رہتی ہیں، اس کے باوجود بنیادی طور پر ان کے طور طریقوں میں اُتنی ہی حیاداری موجود ہے جتنی میری ماں کے طور طریقوں میں تھی۔

میں ان باروزگار عورتوں، ان استانیوں اور ان طالبات کے وجود کو اورنگی کے لوگوں کی سب سے نفیس کامیابی سمجھتا ہوں۔ یہ عورتیں ماضی اور حال کے درمیان ایک زندہ رشتے کی سب سے نمایاں مثال ہیں، اور اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی ہماری تیاری کی بہترین علامت ہیں۔

**

اختر حمید خان کراچی شہر کی محترم ترین شخصیات میں سے ہیں۔ کراچی کے شہری انھیں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے روح و رواں کے طور پر جانتے ہیں۔ یہ سماجی تنظیم اپنے بنیادی فلسفے کے اعتبار سے دوسری غیر سرکاری سماجی انجمنوں سے مختلف ہے، اور اس کی پُشت پر اختر حمید خان کی وہ دانش کارفرما ہے جو ان کی زندگی کے قیمتی تجربات کا حاصل ہے۔

اس انتخاب میں شامل مضمون کا متن اُن کی کئی انگریزی تحریروں کا ترجمہ اور تدوین کر کے تیار کیا گیا ہے۔ ان تحریروں کی تفصیل یہ ہے

1 "What I learnt in Comilla and Orangi",

2 "Personal Reminiscences of Change"

3 "The Good Earth of Dildar Goth",

4 "Learning lessons from Orangi",

5 "Graduate Entrepreneurs"

ان پانچوں مضامین کو یونیسیف کے زیرِاہتمام مارچ ۱۹۹۴ میں اسلام آباد سے ایک مجموعے کی صورت میں *Personal Reminiscences of Change* کے نام سے شائع کیا گیا۔ ان مضامین کے علاوہ اردو متن کی تیاری میں اختر حمید خان کی اس تقریر سے بھی مدد لی گئی ہے جو انھوں نے ۱۶ نومبر ۱۹۹۵ کو Megacities Crisis and Challenges کے موضوع پر آغا خان یونیورسٹی کے بین الاقوامی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کی تھی۔ اُن کے مضامین کا ایک انگریزی مجموعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، کے زیرِاہتمام شائع ہونے والا ہے۔

آصف فرخی

اس شہر میں رہنا

لوگ ایسے شہروں کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہی آئے ہیں۔ ایسے شہروں کو، انگریزی محاورے کے مطابق، میں چٹکی بھر نمک کے ساتھ لیتا ہوں۔

نہ جانے کب سے یہی سنتا آیا تھا آسماں کی کیا مجال کہ ہم سے چھڑائے لکھنؤ۔ میں نے اس لکھنؤ کے بارے میں پڑھا تھا جہاں میرے ابا پیدا ہوئے تھے۔

دلی جو اک شہر تھا عالم میں انتخاب، اور دلی کے کوچے نہ تھے اوراقِ مصور تھے وغیرہ، اس شہر کے بارے میں جہاں میری امی پیدا ہوئی تھیں اور جس کی نسبت سے میرے ننھیال والے اپنے نام کے آگے اس شہر کا نام لکھا کرتے تھے۔

یہ اور ایسی اَور بھی باتیں میرے ذہنی پس منظر کا حصہ ہیں۔ جس شہر میں مَیں نے آنکھیں کھولیں، اس شہر کے لیے میں ایسی باتیں نہیں کر سکتا۔

جن دنوں میں بڑا ہو رہا تھا، اُن دنوں کا کوئی احساس مجھے یاد نہیں کہ ہم کراچی میں رہ رہے ہیں، ارے، او ہو، ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا! پانی پینے اور سانس لینے کی طرح ایک بے رنگ و بو اور ہمہ وقت جاری لازمی کیفیت تھی کراچی میں رہنے کی۔ اب کہیں نہ کہیں تو رہنا ہے، کراچی ہی سہی۔ نہ یہ کہ اس شہر میں رہنا کوئی اہم یا معنی خیز بات ہے۔ اگر یہ کوئی خاص کیفیت تھی تو اس کا کوئی نام بھی نہیں تھا۔ ہم ایسے لوگوں کا بھی کوئی نام نہیں تھا۔ 'کراچی والے' میں اصطلاحی عصبیت کا ٹیکا تو کافی دنوں بعد لگا تھا۔ ممتاز مفتی نے نام وضع کیا 'کراچیے'، جسے سن کر مجھے املی کی چیاں یاد آ جاتی ہیں۔ میری نانی انہیں سکھا کر رکھ لیتی تھیں اور خاندان میں کسی موت کے بعد فاتحہ کے وقت کام آتی تھیں یہ چیاں۔ جو لوگ سیپارہ نہیں پڑھ سکتے تھے، ان پر کلمہ پڑھ کر گنتی کرتے تھے۔ کراچی کے ناموں کا اب شاید یہی مقصد رہ گیا ہے ـــــ مرنے والوں کی گنتی۔

مگر میں اُن دنوں کی بات کر رہا ہوں جب ہمیں کوئی بھی 'کراچی والے' نہیں کہتا تھا۔ 'دلی والے' ہیں، 'میری نانی کہیں محلے میں جاتی تھیں تو لوگ ان کے پیٹھ پیچھے کہتے تھے۔ وہ سن لیتی تھیں تو برا مان جایا کرتی تھیں۔ 'تم لوگ سمجھتے ہو دلی والے بس وہی ہوتے ہیں تیز مرچیں کھانے والے اور آریاؤں، جا

ریاؤں والے؟ ہم وہ سہیں ہیں!

اس کے علاوہ کبھی کبھی یہ سسے کو ملتا کہ سدوستانی ہیں - اب حو سسے کو ملتا ہے اُس میں ترد ترم کی سی قطعیت ہے۔ الو، آپ حھوٹ ںولتے ہیں، ہم سدھی سہیں ہیں، میری چھ سالہ بیٹی ںے ایسے اسکول کے ساتھیوں سے سں کر طے کر لیا ہے۔ سارے مہاحر دہشت گرد سہیں ہوتے. روزا ہ احںار میں کوئی ہ کوئی صاحب اقتدار تسلی دیتا ہے۔ ہم ایسی شباحت کسی ہ کسی مسی تعریف سے حاصل کرتے ہیں۔ ہم یہ ہیں حو وہ سہیں ہے۔ ہم اردو ںولسے والے ہیں —— حو سارے کے سارے دہشت گرد سہیں ہوتے۔ ہم کراچی والے ہیں —— اس لیے کہ ہم اور کہیں کے سہیں ہیں۔ (ہم کہیں کے بھی سہیں رہے —— ہم یہاں کے ہی سہیں رہے!)

اور مام کے ہ ہوںے پر مجھے اُس وقت بھی حیرت ہوئی تھی۔ میں چھوٹا سا ہی تھا حب میرے اںا مجھے پہلی ںار مشاعرے میں لے گئے۔ تحلص کیا ہوتا ہے اور مام کی ںسںت کے ساتھ ڈوئی ہتی ہے، یہ سب مجھے اںھوں ںے ہی ںتایا تھا۔ ملیح آںادی، لکھںوی، دہلوی، امروہوی، ںدایوںی ہولقوں کی طرح مسہ پھاڑے میں سب کو سںتا رہا۔

اسٹیج پر حگمگاتی ہوئی، مائیکروفوں پر ترمم ںکھ اتی ہوئی، وہ ایک محتلف، علیحدہ اور واضح دںیا تھی، حب کہ میں کچا کچا آدھ سا سا تھا۔

یہ سارے اچھے لوگ دور کیوں تھے، پاس کیوں سہیں آتے تھے؟

اں میں کوئی کراچوی کیوں سہیں ہوتا؟ میں ںے ماں سے پوچھا تھا۔

کیوں سہیں لکھا جاتا ہے؟ میں ںے پھر پوچھا تھا، حب اںھوں ںے کہا تھا کہ اس طرح کراچی کا مام تحلص کے ساتھ سہیں لکھا جاتا۔ تو پھر تم لکھ لیںا، اںھوں ںے ںیم تمسحر کے ساتھ کہا ہوگا۔

ںس میں ہی لکھ لوں گا میں ںے فیصلہ کیا تھا۔ تحلص بھی رکھا تھا، کیوں کہ شاعری تو کرںی ہی تھی —— یہ طے ہو چکا تھا۔ ںس تحلص کے مسلے پر گڑںڑ ہو گئی اور شاعری کی ںارات واپس ہو گئی۔ میں کسی ںتیجے پر سہیں پہنچ سکا۔ حس تحلص پر دراحی ٹھہرتا، ساتھ ہی یہ حیال بھی آتا کہ یہ تو صرف ایک کیفیت ہے، اس سے الگ کیفیت ہوئی تو کیا ہو گا۔ اور تحلص کے ںعیر کسی ںے کراچوی ماں کر ہی سہیں دیا، اںو تک ںے سہیں، حو اچھا بھلا صدیقی چھوڑ کر فرحی لکھںے لگے تھے۔ میری سالگرہ پر ساحر لدھیاںوی کی تلحیاں اور پرچھائیاں مجھے میں دیں تو ںہت اصرار کے ںاوحود میرے مام کے ساتھ کراچوی لکھ کر سہیں دیا۔ تم حود ہی لکھ لو، ہم سہیں لکھتے ایسے واہی تںاہی مام، اںھوں ںے حسب عادت ٹکڑا توڑ کر رکھ دیا۔ تحلص طے ہ ہو سکا، اس لیے شہر بھی ہاتھ سے ںکل گیا۔ ںعیر مقطعے کی چھ عزلیں بیاض میں لیے مسہ دیکھتا رہ گیا —— میں، undecided کراچوی، حس کے مام پر ڈوئی سہیں لگائی جا سکتی۔

اس سے کوں سا ایسا بھاری ںقصاں ہو گیا، اگر مام کی ںسںت ظاہر سہیں ہوئی؟ امںساط و افتحار کی قسم کا حدںہ سہیں محسوس ہوتا اس شہر کے حوالے سے، حس طرح حںگ احںار میں احمد ںدیم قاسمی صاحب کا

کالم، مع اس کی چھوٹی سی تصویر کے، جیتا تھا لاہور لاہور ہے ،(اور جس کے عنوان سے آگے نہیں بڑھا جاتا تھا کہ اگر لاہور یہ نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟) یا وہ دلی جو شاہد احمد دہلوی اور اشرف صبوحی کی کتابوں میں زندہ تھی۔ بلکہ وہ چھوٹا سا قصبہ فتح گڈھ بھی نہیں، جس کے جیتے جاگتے کرداروں سے میرے دادا کے سنائے ہوئے قصے آباد تھے۔ قصہ مختصر، جہاں ہے اور جیسا ہے کی بنیادوں پر ہم ایک شہر کے رہنے والے تھے۔ اور یہیں اس کی ہونی کے احساس نے ہم پر اپنا آپ منکشف کیا۔ یہ بھی نہیں کہ اس پر بیتنا پڑی ہو اور اس سے دور جا کر اس کا سُرکا اٹھا ہو۔ اس شہر سے دور رہنے کا باضابطہ طور پر اتفاق ہوا اور بوسٹن میں مَیں نے ایک مدت گزاری، مگر اس میں شہر والوں کو زیادہ اور شہر کو کم کم یاد کیا۔ اس کے بعد جب بھی تلوا کھجلایا، شہر چھوڑنے کا ملال دامن گیر نہیں ہوا۔ کالے کوسوں دور، جہاں گشت کے دوران مومباسا کی ایک سڑک تھی جس کے دونوں طرف گھاس کے قطعوں میں کچھ اس طرح کے مکانات تھے کہ کراچی کے بعض علاقوں کا باوقار سناٹا بے طرح یاد آیا۔ ۱۹۵۰ کی دہائی میں ایسے مکان اعلیٰ درجے کے سمجھے جاتے ہوں گے، اب ان کی لونی لگی دیواروں پر جابجا چونا جھڑنے لگا ہے، گول برآمدے اور آگے کو نکلی ہوئی کھڑکیاں 'پیریڈ' معلوم ہوتی ہیں۔ سمندری ہواؤں کے راستے میں بسے ہوئے شہر کیا ایک ہی طرح سال خوردہ اور عمر رسیدہ ہوتے ہیں؟ مجھے نہیں معلوم۔ دوسرے شہروں کے ایسے ہی کونے کھدروں میں کراچی کی جھلکیاں مجھے یاد آتی رہیں۔ ایک تصویر کھینچنے کے بعد کیمرے کی ریل آگے نہ بڑھی ہو تو ایک تصویر کے اوپر دوسری تصویر کھنچ جاتی ہے، پھر فلم کا اتنا حصہ صحیح طور پر ڈویلپ نہیں ہو پاتا اور نگیٹو دیکھو تو ایک منظر یا چہرے کے حدود حال میں سے پچھلی تصویر کے ادھورے، دھندلے نقوش جھانکنے لگتے ہیں۔ دوسرے شہروں کی جو امیجز میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی ہیں، ان میں سے بھی کراچی کے دھندلے، آؤٹ آف فوکس مناظر جھلکتے ہیں کہ ان کو نظر میں اتارتے وقت آنکھ پوری طرح آگے نہیں بڑھی تھی۔

جگہوں کے احساس کی طرف بعد میں آیا۔ میرا پہلا اور دیرپا احساس وقت کا تھا۔ زندگیاں وقت میں بڑھتی اور سفر کرتی ہیں، میں یہ سمجھ رہا تھا۔ اس گزرنے میں جگہیں ضروری ہوتی ہیں، ہر لمحے ہر قدم پر ہم کہیں نہ کہیں موجود ہوتے ہیں، اس احساس نے بہت بعد میں اپنی دریافت کروائی۔ یہ جگہیں مدتی رہتی ہیں —— کہیں ہم پر حاوی و غالب آ جاتی ہیں اور کہیں پس منظر کا حصہ بن کر، اس دھیمے پن کے ساتھ کہ کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ وقت اگر خطِ مستقیم میں آگے بڑھ رہا ہے تو زندگی کے گراف میں اسی موجودگی کا نقطہ لگانے (plot کرنے) کے لیے متوازی خط (axis) پر مقام کی نشان دہی کرنا ہوگی، کہ زندگی ایک سیدھی لکیر کی طرح آگے نہیں بڑھتی۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو زندگی کو بیش تر وقت کے پیمانے سے دیکھنے کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ اس پختہ ذہنی عادت کی وجہ سے ماضی کو میں نے 'گتہ گزر' ہوا لمحہ سمجھا، چھوڑی ہوئی منزل کم سمجھا۔ جس شہر میں یہ دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ بساط ہی نہ اٹھ جائے کہیں، میں اس شہر کو یاد کرتا ہوں کہ اس شہر میں اپنے وقت کو یاد کرتا ہوں؟ میں جن مکانوں میں رہا ہوں

اور جن گلیوں میں گھوما ہوں، وہ جگہیں بعض دفعہ یوں ہی بیٹھے بٹھائے یاد آتی ہیں اور آنے چلی جاتی ہیں۔ اگر میں ایسے وقت کو کاغذ پر اتارنا شروع کروں تو کراچی کا نقشہ بننے لگتا ہے۔ میری کل کہانی کا پلاٹ یہی ہے۔

وہ پہلی جگہ جس کا میں نے ہونا چاہا اور جو مجھ سے کترا کر نکل گئی، وہ لالوکھیت تھی۔ بس دو چار ہاتھ لبِ بام رہ گیا، چند ایک گلیوں کا فاصلہ۔ میں لالوکھیتا ہو جاؤں، میری شدید خواہش تھی۔ ناظم آباد نمبر ۴ اور لالوکھیت کے کسی درمیانی حصے میں، جس کی حد بندی بہت واضح نہیں تھی، پیدا ہوا تھا میں۔ (مدت ہوئی کہ وہ لیڈی ڈاکٹر فوت ہو گئی، اور اس کا میٹرنٹی ہوم منہدم کر دیا گیا۔ بلدیہ عظمیٰ کراچی کے جاری کردہ سرٹیفکیٹ پر مقامِ پیدائش کراچی درج ہے۔) روشن سراج کی چھت پر چڑھ کر میں جہاں تک دیکھ سکتا تھا وہ میرے بچپن کی مانوس دنیا تھی۔ اس سے آگے کہیں لالوکھیت تھا ــــ مجھے پتا تھا۔ امی اور چھوٹی خالہ وہاں سے سامان خریدنے جاتی تھیں، خاص طور پر کپڑے۔ امی ایک دفعہ بڑے بڑے پھولوں والا کپڑا خرید کر لائی تھیں جس کو دیکھ کر چھوٹی خالہ نے ناک بھوں چڑھالی تھی۔ بالکل لالوکھیتا لگتا ہے، انھوں نے کہا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہ کیسی جگہ ہے کہ ایک تو اس کھیت میں کپڑا ہوتا ہے، پھر دیکھنے ہی سے پتا چل جاتا ہے! یہی اُن بالوں کو دیکھ کر کہا گیا تھا جو مجھ سے بڑے لڑکے سائیکلوں پر آتے جاتے، ماتھے پر لچھے سا کر جوت جمی ہوئی مانگ نکالے نظر آتے تو مجھے بہت قابلِ رشک معلوم ہوتے۔ چھوٹی خالہ کا اعتراض سن کر میرا رشک اور بڑھ گیا ــــ بہت واضح اور دور سے پہچانے جانے والے لوگ ہوتے ہوں گے، شناخت کے باقی سارے مسائل سے مبرا! کسی علاقے سے اس طرح کا بھی تعلق ہو سکتا ہے کہ آدمی وہیں کا معلوم ہو؟ میں اور بھی حیران ہوا تھا۔ میں اس سے دور پیدا ہو گیا، شاید اسی لیے تعلق کے مسئلوں میں اُلجھتا رہتا ہوں۔ اس کے بعد لالوکھیت سے تعلق نہیں، آگ نظر آئی تھی۔ اُس دن سارے وقت گھر میں عجیب طرح کی باتیں ہوئی تھیں جن کی تفصیل مجھ سے چھپائی گئی، لیکن پھر بھی اتنا سمجھ میں آ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے اور اس گڑبڑ کے بیچوں بیچ لالوکھیت ہے۔ جب ایسا ہوتا تھا تو میں سمجھ جاتا تھا کہ مجھ سے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے، لیکن اُس دن شام ہو گئی اور سب چھت پر جا کر کچھ دیکھنے لگے۔ جس طرف مجھے بتایا گیا تھا کہ ادھر لالوکھیت ہے، وہاں جا بجا آگ لگی ہوئی تھی۔ آسمان دھواں دھواں تھا۔ ادھر کی خاموشی میں دور کا شور گھلا ہوا تھا۔ لالوکھیت پر حملہ ہو گیا ہے، چھوٹی خالہ نے مجھے چپکے سے بتایا۔ ایوب خان کے آدمی، یہاں کے لوگوں سے مس فاطمہ جناح کو ووٹ دینے کا بدلہ لے رہے ہیں۔ لالٹین اور گلاب کا پھول میں کچھ سمجھا، کچھ نہیں۔ دعا مانگو! مجھ سے کہا گیا۔ دعا مانگو کہ وہ لوگ لوٹ مار کرتے ہوئے، آگ لگاتے ہوئے لالوکھیت سے نکل کر یہاں نہ آ جائیں۔ لالوکھیت کی سرحد بہت واضح ہو چکی تھی۔ میں سرحد کے اِس پار پیدا ہوا تھا۔

اس سے بھی زیادہ واضح وہ سرحد تھی جس کے پار سے میرے لوگ آئے تھے۔ لکھنؤ، فتح گڑھ، آگرہ، بمبئی ــــ میرے ابا کے شہر یہ رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۴۷ میں وہ بمبئی میں تھے۔ اپنے ایک دوست کو کراچی تک کے لیے رخصت کرنے پانی کے جہاز پر آئے تو رش کے مارے اتر نہ سکے اور عرشے پر رہ گئے۔ چونکے تو جہاز سمندر میں تھا اور آ گئے کراچی۔ وہ ایک نئے شہر میں نئے سرے سے زندگی شروع کر سکتے تھے۔ میرے دادا نے بہت برہم ہو کر انھیں خط لکھا ہماری طرف سے تم پاکستان نہیں انگلستان چلے جاؤ، لیکن کم از کم اطلاع تو کرو۔ ابا کے پاکستان چلے جانے کی اڑتی اور فتح گڑھ کے آبائی مکان پر کسٹوڈین نے تالا لگا دیا تو سارے خاندان کو سمیٹ کر میرے دادا نے بھی پاکستان کا رخ کیا۔ ہم لکھنؤ جا رہے ہیں، کرائے کے مکان سے رخصت ہوتے وقت انھوں نے محلے والوں کو یہی بتایا تھا۔ انھیں جاتا ہوا دیکھنے کے لیے جو لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے، انھیں بھی یقین تھا کہ کیسا لکھنؤ اور کہاں کا کانپور، اب یہ کھوکھراپار سے پہلے رکنے والے نہیں۔ کھوکھراپار، جس کے آگے سیدھا کراچی غیر قانونی تارکین وطن کو راس آنے والے شہر میں پرمٹ ہوا کر آئے تھے وہ، شاید اسی لیے یہاں کچھ اکھڑے سے رہے۔ یہ اَور طرح کا شہر تھا، وہ اَور طرح کے آدمی۔

پاکستان چوک ماکر پر تھا۔ کراچی آنے کے بعد میرے ابا پاکستان چوک میں رہے تھے۔ دکھنی مسجد سے آگے، آؤٹرام روڈ پر دو کمروں کے ایک فلیٹ میں۔ اب وہ پہلوان والی گلی کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے کبھی کچھ اور نام ہو گا، اور شاید اس سے پہلے بھی، کون جانے۔ میری پھپھی اور پھپا آ گئے۔ پھر دادا اور دادی بھی وہاں آ گئے۔ فلیٹ چھوٹا، لوگ بہت۔ ماچس کی تیلیوں کی طرح، رات کے وقت سونے کا انتظام بس کر ہم مخطوط ہوا کرتے تھے۔ یہاں سے نکل کر وہ لوگ پابوش نگر میں بھی رہے اور عزیز آباد میں بھی، لیکن زیادہ مدت پیر الٰہی بخش کالونی میں گزاری، جہاں میرے دادا کا انتقال ہوا اور اس کے تقریباً دس برس بعد دادی کا۔ مجھے معلوم ہے کہ شہر یا گلی کوچے مرحوم کیسے ہو جاتے ہیں۔ دوسرے ہاتھ پر، میری ننھیال کا یہاں آنا تو دلی کی بپتا ہے۔ میرے نانا نانی لاہور سے یہاں آ کر پرانی نمائش پر رہے۔ میری امی اور ان کی بہنوں نے جیکب لائنز کے اسکول میں پڑھا ــــ جہاں کے سرخ کھپریل والی چھتوں کے پیلے پیلے مکان ڈھا دیے گئے ــــ اور اس کے بعد ویمن کالج فریئر روڈ میں، جس کی پرانی عمارت پر اکھڑتے ہوئے رنگ کے نیچے پتھر کے حروف سے اب بھی پڑھا جا سکتا ہے کمیا مہادویا پاٹھ شالا ــــ ماضی کی تہ میں ایک اَور ماضی، جیسے تصویر کے نیچے پینٹی مینٹو (pentimento) ــــ ماضی سے کھرچتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے۔ اس اکھڑے ہوئے رنگ کے اندر ایک نقشہ ــــ میرے نانا نے زمین خرید کر مکان بنوایا اور اس پر جلی حروف میں اپنا اور میری نانی کا نام لکھوایا روشن سراج۔ کئی لوگوں نے انھیں اس کے خلاف مشورہ دیا۔ ناظم آباد؟ غیر آباد، اجاڑ جگہ ہے، بالکل اللہ میاں کے پچھواڑے۔ چھمن میاں کہاں جا کر پھنس گئے؟ لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت لالوکھیت کی سڑک سے یہ لکھا ہوا نظر آتا تھا: روشن سراج۔ اب یہ سوچنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ درمیان کا علاقہ کبھی اس قدر ویران رہا ہو گا۔

ایک محلہ ناظم آباد چار نمبر سے بھی دور تھا یا پوش نگر۔ ہمیں اس بات پر بہت ہنسی آتی تھی۔ کھانے کی میز پر کوئی اگر ایک سرے پر بیٹھا ہوتا کہ سالن اور روٹی کا وہاں تک پہنچنا مشکل ہوتا تو کوئی نہ کوئی مانگ لگاتا بھئی ادھر بھی کچھ دے دو، ہم یا پوش نگر میں بیٹھے ہیں۔ وہ علاقہ تو کب کا شہر کے کیسے حصوں میں آ گیا، ہمارے یہاں یہ مذاق اب بھی چلتا ہے۔ شہر کا نقشہ ایک گھر کے مذاق سے زیادہ تیزی سے بدلتا ہے۔

اس طرف گھر تھا جہاں وہی دیکھی بھالی روز کی مانوس چیزیں تھیں، اور دوسری طرف لالوکھیت جہاں مار دھاڑ کا سامان تھا، جہاں واقعات پیش آتے تھے۔ مجھے شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا۔ ایک آدمی نے دو بچوں کو چڑیا سا کر لالوکھیت کے چڑیا بازار میں بیچ دیا، روزنامہ جنگ میں خبر چھپی تھی۔ (صبح کے وقت برآمدے میں بیٹھ کر میز پر ناشتہ جانے میں پاپا ڈبو کر کھاتے اور میں ایک فرماں بردار طوطے کی طرح انھیں اخبار پڑھ کر سنایا کرتا۔ میں اخبار پڑھنا سیکھ رہا تھا۔) امی بتاتی ہیں کہ اس خبر سے مجھے اتنا ڈر لگا کہ میں کمرے سے باہر نہیں نکلا مجھے بخار چڑھ گیا۔ بخار کی حالت میں کھڑکی کی سلاخوں میں سے املی کے پیڑ میں اٹکے ہوئے بجلی کے تار اور خاک آلود آسمان کی اہمیت مجھے یاد ہے ــــ ڈر کا رنگ ایسا ہوتا ہے۔ ایسے عجیب و غریب لوگ شہر میں ہوتے ہیں، میں نے سوچا ہوگا، کیوں کہ ان دنوں اخبار کی سرخی سے زیادہ اعتبار کس کا ہو سکتا تھا؟ شہر کردن توڑ بخار کی زد میں، ان دنوں کی ایک اور سرخی مجھے یاد ہے۔ اب کی بار کوئی بلا ایسی آئی ہوگی جو بچوں کی گردن کچی لکڑیوں کی طرح چٹاچٹ توڑ ڈالتی ہوگی۔ وبا کے حملے سے مختلف علاقوں میں کسی بچے ہلاک، ایسی خبریں ایک اوائلی خوف کو جنم دیتی تھیں اور بہت دنوں تک باتوں کا موضوع بنی رہتیں۔ اُن دنوں شہر میں ایسے ہی موضوع تھے۔ پھر کسی اخبار رسالے میں (لیکن اس کے بہت دن بعد) اس لڑکی کا حال بھی یقین و گماں کی کیفیت میں پڑھا تھا جو رات گئے مارش میں اکیلے گاڑی چلانے والے کو رکنے اور مدد کرنے کا اشارہ کرتی ہے، ایسے سرخ جوڑے اور سنگھار کے بارے میں بتاتی ہے کہ شادی کے فوراً بعد ٹریفک کے حادثے میں دولھا زخمی ہو گیا۔ وہ مدد مانگتی ہے، التجا کرتی ہے۔ وہ جو سراپا ترغیب ہے، ہوش و حواس پر بجلی گراتی ہے، ڈرگ روڈ پر پی ای سی ایچ ایس کے قبرستان کے پاس گاڑی رکواتی ہے جہاں سڑک کراچی کی مخصوص ملگجی مارش میں ویران پڑی ہے، اور گاڑی سے اتر کر اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے، اپنے پیچھے ایک خلش چھوڑ جاتی ہے۔ چند برس پہلے ان ہی تاریخوں میں یہ حادثہ ہوا تھا اور دولھا ہلاک ہو گیا تھا، اس کے بعد دلہن بھی، اخباروں نے قیاس آرائی کی تھی۔ اب تو کوئی اس کا ذکر بھی نہیں کرتا، لیکن کئی برس تک اس کے دیکھے جانے کے واقعات اخباروں میں اس طرح چھپتے رہے جیسے امریکا میں اڑن طشتریوں کی عینی شہادت (sightings) کے واقعات چھپا کرتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ برسوں پرانے ان اخبار رسالوں کی گرد جھاڑوں، ان واقعات کو ڈھونڈوں جو کراچی کی شہری لوک روایات (urban folk-lore) میں۔ اس روٹی کا احوال بھی مجھے

یاد ہے جو کسی بزرگ نے ایک مایوس عورت کو عنایت کی تھی اور ساتھ ہی ہدایت کہ یہ روٹی پانی کے برتن میں رکھی جائے اور جوں جوں روٹی بڑھ کر ایک سے دو ہو جائے، دوسری روٹی کسی اور مستحق کو دے کر اس کا پانی پیا جائے صبح نہار منھ اور تکلیف کی جگہوں پر لگایا جائے تاکہ محسوروں کی حاجت پوری ہو، بیماروں کو شفا ملے۔ میری بڑی خالہ کو، جنھیں ہم اماں کہتے تھے اور جو بحری حیاتیات کی پروفیسر تھیں، بہت جستجو تھی کہ یہ یقیناً جیلی فش کی کوئی قسم ہو گی، کیوں کہ بقول ان کے، کراچی کے ساحل اور سمندر مختلف اور متنوع حیاتیاتی وسائل سے مالامال ہیں۔ روٹی کے معجزات ایک آدھ بار پھر سننے میں آئے۔ اس وقت تک اوزون لیئر میں سوراخ کی خبر عام نہیں ہوئی تھی، ماحولیاتی تحفظ کا کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا اور میرے شہر کے لوگ معجزوں پر اعتبار کر لیا کرتے تھے۔ ایک رسالے میں وہ خط بھی چلا تھا کہ مقاماتِ مقدسہ سے آواز آئی ہے بہت جلد کچھ رونما ہونے والا ہے، جو شخص اس کا اعتبار کرے گا اور اس خط کی سات نقلیں بنوا کر دوسرے تک پہنچائے گا اسے خوش خبری دیکھنے کو ملے گی اور جو یقین نہیں کرے گا، نقصان اٹھائے گا۔ یہ روٹی اور یہ خط کئی برس بعد یاد آئے جب ایک افسانہ۔ مگر اس کے نقطے پر پہنچا ہوا تھا۔ میں ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن کوئی غیر متوقع خوشی حاصل نہیں ہوئی، افسانہ بھی رہ گیا۔ میں ان کو ایسی تحریر میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کراچی کے روایتی واقعات اور کرداروں کی Book of Grotesques ترتیب دے سکوں، ایک شہر کے خوف اور خواب کی کتاب جس کا راوی میں ہوں۔

خواب اور خوف کی عمارتیں جو انہدام کے لیے نشان زد کی جا چکی ہیں، ان عمارتوں کے شہر کے لیے کوئی Baedeker نہیں ٹی ایس ایلیٹ کی نظم Burbank with a Baedeker کی وہ سطریں

کیا وقت بھی شمع کی طرح گھٹتا ہے۔ تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے؟ کیا میں ریبیک کی مماثلت میں ہوں؟ یہ دھواں کیا اس نقشے میں سے اٹھ رہا ہے؟ میرے نانا کے انتقال کے بعد روشن سراج بک گیا۔ سب کے ایسے ایسے گھر ہیں، لیکن کوئی خاندانی گھر نہیں۔ بچپن کی یادیں خانماں برباد پھرتی ہیں۔ مجھ سے اب دیکھا نہیں جائے گا، لیکن سنا ہے کہ اس مکان کی پیشانی پر سے وہ نام مٹا دیا گیا ہے۔ نہیں معلوم اس گلی کو لوگ اب کس پہچان سے پکارتے ہوں گے؟

یا شاید اس مکان کو بھی ڈھا کر اس کی جگہ کچھ اور بنا دیا گیا ہو ــــ نیا مکان اور نئے مکین۔ پرانے نقشے مگر اس طرح بھلائے نہیں جاتے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ان مکانوں کے گرد و پیش، دیواریں، کمرے، کھڑکیاں، ان میں دھوپ چھاؤں کے بنتے بگڑتے روپ بہروپ بھی اسی طرح یاد آتے ہیں جیسے ان میں ہونے والی باتیں اور ان میں بسنے والے لوگ۔ اور یہ لوگ وہی رہتے ہیں، مکان بدل جاتا ہے۔ جیسے آنکھ وہی رہتی ہے، منظر بدل جاتا ہے۔ ایک محلے سے دوسرے محلے میں منتقلی ــــ مکانوں کی تبدیلی کے اس عمل میں ایک خاندان کے بڑھنے، آگے چلنے کی پوری تاریخ سمٹی ہوئی ہے۔ میرے بچالے پیر

الٰہی بخش کالونی کو چھوڑ کر سوسائٹی میں مکان بنوایا تو میرے دادا کا اس پر رواں تبصرہ تھا۔ انھوں نے بنگلہ بنوالیا ہے، اب اس کے لیے تو ان کو جان سامان بھی رکھنا پڑے گا، بیرے بھی اور مالی بھی۔ لیکن باجی آپا کا اعتراض بنیادی نوعیت کا تھا۔ اتنا بڑا گھر بنوالیا اور پیک تھوکنے کی کوئی جگہ نہیں۔ واقعی مسئلہ شدید تھا۔ ایسے گھروں میں پان کی پیک کہاں تھوکی جائے؟

مکانوں کے ساتھ رہن سہن بدل رہا تھا، ہم بدل رہے تھے۔ نشانیاں واضح تھیں۔ تبدیلی کا اندازہ اس وقت اور بھی زیادہ ہوتا جب ان رشتے داروں سے ملاقات ہو جاتی جن کا ملنا شادی غمی کی خصوصی تقریبات تک سمٹ کر رہ گیا تھا۔ یہ سارے رشتے دار شہر کی نہیں، اس کے مضافات میں آباد تھے۔ ان کی موقع بے موقع یاد مضحک امکانات کو جنم دیتی۔ کوئی خاندانی اجتماع ہوتا تو دبے دبے سوال مسکراہٹ میں سے دبے دبے نکلتے۔ اب تو دوسروں کے گھر میں باتھ روم بھی ناک پر دوپٹہ رکھ کر جاتی ہیں۔ دن لگ گئے ہیں! وہ وقت بھول گئیں جب برسات کے دنوں میں کھڈیوں، قدمچوں پر جانا پڑتا تھا ___ ان کو بڑا اعتراض ہے کہ غسل خانہ پیخانہ ساتھ ساتھ ہیں، ان کے ہاں کا تو پرانا دستور ہے کہ صحن میں پلنگ کھڑا کر کے نہا لیے ___ ارے، تم اس نام سے نہیں پہچانے؟ یہاں آ کر بدل لیا، ورنہ اصل میں تو یہ سرسری تھیں۔ فرخ آباد میں کوئی منے آزاد قوال نہیں تھے، وہ تو ہم فلاں صاحب کو کہتے تھے ارے وہی جن کی ایک بیٹی نکھیاں ٹھسکی ٹھسکی تھی اور اس سے چھوٹی جوت کلے نکلی ___ ارے وہی فلانی کے نکھٹو میاں، نام ہے جن کا بس مالی دھیاں دھیاں، کھاتے ہیں کباب اور سویاں ___ پھر لگے بلوتے بکنے؟ وہ کالا لونڈر نہیں، سعود آباد میں رہتے ہیں۔ مزاحیہ نظموں کی پوری لیں ڈوری لگا دی تھی اور چچا نے، جن کو فرمائش کے ساتھ سنا جاتا تھا۔ پھر ہمیں لے چل دلِ مضطر سعود آباد میں، پھر دکھا ہم کو وہی منظر سعود آباد میں، اور آگے بڑھ کر قوالی کی نذر ہیں۔ دل سعود آباد میں دل پر سعود آباد ہیں۔

سعود آباد ہی میں کیوں؟

شاید اس لیے کہ اتنی دور ہو گیا تھا کہ وہاں جانے کے لیے دوسرے شہر کے سفر کی طرح تیاری کرنا پڑتی تھی جب سے ہم یونیورسٹی منتقل ہو گئے تھے۔

اب شہر کے بچوں کے کھیلنے کے لیے پلے لینڈ اور فن پارک بن گئے ہیں۔ ہمارے بچپن میں کھیلنے کی جگہیں گلیاں اور مکان تھے۔ کسی کے گھر ملنے یا رہنے کے لیے جانا، چھٹیاں، عید بقرعید، سالگرہیں اور سب سے بڑھ کر روزمرہ کے روٹین سے آزادی دلانے والی شادی کی تقریبات ___ یہ بھی ہمارے لیے بہت بڑی تفریح۔ پیارے کی شادی مجھے یاد ہے جس کا ارمان میری نانی اور خالاؤں کو نہ جانے کب سے تھا۔ ایلو، سانچق ہو رہی ہے اور دوسرے بدن کی بیگم رحمت اللہ دروازے سے پکارتی ہوئی، صدقے واری

ہوتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔ (ارے ان کے باپ فلاں تھے۔ آدھی ممبئی ان کی تھی!) وہ آتی تھیں تو لوگ محفل میں سرگوشی کرتے تھے۔ پھر وہ ایک اَور طرح کی خبر بن گئیں۔ کراچی کا اجتماعی حافظہ انھیں یاد بھی رکھے گا تو قتل کی اُس لرزہ خیز واردات کے طور پر جس میں دن دہاڑے گھر کا اسباب اور زیور لُوٹ لیا گیا تھا۔ کیسے لوگ اور کیا انجام! اور دلی کی وہ خاندانی ڈومنی فرمائشی گالیاں گا رہی ہے جس کی پوپلے منھ والی آواز کو سُن کر مردوں کے پیٹ میں بل پڑ رہے ہیں اور عورتیں دوپٹے سے منھ چھپا رہی ہیں۔ وہ ڈومنی جانے کب کی مر کھپ گئی۔ اُس کا گھرانا تتر بتر ہوا تو ہوا، وہ سلسلہ ہی ختم ہو گیا اور اب کسی شادی میں یہ رسم نہیں ہو سکتی۔ اب تو شادی بیاہ کے گیتوں کی جگہ فلمی گانے چلنے لگے ہیں اور موقع بے موقع لڑکیوں کو کچھ اور یاد نہ آئے تو دمادم مست قلندر ہی۔

پھر انور چچا کی شادی یاد ہے جس میں پڑوس کا مکان بھی لیا گیا تھا۔ (تب کراچی میں شادی ہال نہیں تھے اور شادیاں سڑک پر شامیانہ لگا کر کرلینا معمول تھا۔) اس مکان میں کھیلتے ہوئے اس کے روشن دان یاد ہیں جو اوپر کی منزل کے کمروں سے بیچی بیچی کھڑکیاں معلوم ہوتے تھے۔ اور بتی جلنے کے بعد جیسے کسی کھوپڑی کے چمکتے ہوئے دانت۔ پھر وہ پڑوس والے اطہر بھائی مر گئے اور مکان بک گیا۔ جن لوگوں نے مکان خریدا انھوں نے 'اکبری منزل' کی تختی اکھڑوا کر اپنے نام کی نئی تختی نصب کروا کے مکان کو ایک نئی شناخت دے دی۔ مکان کے در و دیوار تو نئے ہو گئے، اس میں جو لوگ گزرے اور جو وقت گزرا اُس کا حساب کہاں گیا؟

شہر کا جو علاقہ سب سے طویل مدت تک میرا رہا، وہ یونیورسٹی کیمپس ہے۔ میں وہاں گیا تو نو سال کا لڑکا تھا اور واپس آیا تو زمانہ بدلا ہوا تھا ــــ اٹھارہ سال کی مدت۔ شہر سے بارہ میل پرے، اس زمانے میں کراچی یونیورسٹی کا ذکر اس طرح کیا جاتا تھا۔ کیمپس سے باہر جانا ہوتا تو ہم بھی یہ کہتے تھے شہر جا رہا ہوں۔ کہیں بھی جانے کے لیے خاص اہتمام سے شہر جانا پڑتا تھا۔ شاید اس لیے میرے اندر کراچی کے حوالے سے شہر سے تھوڑا سا الگ تھلگ ہونے کا احساس ہے ــــ مجھے بار بار شہر جانا پڑتا ہے۔

سبزی منڈی سے آگے سڑک کے ساتھ کوئی آبادی نہیں تھی، رات برات دوا بھی چاہیے ہوتی تو اس کی فراہمی جیل روڈ سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ جب ہم ۱۹۶۸ میں وہاں منتقل ہوئے ہیں تو یہ سڑک (جو اب یونیورسٹی روڈ ہے) کنٹری کلب روڈ کہلاتی تھی اور اس کی واحد نشانی ایرو کلب تھا جہاں ہم نے ایک آدھ گلائیڈر بھی اُڑتے دیکھا۔ اندھیرا ہو جانے کے بعد لوگ وہاں سے گزرنے سے کتراتے تھے۔ (آج اسی جگہ رات گئے ٹریفک کا اژدحام رہتا ہے۔) آمدورفت کا ذریعہ (اس وقت موٹر گاڑی امارت کی نشانی تھی) ایک بس تھی جو وقتوں کی پابندی سے چلتی تھی۔ جیل روڈ، گرومندر، صدر، اس کے تین اسٹاپ تھے اور ایک مدت تک کسی بھی جگہ جانے کا فیصلہ اس بات پر منحصر ہوتا تھا کہ وہ ان سے کس

سمت میں اور کتنی دور ہے۔ ہمارا شہر آنا جانا اسی کے حساب سے تھا۔ شہر سے نہیں، اس وقت میری ملاقات اس الگ تھلگ بستی کے گھمبیر درختوں، چڑیوں، پُروقار سناٹے اور مودب تنہائی سے تھی۔ آج وہاں داخل ہونے کے لیے ریسرچر کی اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ میں اب وہ بستی چھوڑ چکا ہوں اس سرے سے ہرے سناٹوں کی جستجو سے بھی جاتا جس میں ایسی آواز سنائی پڑتی ہے۔ درختوں کے سائے میں چہل قدمی اور خود کلامی کے وہ انداز شہر میں مجھے اب اور کہاں میسر ہیں۔

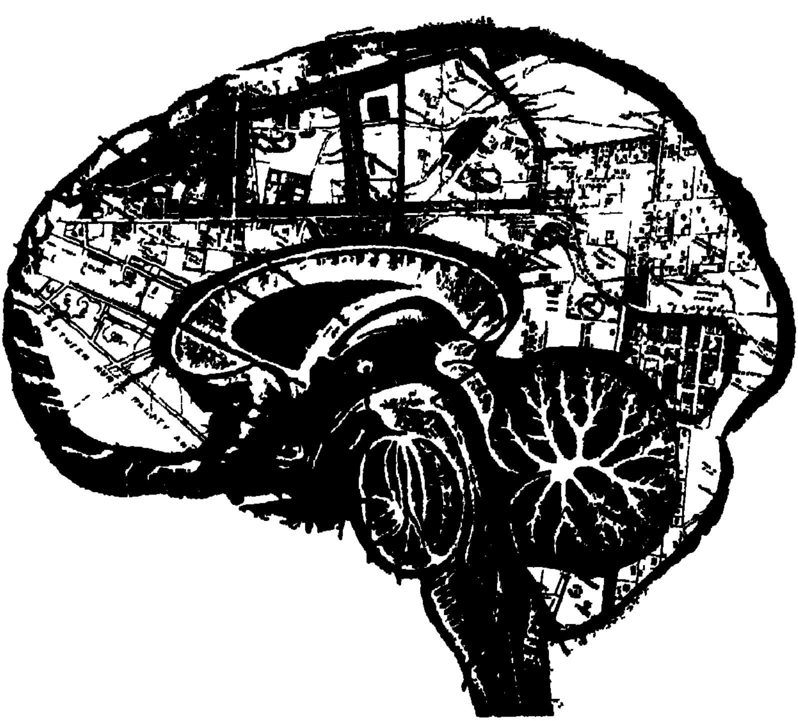
صبح ٹھیک پونے سات بجے ایک بس یونیورسٹی کیمپس کے اسٹاف ٹاؤن سے چلتی اور ہمیں اسکول لے جاتی، جو ظاہر ہے کہ شہر میں واقع تھا۔ پہلے پہل شہر کا مطلب ہی تھا اسکول اور اس کے گردونواح۔ یہاں سے شہر کی دیدودریافت کا مرحلہ شروع ہوا، ورنہ اس سے پہلے تو یہ جامد پس منظر تھا، بھدے رنگ دار چھپے ہوئے پردے کی طرح، جس کے سامنے کھڑا کر کے فٹ پاتھیے فوٹو گرافر تصویر کھینچ لیتے تھے جس کو واپس اپنے گاؤں جا کر آپ تحریہ دکھا سکتے ہیں کہ ماں دیکھ لیا کراچی۔ یہ اس تصویر کی سطح ٹوٹی اور اس نے اپنے اندر شمولیت کی دعوت دی۔ میں نے شہر گردی اختیار کی۔

سینٹ پیٹرکس اسکول صدر میں ہے اور ڈی جے سائنس کالج برنس روڈ سے آگے۔ گھر سے اسکول کالج تک، میں شہر کے نقشے میں ان ہی نقطوں کے درمیان حرکت کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نقشے میں وسعت آئی اور نئے مقام بھی آنے۔ اس ایک سڑک کی سیدھ اور پھر اس کے آس پاس تک محدود تھا کراچی کا جو ذہنی نقشہ (mental map) میں نے بنا رکھا تھا۔ بڑھنے بڑھتے تو اس میں مختلف ادراکی مقامات (perceptual spaces) شامل ہوتے گئے، ایک دوسرے سے منسلک ہوتے رہے۔ ذہنی نقشے میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ میں خود بھی اس سے ملتے جلتے عمل سے گزرتا رہا، اسی لیے میں اپنی زندگی کے ادوار یا تجربات کو شہر کے بعض علاقوں کے حوالے سے جانتا ہوں۔ اس بات کو اگر سینما کی اصطلاح میں دہراؤں تو اپنے آپ کو یوں سمجھا سکتا ہوں کہ زندگی کی بھی locations ہوتی ہیں جس کی مناسبت (relativity) سے ہمارے واسطے اور وسیلے، رہائش کا طور طریقہ، رہن سہن کا اسلوب، وقت گزاری کے مشاغل، دیگر دل چسپیاں اور مواقع، ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے، حلقۂ عمل اور دائرہ کار کا انتخاب اور تعین ہوتا ہے۔ یہ بات میرے دھیان میں آئی پیٹر گولڈ اور روڈنی وائٹ کے جغرافیۂ ادراک کے تجزیاتی مطالعے سے، کہ ہم مختلف جگہوں کی ذہنی امیج کیوں کر بنا لیتے ہیں (جہاں چہ نیویارک والوں کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکا کا ذہنی نقشہ ان لوگوں کے ذہنی نقشے سے مختلف ہوگا جو کیلی فورنیا میں رہتے ہیں، اور امریکا کو نیویارک کے بجائے کیلی فورنیا کی طرف سے شروع کرنے اور کھولنے کے عادی ہیں۔ لندن والوں کے لیے انگلستان کا محور ان کا اپنا شہر ہے، جس سے جتنا دور ہٹتے جائیے، ان کی واقفیت کا نقشہ محدود ہوتا چلا جائے گا۔) یہ امیجز دراصل معلومات عامہ کی selective channeling کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اسی کے زیر اثر ہم شہر کے مختلف حصوں کے بارے میں تاثراتی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ کون کس علاقے کو

کس طرح دیکھتا ہے، اس سے حدود جیسے مطالعے کا مقصد فقط تجسس کی تسکین نہیں ہے، بلکہ مجھے اس کا یہ جملہ کلیدی معلوم ہوتا ہے۔

"We are slowly realizing that people's perception of places is one of the things we must consider as we try to understand the pattern of man's work on the face of the earth "

میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ کراچی کا جو ذہنی نقشہ میں نے قائم کر رکھا ہے، اس میں میرے وقت کے ساتھ ساتھ بڑی معنی خیز تبدیلیاں آئی ہیں اور وہ اب محض عمارتوں، راستوں، گلی کوچوں کی واقفیت پر مبنی نہیں — اس میں میرے تجربے کا لہو دوڑ رہا ہے۔ یہاں لہو سنسناتا ہے، رگوں میں چلتا ہے، یہاں شعور کو جلا ملتی ہے، وہاں جبلت محض کی تسکین ہوتی ہے، اس راہ سے پیغام کی ترسیل ہوتی ہے اور نظر جس سے ہٹتی ہے، قلب وجاں میں اترتی ہے۔ کراچی کا نقشہ میرے لیے کچھ اس طرح کا ہو گیا



مادرِ جہاں بیگم نے اپنی عمر کا خاصا بڑا حصہ کراچی میں گزارا، لیکن میری دادی کو اس شہر کی گلیوں محلوں کا کوئی خاص اندازہ نہیں تھا۔ انھیں پاکستان چوک بھی معلوم تھا اور پیرالٰہی بخش کالونی بھی، لیکن ایک سے دوسری جگہ کیسے جاتے ہیں، اس سفر کا طے کرنا ان کے لیے کسی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ آخر عمر میں جب نسیاں مرض کی سی شدت اختیار کر گیا تو وہ گھر جانے کی ضد کرنے لگیں ــــ لکھنؤ، ان کی جائے پیدائش، ان کا میکا، جہاں ان کے خیال میں، گاڑی میں بیٹھ کر بس تھوڑی سی دور لے جانے کی بات تھی۔ انھیں دکھ تھا کہ کوئی اتنا سا بھی نہیں کر سکتا۔ کم و بیش یہی حال جمیلہ خاتون کا بھی تھا جو ہجرت ماجی آیا تھیں۔ قائم گنج کے قیصے کے ساتھ عمر کا بڑا حصّہ انھوں نے کراچی میں مختلف گھروں میں مسافر طریق، تقریباً یادرر کاب، گزارا۔ انھیں علاقوں کا بہت دھندلا سا اندازہ تھا۔ ایک مرتبہ کسی جگہ سے جاتے ہوئے وہ غلط بس اسٹاپ پر اتر گئیں۔ برقعہ اور بغل میں گٹھریاں، پوٹلیاں سنبھالتی خدا معلوم کہاں کی کہاں چل دیں۔ وہ تو بس کے مردانہ حصے میں سے بڑے میاں نے دیکھ لیا اور شور مچا کر بس رکوالی ورنہ وہ تو کھوئی گئی تھیں ــــ کراچی میں گم شدہ، جو شاید ہم سب ہیں۔ جیبوں میں گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر ہمیں رٹوا دیا گیا تھا کہ اگر کھوئے جائیں تو کوئی ہمیں ہمارے گھر پہنچا دے، اور پھر پکڑنے والوں سے بہت ڈرایا بھی گیا تھا۔ پھر بھی میں شہر کے بہت سے حصوں میں گم ہو سکتا ہوں۔ دراصل مجھے وہی علاقے یاد رہتے ہیں جن سے میرا کوئی نہ کوئی تعلق بن گیا ہے۔ اس شہر کے نقشے میں ہم سب اپنے اپنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں گھومتے رہتے ہیں ــــ اس دماغ کی طرح جس کا بیش تر حصّہ عالمِ امکاں ہی میں رہتا ہے۔ میرے مانوس علاقے مخصوص ہیں۔ امی گلشن اقبال سے نارتھ ناظم آباد جاتے ہوئے کئی بار راستا بھول چکی ہیں۔ ابا کو ڈیفنس سوسائٹی میں خیاباں اور اسٹریٹ نمبر میں دھوکا ہو جاتا ہے اور اکثر غلط گلی میں گاڑی مڑوالیا کرتے ہیں۔ نسیم غلط بس میں بیٹھ کر ناظم آباد کے بجائے ملیر پہنچ گیا اور خاصی دیر بعد چونکا۔ شہر کے نقشے میں ایسے ایسے مقام پر رہتے ہوئے ہم اپنے نقشے خود بنا لیا کرتے ہیں۔ ایک خاتون نے جو کوئی اچھی گھلی، گھر کی پابند نہیں تھیں، کسی حوالے سے پوچھا کہ وہاں کیا حال ہے، ارے بھئی وہیں اور نگی کورنگی جہاں تم جایا کرتے ہو۔ پھر میری ممی کا سب بھی ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دونوں میں فرق کیا ہے۔ اور اگر ہے بھی تو کیا ہوا؟ ایک معروف انگریزی رسالے سے وابستہ صحافی خاتون سے، جن کے نے باک تحریے ارباب اختیار کو پسینے چھوٹ سکتے ہیں، کراچی کی آبادی کے حوالے سے بات ہو رہی تھی کہ اک معمّا ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا، تو آبادی کا تخمینہ سن کر انھیں خاصی حیرت ہوئی۔ یہ سارا کراچی ہے؟ اور اس میں وہ سب بھی شامل ہیں، ناظم آباد، نارتھ ناظم آباد، نیو کراچی؟ اور اس سے آگے سپر ہائی وے پر جو پولٹری فارم ہیں؟ ان پولٹری فارموں سے آگے جہاں اور بھی ہیں! میرے دادا کہیں جانے کا سبب یہ بتایا کرتے تھے کہ ہم گھر سے نکلے تو فلاں نمبر کی بس کھڑی تھی، ہم نے سوچا للو فلاں کے ہاں ہوتے آئیں۔ وہ راستا تو نہیں بھولتے تھے لیکن پتا ڈھونڈنے میں دشواری ہوتی تھی۔ وہ لینڈ مارک کے سہارے چلنے کے عادی تھے۔ ایک مرتبہ کسی کا گھر ڈھونڈنا تھا، باقی لوگ ٹیکسی میں ساتھ تھے اور وہ بار

بار ٹیکسی رکوا کر راہ گیروں سے ایک ہی سوال پوچھے جا رہے تھے جس کا جواب لاعلمی میں ملتا تھا۔ کیوں صاحب، یہ رائل سویٹ میٹ مارٹ کس طرف ہے؟ یہ سوال کچھ مابعد الطبیعاتی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے۔ واقعی، کہاں ہے، کس طرف کو ہے، کدھر ہے؟ یہ کس کو خبر ہے؟

وہ جس طرف بھی ہو، اس شہر کے ذائقے مختلف ہیں ــــ مختلف ذائقے، مختلف تجربے۔ کسی بڑے شہر میں رہنے کے تجربے کو آڈن نے بڑی عمر کی عورت کے ساتھ ملوث ہونے سے مشابہ قرار دیا ہے۔ متنوع اور پختہ کار احساسات اس طرح جلد ہی حاصل ہو جاتے ہیں ــــ یعنی شہر سے رہ و رسم آشنائی۔ کراچی میرے لیے بھی وہ رہا ہے جسے فیض کی زباں میں کوچۂ دلدار کہیں گے (اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا) اور سری ملر کے مطابق دی لینڈ آف فک کہلائے گا۔ جسم وجاں میں ہلچل شہر میں چہروں کا ہجوم جھلکیاں تسکیں کا وہ پہلا سبق کہ احساسِ تشکر سے آنکھیں بند ہوتی جاتی ہیں۔ میری ناآسودہ خواہشوں اور محرومیوں کی یورش اور وفور کا شہر۔ میری آنکھوں سے چیونٹیوں کی ایک قطار نکلتی ہے اور شہر کی گلیوں سڑکوں پر دانہ دانہ چنتی ہے ــــ اس کھڑکی میں بھی دو آنکھیں، اس راہ پر کھلتے ہوئے ہونٹوں کا اجالا، کالج الیکشن کے نتائج کے دن اس عمارت کی چھت پر سے گلاب کی پتیاں برساتے ہوئے دو ہاتھ۔ ایک جلسے کی کارروائی کے دوران کسی کونے میں ایک ادھوری جھلک سے یہ اندازہ لگانا کہ یہ مال اور یہ گردن کیا اسی کے ہیں، اور کیا کسی ایک نقش سے اسے پہچان لینے کی منزل آ گئی؟ شہر کی عمارتوں پر میرے لیے تختی نصب کرنا تو ممکن نہیں، نقشے میں حساب رکھنا ممکن ہے کہ یہاں اپنا دل جوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا۔ اب میں بھی اسی راضی بہ رضا اطمینان کے ساتھ اس شہر کے بارے میں کہہ سکتا ہوں جس طرح سندھ کے غریب ہاری اپنے آبائی قبرستان کے بارے میں کہتے ہیں۔ ہمی انسان ہو مقام آہے۔

ترغیبات سے پورا شہر بھرا پڑا تھا۔ وہ بڑے مزے لے لے کر اس دنیا کے قصے سناتا تھا اور ہم منھ پھاڑے سنتے تھے گویا وہ کسی نئی دنیا کا سیاح ہے۔ میرے اسکول کے اس ساتھی کا نام ململاں فرہنگ تھا۔ سب اسے پیار میں بُلبل اور غصے میں بُل کہتے تھے۔ وہ ایک مرتبہ اپنے والد کے ہوٹل میں چائے پلانے لے گیا۔ سفید ٹائلوں والی دیوار پر شہنشاہ آریامہر اور شاہ بانو کی تصاویر نمایاں تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تصویریں غائب ہو گئیں؛ پھر ململاں اور اس کے والد بھی۔

وہ بہائی تھے اور زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ 'ایرانی ہوٹل کراچی کے مخصوص کلچراسکیپ کا حصّہ ہوا کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی پیسٹری اور چائے میں ایسی کوئی ناقابلِ فراموش بات نہیں تھی کہ اس پر شاہد احمد دہلوی کے سے انداز کا خاکہ لکھا جائے۔

شاہد احمد دہلوی کے چھوٹے بھائی میرے نانا تھے، جنھیں ہم بچے ابا جی کہا کرتے تھے۔ ان کو

پکانے، کھلانے، دعوتیں کرنے اور طرح طرح کے لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع رکھنے کا شوق تھا۔ چھٹی کے دن ان کی خواہش ہوتی تھی کہ سب اکٹھا ہوں، مل جل کر بیٹھیں، باتیں ہوں اور اہتمام سے پکی ہوئی چیزیں کھائیں۔ بے تحاشا بڑھتے ہوئے ٹریفک نے روز روز کے دیکھے بھالے راستوں پر اٹکل سے گاڑی چلانا ناممکن بنا دیا تب انھوں نے چھوڑا، ورنہ ان کا معمول تھا کہ سارے کنبے کو بھر کر چل پڑے سب کو جمع کرنے کے لیے۔ گاڑی کی ڈگی تک میں لوگوں کو بھر لیتے تھے۔ نجمی بھائی کے بیٹی داماد! دوسرے لوگ رشک اور طنز سے کہتے۔ کسی نے تندوری روٹی کی فرمائش کر دی تو یونیورسٹی آتے ہوئے انھوں نے گاڑی روکی (ان کے لیے کھانا قطعاً گھریلو عمل تھا اور بازار سے خرید کر سڑک پر کھانے کو بدتمیزی یا بھونڈا پن قرار دیا جاتا تھا) اور نہاری سے بھری ہوئی پتیلی اٹھائے مسکراتے ہوئے واپس آ گئے۔ بندو بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے بیٹے نے تندور کے ساتھ ہوٹل کھول لیا ہے، انھوں نے میری ماں کو بتایا جن کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ بندو کے بیٹے کے ہوٹل سے ہر روز بلاضرورت نہاری روٹی خرید کر لانے لگے تو ہم سب کی آنکھوں سے اشارہ کر کے پوچھتے بندو؟ اس کے بیٹے کا ہوٹل؟ اماں جی کا رعب اتنا تھا کہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پھر انھوں نے خود ہی بتایا۔ یہ بندو دلی میں فلاں نہاری والے کے ہاں کام کرتا تھا۔ شدو بھائی نے اس دکان کی نہاری کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ کباب بھی لگاتا تھا۔ خوب مصالحہ لگاتا تھا۔ یہاں کراچی میں تو لوگ ہر وقت نہاری کھا لیتے ہیں، اس لیے دکان لگالی۔ اس نہاری روٹی کا ذائقہ مجھے اب بھی دھندلا سا یاد ہے، حالاں کہ وہ دسترخوان مدت ہوئی سمٹ گیا۔ اماں جی نہیں رہے تو یہ شیرازہ بندی بھی نہیں رہی، اور یہ بھی ممکن نہیں رہا کہ سارے لوگ شام کو یوں ہی اکٹھا ہو کر بیٹھیں اور کھانا ساتھ کھائیں۔ چٹخارے دار نہاری والا بندو بھی غتربود ہو گیا۔ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ میں کسی اتفاق سے اُس طرف سے گزرا تھا جہاں اس کے بیٹے نے دکان کھولی ہوئی تھی۔ وہاں اب فاسٹ فوڈ کی بڑی سی دکان کھل گئی ہے جس میں دن کے وقت بھی بجلی کی روشنیاں جلتی رہتی ہیں۔

سب رشتے دار ہمارے، چھوٹی آنکھوں کے تارے —— انور چچا کی ایک اور خاندانی، تقریباتی نظم میں ٹیپ کا مصرعہ کچھ اس طرح کا تھا۔ ان ہی میں نسیم شمیم کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جنھوں نے کتنے ہی کاموں میں ہاتھ ڈالا لیکن مٹی مٹی ہی رہی۔ سب ہی کی چھوٹی بڑی رقمیں ان کی طرف نکلتی تھیں اور ایک مرتبہ قرض خواہوں کو کسی عزیز کا مکان اپنا ہی گھر بتا کر دکھا بھی گئے تھے جنھوں نے بعد میں ان شریف آدمیوں کا گھر سے نکلنا بھی دوبھر کر دیا۔ سب کو اندازہ تھا کہ یہ اپنے کسی نہ کسی آڑ بیاس میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن ان کا بھی کمال تھا کہ اب کی بار ایسی ہوا باندھی کہ جن جن کو چونا لگا کر جا چکے تھے، وہی ان کی باتوں میں آ گئے۔ کوڑیوں کے مول زمین مل رہی ہے، انھوں نے اطلاع دی اور فوراً ہی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے طریقے باور کرانے لگے۔ سوائے ایک کے، سبھی کے اپنے مکان تھے —— اور ان مکانوں کی اپنی انفرادی، سماجی تاریخ —— کسی کو سر چھپانے کے لیے چھت کی اشد ضرورت نہیں

تھی۔ پھر بھی سیم شیں نے نقشہ ایسا باندھا کہ سبھی تیار ہو گئے ابھی وہ جگہ بسی نہیں ہے۔ میرا ایک جاننے والا ہے۔ سرکاری پارٹی کا آدمی ہے۔ اور ان دنوں ان کی رتی چڑھی ہوئی ہے۔ اتنے پیسے لے گا۔ زمین مل جائے گی۔ بعد میں لکھا پڑھی بھی ہوتی رہے گی۔ کچھ کچا پکا تعمیر کر لو۔ خود نہیں رہنا تو کیا ہوا؟ ہاتھ کے ہاتھ دام کھرے کرا لو۔ ایک مہم جو پارٹی تشکیل دی گئی اور وہ سب اس جگہ کو دیکھ بھی آئے۔ ایک سنسان سی زمین پر کچھ حرکت کے سے آثار تھے۔ کراچی میں سرکاری املاک دو تین واسطوں سے کس طرح فروخت ہوتی ہے، حکومت کے اہل کار ایک چہرے پر دوسرا چہرہ لگا کر کس طرح دلالی کرتے ہیں، زمین گیری (land grabbing) کس طرح اقتداری سیاست (power politics) کے زیر سایہ فروغ پاتی ہے ـــــ ان باتوں کا کسی کو پوری طرح اندازہ نہیں تھا۔ کراچی کے بیش تر شہریوں کی طرح ـــــ جو یہ سمجھتے ہیں لیکن جانتے نہیں کہ ان کا شہر سونے کی چڑیا کیوں ہے اور کس کے لیے ـــــ ایک آدھ دوست، کچھ سسرالی رشتےدار بھی اس میں رقم لگا بیٹھے۔ سب کو اطمینان تھا کہ مشہور سیاسی راہ نما کے نام پر نام رکھا گیا ہے، بستی بن جائے گی، رقم نہیں ڈوبے گی، اور زمین تو کہیں گئی نہیں۔ زمین تو واقعی کہیں نہیں گئی لیکن اس پر قبضہ کرنے والے دوسرے تھے۔ وہ بیچ کا آدمی، وہی جو اپنے آپ کو سرکاری پارٹی کا کارکن بتایا کرتا تھا، وہ پھر ہاتھ نہیں آیا۔ سیم شیں بھی اپنے پرانے طریقہ واردات کے مطابق غائب ہو گئے۔

اس واقعے میں انھیں شک کی بنیاد پر بری کیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے الاٹمنٹ حاصل کرنے کی واقعی کوشش کی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں ان کی حیثیت اور اختیار سے زیادہ بڑے لوگ شامل ہوں۔ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

دوبارہ نمودار ہوئے تو سیم شیں خلیجی ممالک کے لیے ریکروٹمنٹ کا کام کر رہے تھے۔ اور بقول شخصے، یہ دوسری کہانی ہے۔

اسکول کی پڑھائی سے الگ ہٹے ہوئے دو دن مجھے شاید کبھی نہ بھولیں۔ ایوب خان کی حکومت ڈانواں ڈول تھی اور ذوالفقار علی بھٹو جیل سے چھوٹ کر کراچی آ رہے تھے۔ ان کے استقبال کے لیے کینٹ اسٹیشن جانے والا بپھرا ہوا ہجوم ہمارے اسکول کے آہنی گیٹ تک پہنچ گیا۔ شہر بھر کے تعلیمی ادارے بند کروائے جا رہے تھے۔ سڑکوں پر ایک والہانہ پن کا اظہار ہو رہا تھا، جیسے شہر فیصلے کی گھڑی پر آن پہنچا ہے۔ (انھی دنوں انو نے غزل کہی تھی لڑکوں نے کچھ ایسا داؤں کیا / ایوب نے گھٹنے ٹیک دیے) اسکول بند کرنے کے بارے میں فادر پمنٹو کسی نتیجے پر ابھی پہنچے بھی نہیں ہوں گے کہ کلاس فائیو اے کا مانیٹر رئیس عالمگیر تیر کی طرح اپنی بنچ پر سے اٹھا اور ہو گری لے کر اسکول کی ڈیڑھ سو سالہ پرانی گھنٹی کو پیٹنے لگا۔ جب تک جلوس اسکول سے گزر نہیں گیا کوئی لڑکا اپنی جگہ سے نہیں ملا۔ اور پھر وہ دن جب ۱۹۷۱ میں جنگی ہسٹیریا کے دوران کلاس کے کسی لڑکے کے ہاتھوں میں کرش انڈیا کا اسٹیکر دیکھ کر

بوڑھی مسز ایملی سالڈانا نے، جو لائبریری کی نگرانی کے ساتھ ساتھ ہمیں انگلش پڑھایا کرتی تھیں، تاسف بھرے لہجے میں سرزنش کی تھی کہ جنگ سبھی کو تباہ کرتی ہے، اور ہم سب جیسے نُرا ماں گئے تھے۔ فادر پنٹو اور فادر ریمنڈ کے موقع بے موقع نصیحت بھرے لیکچر، مسٹر اونی بیرر تھ کے قصّے، کیرکٹر بلڈنگ کی خصوصی کلاسیں، کلاسوں کے دوران اردو بولنے پر پابندی، اسکول کے بارے میں احساسِ تفاخر اور دسویں جماعت کی انگریزی کی ناقابلِ فراموش مسز چندرا گیانی، جو مجھے اور امیر داؤد علی کو الگ سے بلوا کر اعلیٰ درجے کے ناول دیا کرتی تھیں کہ کورس کی کتاب معمولی ہے، تم یہ ضرور پڑھو، اور گرومندر کے آگے جانی کالونی میں ان کے گھر دیوالی کی مبارک باد کے لیے جانا مجھے اب بھی ایک خواب کی طرح یاد ہے پھر سنا کہ وہ اور ان کی بیٹی پُشپا بمبئی چلی گئی ہیں۔ خدا معلوم اب کہاں ہیں گرومندر میں ایک مکان خالی کھڑا ہے۔

اسکول سے نکل کر کالج جانا میرے لیے ایک کلچرل شاک بھی تھا جس کی ٹیس اب بھی اُٹھتی ہے۔ ڈی جے کالج، پھر ڈاؤ میڈیکل کالج، یہاں میری ملاقات ایک اور قسم کے ہجوم سے ہوئی۔ ایسے ساتھیوں کا ہجوم۔ اسکول میں پرانے برطانوی کولونیل انداز کے مینرز اور گڈ بریڈنگ پر زور تھا، لیکن کالج میں دھکم پیل تھی اور کہنی مار کر آگے راستا بنانا پڑتا تھا۔ سیڑھیوں پر دھکیلے جانے کا خوف تب سے بیٹھا ہوا ہے میرے اندر۔ ڈی جے کالج میں پڑھائی کے بوجھ کے ساتھ یہ احساس بھی تھا کہ اس نفیس اور شان دار عمارت کو سب استعمال کر رہے ہیں، لیکن اس پر تحریر یا اس کے لیے اپنائیت نہیں۔ ہم صرف دو سال کے لیے اس کالج میں آئے ہیں۔ سادہ اینٹیں ادھڑیاں، پانی ابال اڑا جانا ہمیں اصل میں تو میڈیکل کالج میں داخلہ چاہیے، بس وہ مل جائے۔ ایسے ادارے اصل میں زندگی کی درس گاہیں ہوتے ہیں۔ لیکن میرے نصیب میں لمبی اُڈاری نہیں۔

ماں اہلِ طلب کون سہے طعنۂ نایافت۔ اس شہر کے کوسموپولیٹن کردار کا ذکر منت انداز میں کرتے ہوئے دل ڈرتا ہے کہ اب کوئی طعنہ مارے گا کہ یہ جڑ سے اکھڑے ہوئے لوگوں کا یوٹوپیائی خواب ہے۔ ایسا خواب جس کی آرزومندی میں اس کو پانے کا نہیں، ایسے ہی کو کھو آنے کا احتمال ہے۔ وہ ایک کثیر اللسانی، کثیر النسلی اور کثیر العقیدہ معاشرے کا خواب دیکھتی ہیں، ایک اہم شاعرہ کے شعری مجموعے پر دیباچہ لکھتے ہوئے قابلِ احترام ناقد نے انہیں گویا رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔ اور اس خواب کو شکست، بھول بھلیاں میں گم شدگی کا نتیجہ قرار دے کر اس کے ڈانڈے اکھنڈ بھارت کے سپنے سے ملا دیے ہیں۔ اکھنڈ بھارت ـــــ میں فوراً ڈر جاتا ہوں۔ کراچی میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے کے بعد یہ الفاظ مجھے ماں کی گالی معلوم ہوتے ہیں۔ اس گالی سے بچنے کے لیے میں کثیر اللسانیت، کثیر النسلیت اور کثیر العقیدگی پر تین حرف بھیجنے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں، یہ یکسر فراموش کرتے ہوئے کہ اس شہر کی جن درس گاہوں نے مجھے تعلیم دینے کی کوشش کی، وہاں یہ خواب ناممکن یا غیر منطقی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ

درس گاہیں رواداری کے معبد تھیں ـــــ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ اسی معاشرے کا حصہ تھیں ـــــ لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ اُکتا دینے والی بے رنگ یکسانیت سے مغلوب ہو کر اُوں مُنڈھی منیڑیں دل رات ورد کیے جائیں۔ دو ٹانگیں اچھی، چار ٹانگیں بہتر! جماعت جماعت کے لوگ جمع تھے میرے ساتھ ڈاؤ میڈیکل کالج میں۔ ایک دوسرے سے مختلف ہونے کا احساس بھی تھا اور اسے مائی لائٹ بھی کیا جاتا تھا کہ کلاس پکنک، ایسول ڈے اور دوسری تقریبات میں اس کی مضحک نقل فوری توجہ حاصل کرنے کا آسان ذریعہ تھی۔

مختلف ہونے اور اس بنیاد پر تقسیم ہونے کا احساس بھی تھا ہمیں۔ یہ احساس اسی وقت سے ہو جاتا جب فرسٹ ایئر کی کلاسیں شروع ہونے کے بعد گروپ بنتے اور ڈیڈ باڈیز الاٹ ہو جاتیں۔ طویل اور ایئر کنڈیشنڈ ڈائی سیکشن ہال میں ایک ترتیب سے رکھی ہوئی پتھر کی سفید میزوں پر وہ مُردے قطار میں نظر آتے ـــــ سخت اور سیاہ پڑے ہوئے، انفرادیت سے عاری، محض گوشت پوست کے مجموعے، کیمیائی محلول میں نہائے ہوئے، جس کی تیز بُو ہال کا دروازہ کھولتے ہی حواس پر حملہ آور ہو جاتی۔ کوئی ایک مردہ ہمارا ہے۔ گروپ رول نمبر کے حساب سے بنائے گئے تھے اور چار چار پانچ پانچ لڑکوں کو جسم کا ایک حصہ الاٹ کر دیا جاتا ٹانگیں ان کی، ہاتھ تمہارے۔ ان مردہ جسموں کی دیکھ بھال کے لیے ہال میں ایک بدروح کی طرح وہاں کا اٹینڈنٹ شہاب الدین گھومتا رہتا، جسے ڈاؤآئٹس (Dowites) کی نہ جانے کتنی کلاسوں نے شاہو بنا دیا تھا۔ ڈاؤ کے فوک لور کے اس اہم کردار کے حوالے سے نہ جانے کتنی داستانیں مشہور تھیں ـــــ وہ لاشیں بیچ دیتا ہے، ان کی بے حرمتی کرتا ہے؛ نہیں نہیں، اس نے تو وصیت کر رکھی ہے کہ مرنے کے بعد اس کی لاش بھی یہاں رکھ دی جائے۔ اور اسی ڈائی سکشن کے دوران بننے والی "couple list" کہ کس کا جوڑا کس کے ساتھ صحیح بیٹھ رہا ہے اور دھیرے دھیرے بڑھنے والی پینگیں جو یہاں کی سالہاسال پرانی روایات تھیں۔ میرا رول نمبر پہلا تھا۔ مجھے اپرلمب (upper limb) الاٹ کیا گیا تھا۔ ہاتھ کی تقطیع مکمل کرنے کے بعد مجھے اور میرے ڈائی سکشن پارٹنر (اب ڈاکٹر) حسنات شریف کو دوسرے حصوں کا ڈائی سکشن کرنا تھا۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ مردہ جسموں کے ان علیحدہ علیحدہ حصوں نے ہمارے طبقے متعین کر دیے ہیں۔

تم اپرلمب والے ہو یا لوئرلمب والے؟ پہلی بار جن لڑکوں سے ملاقات ہوتی تھی ان سے یہی سوال پوچھا جاتا تھا۔ اور یہ سوال انتہائی مناسب بھی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پھر یہ طبقے کچھ مستقل سے ہو گئے۔ اپرلمب والے ان دنوں تھوریکس (Thorax) کر رہے ہیں، یہ اس کا اگلا اسٹیج تھا۔

بہت برسوں بعد مجھے اس کی یاد آئی۔ ہم سب اپنے اپنے راستوں پر نکل چکے تھے۔ کیا ڈائی سکشن ہال اور کیا شاہو، خود ڈاؤ میڈیکل کالج بھی ایک دھندلی یاد بننے لگا ہے۔ ہمارے اس وقت کے فائنل ایئر کے سی آر (Class Representative) اسلم المعروف بہ گولی نے کلاس ری یونین کا اہتمام کیا۔ میز پر سے کھانا لینے کے بعد، پلیٹ ہاتھ میں لیے ہوئے، میں ایسے برابر کھڑے دو چار لڑکوں سے یہ کہہ رہا تھا کہ ہماری کئی سو کی کلاس کے زیادہ تر ساتھی اب امریکا یا انگلستان میں پریکٹس کر رہے ہیں، یہاں

مٹھی بھر نفوس باقی بچے تھے، کہ اتنے میں میرے پیچھے سے ناصر نے، جو اُن دنوں الی نوے میں ریزیڈینسی سے چھٹی پر آیا ہوا تھا، زور سے ہانک لگائی "یہ تم ایرلٹ والے کیا مسکوٹ کر رہے ہو؟"

اب تو اُن دنوں کا سادہ بیان بھی افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ قابلِ احترام نقاد نے مجھے پھر سے ڈائی سکشن ہال پہنچا دیا۔ ان دنوں ہم ڈائی سکشن کر رہے تھے لیکن کٹے پھٹے اعضا، مسخ شدہ لاشیں دیکھنے کے عادی نہیں ہوئے تھے — ایسی لاشیں جن کی اہم ترین بات ان کی انسانی شناخت ہو۔ ان دنوں ہم بٹے ہوئے تو تھے لیکن کٹے نہیں تھے۔ وہ دن بھی گزر گئے۔

گزرے ہوئے دنوں کو لوگ یاد کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلم کی ریل سی چل پڑتی ہے — لیکن اگر ایسا ہو کہ جن سینماؤں میں وہ فلم دیکھی گئی، ایک ایک کر کے منہدم کیے جانے لگیں؟ ان کو بیتے ہوئے اتنا زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا مگر ان دنوں کی علامتیں اس تیزی سے غائب ہوتی جا رہی ہیں جیسے کبھی ان کا نام و نشان بھی نہیں رہا ہوگا۔ اور ... میں وہی سر ریگِ رواں شہر بابل — جہاں سے میں نے کتابیں خریدیں وہ بک اسٹال دکان ابھی اُٹھا گئے اور جہاں فلمیں دیکھیں وہ سینما ہال توسیعِ شہر کی زد میں آ گئے کہ ان کی جگہ شاپنگ مال بنا دیے جائیں۔ وہ دن دور نہیں جب میں پوری طرح اپنے ابا کی طرح ہو جاؤں گا جو پرانے فلمی گانے (ملکہ ا کیٹ کی اصطلاح میں کیسل گانے) سن کر ساتھ ہی ساتھ شروع ہو جاتے ہیں ' یہ گانا؟ ہاں، یہ فلم سن ۶۴ میں لکھنؤ میں دیکھا تھا، الفسٹن سینما میں۔' فلم دیکھنے جانا ایک ایسی تقریب تھی جس کا اندازہ وڈیو جنریشن کے لوگ نہیں کر سکتے۔ بچپن میں والٹ ڈزنی پروڈکشنز کی فلمیں اور سرکس کی فلمیں، سارے کرر کو ایک ساتھ اور اسی پابندی کے ساتھ دکھائی جاتی تھیں جس طرح سال کے سال چیچک کے ٹیکے لگا کرتے تھے۔ اردو فلموں کے دیکھنے پر پابندی تھی۔ گھر والوں کے بغیر پہلی فلم میں نے میڈیکل کالج میں آنے کے بعد دیکھی۔ اداکارہ شبنم کے ابتدائی دور کی فلم تھی 'تلاش'، جس کا re-run ہو رہا تھا (اُن دنوں ایسی باتیں اخباروں کے مطابق پبلک کے بے حد اصرار پر ہوا کرتی تھیں) اور سرور کے کہنے پر اس کا ساتھ دینے کی خاطر جانا پڑا۔ اس قسم کی کئی فلمیں سرور نے مجھے دکھوائیں۔ فلم سے زیادہ مجھے اس کے دوران چلنے والا سرور کا رواں تبصرہ یاد ہے۔ 'دیکھو یہ ڈھاکا ہے'، اس نے اسکرین پر نظر آنے والی عمارتوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔

اکتا دینے والی بے مصرف کلاسوں سے ٹلا مار کر سینما ہال میں رنگ برنگی تصویری تتلیاں پکڑنے کا عمل میلون (Melvyn) نے سکھایا۔ اس کے ساتھ پیلیس میں ڈاکٹر ژواگو دیکھی، ریکس میں اے لائن ان ونٹر دیکھی، ریو میں اے مین فار آل سیزنز دیکھی — اب ان میں سے کوئی سینما ہال باقی نہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی تو وڈیو فلمیں دیکھ دیکھ کر گھبرا جانے کے بعد، پرانے وقتوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے، اہتمام اور انتظار کے ساتھ بار سینما میں کوئی فضول سی فلم دیکھی تھی — ڈاکٹر صاحب،

جلدی چلیے، فلم شروع ہونے والی ہے!" کسی نے ہم سے کہا تھا اور ہم حسب گئے تھے کہ لو بھئی، پہچانے
گئے ـــ اب وہ سینما ڈھایا جا رہا ہے اور تھوڑے دنوں میں لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ بارو
نشاط والے بس اسٹاپ کا آخر یہ نام کیوں ہے۔ اب اگر انتظار یا میلوں میں سے کوئی کراچی آیا تو کسی
سینما ہال کے ساتھ مقام پر یا افسانوی ساحت کے برسٹل ہوٹل کی مدت سے سد بڑی ہوئی ڈھنڈار عمارت
کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر کارلوس ڈرمنڈ ڈی آنڈراڈے کی نظم To a Hotel
Scheduled for Demolition کے یہ مصرعے پڑھوں گا۔

You were Time itself and presided
Over the fevered recognition of fingers
Love without any real place in the city
Over collusion of swindlers, over the expectancy
Of employment, over stagnation of governments
Over the life of the nation in terms of the individual
And over mass movements that came spilling their ways
Into the monastic arcade that houses your streetcars

کوئی آ بھی گیا تو یہ نظم کتنی بار اور کس کس جگہ پڑھیں گے ہم؟

In the heart of Rio de Janeiro
Absence
In the wail of evening papers
Absence
Worm consuming apple
Worm consuming worm
Worm worms worm

یہاں سے یہ جائے۔ وہاں سے وہ جائے ـــ شہر کے نقشے میں خالی جگہیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ایسی
ہی ایک خالی جگہ کا نام میلوں ہے۔ گیارھویں جماعت سے لے کر میڈیکل کالج، ہاؤس جاب اور ایک ہی
شعبے میں تھوڑے وقفے سے کیریئر کا آغاز، پھر ساتھ ساتھ ملازمت ـــ ہماری متوازی زندگیاں
(parallel lives) رہی ہیں اور طویل رفاقت، جس میں اُس وقت ایک خلیج سی آ گئی جب اس نے
امیگریشن حاصل کر لیا۔ پچھلے کرسمس پر ہر سال کی طرح دوپہر کے کھانے کے دوران جب میز پر اس کی ممی
کے پکائے ہوئے لذیذ گوانی کھانے سجے ہوئے تھے، انھوں نے کہا کہ یہ مکان چھوڑنا ہی نہ پڑ جائے۔ زمین
نیچے کی منصوری تو نہیں ہے اور اب تک وہ دلالوں کا دباؤ، اسٹیٹ ایجنٹس کے آفر برداشت کرتے
آئے ہیں، لیکن کراچی کے مخصوص پرانے انداز میں بنے ہوئے "ویریڈین کاٹیج" کے دونوں طرف فلیٹ

بن گئے ہیں جن کی وجہ سے جیسا دوبھر ہو گیا ہے۔ تیرہ نمبر اس اسٹریٹ میں تھوڑے دنوں کے بعد کوئی مکان نہیں رہے گا اور وہ کنکریٹ جنگل کا حصہ بن جائے گی۔ میں کراچی میں پیدا ہوئی تھی۔ نوجوان لوگ تو امریکا جا رہے ہیں، اس لیے کہ وہ جا سکتے ہیں۔ میں کہاں جاؤں؟ اب گھر سے باہر نکلتی ہوں تو لگتا ہے آس پڑوس کے لوگ میرے کپڑوں اور بول چال کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب بھی کیا دیتا؟ پرانے پیانو کو دیکھنے گیا جس پر میلوں پریکٹس کرتا تھا۔ اس بار تمھارے کوئر گروپ نے کرسمس کونسرٹ کہاں پر کیا؟ میں نے بات بدلنے کے لیے پوچھا۔

میلوں کچھ کہتے کہتے میری طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔ آنٹی اینی جینیا نے جواب دیا کہ کونسرٹ کا اشتہار نہیں دیا نہ زیادہ لوگوں کو بلایا۔ اس بار فلاں پیرش میں کرسمس کی دعاے نیم شب (Midnight Mass) نہیں ہوئی کیوں کہ ایک مذہبی تنظیم نے دھمکی دی تھی کہ اگر گرجا میں روشنی ہوئی تو تمھاری عورتوں کو اٹھا کر لے جائیں گے۔

کچھ کہتے کہتے چپ ہو جانے کی اب میری باری تھی۔ بات نے ڈھب ہو گئی ہے، دونوں کو احساس تھا۔ اس وقت وہ اور ہم اقلیت اور اکثریت بن کر الگ ہو گئے تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ میرا بھی آخری کرسمس ہے۔ انکل اسکروج (Uncle Scrooge) ڈکنز کے صفحات سے نکل کر میرے شہر پر حاوی ہو گئے ہیں اور بیمار و سہمی سی یہ آواز بہت جلد خاموش ہو جائے گی

"It's Christmas time God bless us all!"

سوچ رہا ہوں اب سے ۲۵ دسمبر کو Merry Quaid-e-Azam کہا کروں گا۔ آخر کو نام میں کیا رکھا ہے۔

الف کلف رکھے گا   ابو کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا خیال آتا کہ وہ ٹیلی فون اٹھا کر نمبر ملاتے اور دوسری طرف کسی مخصوص آواز کا اطمینان کر لینے کے بعد یہ الفاظ ادا کرتے۔

ان الفاظ اور ان میں پنہاں پُراسرار اشارے سے ایک گفتگو شروع ہو جاتی جو دوسرے لوگوں کے لیے معنویت نہیں رکھتی تھی۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ اس کی مخاطب رٹی پھپھو ہیں۔ الف کلف رکھے گا   ان الفاظ کی طرح ان کا جواب بھی طے تھا، اور مکالمے کا اگلا حصہ بھی۔

کلف عیوض رکھے گا   اودھر سے جواب ملتا۔

عیوض سی رکھے گا   وہ کہتے۔

سی پھر الف رکھے گا   جواب پھر گھوم جاتا۔

یہ سلسلہ اس طرح بہت دیر تک اور دور تک چل سکتا تھا۔

وہ اسپتال میں تھیں، تب بھی اپنی خیریت کے جواب میں ابو کو یہی کہلوایا تھا۔ ہم ٹھیک ہو رہے ہیں۔ الف کلف رکھے گا   اس وقت تک میں اس راز سے واقف ہو چکا تھا۔ برسوں پہلے فتح گڑھ

میں حو کوالادودھ گھر لے کر آتا تھا اس کا مام الف رسول حاں تھا۔ ا ں نے ایک دں اطلاع دی کہ اس کے گھر لڑکا ہوا ہے۔ یہ سں کر اوپر تلے کے ان ہں بھا بیوں نے ایک کھیل سا سالیا کہ وہ بچے کا مام کیا رکھے گا، اور بچے کے بچے کا

دوسروں کا مام تحویر کرنے والی میری پھپھو کا اپنا مام سمٹ کر صرف ں حاتوں ہو گیا حب وہ ریڈیو پاکستان سے حواتین کے پروگرام کرنے لگیں۔ کسی پرانے معند کی طرح لگتی تھی براڈکاسٹنگ ہاؤس کی وہ گسد والی عمارت حس سے گزرتے ہوئے نغمہ و نغمہ سے مملو آواروں کی لرزش کا احساس اب بھی ہوتا ہے۔ شاید آوار کی بھی پرچھائیں ہوتی ہے۔ اور میں نے ان آواروں کو دیکھا بھی ہے۔

ریڈیو پاکستان، پاکستان حوک اور پھر سرسری سدٹھی کا قبرستان ــــ میری پھپھو کا پتا بدل گیا۔

اس شہر میں اپنے حامداں کے ٹھکانے بتاتے ہوئے یہ پتا کیسے رہ گیا ــــ اس کا حوالہ تو بڑھتا جا رہا ہے۔ شاید یہی ٹھکانا حاصل کیا ہے ان سب لوگوں نے کراچی میں۔

سکوں کی تلاش میں بعض دفعہ وہاں جاتا ہوں اور آڑھی ترچھی، ایک کے اوپر چڑھی قبروں کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں۔ کتنے بہت سے مام بیتے دں میں ان کتبوں میں۔ میرے لوگ پڑوسیوں، محلے والوں سے تعلقات بھانے کو بہت اہم سمجھتے تھے، اب کیا سوچتے ہوں گے؟ لیکں ان کتبوں کو کوں پڑھے۔ میرے دہں میں تو ایک ہی سوال رہ رہ کے کوبحتا ہے، وہ کس سے پوچھوں اب الف کیا رکھے گا؟

میرے لوگوں میں سے کئی ایک تعلیم کے شعبے سے وابستہ رہے ہیں اور داخلے، کلاسیں، امتحانات کا سالانہ چکر جیسے ہمارے گھروں کے معمول کا حصہ رہا ہے اور آپس کی باتوں کا بھی۔ ارے فلاں صاحب لڑکوں کو پڑھا رہے تھے کہ گرگِ باراں دیدہ کا مطلب بارہ آنکھوں والا بھیڑیا ہوتا ہے۔ ــــ اس سال حو صاحب کاپیاں جانچ رہے ہیں، ۹۲، ۸۴، حصوں نے پہلے دں کلاس میں داخل ہو کر پوچھا تھا یہاں بیٹھنے کا رتن نہیں ہے؟ ــــ سیئے صاحب، اس مرتبہ طالب علموں نے کاپیوں میں کیسے کیسے گوڑھ حواب لکھے ہیں۔ ــــ وہ چوہدری اطہار والا فارمولا ٹھیک ہے کہ ہر شخص کو ایک حیب اور بھیگا ہوا بید دیا جائے۔ کاپی جانچتے ہوئے اٹھے، حیب دوڑاتا ہوا جائے اور طالب علم کے پیتے پر بیچ کر سڑاسڑ بید مارے کہ ارے کم بحت، یہ پڑھا لکھا ہے تم نے؟

اب یہ گفتگو بدل گئی ہے۔ طالب علموں کے مہمل، مراحیہ (درحقیقت الم ناک) حوابات کے بجائے یہ بات ہونے لگی کہ امتحانوں میں چھرے اور کارتوس آ گئے، طالب علموں میں نقل کا رجحان بڑھ گیا۔ پھر یہ دہں بھی بدل گئی۔ چاقو، پستول، رائفل، تنظیمی عہدے داروں کی دھونس ـــ امتحانوں کا ذکر ان حوالوں سے ہونے لگا۔ حس دں انھوں نے لڑکوں کو نقل کرنے سے روکنے کی کوشش کی تھی، ان کی گاڑی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا؛ کرچیاں دور تک بکھری ہوئی تھیں اور کوئی مدد کرنے، روکنے نہیں آیا۔ شہر کا محاورہ بدل گیا ہے۔

گلابی رنگ کے weeping plaster میں قلعہ سا نظر آنے والا مرکز اعلیٰ کارکردگی ـــــ آغا خان یونیورسٹی۔ میں نے یہاں بھی پڑاؤ ڈالا تھا۔ ڈاؤ میڈیکل کالج سے نکل کر عملی زندگی کے آغاز پر میں ایک اَور اعلیٰ تر درس گاہ سے وابستہ ہو گیا، لیکن زندگی کی اس درس گاہ سے جو سبق سیکھے ان کا رنگ ڈھنگ اور تھا۔ زندگی کا جو رخ یہاں انتہائی قریب سے دیکھنے کو ملا، ہمارے ایسے متوسط طبقے کے لوگ اس سے دامن بچا کر ہی گزر جاتے ہیں ـــــ وہ ہے کچی آبادیوں کی زندگی۔

سول اسپتال میں نفسیاتی امراض کے شعبے میں کام کرنے کے دوران (میری ایک اَور مدت) عادی نشے بازوں کی دیکھ بھال اور علاج بھی میرے ذمے تھا۔ مجھے لیاری کا وہ نوجوان یاد ہے جو نشے کے توڑ کی حالت میں اپنا خون بیچنے کے لیے چیخ رہا تھا۔ لیاری کی گلیوں میں عادی نشے بازوں کا سروے کرنے کے لیے ہم اسنوبال میتھڈ استعمال کر رہے تھے، یعنی ایک نشے باز سے دوسرے کا پتا پوچھنا، پھر اس سے کسی دوسرے کا، یہاں تک کہ مطلوبہ تعداد پوری ہو جائے۔ اس تلاش کے دوران یہ دھندلا سا خیال تھا کہ گولیاں دے کر علامات مرض ختم کر دینا کوئی حل نہیں ہے، مسئلے کو جڑ سے پکڑنا چاہیے، کچھ اور کرنا چاہیے۔ اس کچھ اَور کی تلاش نے آغا خان یونیورسٹی کے ابھرتے ہوئے شعبہ علوم صحت عامہ میں پہنچا دیا، جہاں ڈاکٹر جان برائنٹ نے بتایا کہ اس قسم کے کام کمیونٹی کی سطح پر سودمند ہوتے ہیں اور شہری علاقوں میں صحت کی کیفیات مختلف حکمت عملی کا مطالبہ کرتی ہیں۔

گلابی قلعے کے اندر کام چلاؤ قسم کی چھوٹی سی جگہ ہے جسے ملیک آفس کا نام دیا گیا ہے۔ سوا آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے صبح یہاں گہماگہمی شروع ہو جاتی۔ میڈیکل اسٹوڈنٹ اور ڈاکٹر نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں، کتابیں اور کاغذ اکٹھا کیے جا رہے ہیں، بچوں کے گروتھ چارٹ اور حفاظتی ٹیکوں کے فلاسک سنبھالے جا رہے ہیں، نرسیں گھڑی دیکھ رہی ہیں، کسی نہ کسی کو آخری لمحے پر انتہائی ضروری کام یاد آ رہا ہے، گاڑیاں تیار کھڑی ہیں، فیلڈ سائٹ جانا ہے ـــــ اورنگی، کریکس ولیج، چنیسر گوٹھ، عیسیٰ نگری، اعظم بستی، بابا جزیرہ ـــــ کراچی کی چھ پسماندہ بستیاں جہاں آغا خان یونیورسٹی نے ان علاقوں کے باشندوں کے تعاون سے پرائمری ہیلتھ کیئر کے پروٹوٹائپ ماڈل تیار کیے ہیں۔ ہر علاقے کی منتخب خواتین کو اپنی مدد آپ کے تحت بنیادی صحت کی ضروریات لوگوں تک پہنچانے کی عملی تربیت دی گئی ہے۔ ہر علاقے میں ایک چھوٹے سے سنٹر میں محلے کا نقشہ لگا ہوا ہے جس پر سرخ، سبز، زرد پنوں سے "at risk" گھرانوں کی نشان دہی کی گئی ہے کہ یہ نیم خواندہ خواتین انھیں شناخت کر سکیں۔

ان گلیوں کی خاک چھاننا، ورکر کے ساتھ ہوم وزٹ، لوگوں کے ساتھ لین میٹنگ، بستی کے سربرآوردہ افراد سے ملاقاتیں اور ان سے sustainability اور empowerment کے تصورات پر مغز ماری کرنا، ہیلتھ ورکر کو چن چن کر پروگرام میں شامل کرنا، پھر ان کی ٹریننگ اور روزمرہ کام کی جانچ پڑتال، ان کے کام کے نتیجے میں ان علاقوں میں بہتری کا ایک رجحان، ان رجحانات کی پیمائش کے لیے

انفارمیشن سسٹم اور اس کے مینجمنٹ ٹول۔ پھر ان ورکرز کا لیبر یونین بنانا اور ہڑتال کرنا، طالب علموں اور ڈاکٹروں کی پوری ایک جماعت کا صحت کی حالت کو بہتر کرنے کے لیے ڈویلپمنٹ اور مینجمنٹ کے مسائل سے الجھنا۔ ذہنی افق بھی بدلے اور میرا ذہنی نقشہ بھی اس دوران بدلا۔ ان کمیونٹیز کی زندگی کو قریب سے دیکھا تو تفصیل سے جانا کہ کراچی جیسے شہر میں ساری دنیا کے ایسے سامنے سمٹ کر ایک عالم گیر بستی بن جانے (globalisation) کے جس تجربے سے ہم گزر رہے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اسی شہر کی آبادی کا ایک حصہ معاشرے کے عمل سے marginalisation کا شکار ہے۔ کسی سیارے کی طرح، روشنیوں کے اس شہر کا دوسرا رخ بھی ہے جو تاریک ہے۔

کچی گلیاں، تنگ مکان، بہتی نالیاں، کوڑے کے ڈھیر پر کھیلتے ہوئے بچے ـــ باہر سے دیکھنے والوں کو ان بستیوں میں یہی نظر آتا ہے۔ لیکن اندر قدم دھرا تو جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتا ایسی چہل پہل اور سرگرمی سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں کے مختلف codes اور body language کا ایک دفعہ اندازہ ہو جائے تو پھر یہ اپنے اندر کتنے عالم سمیٹے ہوئے ہیں۔ چنیسر گوٹھ کے کوہستانی محلے میں ڈاکٹر اشرف لاسی کے ساتھ ہیلتھ ایجوکیشن سیشن، پھر ہیلتھ ورکرز کا چناؤ، بھائی اماں اور ڈورو تھی حالہ، جو غربت اور بیماری کے ان مٹ چکر کو ختم کرنے کے لیے گھروں کے اندر رویّے تبدیل کرنے کی کوشش میں جُٹ جاتی ہیں۔ کشتی میں بیٹھ کر بابا جزیرے جانا جہاں نوجوانوں کی پوری ہیلتھ کام کے لیے تیار ہے لیکن لڑکے لڑکیوں کا ساتھ کام کرنا ان کے لیے نئی بات ہے۔ پھر اس کام کو جڑ پکڑتے ہوئے دیکھا۔ سمندر کے راستے میں پرانی بستی گریکس جس کے ساتھ ساتھ سمندر سے نمک بنانے کی جگہیں بے کار پڑی ہیں۔

ایک ہی بستی میں چند قدم کے فاصلے پر کتنے الگ الگ گروہ ہیں۔ لکڑی کے مکانوں میں رہنے والے ذکری بلوچ، پکے مکانوں میں بنگالی کرسچین اور مدنی محلے کے پٹھان، پھر میشوری محلے کے ہندو جن کی عورتوں نے یہاں پیدا ہونے کے بعد سڑک پار کر کے اس بستی کا باقی حصہ نہیں دیکھا تھا جس کو یہاں کے رہنے والے بھی پاکستان کہتے ہیں۔ اعتماد قائم کرنے کے لیے اسی محلے کی پرانی دائی کھیت بائی کو ہیلتھ ورکر رکھا اور چند دن بعد اس کا دوپہر میں سامان سمیٹ لینا کہ تم کراچی والے ایسا نہیں کرتے ہو گے، مجھے تو ساری زندگی کی دوپہر میں سونے کی عادت ہے۔ اس پر ڈاکٹر فرید مدحت اور میں سر پکڑے بیٹھے ہیں کہ اس مینجمنٹ پرابلم کا حل کیا ہے! اور پرابلم بھی ایسی ویسی! ہیلتھ ورکر کی اسٹرائیک، اور کمیونٹی کی توقعات۔ ڈاکٹر کمال اسلام کے بنگلادیش واپس چلے جانے کے بعد یہ پروگرام مجھے سنبھالنا پڑا تو ترقیاتی کاموں کے عملی مسائل کا طوفانی پانی گلے گلے آ گیا۔ یہ سارا سسٹم بہت جلد تاش کے پتوں کے گھر کی طرح بکھر جائے گا، اُس وقت کسے یہ اندازہ تھا! شہر کی ہواؤں کا رخ بدل رہا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی ہوا کی تحریر نہیں پڑھ سکتا۔

آج اورنگی کی ٹیم فیلڈ سائٹ نہیں جائے گی، گڑبڑ کی کوئی نہ کوئی اطلاع آنے لگی تھی اور اسٹاف بھیجنے نہ بھیجنے کا فیصلہ میرے سر آن پڑتا۔ یہ وہاں کے معمول کا حصہ بن گیا تھا۔ لیکن اُس دن تو

جیسے موت یوں سر سے گزر گئی جب ہمیں خبر ملی کہ ہمارے سنٹر سے تھوڑی دور علی گڑھ کالونی میں نامعلوم افراد نے راتوں رات گھس کر گھر لُوٹ لیے ہیں، آبادی پر حملہ کیا ہے، کتنوں کو مار ڈالا ہے۔ یہ محض خبر تھی، تفصیل معلوم نہیں کہ اورنگی سارے شہر سے کٹا ہوا تھا۔ پھر ہماری ایک ورکر نے نہ جانے کس طرح سے ٹیلی فون کروایا کہ ہم تو جیسے کنویں میں بند بیٹھے ہیں، سبزی ترکاری آتی ہے نہ بجلی پانی ہے، بچے دودھ کے بغیر تڑپ رہے ہیں۔ حکامِ بالا سے خصوصی اجازت حاصل کی گئی اور سائرن بجاتی ایمبولینس میں دوائیں اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر ہم روانہ ہوئے ___ ڈاکٹر رانسٹ، ڈاکٹر نوریہ، ڈاکٹر فریال، ڈاکٹر فرید، کوثر اور خُرّم ہم تین۔ بنارس چوک سے ذرا آگے فوجی راستا روکے کھڑے تھے۔ ان کو اپنی شناخت اور اپنی آمد کا مقصد سمجھانے میں بہت وقت لگا، اور اتنی دیر میں لوگ جمع ہو گئے۔ ہمیں موقع مل جائے تو ہم ان کو مزہ چکھا دیں، ان کے افسرِ اعلیٰ نے کہا، اور اشارہ ان لوگوں کی طرف کیا جو رو رو کر اپنا حال سنا رہے تھے۔ جلا ہوا گھر، لٹا ہوا سامان زار و قطار روتی ہوئی ایک برقع پوش عورت ہمیں اندر لے جا کر دکھانے پر مصر تھی۔ تباہ شدہ گھر کی کھڑکی میں سلاخوں پر ایک دھجی سی چپکی ہوئی تھی۔ میرے بیٹے کو مارنے کے لیے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے تو اس نے یہ سلاخ پکڑ لی تھی، وہ عورت بتا رہی تھی۔ کاٹ کر الگ کر دیں۔ یہ اس کی انگلیاں ہیں۔

اس دن کا سبھی کو بے چینی سے انتظار تھا۔ خوب رونق رہے گی فریار کی شادی پر۔ ارمان نکالنے کا پھر کون سا موقع ملے گا کہ سگے بہن بھائیوں کی اولاد میں سمجھ لیں کہ بس اب یہی لڑکی ہے جس کی شادی ہوئی ہے۔ پھر اکرم چچا کب سے اہتمام میں بھی لگے ہوئے ہیں۔ مہندی پر رت جگا ہو گا، رات بھر دھمڑ رہے گی، یہ طے کیا گیا تھا۔ وسیم نے دوستوں سے کہہ دیا ہے، گانے کی پارٹی جمے گی۔ دن بھر تو وسیم ایک معزز افسر بنے رہتے ہیں، اس محفل کے لیے خاص تیاری کر رہے ہیں کہ سوانگ بھریں گے، مادھوری ڈیکشٹ کی نقل اتاریں گے اور عین میں اُسی کے انداز میں چنے کے کھیت میں دکھائیں گے۔ ڈر تھا تو بس یہی کہ تقریبات میں ہڑتال، ہنگامے کی وجہ سے رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے۔ لیکن اس وقت تک سارے کام بخیر و خوبی ہو رہے تھے۔ محفل بھی رات بھر جمی۔ میں تو گھر چلا آیا کہ اگلی صبح مجھے اسلام آباد روانہ ہونا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی طارق بتاتا ہے کہ فجر کی اذان سن کر گانا بجانا بند کیا ہے اور اسپیکر کے تار نکالے ہیں۔ وہ گھر آنے کے لیے اٹھا اور گیٹ تک پہنچا ہی ہو گا کہ تڑاتڑ فائرنگ کی آواز سے ساری گلی لرز اٹھی۔ وہ اُلٹے پیروں لوٹ آیا۔ صبح کا شانت سناٹا گولیوں کی باڑھ سے گونج اٹھا۔ بے حد نزدیک سے آ رہی تھی آواز۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی سامنے سے سنسناتی ہوئی گولیاں گزرنے لگیں گی، کراس فائر ہو گا، میدانِ جنگ یہیں بن جائے گا۔ اس آواز نے پسپا کر دیا سب کو اور نوبت یہاں تک آ گئی کہ ایک کمرے میں بند ہو کر قفل لگا لیے۔ چھوٹے بچوں کو پلنگوں، صوفوں کے پیچھے لٹا دیا گیا۔ گھبراہٹ کے مارے ایک خاتون کی چیخیں نکل گئیں۔ جو لوگ اوپر کی منزل پر تھے، وہ نیچے نہیں آ سکے۔ انھوں نے

دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ موبائل ٹیم کی گاڑی فائرنگ کرتی ہوئی گزری۔ اس کے بعد ایک سفید گاڑی آئی، جیسی ایمبولینس ہوا کرتی ہے۔ اس میں سے دو لڑکوں کو نکالا گیا ___ آنکھوں پر پٹی، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے۔ ان کو دیوار کی طرف منھ کر کے کھڑا کر دیا گیا اور پھر گولیوں کی وہ بوچھار کہ خون کے فواروں کے ساتھ اعضا کے بھی چیتھڑے اڑ گئے۔ لاشوں کو یوں ہی چھوڑ کر سفید گاڑی چلی گئی۔ اس کے بعد موبائل ٹیم کی گاڑی پھر واپس آئی اور دیر تک فائرنگ کرتی رہی۔ تفصیلات ہم نے بعد میں سنی ہیں، ٹی وی کے حسن ماسے پر سنا کہ اس محلے کا نام لیا گیا ہے اور یہ کہ پولیس مقابلے میں دو دہشت گرد مارے گئے۔

اخباروں میں بھی کوئی خاص تفصیل نہیں آئی لیکن مہدی کی تقریب کے اختتام کے اس رنگ کو گھر والے شاید بھلا نہیں پائیں گے۔

میں نے دفتر سے واپس آ کر بچوں کے کمرے میں جھانکا۔ وہ شیلف بالکل خالی پڑا تھا جس پر چار سالہ انوشا اپنی گڑیاں اور اسٹفڈ کھلونے رکھتی ہے۔ میں چونکا اور ذہن میں پہلا جو خیال آیا وہ چوری ڈکیتی کا تھا۔ سامان صدقے گیا، میرے بچے خیریت سے رہیں! میں نے گھبرا کر زور سے آواز دی۔ انوشا ہنستی ہوئی آئی۔ میں نے گڑیاں چھپا دی ہیں۔ اس لیے کہ ان کو گولی نہ لگ جائے، اس نے مجھے بتایا۔ ساری گڑیاں اور اسٹفڈ کھلونے پلنگ کے نیچے ٹھنسے ہوئے تھے۔

ان صاحب سے میرا ملنا جلنا دفتری کام کے حوالے سے تھا، اس لیے صبح سات بجے انہیں دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھ کر تعجب ہونا فطری تھا، اور وہ بھی ورکنگ ڈے پر۔ لیکن وہ اپنی آمد کا مقصد بھی نہیں بتا رہے۔ کچھ گم سم سے، روٹھے سے بیٹھے ہیں۔ پھر آہستہ سے بولے چھوٹا بھائی دو دن سے بند ہے۔ وہی جو میرے ساتھ کام کرتا تھا۔ آپ نے بھی کئی بار دیکھا ہوگا۔

ارے کیا ہوا؟ میں چونک گیا۔

محلے کے لڑکوں کو لے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ وہ بھی ان کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ اور پھر وہی مانوس تفصیلات ___ گھر والوں کی پریشانی، ماں کی بے حوالی، مختلف دروازے کھٹکھٹانا، تعلقات کے ذریعے کوشش ___ بے سود۔ پتا تو چل گیا ہے کہ کہاں ہے۔ لیکن

لیکن کیا وہ آخر کیا چاہتے ہیں؟' مجھے شاید یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔

وہ کانپتی ہوئی تین انگلیاں اٹھا دیتے ہیں۔

میں نظریں جھکا لیتا ہوں۔ ہمارے ایسے لوگوں میں اتنی رقم گھر میں رکھی ہوئی نہیں ہوتی۔ عمر بھر کی کمائی سمجھی جاتی ہے۔

جہاں جہاں سے کچھ بھی مل سکے، کوشش کر رہا ہوں۔ رشتے داروں نے بھی آنکھیں چرا لی ہیں کہ الٹا ہمارے پیچھے نہ پڑ جائیں وہ لوگ۔ سامان بیچ رہا ہوں۔ ان کے لیے یہ ساری باتیں کہنا بے حد تکلیف دہ

تابت ہو رہا تھا۔ کچھ نہ کچھ کر کے باہر بھی بھجوا دوں گا۔ کاروبار جائے جہنم میں۔ جان تو بچی رہے گی۔ دوسرے بھائی کو بھی بھجوا دوں گا

مجھے تذبذب میں دیکھ کر وہ حرفِ مطلب زبان پر لے آئے۔ آپ میری مشین خرید لیجیے۔ تکلف نہ کریں۔ یہ مت سمجھیے کہ آپ میری مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بس یہ سوچ لیں کہ جتنی دیر لگے گی اتنی دیر میں کہیں میرے بھائی کو اذیت نہ پہنچانے لگیں

اچھے بھائی کو فیصلے تک پہنچنے میں مجھ سے مدد ملی۔

یہ تو ان کو بعد میں پتا چلا کہ یہ سڑک تین گروہوں کے درمیان حد بندی ہے (جن میں سے ایک فریق وہ ہے جسے قانون نافذ کرنے والا ادارہ کہا جاتا ہے)، اور یہاں اس گڑھے کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم ہوئی تو کسی نے ڈرائیور کی کنپٹی پر پستول رکھ دیا۔ نیچے اتر آؤ! آواز کا لہجہ تیکھا نہ تھا۔

ڈرائیور اور گاڑی وہیں روک لیے گئے۔ اچھے بھائی سے کہا گیا کہ گھنٹے بھر میں اتنی رقم لے کر آ جائیں۔ اور زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کریں کیوں کہ ہمیں سب معلوم ہے۔ آپ کا یہ پتا ہے۔ آپ یہاں رہتے ہیں اور اس دفتر میں کام کرتے ہیں۔

اچھے بھائی شاید زیادہ گھبرا گئے ہوں گے کیوں کہ وہ ان کو تسلی دینے لگا۔ گاڑی بھی مل جائے گی اور ڈرائیور کو بھی کچھ نہیں ہو گا۔ بس یہ خیال رکھنا کہ کوئی آدمی آ کر پوچھے کہ ہم سے کیا باتیں ہو رہی تھیں تو کہہ دینا دوا کے لیے پیسے چاہییں۔

انھوں نے یہی کہا جب ایک شخص نے آ کر ورثت لہجے میں سوال کیا اور بتایا کہ اس علاقے کا چیف تو میں ہوں، یہ لڑکے مجھے بتائے بغیر واردات تو نہیں کر رہے۔

کہاں سے رقم کا بندوبست کیا گیا، کس طرح مطلوبہ جگہ رقم پہنچا کر گاڑی اور ڈرائیور دوبارہ ملے، ان سب تفصیلات کے بجائے اچھے بھائی کو وہ گفتگو یاد ہے جو وہ لڑکے آپس میں کر رہے تھے۔

کیسے جانے دوں؟ اتنی مشکل سے چڑیا پکڑی ہے۔

عیش کرے۔ بارہ بجے پھر ملیں گے۔

کئی دن تک کوئی آدمی آ کر ان کے گھر کی چیکنگ کرتا رہا۔ اچھے بھائی احتیاط اور خوف کی وجہ سے گھر نہیں گئے۔ اب یہ بھی کر لوں تو جاؤں گا، یہ بھی کر لوں، ذرا اور ٹھہر جاؤں ـــــ وہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے امریکا منتقلی کا فیصلہ ٹال رہے تھے۔ میں نے انھیں فیصلہ کن موڑ تک پہنچا دیا۔

چھوڑ کر چلے جانے کے لیے اب کراچی بہت مناسب شہر ہے۔

آپ وہاں سے گزرے ہی کیوں؟ آپ کو نہیں معلوم تھا کہ اس علاقے کی آج کل کیا پوزیشن ہے؟ جو سنتا ہے وہ اچھے بھائی سے یہی پوچھنے لگتا ہے۔ ہر ایک کے پاس سنانے کے لیے اپنے قصے ہیں۔

وہ علاقہ تو بٹا ہوا ہے، کوئی انہیں بتاتا ہے۔ سڑک کے ایک طرف حقیقی والے ہیں، دوسری طرف مجازی والے۔ بیچ میں سرحد۔ لوگ وہاں سے گزرتے ہوئے کترانے لگے ہیں۔ ایک سے بچ گئے تو دوسرا

گوٹ اس خانے پر پہنچ گئی تو سانپ نگل لے گا۔ اس پر پہنچ گئی تو آگے سیڑھی ہے۔ اس طرف سے بچ کر نکلنا۔ ادھر سے جاؤ۔ سانپ اور سیڑھی کا کھیل بن گیا ہے یہ شہر۔

نقشے، عمارتیں، لوگ، سماجی نشانیاں ملبے کا ایک ڈھیر ہے میں جس کے اندر پھنس کر رہ گیا ہوں۔ شہر کا شہر ایک بند گلی میں ہے۔ راستا کیسے ملے؟ سر پھوڑوں کہ دیوار؟ عماد اندر آیا تو میں یوں ہی بیٹھے بیٹھے کافکا کی Description of a Struggle ایک بار پھر پڑھ رہا تھا اور اسی جملے پر اٹک گیا تھا جس کی نشان دہی ایک حالیہ کتاب نے بھی کی ہے

"You re incapable of loving, only fear excites you "

آپ کے خیال میں اب کیا ہوگا؟' عماد پوچھتا ہے۔ میں چونک پڑتا ہوں۔ وہ اوکلاہوما سے چھٹیاں گزارنے یہاں آیا ہوا ہے اور حیران پریشان ہے کہ جس کراچی میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا وہاں نہ گھوم سکتا ہے نہ دیر تک گھر سے باہر رہ سکتا ہے۔ میں اس کو سیدھا جواب نہیں دے سکتا۔ وحشیوں کی آمد کا انتظار، میں اسے کوافی کی نظم سنانے لگتا ہوں کہ عہدِ زوال میں رومۃ الکبریٰ کے شہریوں کے پاس بس یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔ اور جب وسطی یوروپ کے وحشی قبائل فصیلِ شہر پر آ کر حملہ آور نہیں ہوئے تو لوگوں کو مایوسی ہوئی کہ وحشی ایک طرح سے شہر کے مسئلے کا حل تھے۔

مگر عماد قائل نہیں ہوتا۔ 'آپ بھی کہاں کی باتیں کرتے ہیں!' وہ تمسخر سے ہونٹ سکیڑ لیتا ہے۔ یہ فضول کتابیں چھوڑیے، آج کی آوازیں سنیے۔ وہ پتلون کی پچھلی جیب سے کیسٹ نکال کر لگا دیتا ہے۔ یہ ایلس کوپر ہے، وہ مجھے بتاتا ہے اور ایک تیز بے سنگم آواز میرے سر پر ہتھوڑے برسانے لگتی ہے۔

From the start of life
To my dying day
In the dark of night
And the burning light of day
It's a bloody fight
But I can't walk away
I'm prime for the front line

Unholy war, unholy war,
I'll try, I'll fight until I die
Unholy, unholy war, unholy war
I see, I know, you'll always be
Unholy

You see my burning fuse
From a mile away
I took your cruel abuse
Lord took away my shame
I learned to bite the hand
That used to pull my chain
We'll fight 'cause we ain't on the same side
We're in an unholy war, unholy war
I'll try, yeah I'll fight until I die
Unholy

When I'm all alone, unholy
With your thoughts of pain, unholy
I can break on through, unholy
With just an ounce of faith, unholy
Unholy

You're shaking in your boots
Because it's judgment day
I'll get my just rewards
And you'll have your hell to pay
There's no time to throw out the lifeline

Unholy war, unholy war
I'll try, I'll fight until I die
Unholy, unholy war, unholy war
I see, I know, you 'll always be
Unholy

اس تیز آواز سے میرا ذہن جھنجھنا اٹھتا ہے۔ نہ مجھے ایسی موسیقی پسند ہے نہ یہ آواز۔ لیکن میں ہاتھ بڑھا کر اسے بند نہیں کر سکتا، جیسے وہ آواز میرے دل اور دماغ کو تپتے ہوئے گرم لہو کی طرح داغ رہی ہو

کسی اور بات کا ہوں نہ ہوں، میں وزیرِ اعظم پاکستان صاحبہ کی فصاحتِ بیان کا بہت معترف ہوں۔ ایک حالیہ ناقابلِ فراموش بیان میں انھوں نے کراچی کو 'دہشت گردی کا تھیٹر' قرار دیا ہے۔ میں اس بیان سے تردد میں پڑ گیا کہ کہیں عجلت میں ان سے rhetoric کے پرانے اصول کی خلاف ورزی تو نہیں ہو گئی۔ دہشت گردی کے تھیٹر میں ایبسرڈ ڈراما قولِ محال نہیں تو اور کیا ہے؟ میں ڈرتا ہوں کہ ان کا فقرہ غلط بحث کا شکار ہو کر ان کی اعجاز بیانی پر حرف آنے کا سبب نہ بن جائے۔ یوں بھی ڈراما میری

صف نہیں۔ پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس جاری وساری ناٹک میں میرا کردار کیا ہے؟ میں نایک ہوں، کھل نایک ہوں یا سُوتردھار؟ شاید میں اور میرے ہم شہر اس وقت "active victims" سے کے مرحلے میں ہیں۔ ہم کٹھ پتلیاں بن گئے ہیں، اس کا احساس اس دن ہوا جب بچوں کو ڈبے کے دودھ کے بجائے ماں کا دودھ پلانے پر راغب کرنے کی غرض سے عالمی ہفتے کے سلسلے میں عباسی شہید اسپتال میں منعقدہ اجلاس کے دوران کٹھ پتلیوں کا تماشا دیکھا جو تعلیم صحت کے مقصد سے کیا گیا تھا۔ کٹھ پتلی تماشا دکھانے والا شروع میں کسی قدر گھبرایا ہوا تھا (وہ اس شعبے کا پیشہ ور نہیں، ایک مشہور اسپتال میں ڈاکٹر ہے) اور اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے مذاق کر رہا تھا۔ یہ عباسی شہید اسپتال ہے۔ میں یہاں آیا تو گاڑی پر ہوں۔ ایسا نہ ہو واپسی کے لیے بوری میں بند کر کے بھجوا دیں۔ اس فقرے پر زوردار تالیاں اور بے ساختہ قہقہے۔ میں حیران ہو کر دیکھتا ہوں۔ ایک آدمی اندر آتا ہے، کان میں کچھ کہتا ہے، پھر چلا جاتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد، پھر تھوڑی دیر کے بعد میں اس مستقل مداخلت پر چڑ کر پوچھتا ہوں کیا مسئلہ ہے؟ بارہ، مجھے جواب ملتا ہے، اب تک بارہ۔ اس ہال سے ملحقہ مردہ خانے میں اب تک بارہ لاشیں لائی جا چکی ہیں۔ اورنگی میں اجتماعی قتل، دہشت گردی کی ایک اور واردات۔ باقی تفصیلات قہقہوں کے شور میں دب جاتی ہیں۔ کٹھ پتلی تماشا بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ اسپتال کا عملہ کھانے میں مشغول ہو جاتا ہے تو میں اجازت لے کر باہر آنے لگتا ہوں۔ تم بھی جلدی سے اس علاقے سے نکل جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس واردات کا ردعمل ہونے لگے، میں شاہ محمد سے کہتا ہوں۔ ارے چکّل تو آپ نے چکھا تک نہیں۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ جو مارے گئے وہ سندھی نہیں ہیں، پٹھان ہیں![1] اسپتال کی ایک لیڈی ڈاکٹر صاحبہ فرائضِ میزبانی نبھاتے ہوئے مجھ سے کہتی ہیں۔

اس کی اتنی محنت سے تیار کی ہوئی تقریب غارت نہ ہو جائے ___ چند نوالے بھی میرے حلق سے اتر نہیں سکے۔

واپس جاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کر میں اس کو rationalize کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دماغ کی سوئی جیسے ایک ہی نقطے پر اٹک گئی ہے۔ میرے ذہن کا اسکرین یکسر خالی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد کسی رسالے میں پڑھا ہوا فقرہ یاد آتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر جرمنی کی شکست خوردہ فوج کے ایک سپاہی نے، جس کی عمر سولہ سال تھی، گھر واپسی کا سفر شروع کرتے ہوئے کہا تھا۔

Behind us was madness, before us nothingness

اس سے زیادہ مجھے کچھ یاد نہیں آیا۔ میرا دماغ اس نقشے کی طرح خالی ہو گیا جس پر پانی گر گیا ہو، اس رگ کی طرح معلوم جس میں خون کا ذرہ پھنس گیا ہو۔ میں سیٹ کے ہتھے کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہوں۔ اس علاقے سے جلد از جلد باہر نکلنے کے لیے ڈرائیور نامعلوم راستوں پر تیزی سے گاڑی چلا رہا ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ مجھے بس اتنا اندازہ ہے کہ میری کھڑکی کے باہر کراچی ہے، ابھی تک کراچی

لیکن کب تک؟ اور کس حال میں؟ ناسٹراڈیمس اور شاہ نعمت اللہ کی پیشنگوئیاں مجھے میسر نہیں ہیں کہ اس شہر کے مستقبل کا حال بتا دیں جہاں آدھا شہر یہ دیکھتا جاتا ہے کہ باقی آدھا کس طرح ہلاک ہو گا۔

یا پھر شاید یہ شہر ایسا نہیں ہے۔ میں نے اب تک جو کچھ دہرایا ہے وہ کٹھ بیتی ہے، شہر بیتی نہیں۔ میرے پاس اُس کا کوئی حل بھی نہیں ہے جسے کراچی کا مسئلہ سمجھا جانے لگا ہے۔ من وسلویٰ کی طرح روزانہ ہمارے رقیباتی ذرائع ابلاغ سے کراچی کے واقعات پر افسوس کا اظہار اور کراچی کے مسئلے کے حل کے لیے نیک خواہشات اترتی ہیں، جن پر اپنی مسوسیت کے اظہار سے بھی میں قاصر ولاچار ہوں۔ اس لاچاری کے سوا میرے پاس کوئی انجام نہیں ــــ ایک کہانی جس کا کوئی خاتمہ نہیں، جس طرح زاسیٹسکی (Zasetsky) نے کہا تھا۔ میں اب اسی طرح محسوس کر رہا ہوں۔

اس اجمال کی تفصیل کے لیے مجھے پروفیسر اے آر لوریا (A R Luria) کا حوالہ دینا ہو گا کہ اس عہد ساز روسی نیوروسائیکولوجسٹ کی کتابیں خدا معلوم کہاں کہاں سے حاصل کر کے سول اسپتال میں کام کرنے کے دوران نائٹ ڈیوٹی اور ایمرجنسی ڈیوٹی کے دوران فرصت کے چند ایک لمحوں میں گھونٹ لیتا جاتا تھا۔ ممکن ہے یہ کتابیں جدید تر تحقیق کے سامنے ازکاررفتہ ہو گئی ہوں، لیکن آج کے کراچی کے حوالے سے مجھے *The Man with a Shattered World* بہت معنی خیز معلوم ہوتی ہے۔ ایک مریض کے اپنے تحریر کردہ شذرات سے لوریا نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ ۱۹۴۳ میں جنگ کے دوران ایک نوجوان روسی سپاہی، جس کا نام زاسیٹسکی ہے، گولی لگنے سے زخمی ہو جاتا ہے۔ گولی اس کے دماغ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ذہنی امراض کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس کی بصارت متاثر ہو جاتی ہے اور یادداشت گم ہو جاتی ہے۔ وہ لکھنا پڑھنا بھول جاتا ہے۔ اس کے حافظے سے الفاظ محو ہو جاتے ہیں اور وہ دیر تک ایک ایک لفظ کو ٹٹولتا اور یاد کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جانے میں راستا بھول جاتا ہے۔ بالٹی اٹھاتے اٹھاتے اسے یاد نہیں رہتا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ اسے پوری طرح اپنے جسم اور اس کے طبیعی وجود کا احساس ہے نہ ارد گرد رکھی ہوئی چیزوں کے مقام کا۔ اس چوٹ سے صرف اس کی قوت متخیلہ متاثر نہیں ہوئی اور اسے اس زندگی میں، جو اس کے لیے بڑی حد تک ناقابلِ فہم ہو گئی ہے، کسی قدر لمحاتی تسکین فراہم کرتی ہے۔ لوریا کی تشخیص میں شبے کی گنجائش نہیں

> His mind had nothing to work with except undeciphered images and unrelated ideas

اُس کا زخم پچیس سال پہلے بھر گیا لیکن کھرنڈ scar tissues پڑ جانے کا نتیجہ دورے کی شکل میں ظاہر ہوتا رہا۔ اس کے cerebral cortex کے نقصان زدہ حصے اصلی حالت پر واپس نہیں آ سکتے۔ لہٰذا وہ جب بھی سوچنے کی کوشش کرتا، اس کے ذہن کو اُن جھلسے ہوئے حصوں کے گرد گھوم کر کام کرنا پڑتا کہ ان کے توسط سے دوبارہ سیکھے اور گم شدہ ہُنر کو کسی حد تک بازیاب کر سکے۔

وہ پوری شدت کے ساتھ چاہتا تھا کہ اس بھیانک خواب سے بیدار ہو جائے، ذہنی انجماد کی مایوس کن حالت کو توڑ کر باہر نکل سکے، دنیا کو واضح اور قابلِ فہم پائے، بجائے اس کے کہ ایسی زباں سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو ٹٹولتا رہے۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔

اُس نے لکھا وقت اُڑا جا رہا ہے۔ دو دہائیاں گزر گئیں اور میں اس ہولناک چکّر میں پھنسا ہوا ہوں۔ میں اس سے باہر نہیں نکل سکتا کہ صحت مند آدمی بن جاؤں جس کا حافظہ اور ذہن صاف ہوں۔

'عام آدمی کبھی بھی میری بیماری کو نہیں سمجھ پائے گا، کبھی نہیں جان سکے گا حتیٰ کہ وہ خود اس تجربے سے گزرے۔

اور یوں وہ ماضی کی طرف پلٹتا تھا کیوں کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ دنیا ایسی عجیب و غریب کیوں کر ہو گئی تھی، جنگ کیوں لازم ہو گئی تھی، اور اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا کیا کوئی جواز تھا۔ پچیس سال پہلے وہ باصلاحیت نوجوان تھا جس کا مستقبل روشن تھا۔ آخر ایسا کیوں ہوا کہ اسے اپنا حافظہ گنوانا پڑا۔ جو علم اس نے حاصل کیا تھا وہ بھولنا پڑا اور ایک بے یار و مددگار اپاہج بن کر رہ گیا جسے ساری عمر کشمکش ("struggle") میں مبتلا رہنے کی سزا دی گئی۔

دھیرے دھیرے اس نے لکھنا پڑھنا دوبارہ سیکھا اور اپنا احوال درج کیا۔ میری کہانی کا کوئی خاتمہ نہیں ہے، اس نے لکھا۔ وہ اس بھیانک خواب سے جاگ جانا چاہتا تھا لیکن ذہنی انجماد کی ناامیدی سے مفر نہیں تھا۔

خاتمہ کتاب کے بجائے اس کے چند جملے لوریا نے درج کیے ہیں۔ جیسے لکھنے والے نے کاغذ پر کلیجا نکال کے رکھ دیا ہو:

اگر جنگ نہ ہوتی تو دنیا زندہ رہنے کے لیے بہت پہلے بڑی عمدہ جگہ بن چکی ہوتی۔ اس دور میں ہمیں موقع ملا ہے کہ ایک نئی اور حسین تر دنیا کی تعمیر کریں، تمام تر انسانیت کو پیٹ بھرنے کے لیے غذا، تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا، سر پر چھت فراہم کریں؛ صرف موجودہ نسل کے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے بھی جو آنے والے ہیں۔

اس دنیا کی مٹی اور پانی میں خام مواد اور طاقت کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ موجود ہے، اس میں کسی کمی سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ جلد ہی خلا کا سفر بھی شروع ہو جائے گا ـــــ پہلے چاند، پھر دوسرے سیاروں کی طرف۔ اس سے ہمیں اور بھی موقع مل جائے گا کہ زندگی کو اور بھی پُرمایہ بنا لیں، ان نادر عناصر اور مادوں سے خود دنیا کے مقابلے میں دوسری جگہوں پر وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ہم یہ سب کر سکتے ہیں، اگر جنگ نہ ہو۔

ہم بھی یہ کر سکتے ہیں۔ اگر گولیاں نہ چل رہی ہوں اور دنیا کا نقشہ ٹوٹ کر پارہ پارہ نہ ہوئے چلا جا رہا ہو تو ہم اس شہر میں رہ بھی سکتے ہیں جس شہر میں مَیں رہتا ہوں۔

**

محمد حنیف

ایک اخبار نویس کا کراچی

کراچی کے بارے میں پہلی خبر مجھے شہر میں پہنچتے ہی ایئرپورٹ کے ایک باتھ روم کی دیوار پر لکھی ہوئی ملی۔ یہ جناح ٹرمینل بننے سے بہت پہلے اور قصبہ کالونی کے سانحے کے چند دن بعد کی بات ہے۔ باتھ روم کے تعفن سے ماورا ہو کر کسی نے اطمینان سے اپنی خوش خطی کے جوہر دکھاتے ہوئے لکھا تھا پنجابیو! اپنے گاؤں واپس جاؤ۔ وہاں تمہاری بہنیں چُد رہی ہیں۔ اس سے ذرا نیچے کسی صحافی نے بال پوائنٹ پین سے اپنی بھدّی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا ہم بھی یہاں یہ اُن کا بدلہ لینے آئے ہیں۔ ادبی زبان میں شاید اسے مصرعے پہ مصرع لگانا کہتے ہیں۔

کراچی ابھی ایک سویا ہوا جِن تھا جس نے سہراب گوٹھ کے آپریشن کے بعد کروٹ لی تھی۔ سرکار اور اخبار ایک دم منشیات فروشوں کے بے رحم انڈرورلڈ سے آشنا ہوئے تھے اور، جیسا کہ عام طور پر ہوتا آیا ہے، دونوں کو یہ خبر بہت تاخیر سے ملی تھی۔ شہر میں رہنے والا کوئی بھی عام سا نوجوان برسوں سے منشیات کے اڈوں، اُن کے مالکان کے کوائف اور اُن کے سَودوں کی کوالٹی سے باخبر تھا۔ تازہ خبریں، بلکہ آنے والے مستقبل کی خبریں، جیسا کہ اکثر ہوتا آیا ہے، پبلک باتھ روموں، ہسپتالوں کی دیواروں اور تعلیمی اداروں کی بَین شدہ یونینوں کے پمفلٹوں میں تھیں۔ رات گئے نشے میں دُھت نوجوان کسی اکیلے پولیس والے کے پاس سے گزرتے ہوئے جیے مہاجر کا نعرہ لگاتے۔ پانچویں قومیت، قائد تحریک اور حقوق یا موت جیسے الفاظ کراچی کے باہر سے آنے والوں کے لیے ثقافتی اظہار تھے۔ سیاست کی زبان میں بات کرنے والے یا تو مہاجروں کو اُن کے قدموں سے ناپ رہے تھے یا دوسری طرف سندھ میں ایک نئی صبح کے طلوع کی بشارت دے رہے تھے۔ اندرون سندھ میں قوم پرستی کا عروج اور شہری علاقوں میں مہاجر قومیت کے نعرے ترقی پسند لبرل مبصرین کے لیے ایک ہی سکّے کے دو رُخ تھے۔ اسی زمانے میں حیدر آباد کے قریب ہونے والی ایک سیاسی تقریب میں قادر مگسی نامی ایک نوجوان نے الطاف حسین نامی ایک نوجوان کو ایک اجرک اور ایک کلاشنکوف تحفے میں پیش کی۔ کیا اس سے بڑی ضمانت متحدہ سندھ کے مستقبل کے لیے دی جا سکتی تھی؟

میری پہلی سیاسی اسائنمنٹ الطاف حسین کا ایک طویل انٹرویو تھا۔ یہ ایک ایسے انگریزی رسالے کے لیے کیا گیا جس کا نام 'گلیمر' تھا اور ہم نے ایسے سبجیکٹ کو اُسی طرح اپروچ کیا جیسے ہم اُن فیشن ماڈلز کو کیا کرتے جو رسالے کی مختصر زندگی میں اس کی وجہِ شہرت ہیں۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت سر کاٹے گئے گریبان، سمندر کے پانی میں بھیگی ساڑیاں اور ذومعنی عنوانات۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ چھ مہینے کی مختصر زندگی میں 'گلیمر' نے آزادیِ اظہار اور ملبوسات کی حدوں کو کافی پیچھے دھکیل دیا تھا۔

پہلی نظر میں الطاف حسین ہمیں ولیمے کے دن والا دُولھا نظر آئے۔ سر سے پا تک ریشمی کُرتا اور پاجامہ، زری والا جوتا اور نگوں والی انگوٹھیاں جو روحانی تاثیر رکھتی ہیں۔ اُن کے بال بہت احتیاط سے بلو ڈرائی (blow dry) کیے گئے تھے اور ان کے پیچھے ایک نوجوان مستعد لڑکا گولڈلیف کے پیکٹ اور لائٹر سے مسلح کھڑا تھا جو وہ وقفے وقفے سے قائد کو پیش کرتا۔ عزیز آباد میں ۲۴۰ مربع گز پر بنے اس چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں ایک بڑا سا ایکویریم ایک کونے میں رکھا تھا جو کسی کارکن نے تحفے میں دیا تھا اور جس میں تیرتی مچھلیاں شیشے کی دیوار سے، جس پر بڑے بڑے حرفوں میں MQM لکھا تھا، سر مار رہی تھیں۔ سب سے زیادہ جس بات نے مجھے حیران کیا وہ الطاف حسین کا رے بان (Ray Ban) کا سیاہ چشمہ تھا جو انھوں نے چار گھنٹوں میں ایک بار بھی نہیں اتارا۔ میری ایڈیٹر نے، جن کا سیاست کا علم محض سے کچھ زیادہ نہیں تھا، ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے ایکویریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا 'کیا یہ مچھلیاں بھی مہاجر ہیں؟' الطاف حسین نے ایک انگلی سے اپنے چشمے کو پیچھے کی طرف دبا کر ایک قہقہہ لگایا اور گولڈلیف والے نوجوان کو سگریٹ پیش کرنے کا اشارہ کیا۔

الطاف حسین کو سیاست سے زیادہ فوج میں جانے کا شوق تھا۔ وہ رضاکار کے طور پر بھرتی بھی ہوئے لیکن وہاں اُجڈ پنجابی حوالداروں نے بجائے اُن کے جذبۂ جہاد کی توقیر کرنے کے اُنھیں مکڑ اور بھیا کہہ کر اُن کا مذاق اڑایا۔ اُس بے عزتی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک گالی الطاف حسین نے اپنے انٹرویو میں دُہرائی۔ دراصل یہ انٹرویو سے زیادہ وعظ تھا کیوں کہ انھوں نے سوالوں کی زیادہ پروا نہیں کی، جو کچھ کہنا تھا وہ کہا۔ میری شستہ اردو، جس کا اعتراف کئی اہلِ زبان دوست بھی کرتے تھے، میری زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوئی۔ جب میں اُن کی تقریر کو کاٹ کر ایک سوال کرنے کی کوشش کر رہا تھا، الطاف حسین نے مہاجر فلسفے کے تاریخی پس منظر کا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "اب دیکھیں، آپ بھی پنجابی ہیں، آپ سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔" اس کے بعد میں نے یہ پروا کرنا چھوڑ دی کہ میرے قاف کا مخرج حلق میں ہے یا پیٹ میں۔

یہ ثابت کرنے کے بعد کہ علامہ اقبال کو اس لیے بڑا شاعر مانا جاتا ہے کہ وہ پنجابی ہیں، الطاف حسین نے اپنی موٹرسائیکل کا قصہ اتنے مزے لے لے کر سنایا کہ اگر کالا چشمہ نہ ہوتا تو ہم یقیناً اُن کی چمکتی آنکھوں کا بیان کرتے۔ یہ موٹرسائیکل جو تحریک کے آغاز کے دنوں میں بڑی کارآمد ثابت ہوئی تھی، رفتہ رفتہ پارٹی کے تبرکات میں شامل ہو گئی۔ ساری اے پی ایم ایس او نے ڈرائیونگ اِسی یہ

سیکھی۔ آپ یوں سمجھیں کہ اُن دنوں میں تحریک ہم نے اسی موٹر سائیکل پہ چلائی۔ لیکن اب اللہ کا ایسا کرم ہے کہ دو دو پجیرو ہمارے دروازے پہ کھڑی رہتی ہیں۔ وہ لوگ جو اس ڈر سے ہمیں گیٹ سے لوٹا دیا کرتے تھے کہ ہم چندہ مانگ لیں گے، آج ہم سے ملاقات کا وقت مانگتے ہیں۔ الطاف حسین نے اُس دکاں دار کی سی تسلی سے کہا جس کا کاروبار نیا نیا چل نکلا ہو۔

سیلف سنسر شپ کا پہلا تجربہ بھی مجھے اس انٹرویو کے چھپنے کے وقت ہوا۔ میں نے سوال و جواب کے ساتھ ایک تعارف لکھا جو ذاتی مشاہدات پر مبنی تھا۔ مچھلیوں والا انٹرویو چھپ گیا لیکن کالا چشمہ، جو میرے غیر سیاسی تجربے کی بنیاد تھا، تحریر میں سے بالکل غائب کر دیا گیا۔

اس بات کو چند سال گزر جانے کے بعد میرے لیے اب بھی یہ ایک معما ہے کہ ذمے دار مدیران کا ذہن کیسے کام کرتا ہے۔ قصبہ کالونی کے قتلِ عام کے بعد چند نوجوانوں نے شہر کے مضافات میں لکڑی کی ایک ٹال پر سوئے ہوئے ایک پٹھان کا سر ایک بڑے پتھر سے کچل ڈالا۔ ایک نوجوان نے، جو اس گروہ میں شامل تھا، بعد میں قصہ سناتے ہوئے مجھے بتایا کہ تمام لڑکے جیے مہاجر کے نعرے لگا رہے تھے۔ پٹھان کی کہانی چھپ گئی لیکن نعروں کا ذکر کاٹ دیا گیا۔ پھر تاج محل ہوٹل کے سامنے ایک کار بھی میں سے ایک زخمی نوجوان کو پھینکا گیا۔ اسے اغوا کرنے والوں نے اس کے بازو پر خنجر سے جیے سندھ کھود دیا تھا۔ زخمی نوجوان کا قصہ چھپ گیا لیکن جیے سندھ پر لکیر پھیر دی گئی۔ ایسی ناتجربہ کاری میں مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی چھوٹی سی فلم بنائی ہو اور سنسر بورڈ نے اس کا تمام ساؤنڈ ٹریک اور بیک گراؤنڈ میوزک نکال دیا ہو۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ایڈیٹر کو صرف اپنی جان کا خوف نہیں تھا، اُن کو اس بے احتیاطی سے ڈر لگتا تھا جس کے باعث نفرت کی چنگاریاں آگ بن سکتی ہیں۔ اسی طرح پہلوں سے نفرت کے لاوے کو روکنے والے یہ صحافی گو کم تھے لیکن تھے، اور اب بھی ہیں۔ لیکن اُن کی یہ سادہ لوح کوششیں آج کل کے حالات میں عجیب لگتی ہیں۔ آج کوئی باہر سے آنے والا اگر سٹی بیٹ پر کام کرتے کسی رپورٹر کو دیکھے تو یہ سمجھے کہ وہ اسٹاک ایکسچینج کے ریٹ چیک کر رہا ہے یا ومبلڈن کے اسکور اپ ڈیٹ کر رہا ہے۔ کتنے ہوئے؟ تمھارے پاس کتنے ہیں؟ یہ دو کدھر سے آ گئے؟ عثمان آباد میں ایک بوری سے ملے ہیں۔ اُن کی زندگی مختلف وقفوں میں بٹی ہوئی ہے ایدھی ایمبولینس کو فون، پولیس کنٹرول سے چیک، تینوں ہسپتالوں کو فون، ان سب سے ملنے والے اعداد کو جمع کرنا، پھر کسی ہم پیشہ کو فون کر کے پوچھنا، کل کتنے ہوئے؟

اُس دن سڑک پر ہزاروں لوگ تھے۔ ۱۹۸۸ کے الیکشن کے بعد پی پی پی اور ایم کیو ایم دونوں کراچی کی سڑکوں پر جشنِ فتح منانے نکلے تھے۔ وہ خواتین جنھیں گیارہ سال تک چادر اور چار دیواری میں ڈھانپنے کی کوشش کی گئی تھی، گاڑیوں کی کھڑکیوں میں سے باہر لٹک کر ناچ رہی تھیں اور لڑکے فٹ پاتھ

پر کھڑے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دیکھ رہے تھے۔ یہ مناظر دیکھ کر ٹریفک کے سپاہیوں کی ہوائیں اُڑ گئی ہاہیں ایسے تربیت یافتہ اشارے بھول گئیں اور ٹریفک کا نظام لڑکوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اسی جشن کے دوران آنے والے دنوں کی ایک جھلک بھی نظر پڑی۔ ایک سڑک پر مڑتے ہی وکٹری سائن بناتے اور جھنڈے لہراتے ایک گروہ نے ہمارا راستہ روکا اور مطالبہ کیا کہ چندہ دو اور جیئے مہاجر کا نعرہ لگاؤ۔ اُن کی آنکھوں میں جیتنے والوں کی بے رحمی تھی۔ ہم نے مطالبے کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔ ایک پھنکارتے ہوئے لونڈے نے آگے بڑھ کر گاڑی کی چابی اُچک لی اور چیخ کر کہا "بولو جیئے مہاجر!" میرے گلے سے جو آواز نکلی اُس نے خود مجھے حیران کر دیا۔ چاروں طرف لوگوں کا اُمڈتا سمندر جو چند لمحے پہلے تک تحفظ اور آزادی کا احساس دلا رہا تھا، یک وقت بے بس، متلاطم اور خطرناک نظر آنے لگا۔

کراچی سے شائع ہونے والے محدود اشاعت کے ایک انگریزی رسالے کے لیے لکھنا، بقول ہمارے ایک مدیر کے، مومنوں کو تبلیغ کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن محدود اشاعت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ تمام باتیں جو کبھی بھی جنگ یا ڈان میں نہیں چھپ سکتیں، ہم ہیرالڈ میں بڑی بڑی سُرخیوں کے ساتھ چھاپ سکتے ہیں۔ مگر اپنے آپ کو چھوٹا جان کر محفوظ سمجھنا بھی ایک غلطی ہو سکتی ہے۔ کلفٹن میں ہونے والے ایک انتخابی جلسے کے دوران الطاف حسین نے ہمارے رسالے کا نام لے کر تقریر شروع کی۔ "یہ کٹے ہوئے بالوں والی عورتیں، یہ فرانس کا پانی پینے والیاں"، انھوں نے ہمارے رسالے کی خاتون مدیروں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا، "یہ وہ صحافی ہیں جو ایک بوتل کے بدلے اپنا قلم بیچ دیتے ہیں۔" یہ سب کہہ چکنے کے بعد انھوں نے فرمایا کہ ابھی تک انھوں نے مہذب زبان استعمال کی ہے اور اب وہ اپنے خیالات کا اظہار بازاری زبان میں کریں گے۔ اس کے بعد جو کہا گیا وہ کچھ ایسا تھا جسے ادبی زبان میں ناقابلِ اشاعت کہا جاتا ہے۔

جلسے میں یقیناً ہمارے پڑھنے والے بھی موجود تھے مگر کسی صدائے احتجاج کی توقع رکھنا عبث تھا۔ شہر کے حالات سے سب سے زیادہ خوف زدہ یہ لوگ ہیں، حالاں کہ واحد وائلنس جو ان لوگوں کی زندگیوں تک پہنچ پاتا ہے وہ ناشتے کی میز پر صبح کا اخبار ہے۔ ان کے دل رحم سے اور پیٹ لوفیٹ (low fat) خوراک سے بھرے ہیں۔ یہ اپنے نوکروں سے اُن کے مرنے والے عزیزوں کا حال احوال پوچھتے ہیں، اسٹیٹ ایجنٹوں سے رابطہ رکھتے ہیں کہ پراپرٹی بیچنے کا بہترین موقع کب ہے، اور دوسرے شہروں میں رہنے والے اپنے عزیزوں کو بتاتے ہیں کہ وہ وار زون (war zone) میں رہ رہے ہیں۔ جب ہڑتال کی وجہ سے ان کی صفائی کرنے والی ماسی ان کے گھر نہیں پہنچ پاتی تو یہ اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ان کا بیوروکریٹ دوست پارٹی میں نظر آتا ہے تو اُس کے ساتھ مل کر سیاست دانوں کو گالیاں دیتے ہیں، اور جب واقف کار سیاست داں سے ملتے ہیں تو اپنی بندوق کا رُخ بیوروکریسی کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ سکیورٹی ایجنسیوں کی ویٹنگ لسٹ میں ان کے نام ٹاپ پر ہیں۔ انھیں حکومت

در پورٹس سے یکساں نفرت ہے۔ جب مشین گنوں کے پیچھے کھڑے نوجوان ہوتے ہوئے رینجرز کا ٹرک اِن لڑکوں کے پاس سے گزرتا ہے تو اُن کا بلڈ پریشر ذرا نیچے آتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ کلفٹن میں اصل بدامنی اس وقت پیدا ہوئی جب آغا سپر مارکیٹ حادثاتی طور پر جل کر راکھ ہو گئی اور کچھ دنوں کے لیے انہیں تازہ مشروم ملنا بند ہو گئے۔

آپریشن کلین اَپ شروع ہونے کے کچھ عرصے بعد فوج کے ایک کرنل نے، جو فیلڈ انویسٹی گیشن ٹیم کے کرتا دھرتا تھے، ایک آف دی ریکارڈ بریفنگ میں نظریہ پاکستان، ملک کو درپیش علاقائی خطروں اور اپنے خفیہ کیمروں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ٹیلی وژن کی اسکرین پر ایک کے بعد ایک نوجوان خالی نظروں کے ساتھ بتاتا کہ اس نے کتنے قتل کیے، کہاں سے اسلحہ لیا، کس کے حکم پر ٹریگر دبایا۔ ان نوجوانوں کے نام ہندی فلموں کے کرداروں کا چربہ لگتے اور یوں محسوس ہوتا جیسے انہیں خود بھی اپنے کارناموں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ ہم نے ہاتھ تک نہیں لگایا، کرنل بار بار دعویٰ کرتا۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنی کرسی کے ساتھ ٹکی جی تھری رائفل کو اٹھاتا اور نظریں ہم پر مرکوز کیے ہوئے، سدھے ہاتھوں سے مسلسل لوڈ اور اَن لوڈ کرتا جاتا۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن جب کوئی بھارت کا نام لیتا ہے تو میرا خون کھولنے لگتا ہے، اس نے ٹی وی پر ایک نوجوان کی تصویر کو اسٹل کر کے کہا جو اعتراف کر رہا تھا کہ وہ بھارت سے تربیت لے کر آیا ہے۔

جب ۱۹۸۸ میں حیدرآباد کا قتلِ عام ہوا تو میں وہیں ڈیوٹی پر تھا۔ میرے ذمے سارے دن کی کارروائیوں کی رپورٹ تیار کرنا تھا۔ رات کو لاشیں گنتے گنتے تھک کر میں نے ایک پنجابی گانا گانا شروع کر دیا۔ بُرے نصیب مرے ویری ہویا پیار مرا۔ میرے کمانڈر نے کہا، شہر میں لوگ مر رہے ہیں اور تم گا رہے ہو۔ میں نے کہا، میں فوجی ہوں اس لیے رو نہیں سکتا۔

پھر اُس نے آپریشن کے آغاز میں اپنے کارنامے سنائے۔ میں نے اس ایم این اے کو اٹھایا اور یہیں لے آیا۔ میں نے کہا دیکھو، میں تمہیں ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ مجھ سے بحث کرو۔ مجھے بتاؤ یہ مہاجر قوم کیا ہوتی ہے۔ دلیلیں دیں اُس کو۔ صبح پانچ بجے وہ مجھے کہنے لگا، چلو مجھے حقیقی والوں کے پاس لے چلو، پریس کو بلاؤ۔

اس کمرے میں کچھ آف دی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ کرنل نے جی تھری کو کرسی کے ساتھ ٹکاتے ہوئے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر کچھ بٹن دبائے اور ٹی وی اسکرین پر میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ میرے اس کمرے میں داخل ہونے سے لے کر بریفنگ کا ایک ایک لمحہ اسکرین پر فاسٹ فارورڈ میں دوڑنے لگا۔ کرنل نے یگانہ مسکراہٹ کے ساتھ دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے اور ہمیں چیلنج کیا کہ اُس کے الیکٹرانک کھلونے کا سراغ لگائیں۔ میں نے ریکارڈنگ کے زاویے کو نظر میں رکھتے ہوئے خفیہ کیمرے کی تلاش میں نظریں اٹھائیں تو دیوار کے کونے میں محمد علی جناح کا مشہور پورٹریٹ جس میں وہ ایک آنکھ کا چشمہ

لگانے مطالعے میں مصروف ہیں، نظر آیا۔ کرنل نے ایسی جی تھری کی طرف دیکھے بغیر ایک دفعہ پھر اس کا میگزین فٹ کیا۔ حسام کے ایک آنکھ والے چشمے کے پیچھے سے شیشے کی ایک گول آنکھ ہم پر مرکوز تھی۔

**

زینت حسام

گزرے دن، گزرتے دن

مجھے بیٹھادر کے اُس گھر کا صرف لکڑی کا وہ زینہ یاد ہے جس پر چلنے سے دھمک پیدا ہوتی تھی ــــ ہم بچے اس پر کود کود کر چڑھتے اُترتے اور وہ دھمک ایک گونج میں بدل جاتی ــــ یا پھر پرانی وضع کے خوب صورت بُوٹے والے ٹائلوں سے سجا چمکدار فرش۔ بیٹھادر کے بازار میں واقع اس چھوٹے سے چار منزلہ مکان کے نچلے حصے میں جوتوں کی دکان تھی اور ہر منزل پر دو کمروں پر مشتمل ایک فلیٹ۔ پہلی منزل پر دادا دادی اور دادا کی پہلی مرحوم بیوی کی اولاد، جنھیں سب بچے محمود بھائی کہتے تھے، دوسری منزل پر بڑے ابا کا کنبہ، تیسری منزل پر امی ابا اور ہم بہن بھائی (اس وقت ہم دو بہنیں اور دو بھائی تھے) اور چوتھی منزل پر چچا کا کنبہ۔ میں اسی گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ کھارادر کے میٹرنٹی اسپتال میں کام کرنے والی ایک عیسائی نرس کی نگرانی میں۔

ابا بیس سال کی عمر میں، ستمبر ۱۹۴۷ میں، کانپور سے کراچی آئے تھے، امی اور ایک سالہ ضیا (بھائی)، اور محمود بھائی کے ساتھ۔ پھر چچا اور تایا کا کنبہ آیا اور اس کے بعد دادا دادی کو بلایا گیا۔ چھوٹے تایا کانپور چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے اور نہ ہی کوئی پھوپھا۔ لہٰذا چاروں پھوپھیاں اور ان گنت دوسرے رشتے دار وہیں رہے۔ نانی ماما اور ماموں ممانی امی کی خاطر پاکستان آ گئے تھے۔ دادا کا شمار مسلمانوں کے محلے کرنل گنج کے معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔ دادا کا کپڑوں کی چھپائی، بلاک پرنٹنگ، کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ دادا بھاری پرہیز گار تھے اور انھوں نے بیٹوں کو بھی دین کی طرف راغب کیا۔ ایک مولوی بچوں کی تعلیم پر مامور تھے۔ بچے اسکول بھی جاتے، لیکن زور دینی تعلیم پر رہا۔ مولوی صاحب مغربی تعلیم کے سخت خلاف تھے اور دادا کو، بقول ابا، بھڑکایا کرتے کہ بچوں کو اسکول بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابا باغی نکلے۔ مسجد سے بھاگتے۔ مولوی سے چڑتے۔ ابا کا کہنا ہے کہ ان خاندانی مولوی نے ابا کو دین کی طرف راغب کرنے کے لیے اتنا زور لگایا کہ ابا کا دل دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم سے بھی اچاٹ ہو گیا۔ چھٹی پاس کرنے کے بعد ابا نے اسکول کا دوبارہ رخ نہ کیا۔ کاروبار سے بھی ابا کو رغبت نہ تھی۔ ان کے مشغلے تھے فلمیں دیکھنا، کتابیں پڑھنا، دوستوں میں رہنا، گھومنا پھرنا، کباڑیوں کی دکانوں میں جانا، انوکھی چیزیں، خاص طور پہ پرانے کیمرے، خریدنا اور تصویریں بنانا۔ تقسیم ہند سے پہلے ابا نے اپنی تحسیمی ہوئی

ایک تصویر السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کے ایک انعامی مقابلے میں بھیجی تھی جس کو انعام بھی ملا تھا۔ ابا کے پاؤں میں چکر تھا، دل میں جنوں۔ لڑکپن ہی میں ہندوستان کے کئی شہر گھوم چکے تھے۔ اکثر دادا سے جھگڑ کر گھر چھوڑ جاتے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جب جرمنی نے برما پر حملہ کیا تو آسام خالی ہونے لگا۔ ابا نے ٹرین پکڑی اور آسام روانہ ہو گئے۔ ابا بتاتے ہیں وہ اس ٹرین میں واحد مسافر تھے۔ لڑکپن میں عشق ہو گیا تھا۔ ابا نے دھمکی دی کہ اگر اس لڑکی سے ان کی شادی نہ ہوئی تو وہ زہر کھا لیں گے۔ لیکن دادا بھی ضد کے پکے تھے۔ ابا اس بات پر بھی گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پھر ایک سال بعد امی سے ان کا بیاہ کر دیا گیا۔ امی دادا کی پسند تھیں۔

کراچی میں بیشاور کے قریب کاغذی بازار میں سارہی ساریوں، کمخواب، زربفت کا مشترکہ کاروبار شروع کیا گیا۔ دکان میں ایک دوچھتی ہوا کرتی تھی۔ ابا کو اب تک دکانداری سے دلچسپی نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے دوچھتی پر دیوار سے لگے لکڑی کے کھانچوں پر اب جمع کی ہوئی کتابیں سلیقے سے جما دیں۔ جب ابا کراچی آئے تھے تو کتابوں سے بھرے کئی صندوق کانپور کی پبلک لائبریری کو دے دیے تھے اور صرف تین چار صندوق ہی ساتھ لا سکے تھے۔ دوچھتی میں فرش اور چاندنی بچھائی گئی تھی اور گاؤتکیے رکھے ہوئے تھے۔ دکان کی یہ دوچھتی دوپہر کے کھانے اور قیلولے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ابا یا تو دکان میں پائے ہی نہ جاتے، یا آتے بھی تو دوست سے گپ شپ کر کے دوچھتی میں بیٹھ کر کتابیں پڑھا کرتے۔ گھر چھوٹا تھا اس لیے وہاں دو چار کتابوں سے زیادہ نہ رکھتے تھے۔ کتابوں کا ذخیرہ اردو ادب اور شاعری کے نسخوں، دیوانوں، ادب لطیف ، عالمگیر ، ہمایوں ، ساقی اور دوسرے رسالوں کے انبار پر مشتمل تھا۔ پچاس کی دہائی میں پاکستان سے نکلنے والے تمام رسالوں — سویرا ، نقوش ، داستان گو ، لیل و نہار ، نصرت وغیرہ — کے شمارے ابا محبت سے سنبھال کر رکھتے تھے۔ اکثر رسالوں کی خود پیلے رنگ کی جلد بناتے اور اپنا نام emboss کرتے۔ یہ کام ابا کا نپور میں بھی کرتے تھے۔ کتابوں کی دنیا سے میرا پہلا تعارف کاغذی بازار کی دکان کی اسی دوچھتی میں ہوا۔

میں جب پانچ برس کی ہوئی تو یہ مشترکہ خاندان بیشاور سے اٹھ کر پیر الٰہی بخش کالونی کے ایک دومنزلہ مکان میں منتقل ہو گیا تھا جس میں لگے امرود کے پیڑوں کی پھل دار شاخیں دوسری منزل کے کمرے کی کھڑکی اور چھجے تک آتی تھیں۔ ہم بچے چلچلاتی دوپہر کی خاموشی میں کچے امرود توڑ توڑ کر کھاتے اور پیر کالونی کی خاک آلود گلیوں میں کھیلا کرتے۔ ایک سال بعد پھر نقل مکانی ہوئی۔ دادا کا انتقال ہو چکا تھا۔ محمود بھائی اپنے کنبے کے ساتھ ملیر جا بسے تھے۔ اب ہم سب لوگ شہید ملت روڈ سے متصل پنجابی سوداگران ہاؤسنگ سوسائٹی میں واقع کرائے کے دومنزلہ مکان میں اٹھ آئے تھے جس میں چار فلیٹ تھے۔ ایک فلیٹ میں دہلی کا ایک مختصر سا خاندان تھا — والدین اور دو لڑکے مسعود اور ہارون۔ باقی تین فلیٹوں میں بڑے ابا، چچا، اور ابا اپنے اپنے ڈھیر سارے بچوں کے ساتھ رہائش پذیر ہوئے۔ یہ ۱۹۵۹ کی بات ہے۔

تب کراچی کی ریتیں ہم بچوں کے لیے ایک وسیع کائنات تھی۔ سوسائٹی میں اکا دکا مکانات تھے۔ ہماری گلی میں صرف تین مکان تھے۔ ہمارے مکان سے متصل مالک مکان، تقی صاحب، کا گھر، اور گلی کے سرے پر ایک اور مکان۔ باقی پلاٹ خالی تھے۔ دوسری گلیوں میں بھی یہی صورت حال تھی۔ ہر گھر کے احاطے میں اور احاطے سے باہر مختلف طرح کے پیڑ پودے ہوتے تھے۔ امرود، آم، شریفے، گلاب، چنبیلی، موتیا احاطے کے اندر، اور باہر بادام، جامن، املی، نیم، گل مہر، بوگن ویلیا۔ ہمارے گھر کے عین مقابل ایک کھنڈر سا تھا۔ غالباً کسی نے چار دیواری اٹھائی تھی، پھر کسی وجہ سے دیواریں منہدم کر دی گئی تھیں۔ اینٹوں کے ملبے، ٹوٹی ہوئی دیواروں اور خودرو جھاڑیوں میں چھپکلیاں اور گرگٹ رینگا کرتے۔ احتشام بھائی جان اور انعام بھائی (میرے تایازاد بھائی) غلیل لیے ان گرگٹوں کا شکار کیا کرتے۔ مجھ سے چھ برس بڑے ضیا بھائی کا وقت انعام بھائی کے ساتھ گزرتا۔ نورالصباح، عائشہ، احترام (تایازاد)، صبیحہ (چچازاد)، میں، عذرا اور ریاض ـــــ ہم بچوں کا غول زیادہ وقت باہر ہی منڈلاتا رہتا۔ ہم سب بہن بھائیوں کو باہر گھومنے کی یکساں آزادی تھی۔ ہم گلیوں اور سڑکوں سے سگریٹوں کے خالی پیکٹ اکٹھا کر کے ان کے قلعے اور مینار بناتے، جن کو بنانے سے زیادہ ڈھانے میں لطف آتا۔ کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے چن کر انھیں آگ دکھا کر زنجیریں تیار کی جاتیں۔ تب کراچی میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اتنے نہ ہوتے تھے۔ پلاسٹک کی تھیلیوں کا رواج نہ تھا۔ کاغذ کی پڑیوں یا پھر سلے ہوئے کپڑوں کے تھیلوں میں سودا آتا۔ سڑکوں پر کاغذ، سگریٹوں کے ڈبے اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں تو پڑی ہوتی تھیں، لیکن گیلا کچرا نہ ہوتا تھا۔

کراچی میں تتلیاں بھی بے تحاشا ہوتی تھیں۔ خاص طور پر برسات کے بعد تتلیاں امڈ آتیں۔ ہم بچوں نے تتلیوں کو مختلف نام دیے ہوئے تھے۔ سبز اور سیاہ بادشاہ تتلی، باریک پروں پر سیاہ و سفید دھبے والی ملکہ تتلی، نقرئی جامنی شہزادی تتلی۔ انعام بھائی نے ایک چھوٹا سا جالی کا ڈبا بھی بنایا تھا جس میں وہ تتلیوں کو پکڑ کر بند کرتے۔ مجھے اور نورالصباح کو تتلیاں چھونے کا بڑا شوق تھا۔ ہم بہت منت سماجت کر کے ڈبے سے تتلی نکلواتے پھر فخر کے ساتھ انگلیوں پر اترے رنگ ایک دوسرے کو دکھاتے۔ بارش کے بعد میدان میں بیربہوٹیاں امڈ آتیں اور سب بچے ماچس کی خالی ڈبیاں لیے بیربہوٹیوں کو پکڑنے میں شام کر دیتے۔ پھر اپنی اپنی ڈھونڈی ہوئی بیربہوٹیاں گنی جاتیں اور پھیلی ہوئی ہتھیلیوں پر رکھی سرخ مخملی مخلوق پر انگلیاں پھیری جاتیں۔ آج ۱۹۹۵ میں یہ بات یاد کرتے ہوئے بھی عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ کراچی میں کبھی بچے تتلیاں اور بیربہوٹیاں پکڑا کرتے تھے۔ یا یہ کہ کبھی یہاں قدم قدم پر بڑے بڑے سرپتوں والے بادام کے پیڑ ہوتے تھے اور زمین پکے ہوئے سرخ باداموں سے پٹی رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ کراچی سے بادام، امرود، جامن، شریفے اور املی کے پیڑ غائب ہوتے گئے اور شہر سیمنٹ کی لپیٹ میں آ گیا۔

ابا اور امی دونوں ہی کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ امی بتاتی ہیں جن دنوں مجھ سے دو سال چھوٹی بہن پیدا ہوئی، امی صالحہ عابد حسین کا ناول عذرا پڑھ رہی تھیں۔ میرے بڑے بھائی کا، میرا اور اس بہن کا

نام مولانا احتشام الحق (جن سے دادا کے خاندانی مراسم تھے) نے تجویز کیا تھا ضیاالدین، زینت النسا، طلعت النسا۔ طلعت ان دنوں تین چار ماہ کی ہو گی۔ نام ساتویں دن طلعت رکھ دیا گیا تھا، لیکن امی کو عذرا ناول اس قدر بھایا کہ انھوں نے طلعت کا نام بدل کر عذرا رکھ دیا۔ امی ہم بچوں کو کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتیں۔ کتابیں خریدنے کا شوق ضیا بھائی، مجھے اور عذرا کو بھی تھا۔ ہم لوگ جیب خرچ کا زیادہ حصہ کتابیں اور رسالے خریدنے میں صرف کرتے۔ اس زمانے میں بچوں کی (اردو) کہانیاں چار آٹھ آنے، روپے دو روپے میں آتی تھیں۔ انگریزی کی Archie کامکس اور رنگین، باتصویر عمدہ سپر پرنٹ پر چھپی fairy tales ایک روپے میں ایک ملا کرتیں۔ یہ ۱۹۶۰ کی دہائی کی بات ہے۔ ہم بچوں کی کتابیں اور رسالے تو گھر ہی میں لڑھکتے پھرتے لیکن ابا اب تک ایسی کتابیں اور رسالے کاغذی بازار میں واقع دکان کی دو چھتی ہی میں ذخیرہ کر رہے تھے۔ دو کمروں کا تنگ فلیٹ تھا اور بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد۔ ابا صرف چند ایک کتابیں دیوار میں بنی الماری میں رکھا کرتے جس کے پٹ ہمیشہ بند رہتے۔ رات کو سونے سے پہلے بستر پر لیٹ کر ابا مجھ سے الماری کھلواتے جس کی کنڈی مجھے مونڈھے پر چڑھ کر کھولنی پڑتی۔ پھر ایک کتاب نکلواتے ___ مجھے صرف ایک کتاب یاد ہے، ممتاز مفتی کی علی پور کا ایلی - یہ ایک بے حد ضخیم کتاب تھی، مجلد، اور سبز اور خاکی ڈسٹ کور پر غالباً ٹڈے سے ہوئے تھے۔ میں یہ کتاب مونڈھے پر چڑھ کر احتیاط سے نکال کر ابا کو دیتی۔ ٹڈے کی سرورق پر بنی تصویر دیکھ کر ایک دفعہ میں نے پوچھا، ابا، کیا یہ ٹڈے کی کہانی ہے؟ اور ابا نے ہنس کر کہا تھا، ہاں۔ ابا سے مجھے ایک شکایت تھی۔ وہ اس کتاب کے دو چار یا آٹھ دس صفحے پڑھ کر، نشانی لگا کر، مجھ سے واپس رکھوا دیتے۔ مجھے یہ بے صبری کہ آخر ابا اسے فوراً پورا کیوں نہیں پڑھ ڈالتے۔

ابا کو گاڑی چلانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ سیکنڈ ہینڈ گاڑی خریدتے اور ہر سال گاڑی تبدیل کرتے۔ کبھی آسٹن، کبھی ہلمین۔ فورڈ کی سفید اسٹیشن ویگن کی یاد بے حد واضح ہے۔ وہ ہم بچوں کو بہت پسند تھی۔ پچھلے حصے میں بیٹھ کر ڈکی کا دروازہ کھلا رکھا جاتا۔ خاندان کے تمام بچوں کو گاڑی میں بھر کر ابا سیر کرانے لے جاتے۔ کلفٹن میں کوٹھاری پریڈ ہم بچوں کی پسندیدہ جگہ تھی۔ ہم سب گنبد نما کھلی عمارت کے اطراف جودھ پوری پتھر کی بنی چکنی ڈھلان پر چڑھ کر پھسلا کرتے۔ اتوار کے اتوار ہاکس بے، سینڈز پٹ اور پیراڈائز پوائنٹ کا چکر لگتا۔ اکثر شام کو صدر میں واقع کیفے جارج میں ہم بچوں کو آئس کریم کھلانے لے جاتے۔ منگھوپیر بھی ایک دو دفعہ گئے۔ سٹی ریلوے اسٹیشن اور ایرپورٹ بھی تفریح کی غرض سے جایا کرتے۔ ابا کے ایک دوست تھے، ایم ایف آئس کریم فیکٹری کے مالک۔ ہم بچے اکثر ابا کے سر ہو جاتے کہ ہمیں ان کی فیکٹری کی سیر کرائیں۔ فیکٹری ملیر کے مضافات میں تھی اور آس پاس ان کے امرود کے باغات ہوا کرتے تھے۔ پہلے باغ جا کر جی بھر کر امرود کھائے جاتے۔ پھر فیکٹری کی سیر کرتے ___ آئس کریم کے پلانٹ میں۔ آئس کریم سے نہ صرف وہیں خاطر تواضع کی جاتی بلکہ ایم ایف آئس کریم کے ڈبے بھی تحفے میں ملتے۔ ہم بچوں کا ہر شام موٹر میں سیر کرنا لازمی ہوتا۔ اگر کہیں دور نہیں تو ابا

ہمیں سوسائٹی کی گلیوں ہی کے چکر لگانے لے جاتے۔ ہل پارک کے قریب ایک گلابی رنگ کا بنگلہ تھا۔ گنبدوں، محرابی کھڑکیوں اور محرابی دروازوں والے اس منفرد بنگلے کے دو گیٹ تھے لکڑی کے، اور اندر بڑا سا پورچ تھا۔ ہم بچوں کو یہ گھر بڑا سحرانگیز دکھائی دیتا، بالکل پریوں کا محل۔ اس بنگلے پر اکثر سناٹا چھایا رہتا اور دونوں گیٹ ہمیشہ کھلے ہوتے۔ اما ایک گیٹ سے گاڑی اندر گزارتے اور دوسرے گیٹ سے نکال لیتے اور ہم بچے، سحرزدہ، اس کے درودیوار دیکھتے رہ جاتے۔ گو اس بنگلے کا رنگ آج بھی گلابی ہے لیکن اب اس کے درودیوار پر اس فسوں، معصومیت اور مہماں نوازی کی جگہ کرختگی اور سرد مہری نے لے لی ہے۔ دیواریں بلند ہو چکی ہیں اور سد آہنی گیٹوں کے باہر ایک چوکیدار بیٹھا ہوتا ہے۔

سال میں ایک دفعہ ایک تفریح کا موقع صدر روڈ پر بھی ملتا۔ یہ دس محرم کو نکلنے والے تعزیے اور علم کے بڑے جلوسوں اور ماتم کے دیدار کا موقع ہوتا۔ یہاں ہم ماموں کے ساتھ جایا کرتے۔ ماما، مانی، ماموں اور ممانی اور میری ہم عمر خالہ ملیر میں رہتے تھے۔ یہ شیعہ محلہ تھا۔ آٹھ دس گھر سیدوں کے بھی تھے۔ ہم بچے آٹھ محرم سے مانی کے گھر رہنے آ جایا کرتے۔ محلے میں ہونے والی مجلسوں میں شریک ہوتے۔ چھریوں کا ماتم اور ذوالجناح دیکھنے کے چکر میں نو اور دس محرم کی راتوں کو جاگتے رہنے کی کوشش کرتے۔ جب نیند سے آنکھیں بوجھل ہونے لگتیں تو امی، مانی یا ممانی کو تاکید کر کے کہ ہمیں جلوس کے وقت ضرور اٹھائیے گا، صحن میں بچھی چارپائیوں پر پڑ کر سو جاتے۔ واقعتاً ہمیں جلوس نکلنے پر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا جاتا اور ہم بچے دروازے کھول کر دہلیزوں پر کھڑے ہو جاتے۔ تنگ گلیوں سے جب جلوس اور ذوالجناح گزرتے تو یہ سب اتنے قریب سے دیکھنے کی عجب خوشی ہوتی۔ صدر روڈ پر البتہ گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر ماتم دیکھا جاتا۔ اس زمانے میں لوگ گھروں کے دروازے کھلے ہی رکھتے تھے۔ اور صدر روڈ پر رہنے والے اتنے مہماں نواز ہوتے تھے کہ سب کو چھتوں اور منڈیروں پر ٹک کر جلوس دیکھنے کی بخوشی اجازت دے دی جاتی تھی۔ خاص طور پر بچوں کو۔

اسی زمانے میں اما نے سراج الدولہ روڈ کے اس پار دارالاماں ہاؤسنگ سوسائٹی میں زمین خریدی۔ مکان کی تعمیر شروع ہوئی۔ اب ہم بچوں کی آوارہ گردی کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ پلاٹ پر جانے کے بہانے ہم آس پاس کی گلیوں اور تھوڑے فاصلے پر واقع پہاڑی تک جانے لگے۔ یہ پہاڑی، جو اب ہل پارک کہلاتی ہے، بڑے بڑے پتھروں، جنگلی جھاڑیوں، خودرو پودوں اور گھاس پھوس سے ڈھکی ہوتی تھی۔ پہاڑی پر دو تین پگڈنڈیاں ہوتی تھیں جسے لوگ سوسائٹی کے دوسرے حصے کو عبور کر کے ڈرگ روڈ (شارعِ فیصل) تک پہنچنے کے لیے استعمال کرتے۔ لیکن پہاڑی پر ہم بچے کبھی اکیلے جانے کی ہمت نہ کر پاتے۔ احتشام بھائی جان کے پیچھے پڑتے کہ پہاڑی پر چلیں۔ اور سب بچے ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے دوڑتے پہاڑی پر چڑھتے۔ پہاڑی کے اوپر سے دوسری طرف ڈھلان پر سے مکانات کھلونے اور سڑک پر چلتی موٹریں ماچس کی ڈبیاں نظر آتیں۔

ہم سب بچے دہلی مرکنٹائل سوسائٹی (ڈی ایم ایس) اسکول میں پڑھتے تھے جو گھر کے قریب ہی

تھا۔ جب میں پانچویں جماعت میں آئی تو لڑکیوں کی علیحدہ شاخ کھلی جو شہید ملت روڈ کے پار کوکن سوسائٹی میں واقع تھی۔ شہید ملت روڈ اس زمانے میں ایک تنگ اور ٹوٹی پھوٹی دورویہ سڑک ہوا کرتی تھی جو ڈرگ روڈ کو جیل روڈ سے ملاتی تھی۔ سڑک کی دو پٹیوں کے درمیان ایک وسیع و عریض میدان تھا۔ گھر سے اسکول تک پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا اور ہم بچے کھیلتے کودتے، شہید ملت روڈ کا میدان پار کرتے اسکول پہنچتے۔ (یہ سڑک ستر کی دہائی کے وسط میں چوڑی ہوئی۔) اسکول کے بعد اکثر میں، نورالصباح اور دو تین سہیلیاں گھر کی طرف لوٹتے اور گھر سے آگے واقع جھیل پارک چلے جاتے۔ (یہ سوسائٹی کا وہی پارک ہے جو ستر کی دہائی کے آخر میں کٹ کٹا کر چھوٹا ہوا، اسی کی دہائی میں یہاں رہائشی منصوبہ شروع ہوا جو شہریوں کے دباؤ کی وجہ سے اب تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔) مجھے یہ باغ بے حد پسند تھا۔ اس کی وجہ نفاست سے تراشی ہوئی ہری بھری باڑھیں تھیں جو باغ کو چھوٹے چھوٹے چوکور احاطوں میں تقسیم کرتی تھیں۔ یہ سبز دیواریں ہمارے قد سے اونچی ہوا کرتی تھیں۔ ہم ان سبز دیواروں کے گرد گھومتے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ایسی دنیا میں گم ہو جاتے۔ بے شک جب ہم باغ سے واپس لوٹتے تو پوچھا جاتا کہ ہم کہاں تھے لیکن یہ ہماری ماؤں کے لیے کوئی ایسی پریشان کن بات نہ تھی۔ وہ پرسکون دور تھا کراچی کا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم بچیوں کی طرف سے ہماری اماؤں کو صرف ایک دفعہ پریشانی لاحق ہوئی تھی کہ بچیوں کے کانوں سے سونے کی بارک بالیاں کوئی اتار نہ لے۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ میری چھوٹی تایازاد بہن روتی ہوئی گھر پہنچی کہ ایک بابا نے اس کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار لی ہیں۔ اس واقعہ کا رد عمل صرف یہ ہوا تھا کہ ہم سب بچیوں کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار دی گئی تھیں۔ ہمارا گھومنا پھرنا اسی طرح جاری رہا تھا۔

ساٹھ کے عشرے میں طارق روڈ پر کیپٹے لبرٹی کے آس پاس چند دکانیں کھل چکی تھیں۔ یہ اسٹیشنری، کتابوں اور کپڑوں کی دکانیں تھیں۔ لندن بک ہاؤس، گلستاں بک اسٹال، اور پچھلی گلی میں (جو اب دوپٹہ گلی ہے) ایک دو اسٹیشنری کی دکانیں اور ایک چھوٹی سی لائبریری ہوا کرتی تھی۔ طارق روڈ ہمارے گھر سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں اور صدر ہفتے میں کئی چکر لندن بک ہاؤس اور لائبریری کے لگاتے۔ کتابوں کے علاوہ ہم دونوں کو paper dolls جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ لندن بک ہاؤس سے باقاعدگی سے یہ کاغذ کی گڑیاں خریدی جاتیں۔ ہم دونوں اکثر اکیلے ہی طارق روڈ جایا کرتے تھے۔ کتابوں کا شوق ہم اس زمانے میں ایک چلتی پھرتی لائبریری سے بھی پورا کرتے تھے۔ اس لائبریری کا مالک ایک نرم گو، شفیق چہرے والا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو ایک سائیکل کی پشت پر بندھے بڑے سے تھیلے میں بچوں کی کتابیں ڈالے سوسائٹی میں گلی گلی آواز لگاتا گھوما کرتا۔ یہ لائبریری والا ہفتے میں دو تین دفعہ ہماری گلی میں بھی آتا۔ ہم بچے اس کا بے چینی سے انتظار کرتے۔

نیا گھر بننے میں چار پانچ سال لگے۔ وجہ مالی مشکلات تھیں۔ آخر جب کرائے کے مکان میں رہنا مشکل ہو گیا تو ابا نئے مکان میں اٹھ آئے گو کہ ابھی چھوٹے موٹے کافی کام باقی تھے۔ گھر میں گیٹ بھی نہیں لگا تھا۔ امی، ابا اور ہم بچے (اب ہم چار بہنیں اور چار بھائی تھے) نیچے کی منزل میں مقیم ہوئے اور اوپر تایا اور

بچا کے کیسے آباد ہوئے۔ یہ گھر ابا نے روایتی طرز پر بنوایا تھا، یعنی بیچ میں ایک آنگن تھا جس کے تین طرف کمرے، باورچی خانہ، غسل خانہ تھا اور چوتھی سمت ایک چھوٹی سی کھلی جگہ تھی، باغیچہ نما۔ کیاری میں پیڑ پودے لگائے گئے تھے ــــ رات کی رانی، دن کا راجا، چمپا اور چنبیلی ــــ اور درمیان میں گھاس لگانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس باغیچے اور گیراج کے درمیاں کوئی دیوار نہ تھی اور آنگن بھی کھلا تھا۔ یعنی گیٹ سے داخل ہو کر ہمارے صدر دروازے کے اس کھلی جگہ سے آنگن اور پھر کمروں میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ مالی دشواریوں کی بنا پر ابا تقریباً تین سال تک گیٹ نہ لگوا سکے۔ لیکن ہم سب اپنے کمروں کے دروازے کھلے رکھ کر اس تمام عرصے چین کی نیند سوتے تھے۔ اب تو کراچی کے وہ دن مٹھی میں ریت کے مانند ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔

گھر کے آنگن اور اس چھوٹے سے باغیچے کے ساتھ ایک بے حد خوش کن اور منفرد یاد وابستہ ہے۔ وہ یاد ہے چارلی چپلن کی فلموں کی۔ ابا کو موسیقی، فلموں اور فوٹوگرافی کا شوق تھا۔ ابا کے پاس دو پروجیکٹر تھے۔ ایک چھوٹا سیکنڈ ہینڈ، خاموش فلموں کے لیے، اور دوسرا بڑا، جو ابا ۱۹۵۸ میں جاپان سے خرید کے لائے تھے (ابا کا بزنس کے سلسلے میں جاپان جانا ہوا تھا)۔ ابا اس زمانے میں USIS کے ممبر تھے۔ چارلی چپلن اور ڈاکیومنٹری فلموں کی ریلیں وہیں سے لائی جاتیں۔ رات کے کھانے کے بعد باغیچے کی دیوار سے لگی کپڑے سکھانے کی ڈوری پر ایک سفید دھلی ہوئی چادر لٹکائی جاتی، ابا پروجیکٹر سیٹ کرتے، چھوٹے پایوں والے نواڑ کے دو پلنگ اور گھر میں پائی جانے والی تمام کرسیاں نکال کر آنگن میں بچھائی جاتیں، آنگن اور کمروں کی بتیاں گل کی جاتیں، اور ہم بچے اپنی اپنی سیٹیں سنبھالتے۔ کیاری میں لگی رات کی رانی اور چنبیلی کی مہک سے لبریز، کراچی کی خوشگوار ہوا آنگن میں تیرتی، اور ہم سب چارلی چپلن کی مزیدار حرکتوں پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوا کرتے!

لیکن ابا کبھی ہم بچوں کو فلم دکھانے سینما ہال نہیں لے گئے۔ ہندوستانی اور انگریزی فلمیں ابا اپنے دوستوں کے ساتھ دیکھا کرتے۔ ابا کے ان گنت جگری یار تھے ــــ دہلی کے تاجر وحید صاحب، بنگال کے بیوروکریٹ عالم صاحب، بہار کے انجینئر سید صاحب، پنجاب کے ٹھیکیدار شیخ صاحب، اور کراچی کے پارسی ملیموریا صاحب۔ سوائے ان ملیموریا صاحب کے، باقی سب کے گھروں میں امی اور ہم بچوں کا آنا جانا تھا۔ سب سے زیادہ دوستی وحید صاحب اور عالم صاحب کی فیملی سے تھی کیوں کہ ان کے بچے ہم بچوں کے ہم عمر تھے۔ سید صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی لیکن ان کی سوشیالوجی میں ایم اے پاس بیوی سے امی کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ ملیموریا صاحب کے ہاں اولاد نہ تھی، اور غالباً ابا کا خیال ہوگا کہ امی کی دوستی مسز ملیموریا سے شاید نہ ہو پائے، اس لیے وہ ہمیں بچپن میں ان کے گھر نہیں لے گئے۔ لیکن گھر میں ملیموریا صاحب کا تذکرہ اسی زور شور سے ہوا کرتا تھا۔

امی کو بھی فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ امی نے زیادہ تر فلمیں بیگم وحید اور بیگم عالم کے ساتھ

دیکھیں۔ عالم صاحب انویسٹمنٹ پروموشن بیورو میں ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے اور جمشید کوارٹرز میں ان کی رہائش تھی۔ وحید صاحب فریئر روڈ کے ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے پی ای سی ایچ ایس میں مکان بنوایا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ اکثر دوپہر میں امی چھوٹے بچوں کو رشیدہ بجی کی نگرانی میں ایک سواتی آیا کے حوالے کر کے میرے ساتھ چپکے سے نکل آتیں۔ پھر ہم دونوں رکشا میں عالم صاحب کے گھر پہنچتے۔ مسز عالم اور ان کی بیٹی شائستہ، جو میری ہم عمر تھی، فلم دیکھنے کے لیے بالکل تیار ہوتیں۔ وہ بھی اپنے چھوٹے بچوں کو پڑوس کے حوالے کرتیں اور ہم چاروں پیدل فلستان یا باوٹی سینما پہنچتے اور سکوں سے میٹنی شو دیکھا جاتا۔ اس طرح میں اسکول کے زمانے میں راج کپور اور نرگس کی پرستار بنی۔ آہ ، آوارہ ، انداز ، برسات ، اور بہت سی دوسری فلمیں دیکھیں۔ جب ستمبر ۱۹۶۵ کی جنگ کے بعد ہندوستانی فلموں پر پابندی لگی تو مشرقی پاکستان میں بننے والی اردو فلمیں آخری اسٹیشن ، چندا ، چکوری ، تلاش وغیرہ بڑے شوق سے دیکھیں۔

عالم صاحب کے گھر ہم سب کو بہت مزہ آتا۔ سب سے بڑی شائستہ، اس سے چھوٹا شاہد اور پھر پیارا (جس کا اصل نام کچھ اور تھا)، شہناز اور محمود۔ بچے تو رواں اردو بولتے لیکن مسز عالم دو چار جملے ہی بول پاتیں۔ آپس میں وہ سب ہمیشہ بنگالی بولتے۔ اکثر ہم لوگ ایک دوسرے کے گھر دعوتیں کھایا کرتے۔ ہمیں ان کی مچھی بھات ترکاری مزیدار لگتی اور انھیں امی کے ہاتھ کے پکے کھانے بھاتے۔

شائستہ اور میں تیرہ چودہ برس کے ہو رہے تھے۔ شائستہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور مکھن جیسی ملائم سنہری جلد والی پرکشش لڑکی تھی اور میں ایک گول چہرے، چپٹی ناک، اور نکلتے مہاسوں والی معنک ٹین ایجر۔ شائستہ مجھے لڑکوں کی باتیں سناتی۔ پڑوس کے لڑکے، محلے کے لڑکے، اسکول کے لڑکے، اسکول کے سامنے بس اسٹاپ پر کھڑے ہونے والے شہر کے کالجوں کے لڑکے۔ لڑکے جو اس پر عاشق تھے۔ مجھ پر کوئی عاشق نہ تھا۔ میں رشک سے شائستہ کی باتیں سنا کرتی۔ لڑکپن کی یہ گہری دوستی ۱۹۷۰ میں ایک شام اداس کن موڑ پر پہنچ کر ختم ہوئی جب عالم صاحب کا خاندان کراچی چھوڑ کر ڈھاکے جا بسا۔

۱۹۶۰ کی دہائی اور موجودہ عشرے کے درمیان تیس برس گزر چکے ہیں۔ تیس برس۔ ان تیس برسوں میں اس شہر، اس زمین آسمان اور شہر کے مکینوں کی زندگی میں کتنی تبدیلیاں آئی ہیں۔ تیس برس اتنا طویل عرصہ تو نہیں۔ یا شاید ہے۔ لیکن کیا کسی شہر کے مکین تین عشروں میں اتنی سنگین تبدیلیوں کے متحمل ہو سکتے ہیں؟

***

ملیر کی گلیاں

ملیر کی یادوں کے ساتھ ہرے بھرے پیڑ وابستہ ہیں۔ امرود، آم، انار، نیم، گلاب، چنبیلی، موتیا۔

ہم بچے نانی کے گھر رہنے جایا کرتے۔ نانا اور ماموں کے کوارٹر ملے ہوئے تھے۔ ہر کوارٹر میں ایک کمرہ اور ایک بڑا سا آنگن تھا۔ نانا نانی کے ساتھ خالہ رہتی تھیں، اور ماموں، ممانی اور ان کے تین بیٹے ایک ساتھ۔ دونوں کوارٹروں کی درمیانی دیوار نہ تھی لہٰذا یہ ایک بڑا سا گھر نظر آتا۔ نانی کے آنگن میں امرود کے تین چار پیڑ قطار سے لگے ہوئے تھے اور ایک انار کا درخت تھا۔ ماموں کی طرف ایک بڑا سا نیم کا پیڑ اور موتیا، چنبیلی، اور گلاب کی جھاڑیاں تھیں۔

چھٹیوں کی دوپہر ہم بچے درختوں پر چڑھتے، امرود توڑ توڑ کر کھاتے، آنکھ مچولی کھیلتے۔ شام کو سڑک کے اُس پار ملیر ریلوے اسٹیشن کی سیر کو جاتے اور اسٹیشن کے باہر ریل کی پٹریوں کے پیچھے بنی پلیاؤں کے اندر بیٹھ کر اوپر سے جاتی ہوئی ٹرین کی آواز سنتے۔ رات کو نانی چارپائیوں پر صاف ستھرے بستر لگاتیں اور ہمیں کہانیاں سناتیں۔ اور ہم تاروں بھرے آسمان کو تکتے تکتے سو جاتے۔ یہ ۱۹۶۰ کی دہائی کی بات ہے۔

تب ملیر کے ہر کوارٹر میں آنگن اور پیڑ ہوتے تھے اور گلیاں صاف ستھری۔ ہواؤں میں امرود کی مہک اور چنبیلی کی خوشبو بسی ہوتی۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے پیڑوں کو کاٹ کر اضافی کمرے بنانے شروع کیے۔ کچے آنگن پکے ہوتے گئے۔ پیڑوں کی تعداد گھٹتی گئی۔ گلاب اور چنبیلی کی جھاڑیاں بھی بتدریج کم ہوتی گئیں۔ کمروں کے باہر ٹین کے شیڈ ڈال کر برآمدے بنائے گئے۔ یہ ۱۹۷۰ کے عشرے کا ذکر ہے۔

آبادی بڑھتی رہی۔ اسی مربع گز پر بنے ہوادار اور روشن گھر گھٹے ہوئے، چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والے تاریک، ایک مرلہ، دو مرلہ بدصورت مکانوں میں تبدیل ہو گئے۔ گلیوں کی چوڑائی کم ہو گئی کیوں کہ لوگوں نے گھروں کے باہر ناجائز احاطے تعمیر کر لیے اور سیاہ آہنی گیٹ لگا لیے تھے۔ پیڑوں کی شاخوں کی جگہ اب ٹی وی اینٹینوں، سیاسی جماعتوں کے رنگ برنگے جھنڈوں اور ٹیلی فون کے بے ہنگم تاروں نے لے لی تھی۔ یہ ملیر کالونی تھی ۱۹۸۰ کی دہائی میں۔

اور آج، اپریل ۱۹۹۵ کی ایک صبح، میں ملیر کی ایک پکی سڑک پر چلتے ہوئے اس حصے پر قدم رکھتی ہوں جو کلاشنکوف کی گولیوں کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے چھلنی اور ایک انسان کے خون سے سیاہ ہے ـــ وہ انسان جسے آج سے پندرہ دن قبل سڑک کے اسی حصے پر سفاکی سے قتل کیا گیا۔ میں ان تبدیلیوں کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتی ہوں جو گزشتہ تین دہائیوں میں اس زمین اور اس زمین کے باسیوں کی روح میں در آئی ہیں۔ کتنی گمبھیر تبدیلیاں ہیں یہ۔ اور کتنا مسخ کر دیا ہے انھوں نے ملیر کو، جو کبھی ایک سرسبز اور پُرامن وادی تھی، اور اس کے مکینوں کی روح کو، وہ سادہ لوح، مہمان نواز مکین جو

پیڑوں، پھلوں، پھولوں، سنگ سواؤں اور زندگی سے محبت کرتے تھے۔
اس منظر کی تصویر میرے دس کے دریچے میں ثبت ہو کر رہ گئی ہے؛ دوپہر کا وقت ہے۔ زندگی کا کاروبار جاری ہے۔ سڑک کے کنارے سی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں گاہک کھڑے اشیائے صرف کی خریداری میں مصروف ہیں۔ بچے گلیوں میں کھیل رہے ہیں اور عورتیں گھروں کی دہلیز پر کھڑی ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں۔ ایک کار سڑک پر رکتی ہے۔ سامنے حلوائی اور ڈرائی کلینر کی دکانیں ہیں۔ گاڑی میں سے تین مسلح آدمی اترتے ہیں، ڈگی کھولتے ہیں۔ ایک ادھ موئے، نیم جان، کمر تک ننگے آدمی کو نکالتے ہیں جس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں، اور اسے تپتی ہوئی تارکول کی سڑک پر پھینکتے ہیں، اس پر کلاشنکوف سے گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں، پھر اس کے چہرے پر ٹھوکر مار کر اطمینان کرتے ہیں کہ وہ مر چکا ہے یا نہیں۔ اور جب اس کا خون آلود ساکت چہرہ ایک طرف ڈھلک جاتا ہے تو گاڑی کا دروازہ کھول کر اطمینان سے بیٹھتے ہیں اور گاڑی آہستہ خرامی سے سڑک پر چلتی ہوئی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔
لاش تین گھنٹے خون کے تالاب میں ڈوبی پڑی رہی۔ وہ ایک تنومند، کسرو جوان تھا۔ کوئی لاش کے قریب نہ پھٹکا۔ سڑک پر زندگی کا کاروبار جاری رہا۔ البتہ ایک وحشت ناک خاموشی پھیل چکی تھی۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنے کام جلدی جلدی نمٹا رہے تھے اور لاش کو کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ آخرکار تین گھنٹے بعد ایدھی کی ایمبولینس پہنچی اور لاش اٹھا کر لے گئی۔ ہفتہ بھر وہ لاش مُردہ خانے میں پڑی رہی۔ پھر کہیں جا کے اس کی شناخت ہوئی۔ پتا چلا کوئی فوجی تھا، سفید بالوں اور جھریوں بھرے چہرے والی بزرگ خاتون موضوع سخن سے ہٹ چلی ہیں۔ میں ملیر کے اس گھر میں بیٹھی ان کے نوجوان بھتیجے کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی ہوں جو چند ماہ پہلے اس گھر کے اندر قتل ہوا تھا۔
خدا رحم کرے ہم سب پر۔ ہمیں کیا ہو گیا؟ کیا ہمارے اندر شیطان حلول کر گیا ہے؟ مقتول نوجوان کی پھوپھی، تسبیح ہلاتی ہوئی، تیز تیز بولے جا رہی ہیں۔ مقتول کی ماں کسی ہوئم میں گئی ہوئی ہیں اور میں گھر کی عورتوں سے بات کر رہی ہوں۔
لوگ اتنے بے درد، اتنے بے رحم ہو گئے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں کہ بھیڑ بکریوں کو بھی ایسے ذبح نہیں کیا جاتا مقتول کی چچی تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔
ساتواں روزہ تھا۔ میں ظہر کی نماز کے بعد تسبیح پڑھ رہی تھی۔ ریحان دوسرے کمرے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ ریحان کی ماں بھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ دودھ والا دودھ دے کر پلٹا تھا اور میں دودھ کی تھیلی ہاتھ میں لیے باورچی خانے کی طرف مڑی ہی تھی کہ اتنے میں ایک سفید کار گھر کے گیٹ پر رکی، تین آدمی بڑی بڑی بندوقیں لیے دندناتے ہوئے اندر آ گئے اور چلا کر پوچھا ریحان ہے؟ انھوں نے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور سیدھے اندر چلے گئے۔ ہمارے گھر کے ساتھ والا مکان ریحان کا ہے اور اندر سے ایک چھوٹا سا راستا ہے جو دونوں گھروں کو ملاتا ہے۔ بس وہ سیدھے اس راستے سے ہوتے ہوئے اندر چلے گئے۔ ریحان ظہر کی نماز

پڑھ رہا تھا، بچی ایک دم سے خاموش ہو گئیں۔ پھوپھی، ماں اور بچی کی چیخوں اور بچوں کی خوف زدہ ہو کر رونے کی آوازوں کے درمیان قاتلوں نے کمرے میں داخل ہو کر گولیوں کی باڑھ ماری۔ 'ریحان کے ہاتھ نماز کے لیے بندھے ہوئے تھے۔ جیسے یہ بندھے ہاتھوں کے ساتھ کوئی آواز نکالے بغیر گر گیا۔ بائیس گولیاں نکلی تھیں جسم سے، وہ مجھے بتا رہی ہیں۔

یہ سب کچھ منٹوں میں ہو گیا اور قاتل جس راستے سے آئے تھے اسی راستے واپس ہو گئے۔ دو کے سر پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے اور ایک جو درمیانی راستے پر تھم کر کھڑا ہوا تھا نقاب نہیں پہنے تھا، بچی نے بتایا۔

شاید آپ اسے پہچان سکیں؟ میں سوالیہ لہجے میں کہتی ہوں۔

میں؟ نہیں۔ نہیں۔ وہ گھبرا سی گئیں۔ 'مجھے اس کی شکل بالکل یاد نہیں۔ ہوش و حواس میں کہاں تھی تب۔'

اگر پہچان بھی لیں تو کیا ریحان ہمیں واپس مل جائے گا؟ جانے والا تو گیا، پھوپھی جلدی سے بولیں۔

پھوپھی مجھے وہ کمرہ دکھانے لے جاتی ہیں جہاں وہ قتل ہوا تھا۔ یہ ایک بہت تنگ سا کمرہ ہے جس میں صرف ایک صوفہ سیٹ ہے جو تین دیواروں کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ صوفے کی وسطی میز کو جو تھی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھا گیا ہے اور کمرے کے وسط میں دری بچھی ہوئی ہے جس پر جائے نماز بچھائی جا سکتی ہے۔ چاروں دیواریں، اور صوفہ سیٹ گولیوں سے چھلنی ہیں۔ میں صوفے پر بیٹھی ہوں۔ ریحان کی بچی ہمارے لیے چائے لے کر آتی ہیں۔

ستائیس سالہ ریحان ایک بہن اور سات بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ ریحان کے باپ تیرہ سال پہلے طویل بیماری کے بعد فوت ہوئے۔ ریحان اس وقت آٹھویں میں تھا۔ اس نے پڑھائی جاری رکھی اور لیاقت مارکیٹ میں اپنے ماموں کی دکان میں بطور سیلز مین کام شروع کیا۔ بی کام کرنے کے بعد اس نے دوپٹوں کی دکان لگائی۔ دو چھوٹے بھائی اس کی مدد سے جمعہ بازار میں اسٹال لگاتے۔ پورے گھر کی ذمہ داری اس پر تھی۔

"ریحان کے قتل کے بعد سب کچھ ختم ہو گیا۔ بھائیوں نے تین ماہ سے جمعہ بازار میں اسٹال نہیں لگایا ہے۔ ایک چھوٹے بھائی کی ذہنی حالت بگڑ گئی۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔ پنڈی بھیج دیا تھا رشتے کے چچا کے پاس۔ لیکن کوئی خاص فرق نہیں پڑا ہے۔ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ خلا میں تکتا رہتا ہے۔ ہاتھ کھڑے کھڑے سینے پر باندھ لیتا ہے جیسے نماز پڑھ رہا ہو اور بڑبڑانے لگتا ہے: میرا بھائی ستائیس سال کا تھا۔ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اور پتا نہیں کیا کیا، پھوپھی کہہ رہی ہیں۔

'کیا ریحان کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ تھا؟

پھوپھی اور بچی خاموش ہو جاتی ہیں۔

ہمیں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ آپ اس کی ماں سے بات کریں آکر۔ وہ بتائیں گی سب۔

ریحان کا تعلق ایم کیو ایم سے تھا، محلے کے لوگوں سے معلوم ہوا۔ تین سال پہلے ریحان کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ اٹھارہ دن بعد واپس آیا۔ ان دنوں اس نے ایک جگہ نوکری شروع کی تھی۔ اغوا کے بعد اس نے ہمیں کبھی کچھ نہ بتایا۔ لیکن اس کے بعد سے مہینوں وہ دہشت زدہ رہا۔ ہفتوں کھانا نہ کھا سکا۔ نوالہ ہی نہیں نگلا جاتا تھا۔ ایسا خوف، ایسی دہشت تھی کہ ہم نے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کی۔ ماں اور پھوپھی کے بیچ میں لیٹ کر سوتا۔ راتوں کو گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ بس کچھ نہ پوچھو کیسا کڑا وقت تھا۔ لیکن ایک تسلی تھی کہ زندہ سلامت تو ہے۔ اب تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ یاد ہی رہ گئی ہے۔

ملیر، اے ون ایریا۔

دیواروں میں لکھے نعروں سے اندازہ ہوتا ہے یہاں ایم کیو ایم حقیقی کا راج ہے۔ ۱۹۷۰ کے عشرے تک یہ علاقہ ایک کھلے وسیع میدان پر مشتمل تھا جس کے کنارے بیرکوں کی صرف ایک قطار تھی۔ یہ بیرکیں شیڈ کے نام سے مشہور تھیں۔ شیڈ کے آس پاس کچھ جھگیاں تھیں اور بھینسوں کے باڑے۔ یہاں پنجابیوں، سندھیوں اور مہاجروں کی ملی جلی آبادی تھی۔ ۱۹۸۰ کی دہائی کے اوائل میں یہ علاقہ دلالوں کے ہاتھ میں آیا جو علاقے میں جلد ہونے والی قانونی پلاننگ کے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کچے گھروں کی قطاریں کھڑی ہو گئیں۔ ۱۹۸۰ کی دہائی کے وسط میں ساٹھ مربع گز کے پلاٹوں کی حد بندی شروع ہوئی۔ شیڈوں کو منہدم کیا گیا اور پرانے مکینوں کو نئے پلاٹ الاٹ ہوئے۔ لیکن ان گنت پلاٹ دلالوں کے ذریعے کراچی کے دوسرے علاقوں سے آنے والے لوگوں کے ہاتھوں فروخت کیے گئے اور یوں اے ون ایریا ۱۹۸۰ کی دہائی کے تین خطرناک عناصر ـــ ہتھیار، ہیروئن اور ایم کیو ایم ـــ کی پناہ گاہ بن گیا۔ ۱۹۹۲ کے وسط میں ہونے والے واقعات ـــ آپریشن کلین اپ اور حقیقی کی پیدائش ـــ نے بارود کا کام کیا۔

ہم ملیر میں ۳۵ سال سے ہیں لیکن ایسے حالات نہیں دیکھے۔ یہ ایم کیو ایم کی دھڑے بندی تھی جس نے ہم سب کو برباد کیا۔ لالو کھیت، کورنگی اور دوسرے علاقوں سے ایم کیو ایم کے لڑکے چھپنے کے لیے یہاں اٹھ آئے۔ چھپنے چھپانے والوں نے ہمارے علاقے کا ستیاناس کیا۔ اب یہ لڑکے بندوقیں اٹھائے گلیوں میں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ بھتا لیتے ہیں۔

سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ یہاں انسانوں کی کوئی عزت نہیں رہی۔ ہماری گلی میں ایک بوڑھا، سعید، کھچڑی بال، سبزی کا ٹھیلا لگاتا ہے۔ اسے ان لڑکوں سے التجا کرنی پڑتی ہے۔ ہاتھ باندھ کے وہ ان اٹھارہ اٹھارہ برس کے لڑکوں سے کہتا ہے سر جی، پھیری لگا لوں؟ ایک ہفتہ ہوا، ان لڑکوں نے پنساری کی دکان لوٹ لی۔ گلی کے بچوں میں لوٹی ہوئی ٹافیاں اور دو دو روپے تقسیم کیے اور کہا بولو، حقیقی زندہ باد۔ ہمارے دودھ والے نے میرے میاں کو بتایا کہ لڑکے اس سے دس ہزار مانگ رہے ہیں

کہ اسلحہ خریدنا ہے۔ غریب دودھ والا دس ہزار کہاں سے لاتا۔ بے چارہ یہ علاقہ چھوڑ گیا۔ خدا جانے اب کہاں دودھ بیچتا ہو گا۔

تو یہ حال ہے ہمارے علاقے کا۔ یہ غنڈے بدمعاش جن کے منہ سے ابھی دودھ کی بو آتی ہے، نہ صرف یہ کہ بھتا مانگتے ہیں بلکہ تمہارے منہ پر کہتے ہیں کہ اسلحہ ختم ہو گیا ہے، بندوقیں لانی ہیں، گولیاں خریدنی ہیں، سکینہ، عمر پچپن کے لگ بھگ، مادری زبان پنجابی، سانس لیے بغیر بول رہی ہیں۔ تین سال کے عرصے میں سکینہ نے اس علاقے کا جو اخلاقی اور معاشرتی زوال دیکھا ہے، اس نے ان کا سر چکرا دیا ہے۔

میں ان کے گھر میں اپنی خالہ کے ساتھ ان کے بیٹے کا حال پوچھنے آئی ہوں جو گلی میں چلنے والی گولیوں سے شدید زخمی ہوا تھا۔ میری خالہ گورنمنٹ کے ایک محکمے سے وابستہ ہیں اور اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اس علاقے میں رہتی ہیں۔

اس دن بہت فائرنگ ہو رہی تھی۔ احمد نے ہم سب کو اندرونی کمرے میں جانے کو کہا اور برآمدے میں آیا کہ گیٹ بند کر لے۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے گیٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانک لیا۔ ایک گولی اس کی دائیں آنکھ کے اوپر لگی اور وہ وہیں گر پڑا۔ باہر لڑکوں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں احمد بھائی کے گولی لگ گئی، فائرنگ بند کرو، فائرنگ بند کرو۔ فائرنگ بند ہو گئی۔ چند لڑکے ہماری مدد کو آئے اور احمد کو جناح اسپتال پہنچایا گیا۔ دوسرے دن دو تین لڑکے میرے پاس آئے اور کہنے لگے خالہ معاف کرنا، لیکن یہ ہماری گولی نہیں تھی جو احمد بھائی کو لگی۔ ذرا دیکھو ان کی ہمت۔ اور ہماری بے بسی! کیا کر سکتے تھے ہم؟ اگر وہ لڑکا بھی، جس کی بندوق سے چلی ہوئی گولی احمد کو لگی، ہمارے پاس آ جاتا تو ہم کیا بگاڑ سکتے تھے اس کا؟ کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ کوئی ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔ اور اٹھائے بھی کیسے؟ کوئی دو لفظ بول دے تو جان سلامت نہیں، سکینہ کہہ رہی ہیں، ہر حال میں جینے کی ہوس نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا وہ چپ ہو جاتی ہیں۔

جس دن میرے بھائی کو گولی لگی جی چاہتا تھا پورے اے ون ایریا کو جلا کر راکھ کر دوں، احمد کی چھوٹی بہن کی آواز غصے سے کپکپاتی ہے۔ وہ بی اے پاس ہے اور ایک دواساز کمپنی میں کام کرتی ہے۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں سامنے دری پر بیٹھی مٹر کی پھلیاں چھیل رہی ہیں۔

یہ چھ بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ احمد سب سے بڑا ہے۔ دو بہنیں نوکری کرتی ہیں۔ باپ کسی فوج میں سپاہی تھے۔ اب معمولی پنشن ملتی ہے۔ احمد ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ پھر اسے فیکٹری سے نکال دیا گیا۔ فیکٹری نقصان میں جا رہی تھی لہذا تیس آدمیوں کی چھٹی ہوئی۔ ایک دفعہ احمد نے باہر جانے کی کوشش کی۔ آٹھ ہزار مانگ تانگ کر کسی ایجنٹ کو دیے۔ لیکن یونان والوں نے پکڑ کر واپس بھیج دیا۔ احمد دو سال سے بے روزگار ہے۔

میں خالہ کے ساتھ طیر کی گلیوں سے گزر رہی ہوں۔ اس علاقے میں بہت اسلحہ ہے۔ چند ایک

خالی گھر ہیں جہاں لڑکوں نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ یہ گھر اسلحہ ڈپو بنے ہوئے ہیں۔ کبھی ان گھروں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں اور قطار سے لگی ہوئی بندوقیں، کلاشنکوفیں اور گولیوں کی پیٹیاں ہر آنے جانے والے کو صاف نظر آتی ہیں۔ بندوقیں لٹکائے یہ لڑکے گولیوں کی پیٹیاں ادھر سے اُدھر پہنچاتے رہتے ہیں۔ آج کل البتہ یہ لڑکے روپوش ہیں۔ جب سے دو امریکی مارے گئے ہیں، تب سے ذرا سکون ہے۔

یہاں دو بدنام ترین لڑکے ہیں حقیقی کے۔ ایک کو تو پولیس گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ محلے والوں نے سکون کا سانس لیا کہ چلو ایک تو کم ہوا۔ لیکن ایک ہفتے بعد وہ لڑکا واپس گلیوں میں گھوم رہا تھا اور فخریہ انداز میں لوگوں کو بتا رہا تھا، دو لاکھ روپے دیئے ہیں۔ ان لڑکوں نے کئی بچوں کو تنخواہ پر رکھا ہوا ہے جو پولیس یا دوسرے گروپ کے لڑکوں کے آنے کی اطلاع انہیں وقت پر پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ بچے بڑے ہو کر کیا کریں گے؟ ہمارے محلے میں الطاف گروپ سے کسی کو کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ لیکن حقیقی والے ان سے بھی بد تر ثابت ہوئے ہیں۔'

ہم ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں جس کا سربراہ، ایک ادھیڑ عمر کا آدمی، پانچ بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کا باپ، دو ماہ پہلے فائرنگ میں ہلاک ہوا ہے۔ بیوہ کسی کام سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ میں لڑکیوں سے بات چیت کر رہی ہوں۔ سب سے بڑی لڑکی بیس سال کی ہے۔ اس دن ابا سہ پہر میں گلی کی نکڑ پر مکینک کی دکان سے اپنی اسکوٹر ٹھیک کروا رہے تھے کہ کچھ مسلح افراد گاڑی میں آئے اور گولیاں برسا کر چلے گئے۔ مکینک تو اسی وقت ختم ہو گیا۔ ابا زخمی حالت میں سڑک پر پڑے رہے۔ کوئی اٹھانے نہیں آیا۔ اتفاق سے میرے بھائی نے اس دن فیکٹری سے چھٹی کی تھی۔ جب گولیاں چلنی بند ہوئیں تو وہ باہر نکلا۔ دیکھا ابا سڑک پر پڑے ہوئے تھے۔ بہت خون بہہ گیا تھا۔ اسپتال جاتے وقت راستے میں ختم ہو گئے۔

میرے ابا اور بھائیوں کا کسی بھی پارٹی سے تعلق نہیں رہا، لیکن ابا کی موت کے بعد ایم کیو ایم اور حقیقی دونوں تنظیموں نے دعویٰ کیا کہ ابا ان کے پارٹی کے ہمدرد تھے۔ یہ جھوٹ تھا۔ بعد میں جب اخبار سے لوگ آئے تو بھائی نے کسی سے بات نہ کی۔ کیا فائدہ ان سب باتوں کا؟ الٹا نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔ ایک آدمی نے کہا میں دستاویزی فلم بنا رہا ہوں دنیا بھر میں دکھانے کے لیے کہ کتنا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ لیکن میرے بھائیوں نے منع کر دیا۔

ہم چارپائی پر بیٹھے ہیں اور بچے ہمارے گرد گھیرا ڈالے کھڑے خاموشی سے ہماری باتیں سن رہے ہیں۔

'ابا موٹر سائیکل پر دکانوں کو مال سپلائی کیا کرتے تھے،' وہ مجھے بتا رہی ہے۔ اب گیارہ افراد پر مشتمل اس خاندان میں دو کمانے والے ہیں۔

جب بھی فائرنگ ہوتی تھی ابا کہتے دروازہ بند کر لو، باہر نہ نکلو۔ بہت ڈرتے تھے۔ ہنگاموں سے دور رہتے تھے۔ دو دن پہلے ہی کہا تھا کہ کھڑکیوں دروازوں میں لوہے کی جالی لگوا لیں گے۔ بہت وارداتیں ہو

رہی ہیں۔ کسی کو کیا معلوم تھا خود ہی واردات کا شکار ہو جائیں گے۔

کیا حکومت کی طرف سے کوئی معاوضہ وغیرہ ملا؟ ہمیں صرف ایف آئی آر کی کاپی ملی جو پولیس نے خود درج کی تھی۔ اور اماں کی موت کا سرٹیفکیٹ جو اسپتال والوں نے دیا۔

'لیاقت آباد میں بھی بہت برا حال ہے، جہاں میں رہتی ہوں۔ لیکن یہاں کے حالات تو بہت ہی خراب ہیں، ایک بوڑھی خاتون جو گھر میں مہمان آئی ہیں بتانے لگیں۔ دو مہینے پہلے میں یہاں آئی تھی۔ بس سے اتر کر گلی میں داخل ہوئی۔ میری نظریں اتنی کمزور ہیں کہ میں صرف زمین کی جانب نظریں جمائے رکھتی ہوں کہ کسی پتھر سے ٹھوکر نہ کھاؤں۔ ادھر اُدھر تو دیکھتی نہیں انھوں نے موٹے شیشوں والا چشمہ درست کیا، اور بولیں، میں جب گلی میں داخل ہوئی اور نظر اٹھائی تو دیکھا تین لڑکے یہ لمبی لمبی صندوقیں کندھوں پر لٹکائے کھڑے ہیں۔ میں وہیں بت بن گئی۔ مجھ سے اگلا قدم اٹھائے نہ اٹھے۔ خوف تھا کہ ابھی اور ان لڑکوں نے گولی چلائی۔ ایک لڑکے نے میرے سفید بالوں اور جھکی ہوئی کمر کو دیکھتے ہوئے کہا، اماں ڈر گئیں؟ میں بولی، بیٹا ڈروں کیسے نہیں؟ صندوق جو اٹھائے ہوئے ہو۔ بولا، اماں تم تو پہلے ہی مری ہوئی ہو۔ تمھیں کیا ماریں!'

ہم تنگ گلیوں سے گزر کر خالہ کے گھر واپس لوٹتے ہیں۔ یہاں منشیات کا مسئلہ بھی ہے، خالہ کہتی ہیں۔ ایک مکان کے باہر بنے ہوئے چبوترے پر ایک آدمی بیٹھا ہے ___ سرخ آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں نکلی ہوئی، خالی الذہن، خلا میں گھورتا ہوا۔

کچھ لوگ کھلم کھلا بیچتے ہیں ہیروئن۔ ایک پکڑا بھی گیا تھا۔ لیکن چھوٹ کے آ گیا۔ اس کا بھائی وکیل ہے۔'

میری خالہ کو حالات سے باخبر رہنا پڑتا ہے۔ ان کے بچے چھوٹے ہیں اور اسکولوں کالجوں میں پڑھ رہے ہیں۔ بڑی بیٹی کراچی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہے۔ دو لڑکوں نے تکنیکی ڈپلومے لیے ہیں اور اب ٹیکسٹائل ڈیزائن کا کام شروع کیا ہے۔ خالہ کی زندگی جدوجہد کی داستان ہے۔ خالو کی مسلسل بیماری کی وجہ سے گھر بار کا پورا بوجھ ہمیشہ خالہ پر ہی رہا۔

اور اب میں سوچنے لگی تھی کہ چلو بچوں کی تعلیم ختم ہونے کو آ رہی ہے اور وہ برسرِروزگار ہونے لگے ہیں۔ سکون سے بقیہ دن گزر سکیں گے۔ لیکن اب یہ گھر ہے، اور ہم خالہ بھرے بھرے گملوں پر نظر ڈالتی ہیں۔ برآمدے میں سیمنٹ کی چادر ڈلوا کر لوہے کی جالی لگوائی ہے۔ سفید پینٹ تازہ ہے۔ اور یہ محلہ جو تیزی سے تباہی کے گڑھے میں گر رہا ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں دلدل پہ چل رہی ہوں۔ بس ایک تسلی ہے، اگر اسے تسلی کہہ لو، کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ ہم سب ہی اس دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔ شاید آگے دلدل ختم ہو جائے اور زمین مضبوط، کون جانے ، خالہ کے چہرے پہ ایک موہوم سی مسکراہٹ ہے۔

***

کورنگی کی کہانی

صبح کے نو بجے ہیں۔ وسط مارچ کے سورج کی چمکیلی کرنیں فضا کو آہستہ آہستہ گرما رہی ہیں۔ میں پُل پر سے ہوتی ہوئی کورنگی انڈسٹریل ایریا سے گزر رہی ہوں۔ دورویہ چوڑی سڑک کے دونوں اطراف ملیں اور فیکٹریاں ہیں۔ کراچی کے سائٹ ایریا کے برخلاف، جہاں غیر ملکی کمپنیوں نے فیکٹریوں کے اردگرد پیڑ پودے، گل بوٹے لگا کر علاقے کو سرسبز کر دیا ہے، کورنگی انڈسٹریل ایریا بنجر اور خاک آلود ہے۔ یہاں دو چار ہی غیر ملکی کمپنیوں کے پلانٹ ہوں گے۔ اکثریت مقامی کارخانوں کی ہے۔ فیکٹریوں کے باہر کہیں کہیں گھاس کے قطعے ہیں اور پودوں کی دو چار قطاریں نظر آتی ہیں، گویا کسی نے بادلِ ناخواستہ کونسل کی ہوا اس علاقے کو خوش نما بنانے کی اور پھر پھولوں کی کیاریوں کو تنہا چھوڑ گیا ہو۔

واقعی کورنگی اب ویران اور تنہا رہ گیا ہے۔

تنہا اور زخم خوردہ۔ خوف و دہشت اور نفرت وحشتوں کے جال میں الجھا ہوا۔

کراچی کے غیر متاثرہ علاقوں کے مکینوں کے لیے کورنگی، جو کبھی شہر کا ایک پھلتا پھولتا، پُرامن علاقہ تھا، آج اخبار کی صرف ایک کالمی روزانہ سرخی میں سمٹ کر ختم ہو گیا ہے گولیوں سے چھلنی ایک لاش کورنگی میں پائی گئی۔

ٹریفک کم ہے۔ دور دور تک کوئی پیدل چلتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ایک پیلی ٹیکسی سڑک کے کنارے رکتی ہے اور ایک مرد چشمہ لگائے پینٹ اور ٹائی میں ملبوس، بریف کیس ہاتھ میں لیے، ٹیکسی سے اترتا ہے اور تیز تیز قدموں سے چلتا فیکٹری کے گیٹ کے اندر غائب ہو جاتا ہے۔ میں گاڑی روکتی ہوں اور ٹیکسی ڈرائیور سے راستا پوچھتی ہوں۔ تیسرے چوراہے پر دائیں ہاتھ کو مڑیں۔ وہی ڈھائی نمبر کورنگی ہے۔ میں گاڑی اسٹارٹ کرتی ہوں۔

یہ کورنگی کا رہائشی علاقہ ہے۔ سڑک پر جابجا گڑھے ہیں۔ ٹوٹے پھوٹے فٹ پاتھ پر لوگ چل رہے ہیں۔ کہیں کہیں بس کے انتظار میں لوگ کھڑے ہیں۔ سڑک کے وسط میں سی سر پٹی کیپیٹل اور کوڑے کرکٹ سے اٹی ہوئی ہے۔ بچے کھیل رہے ہیں۔ میں گاڑی آہستہ کرتی ہوں اور لوگوں سے پتا پوچھتی ہوئی آگے بڑھتی ہوں۔ ایک مرد، ایک لڑکا اور دو برقع پوش عورتیں باری باری مجھے پتا سمجھاتی ہیں۔ میں اب بائیں ہاتھ کی سڑک پکڑتی ہوں۔ سڑک کے ایک طرف کیکر کی جھاڑیاں ہیں اور دوسری طرف ٹریفک ایک سائیکل، ایک گدھا گاڑی اور ایک ٹیکسی۔

کورنگی ٹاؤن شپ کی بنیاد یونانی مشیروں کے تیار کردہ گریٹر کراچی ریسیٹلمنٹ پلان کے تحت ۱۹۵۹ میں کیے گئے ایک سروے کے بعد ڈالی گئی تھی۔ اُس وقت کراچی میں ایک لاکھ اکیس ہزار بے گھر خاندان تھے جو شہر کے مرکز میں جھونپڑیوں اور کچے گھروں میں رہ رہے تھے۔ ۱۹۶۰ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وسطی شہر کو جھگیوں سے صاف کیا جائے اور ان خاندانوں کو شہر کے مرکز سے اٹھا کر پندرہ

میل پرے کورنگی اور نیو کراچی میں آباد کیا جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ حکومت ایک کمرے والے ۴۵ ہزار مکانات بنائے گی۔ لیکن ۱۹٦۴ تک صرف دس ہزار مکانات بنے تھے اور یہ منصوبہ ناکام قرار پا کر سرد خانے کی نذر ہو چکا تھا۔ کورنگی میں رہائشی کالونی کے ساتھ ساتھ انڈسٹریل ایریا کی بھی داغ بیل ڈالی گئی تھی تاکہ کورنگی کے مکینوں کو روزگار کے لیے شہر نہ آنا پڑے۔ لیکن انڈسٹریل ایریا میں کارخانے اتنی تیزی سے نہ لگ پائے۔

یہ بستی پینتیس سال پرانی ہے۔

میں شمشاد بھائی کا گھر تلاش کرتی ہوں۔ ان کا گھرانہ بیس سال سے کورنگی میں مقیم ہے۔ ان کی بیوی شکیلہ سے میں نے فون پر بات کی ہے اور انھوں نے مجھے کورنگی کے دو چار متاثرہ خاندانوں میں لے جانے کی حامی بھری ہے۔ یہ وہ خاندان ہیں جو کراچی کے حالیہ پُرتشدد واقعات سے براہِ راست متاثر ہوئے ہیں۔

شمشاد بھائی کراچی کے مختلف علاقوں کے مکانوں میں رنگائی کا کام کرتے ہیں اور عام طور پر گھر رات ہی کو پہنچ پاتے ہیں۔ ان کے نو بچے ہیں تین لڑکے اور چھ لڑکیاں۔ سب سے بڑا لڑکا ۲۳ سال کا ہے اور نیوی میں ملازمت کرتا ہے۔ اکیس سالہ علی گھر کے قریب کرائے پر لی ہوئی کریانے کی دکان پر بیٹھتا ہے۔ نویں جماعت کے بعد اس نے پڑھائی چھوڑ دی ہے۔

میں شکیلہ سے باتیں کرتی ہوں۔ ہم علی کے دوست نعمان کا انتظار کر رہے ہیں جو ہمیں ایک خاتون کے پاس لے جانے والا ہے جس کا اکیس سالہ بیٹا دہشت گردوں کے ہاتھوں بیس دن پہلے قتل ہوا ہے۔

شکیلہ کی بیٹی نے دالان کی ابھی ابھی دھلائی کی ہے۔ دوسری بیٹی کمروں کے فرش پر پوچھا لگا رہی ہے۔ یہ تین کمروں والا ۸۰ مربع گز پر بنا مکان ہے۔ گیٹ کے چھوٹے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا ہے۔

دوسرے علاقے کے لوگوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہم یہاں کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ مسلسل خوف، فکر و اندیشے اور ذہنی تناؤ نے ہماری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے، وہ کہہ رہی ہیں۔ اُن کی آٹھ سالہ بیٹی محاصرے کی رات کے بعد بخار میں ہفتوں پھنکتی رہی۔ پلنگ سے لگ گئی تھی۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو کانوں میں انگلیاں دیے رہنے لگی۔ ذرا سی آواز پر پلنگ کے نیچے چھپ جاتی، ہر وقت میرا دامن پکڑے رہتی۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئی تو اس نے کہا بچی کے دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے۔

میں بچی کو دیکھتی ہوں ــــ دبلی پتلی، آنکھوں کے گرد حلقے، اور ہلکی سی سُرخی۔ لگتا ہے بہت دنوں تک روتی رہی ہے۔

میرا بیٹا جو کریانے کی دکان پر بیٹھتا ہے، خاموش رہنے لگا ہے۔ بہت خوش مزاج بچہ تھا۔ ہمیشہ چہکتا رہتا تھا۔ اب تو چپ لگ گئی ہے۔ لیکن یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میری بڑی بہن کا گھرانہ بے حد پریشان

ہے۔ ان کا سب سے بڑا بیٹا اسپتال میں نفسیاتی ڈاکٹر کے زیر علاج ہے۔

شکیلہ کی رشتے سے پڑوس میں رہتی ہیں۔ ہم ان کے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے دالان کو ابھی پانی سے دھویا گیا ہے۔ غالباً کورنگی میں پانی کی قلت نہیں ہے، میں سوچتی ہوں اور خاتون خانہ سے ہاتھ ملاتی ہوں۔

ایک شام دیکھا ننگے پیر گھر چلا آرہا ہے۔ پیر مٹی میں اٹے ہوئے، خراشیں پڑی ہوئیں۔ پوچھا جوتے کہاں گئے۔ کہنے لگا، امی، فقیر کو دے دیے۔ دوسرے دن گھڑی اتار کر کسی کو دے آیا۔ اپنے کپڑے بانٹنے شروع کر دیے۔ کہتا تھا غریبوں کو دے رہا ہوں۔ سکون ملتا ہے مجھے۔ پھر گھر کی چیزیں اٹھا اٹھا کر دینے لگا۔ برتن بھانڈے، ٹیپ ریکارڈر، بہن بھائیوں کے کپڑے، جوتے سراج کی ماں مجھے دھیمے لہجے میں بتا رہی ہیں۔ سفید اور سرمئی بال ململ کے دوپٹے سے ڈھکے ہوئے، اندر کو دھنسی ہوئی بے رونق شربتی آنکھیں، جو گھیرے حلقوں کے باعث گول اور مزید نمایاں ہو گئی ہیں۔ رخسار کی ہڈیاں نکلی ہوئی، چہرے پر باریک باریک لکیروں کا جال بچھا ہوا ـــــ کرب اور دکھ اور گزرے ہوئے برسوں کا جال۔ ساٹھ برس کی ہوں گی لیکن ستر بہتر کی لگ رہی ہیں۔

پہلے تو میں سمجھا شاید نکمّا آ گیا ہے لڑکے میں۔ ابا پیدا ہو گئی ہے اس کے اندر۔ کیوں کہ میں کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا تو میری بات کاٹ دیتا۔ زور زور سے بولنے لگا تھا، سفید شلوار کرتے میں ملبوس، گھٹے ہوئے بالوں پر سفید ٹوپی اوڑھے ہوئے، خشخشی ڈاڑھی والے بزرگ، سراج کے والد، کہہ رہے ہیں۔

تو کیا گھر میں توڑ پھوڑ بھی میں نے پوچھنا چاہا۔

نہیں، ایسی بات نہیں تھی۔ توڑ پھوڑ نہیں کی کبھی اس نے، انھوں نے بتایا۔

آفس جانا تو چھوڑ دیا ہوگا، میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

آفس وہ برابر جاتا رہا۔ لیکن وہاں بھی یہی باتیں شروع کر دی تھیں امن چاہیے، سکون چاہیے۔ بس ایک ہی رٹ لگ گئی تھی۔ امن چاہیے، امن چاہیے، سراج کی اماں بتا رہی ہیں۔

دراصل لاشیں دیکھ دیکھ کر اسے کچھ ہو گیا تھا۔ ندی کے راستے اسکوٹر پر آفس آتا جاتا تھا۔ روز شام مجھے آکر بتاتا۔ امی، آج ایک لاش پڑی ہوئی تھی، گولیوں سے چھلنی، چہرہ اُڑا ہوا۔ کیسے تڑپ تڑپ کر جان دی ہو گی۔ اور پھر جب محاصرہ ہوا، علاقے کے تمام لڑکوں اور مردوں کو فوجی لے گئے۔ اُس کو بھی لے گئے۔ حالاں کہ اس نے اپنا پی اے ایف کا کارڈ دکھایا تھا۔ چھوڑ تو اُسی دن دیا، لیکن اس کے بعد سے ہی اس نے الٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دیں اور گھر کا سامان باہر لے جا کر بانٹنے لگا۔

دس بارہ ہزار کا سامان بانٹ دیا۔ چھوٹا سا گھر بار ہے ہمارا۔ یہاں ہر چیز ضرورت ہی کی خریدی جاتی ہے۔ بے ضرورت چیزیں تو ہیں نہیں کہ بانٹنا شروع کر دیں اور کوئی فرق نہ پڑے۔ دس بارہ ہزار کا سامان بانٹ ڈالا اس نے، بزرگ نے دہرایا۔ سراج کی اماں نے پہلو بدلا۔ شاید وہ سامان کی مالیت کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتیں۔

میں سوچتی ہوں اس چھوٹے سے گھر کے مکینوں پر اُن دنوں کیا بیتی ہوگی؟ گھر کے باہر قتل وغارت گری، دہشت گردی کی فضا، ایم کیو ایم الطاف گروپ، حقیقی، پولیس اور رینجرز کے درمیان گولیوں کی بوچھاڑیں، پولیس اور نامعلوم دہشت گردوں کے آپس میں مسلح مقابلے، گلیوں میں موت کے سائے۔ اور پھر محاصرے کی پیدا کردہ دہشت۔ گھروں کے اندر فوجیوں کا دندناتے ہوئے گھسنا، گھر کی چیزوں کو تہس نہس کرنا، الماریوں، صندوقوں کا سامان باہر پھینکنا ـــ ان ہتھیاروں کی تلاش میں جو وہاں نہیں ہیں، مکینوں کی فکر اور تشویش اگر بیٹے کو اٹھا کر لے گئے تو کیا ہوگا؟ کیا کریں گے؟ کس کے پاس فریاد لے کر جائیں گے؟ کیسے یقین دلائیں گے کہ اس کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں؟ کیسے اس کی بے گناہی ثابت کریں گے؟ نہ کسی صاحب اختیار کی سفارش ہے اور نہ جیب میں رقم۔ اگر لے گئے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ زندہ واپس آئے گا کہ نہیں؟ اور گھر میں سب سے بڑے کماؤ پوت کی بہکی بہکی باتیں، گھر کی اشیا کو عزیزوں میں تقسیم کرنا، باپ کی سرزنش، بیٹے کی اونچی ہوتی ہوئی آواز، چھوٹے بہن بھائیوں کا سہم کر دیکھنا اور ماں کی سرگوشیاں جانے دیں چھوڑیں بھی عزیزوں ہی کو تو دے رہا ہے، کوئی گناہ تو نہیں کر رہا

دس بارہ دن بعد مجھے احساس ہوا کہ اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اسپتال لے گیا اسے۔ ایرفورس کا اسپتال۔ ملیر میں ہے۔ ڈاکٹر نے پوچھا، کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا، میں امن چاہتا ہوں، صرف امن۔ ڈاکٹر نے سوال کیا، امن کیسے قائم کیا جائے؟ بندوق سے؟ کلاشنکوف سے؟ اس نے کہا، نہیں۔ صرف پیار محبت سے۔ ڈاکٹر نے کہا، اسے داخل کرنا پڑے گا۔

سراج کو اسپتال میں داخل ہوئے ڈھائی ماہ ہو چکے ہیں۔

سراج کی عمر ۲۵ سال ہے۔ گزشتہ سات سال سے پاکستان ایر فورس میں ملازمت کر رہا ہے۔ کاغذ پر اس کی نوکری اے سی مکینک کی لکھی ہے، والد نے میرے دریافت کرنے پر بتایا۔ لیکن وہ آفس میں کام کرتا ہے، انھوں نے آفس پر زور دے کر کہا۔

بی اے پارٹ ون کا امتحان پاس کر چکے ہیں۔ کمپیوٹر کورس بھی کیا ہوا ہے بھیا نے، چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے سولہ سالہ چھوٹی بہن بولی۔ چمکتی ہوئی شربتی آنکھیں، ناک میں لونگ، گالوں پر مہاسے، سر پر قرمزی چُنری۔ وہ ماں کے پہلو سے لگی چارپائی پر بیٹھی ہوئی ہے اور والد صوفے کے دوسرے کنارے پر۔ کمرے کی دیواریں ننگی ہیں۔ فرج کونے میں رکھا ہے، ٹی وی سامنے اور ٹیلی فون تپائی پر دھرا ہے۔

بی اے کا امتحان کیا ملازمت کے دوران دیا؟ ہاں، بڑا محنتی اور ذہین لڑکا ہے۔ ایرفورس کے کچھ تکنیکی کورس بھی کر چکا ہے۔' والد کے چہرے پر ٹھہراؤ کی کیفیت ہے۔ لکیروں کا جال ابھی اتنا گہرا نہیں ہوا ہے۔

سراج کے ماں باپ ۱۹۴۹ میں پاکستان آئے تھے۔ ابتدا میں کراچی ایرپورٹ کے قریب جھگیوں میں رہے، پھر ملیر اٹھ آئے۔ ۱۹۷۵ میں ہم نے ایک چھوٹا سا پلاٹ خریدا اور یہاں مکان

ہو آیا۔ اس زمانے میں کورنگی میں امن وامان تھا۔ ۱۹۸۵ کے بعد ایم کیو ایم یہاں بے حد مقبول ہو گئی۔ لیکن اُس وقت بھی سکون تھا۔ لڑائی جھگڑے والی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ یہ حال تو صرف ایم کیو ایم کے دو دھڑے بننے کے بعد ہوا، جب حقیقی بنی۔ ڈھائی تین سال پہلے کی بات ہے۔ عزیز آباد، نائن زیرو کے بعد ایم کیو ایم الطاف گروپ کا سب سے بڑا مرکز کورنگی ہے۔ ایم کیو ایم اور حقیقی دونوں کے لڑکے اتنے سمجھے ہوئے ہیں کہ وہ کارروائی کے بعد فوراً غائب ہو جاتے ہیں۔ بے گناہوں کی شامت آتی ہے، پولیس اور رینجرز والوں کے ہاتھوں، وہ کہہ رہے ہیں۔

جب فوجی ہمارے گھر کی تلاشی لینے آئے تو میں نے کہا، جو لینا ہو صندوق سے نکال لو۔ پھر میں نے پوچھا، کب سے ڈیوٹی پر ہو؟ تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ آرام کرو۔ چائے بنوا کے دی۔ ہمارے کچھ رشتہ دار پنڈی، ملتان اور لاہور میں شروع سے آباد ہیں۔ پنجاب آتا جاتا رہتا ہوں، اس لیے پنجابی آتی ہے۔ ایک فوجی نے پوچھا، چاچا، کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے کہا، لاہور کا رہنے والا ہوں۔ انھوں نے گھر کا کوئی سامان نہ چھوا اور خاموشی سے نکل گئے۔ سراج کے والد کی مسکراہٹ میں تلخی ہے۔

سراج کی طبیعت اب سنبھل چلی ہے۔ وہ کراچی کے حالات سے باخبر رہتا ہے۔ اسپتال میں باقاعدگی سے اخبار پڑھتا ہے، ٹی وی دیکھتا ہے۔ لیکن اب اس کی امی امی کی رٹ ختم ہو چلی ہے۔ اب وہ سیٹ ہو گیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں دوائیوں کا کورس پورا ہو جائے تب چھٹی ملے گی۔ عید پر آیا تھا پانچ دنوں کے لیے، والد بتا رہے ہیں۔

ہم شکیلہ کے گھر واپس آتے ہیں۔ لڑکے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ نعمان اپنے ساتھ انور کو لے کر آیا ہے۔ انور کی عمر چھبیس ستائیس سال ہے لیکن پینتیس کا نظر آتا ہے ___ سنولایا ہوا سنجیدہ چہرہ، سوچ میں ڈوبی آنکھیں۔ وہ خاموش ہے۔ انور ایم کیو ایم کا کارکن ہے۔

یہ اُس لڑکے کا ماموں ہے جس کا قتل ہوا تھا۔ قاتل اس کی تلاش میں آئے تھے۔ اس وقت یہ وہاں نہ تھا۔ انھوں نے بھانجے کو مار دیا، شکیلہ مجھے سرگوشی میں بتاتی ہیں۔ یہ اپنی بہن کے گھر سوئم کے بعد سے نہیں گیا ہے۔ کہتا ہے، آپا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ روتا ہے کہ میں اس دن وہاں کیوں نہ ہوا۔ موجود ہوتا تو مجھے قتل کرتے، بھانجا زندہ ہوتا۔

میں گاڑی کھڑی کرتی ہوں۔ گھر کے سامنے میدان ہے۔ غالباً یہ چوڑی، دورویہ سڑک کی جگہ ہے جو اب معلوم نہیں کتنے برس بعد بنے گی۔ فی الوقت کورنگی میں بلدیاتی اداروں کی جانب سے کوئی ترقیاتی کام ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ سڑک کے ایک کنارے کیکر کی گھنی جھاڑیاں ہیں اور دوسری جانب ساٹھ مربع گز پر بنے مکانات کی ایک یکساں قطار۔ گھروں کے دروازے بند ہیں۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیتا، گو کہ گیارہ بجے کے آس پاس کا وقت ہے۔ گھر کے تھوڑا آگے جھاڑیوں کو کاٹ کر میدان صاف کیا گیا ہے اور ایک باڑا نظر آ رہا ہے۔ بھینسیں جگالی کر رہی ہیں اور فضا میں گوبر، چارے اور دودھ کی ملی جلی مہک بسی ہوئی ہے۔

انور اسی سہن کے دروازے پر دستک دیتا ہے اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک بوڑھا آدمی دروازہ کھولتا ہے۔ میں اور شکیلہ اندر داخل ہوتے ہیں۔ لڑکے باہر ہی کھڑے ہیں۔

ہم صوفے پر بیٹھے ہیں۔ کمرہ چھوٹا ہے اور فرش پر دری بچھی ہوئی ہے۔ مقتول لڑکے کی ماں ایک بھاری بدن کی عورت ہیں، چالیس کے پیٹے میں۔ ان کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی ہیں۔ وہ کمرے کا سامنے والا دروازہ، جس پر ایک موٹا سیاہ تالا لٹکا ہوا ہے، کھولتی ہیں۔ کمرہ سورج کی تیز چبھتی ہوئی روشنی سے اچانک بھر جاتا ہے۔ وہ میرے برابر آ بیٹھتی ہیں۔ ایک وقت تھا ہم سب رات کو یہ دروازہ کھول کر اس کمرے میں سویا کرتے تھے۔ اتنا امس والا تھا کوری گلی میں۔ اب تو یہ موٹا تالا اندر سے دن رات لگائے رہتی ہوں۔ پھر وہ اس بھیانک صبح کا نقشہ کھینچتی ہیں جس کی یاد زندگی بھر ان کو کچوکے دیتی رہے گی۔

صبح کے سات بجے ہوں گے جب کسی نے دستک دی۔ میں پراٹھوں کے لیے آٹا گوندھنے کے بعد ہاتھ دھو رہی تھی۔ میں نے پوچھا، کون ہے؟ آواز آئی، انور ہے؟ میں سمجھی انور کا کوئی دوست ہوگا۔ کبھی میرا بھائی میرے گھر ہی رات رہ جاتا ہے۔ اماں قریب ہی رہتی ہیں۔ لیکن اُس صبح انور نہیں تھا۔ اچھا، ہمو کو بھیج دو۔ کیسٹ کا پوچھا ہے، آواز آئی۔ میرے بیٹے نے حال ہی میں وڈیو کیسٹ کی دکان سیٹ کی تھی۔

اس صبح ہمو کی آنکھ آواز سے فوراً کھل گئی۔ عام طور پر وہ دیر تک سوتا تھا اور اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ اتنی گہری نیند سوتی تھی اس کی۔ لیکن اس دن قضا ہو آئی تھی۔ آنکھیں ملتا اٹھ کھڑا ہوا۔ میاں پہنے ہوئے تھا، قمیص اٹھائی اور باہر نکل آیا۔ اماں ابھی آتا ہوں۔ اس آدمی نے غالباً اس سے کچھ کہا اور ہمو اس کے پیچھے چلا گیا۔ اور پھر مجھے گولیاں کی باڑھ کی دل دہلانے والی آواز آئی۔ میں سمجھی دوبارہ محاصرہ ہو گیا ہے۔ میں باہر بھاگی کہ ہمو سے کہوں فوراً اندر آ جائے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان گولیوں کا نشانہ میرا بیٹا ہی بنا ہے۔ جب میں نے دیکھا تو بچہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ گولیوں نے اس کے چہرے اور ٹانگوں کو چھلنی کر دیا تھا۔ آج تک محلے والوں نے میرے بالجن تک نہ دیکھے تھے لیکن اس وقت مجھے ایسا ہوش نہ تھا۔ بس اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور ختم۔

اتنا معصوم تھا میرا بچہ۔ ہر ایک سے محبت کرنے والا۔ محلے والوں کے کام کرتا۔ سب کا لاڈلا تھا۔ خدا معلوم اسے کیوں مار ڈالا۔ تین سال پہلے اس کے باپ کا انتقال ہوا تھا۔ بڑا عرصہ بیمار رہے۔ ہمو اس وقت نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ باپ کے مرنے پر ہمو ہی کہتا تھا، اماں تم فکر نہ کرو، بس اب میں گھر چلاؤں گا۔ پڑھائی چھوڑ دی اور ادھر اُدھر چھوٹا موٹا کام کیا۔ جب مستقل روزگار نہ لگا تو بولا اماں میرا حصہ دے دو۔ چند سالوں میں تمہیں یہ روپیہ واپس لوٹا دوں گا۔ ان کے پراویڈنٹ فنڈ کے تیس ہزار پڑے تھے میرے پاس۔ اس نے ایک وڈیو کیسٹ کی دکان لگائی تھی ایک ماہ پہلے۔

میں اٹھ کر ہمو کی سولہ سالہ بہن سے ملنے اندر جاتی ہوں۔ سر پر دوپٹہ، صدمات سے ماری، ساکت

پھرہ۔ اس کو سکتہ سو گیا تھا بھائی کی موت پر۔ نویں میں پڑھ رہی تھی۔ اسکول چھوڑ دیا ہے۔ میرا چھوٹا بیٹا ساتویں میں پڑھ رہا تھا، وہ بھی اسکول سے اٹھ گیا ہے۔ وڈیو کی دکاں میں بیٹھتا ہے۔ کہتا ہے آگے نہیں پڑھے گا۔ ۱۵۰۰ روپے پنشن کے ملتے ہیں۔ میں نے والد صاحب کو گھر بلالیا ہے تاکہ بچوں پر نظر رکھیں، گھر سے باہر نہ نکلنے دیں۔

کورنگی جیسے علاقوں میں اسکول بیچ میں چھوڑ دینے والے بچوں کی تعداد شہر کے دوسرے علاقوں کی نسبت ویسے ہی زیادہ ہے۔ آٹھویں کے بعد والدین عام طور پر لڑکیوں کو اٹھا لیتے ہیں کیوں کہ وہ تمام بچوں کے اسکول کے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بعض گھروں میں اس عمر میں لڑکوں کو روزگار پر بٹھانا لازمی ہو جاتا ہے یا پھر لڑکے پڑھائی میں عدم دلچسپی کی وجہ سے خود ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ کراچی کے بگڑتے ہوئے حالات کی وجہ سے اسکول چھوڑنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ ان علاقوں کے اسکول فائرنگ اور تشدد کے واقعات کی وجہ سے آئے دن بند رہتے ہیں۔

ہم گھر سے باہر آتے ہیں۔ لڑکے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔ انور ہمیں خدا حافظ کر کے چلا جاتا ہے۔ شکیلہ کا بیٹا اور اس کا دوست ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔ وہ لوگ سمجھ رہے تھے یہ جماعت اسلامی والوں کی گاڑی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جماعت اسلامی کا آدمی آیا تھا۔ فیچر لکھنے۔ لیکن جب اس کا مضمون آیا تو صرف جماعت کی تعریفوں سے بھرا ہوا تھا۔ جماعت نے کورنگی میں یہ کیا، جماعت نے وہ کیا وہ بڑبڑا رہا تھا۔ تو جماعت اسلامی بھی کورنگی میں موجود ہے؟ میرا خیال تھا یہ صرف اور صرف ایم کیو ایم کا علاقہ ہے۔

ہم شکیلہ کے گھر واپس لوٹتے ہیں۔ ہمیں پیغام ملا ہے کہ ہم آپ کو کسی اور گھر نہ لے جائیں۔ یہ پیغام کل رات سیکٹر آفس میں آگیا تھا لیکن مجھ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ وہ کہتے ہیں آپ کو مائں ریرو سے اجازت لینی ہو گی، نعمان کہہ رہا ہے۔

میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں میں نے آنے سے پہلے شکیلہ کو فون کیا تھا۔ شکیلہ نے اپنے بیٹے علی سے تذکرہ کیا ہو گا اور اس نے اپنے دوست نعمان کو بتایا ہو گا۔ نعمان ایم کیو ایم کا کارکن ہے۔ نعمان نے انور سے رابطہ کیا ہو گا جو ایم کیو ایم کا سرگرم کارکن ہے اور بتایا ہو گا کہ میں فیچر کے لیے آرہی ہوں، ان خاندانوں کے بارے میں جو دہشت گردی سے براہ راست متاثر ہوئے ہیں۔ انور نے یونٹ انچارج سے بات کی ہو گی جس نے سیکٹر انچارج سے رابطہ کیا ہو گا اور وہاں سے مائں ریرو فون کیا گیا ہو گا۔ اور مائں ریرو نے اجازت نہ دی ہو گی۔

لیکن یہ پیغام اُس وقت پہنچا جب میں سو کی اماں سے باتیں کر رہی تھی۔

میں کوئی سیاسی نوعیت کا مضمون نہیں لکھ رہی ہوں۔ میں صرف متاثرہ خاندانوں کی عورتوں سے باتیں کرنا چاہ رہی تھی۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کون کس پارٹی سے منسلک ہے،" میں اس لڑکے کو سمجھانے کی بے سود کوشش کرتی ہوں۔

تو کیا تم مجھے ان خاندانوں سے بھی ملنے دو گے جن کا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں؟ میں نے پوچھا۔

نہیں، میرا خیال ہے یہ مشکل ہوگا۔ وہ کچھ سوچتا ہے۔ اچھا، میں مقصود بھائی کو پیج (page) کرتا ہوں۔' میں دوسرے کمرے میں شکیلہ کی بیٹیوں سے باتوں میں مصروف ہو جاتی ہوں اور نعمان فون کے پاس بیٹھ کر بیپر کے پیغام کا انتظار کرتا ہے۔ دن چڑھتا جا رہا ہے، اور میری بے صبری بڑھ رہی ہے۔ آپ ٹھہریں، میں سینٹر والوں سے بات کرتا ہوں۔' وہ باہر جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد واپس آتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔ باہر ایک لڑکا کھڑا ہے۔ تیس کے لگ بھگ ہوگا۔ وہ میرا نام پوچھتا ہے۔ میں رسالے کا ایک شمارہ اسے دیتی ہوں۔ وہ رسالہ ہاتھ میں لیتا ہے، دو چار ورق الٹتا ہے اور مجھے واپس کر دیتا ہے۔ میرے ساتھ آئیے، وہ کہتا ہے۔ ہم تینوں چلتے ہیں۔ گلی کے اختتام پر ایک میدان ہے۔ میدان پار کرنے کے بعد ہم دائیں مڑتے ہیں اور پھر بائیں گلی کے کنارے پہنچتے ہیں۔ وہ آدمی کہتا ہے، آپ یہیں رہیں۔ آفس میں لوگ بیٹھے ہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ گلی سے نکل کر غائب ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک موٹا تازہ، چوڑا چکلا آدمی نمودار ہوتا ہے۔ یہ چالیس کے لگ بھگ ہوگا۔ میں اپنی کہانی دہراتی ہوں۔ میں عزیز آباد بھی جانا چاہتی ہوں، میں ٹکڑا لگاتی ہوں۔ آپ کو مرکز سے اجازت لینا ہوگی۔ پھر آپ کو ہر گھر میں لے جایا جا سکتا ہے۔ کورنگی ہو یا عزیز آباد۔ وہ رسالہ ہاتھ میں لیتا ہے اور ایک نظر ڈال کر واپس کر دیتا ہے۔ پھر دونوں آدمی گلی سے نکل کر غائب ہو جاتے ہیں اور میں نعمان کے ساتھ واپس چل پڑتی ہوں۔ جس گھر کی دیوار کے ساتھ ہم لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے اس کا دروازہ کھلتا ہے اور دو عورتیں سر نکال کر باہر جھانکتی ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر مسکراتی ہوں۔ جواب میں وہ بھی مسکراتی ہیں۔ شاید یہ دیوار سے لگی سب باتیں سن رہی تھیں، میں سوچتی ہوں۔

گلی میں چلتے ہوئے مجھے لگتا ہے گھروں کے مکینوں کی آنکھیں دروازوں کی جھریوں، کھڑکیوں کی اوٹ سے مجھ پر اور نعمان پر لگی ہوئی ہیں۔ کوئی دروازہ کھول رہا ہے، کوئی کھڑکی بند کر رہا ہے۔ ایک گھر کی چھت سے ایک بوڑھا آدمی ہم دونوں کو غور سے دیکھتا ہے۔ چلچلاتی دھوپ میں چھت پر ٹہلنا؟ شاید اس محلے کے لوگ عام حالات میں بھی ایک دوسرے پر نظر رکھنے کے عادی ہیں، اور آج کل تو کورنگی کے حالات بہت خراب ہیں۔ کوئی تعجب نہیں اگر وہ ہر ایک کو شبے کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے ہوں۔

میں شکیلہ کے گھر واپس آتی ہوں۔ نعمان اب تک ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی گہری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری ہے۔ خدا جانے اندر کتنے طوفان دفن ہیں، میں سوچتی ہوں۔ محاصرے کے دن نعمان کو رینجرز لے گئے تھے۔ اٹھارہ دن رکھا۔ اس نوجوان پر کیا گزری ہو گی؟

تم پڑھتے ہو؟ میں بات شروع کرتی ہوں۔

میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی، وہ کہتا ہے۔ تین سال تک میں صدر میں ایک شو، کی

دکاں پر کام کرتا رہا۔ پھر ابا کی درزی کی دکاں پر بیٹھنے لگا۔ لیکن ابا بیمار رہتے ہیں اور دکاں آئےدں بند ہوتی ہے۔ مجھ سے اب وہاں نہیں بیٹھا جاتا۔

تو آج کل کیا کر رہے ہو؟

سنار کی دکاں پر دوبارہ جانے لگا ہوں۔

آج نہیں گئے؟ وہ خاموش ہے۔

نعماں کے چار بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ دو بڑے بھائی شادی شدہ ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتے ہیں۔ ایک بھائی امریکا میں ہے اور ایک ایم کیو ایم میں۔ یہ بھائی ہمارے ساتھ نہیں رہتا۔

فوجیوں نے اس کے ساتھ کیا کیا اٹھارہ دں تک؟ انھوں نے ہماری آنکھوں پر اٹھارہ دں تک پٹی باندھے رکھی۔ جس کمرے میں مجھے رکھا گیا تھا وہاں ستیس لڑکے تھے۔ وہ ایک بے حد تنگ کمرہ تھا۔ میں تصور کرنے کی کوشش کرتی ہوں ــــ ایک چھوٹے سے کمرے میں ۳۲ لڑکے جں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ کیا وہ سب کے سب فرش پر بیٹھ سکتے تھے؟ یا کھڑے تھے؟ اور بنیادی ضروریات؟

دو دں میں انھوں نے انھوں نے ہمیں پاخانے تک آنا جانا سکھا دیا تھا۔ کھانے کو دیتے تھے۔ ہر تیسرے دں ہمیں بیاں دہرانا ہوتا تھا۔ اگر ایک لفظ کا فرق ہوجاتا تو مارا جاتا۔ اٹھارویں دں مجھے پولیس اسٹیشن لایا گیا اور وہاں سے رہا کیا گیا، نعماں نے مختصراً بتایا۔

تم ایم کیو ایم چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ میں پوچھتی ہوں۔

اب دلی لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ بچوں کی طرح مسکراتا ہے۔

چار سال پہلے نعماں کے بھائی نے امریکا کی ویزا لاٹری میں درخواست ڈالی تھی۔ اس کا نام نکل آیا۔ تب سے وہ وہیں ہے۔ تم امریکا جانے کی نہیں سوچتے؟ میں نے سوال کرتی ہوں۔

مستقبل کی سوچ ختم ہو گئی ہے۔ خدا جانے ایک گھنٹے بعد کیا ہو جائے۔ ایسے میں کل کا سوچنا ناممکن ہے۔ اب اس کی مسکراہٹ تھکی تھکی سی ہے۔

میں اس نوجواں لڑکے کی اندر کی دنیا کے بارے میں سوچتی ہوں۔ کیسی دنیا ہو گی یہ؟ جوانوں کی دمک، امید کی کرنوں اور جواں محبت کی آرزوؤں کے بغیر یہ دنیا کتنی تاریک ہو گی! فکر اور اندیشے، نفرت اور انتقام، گولیاں اور خوں، پولیس اور رینجرز۔ اور مائی ریرو۔ تنگ دائروں کے درمیاں گھومتی ہوئی دنیا۔ مجھے اپنے اندر ایک سنسناہٹ دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

نعماں اٹھارہ دں بعد گھر آیا تو شکیلہ اپنے بیٹے اور نعماں کو اس کے گھر والوں کی اجازت سے لاہور لے گئیں۔ میں لاہور رشتےداروں کے پاس رک گئی اور نعماں اور علی کو اسلام آباد اور مری بھیج دیا۔ نعماں کو تبدیلی کی شدید ضرورت تھی۔ اس کی اماں کا بھی خوف اور دکھ سے برا حال تھا کہ کہیں دوبارہ نہ اٹھا لے جائیں، وہ بتاتی ہیں۔

اں محلوں کے مکینوں کی زندگیاں آپس میں اس طرح گتھی ہوئی ہیں کہ ایک خارجی شخص کے لیے

اس کو سمجھنا مشکل ہے۔ کیا آپ کو کبھی یہ ڈر نہیں لگتا کہ کہیں آپ کے بیٹے بھی ان چکروں میں نہ آ جائیں؟ میں شکیلہ سے سوال کرتی ہوں۔ آخر وہ ایم کیو ایم کے لڑکوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔
ہماری زندگی جہنم بن کے رہ گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے میں خوف اور وسوسوں کی آگ میں جل کر خاکستر ہو جاؤں گی۔ ذہنی پریشانی اتنی شدید ہے کہ مجھے مستقل سر درد اور ہائی بلڈ پریشر رہنے لگا ہے۔ میں اور میرے شوہر اس کوشش میں ہلکان ہوئے جاتے ہیں کہ ہمارے لڑکے سیاست سے دور رہیں۔ یقین جانو جتنی دیر میرا بیٹا دکان پر بیٹھتا ہے میں دروازے کی جھری سے لگی گلی میں دیکھتی رہتی ہوں ـــــ دکان نظر آتی ہے یہاں سے ـــــ کہ کس سے بات کر رہا ہے، کون آیا ہے دکان پر۔ اب تو ایسے برے حالات میں کہ لڑکے خود بھی ایم کیو ایم سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے بچپن کے دوستوں سے قطع تعلق تو نہیں کر سکتے۔ انہیں گلیوں میں ساتھ ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ،، ایک ہی اسکول میں پڑھے ہیں۔ کتنے دن کتنی شامیں اکٹھے گزاری ہیں۔ ہم اپنے بچوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم ان سے نہ ملو۔ دوسری بات یہ کہ اگر ہم چاہیں بھی تو اب یہ تعلقات ختم نہیں کر سکتے۔ ہمیں سب کے ساتھ میل جول کر رہنا ہے۔ یہ ہمارے اپنے مفاد میں ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سلام دعا رکھنی پڑتی ہے۔ ہر طرف مخبر لگے ہوئے ہیں۔ سی آئی اے کے، ایف آئی ٹی کے، حقیقی کے، ایم کیو ایم کے۔

کیا میں تمہاری اماں سے مل سکتی ہوں؟ میں نعمان سے کہتی ہوں۔

کیوں نہیں۔ نعمان اٹھ پڑتا ہے۔ ہم دونوں اس کے گھر آتے ہیں۔ چھوٹا سا دو کمروں کا گھر ہے ـــــ ٹی وی، فرج، واشنگ مشین اور فون۔ اماں بوڑھی ہیں لیکن دبلی پتلی۔ جسم میں پارہ بھرا ہے، اور زبان زہر اگل رہی ہے۔

جب جی چاہتا ہے چھلانگ مار کر آ جاتے ہیں۔ کمرے کے دروازوں کو لات مار کر کھولتے ہیں۔ ایسے ٹرک بھر بھر کر آتے ہیں جیسے انڈیا فتح کرنے جا رہے ہوں۔ پورے گھر میں چھا جاتے ہیں۔ اندھیر اکر دیتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ۲۶ دفعہ چھاپا مار چکے ہیں۔ چھبیس دفعہ سب کچھ تہس نہس کر دیتے ہیں۔ ذلیل کرتے ہیں۔ حقارت آمیز لہجے میں چیختے چنگھاڑتے ہیں۔ اس میں میرا کیا قصور ہے اگر میرا بیٹا ایم کیو ایم میں ہے؟ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو؟

نعمان کا بڑا بھائی ۲۳ سالہ سلمان، ایم کیو ایم کا سرگرم کارکن ہے۔ وہ اس چھت تلے پچھلے ڈھائی سال سے نہیں سویا ہے۔ مجھے نہیں پتا میرا بیٹا کیا کھاتا ہے، کہاں سوتا ہے، کیسے جیتا ہے۔ مجھے اس کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ وہ سائے کی طرح آتا ہے ہمیں پوچھنے، اور دس پندرہ منٹ میں ہوا کے جھونکے کی طرح نکل جاتا ہے۔ میں چھاپوں کے خوف سے اور بیٹے کی ایک جھلک کی آس میں راتوں کو سو نہیں پاتی ہوں۔ میرے دونوں بڑے بیٹے میرے ساتھ ہی رہتے تھے لیکن آئے دن کے چھاپوں سے میرے پوتے پوتیاں بیمار رہنے لگے تھے۔ اسکول بھی آئے دن بند رہتے ہیں یہاں۔ مجبور ہو کر میرے دونوں بیٹے شہر میں کرائے کے مکانوں میں اٹھ گئے ہیں۔

آپ اپنے بیٹے سے نہیں کہتیں کہ ایم کیو ایم سے نکل جائے؟ میں سوال کرتی ہوں۔
وہ کہتا ہے میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ میرے لیے اِدھر بھی موت ہے اُدھر بھی موت ہے۔ پارٹی چھوڑ دے گا تو کیا بچ جائے گا؟
شروع میں آپ لوگوں نے منع کرنے کی کوشش کی تھی؟
وہ ۱۹۸۵ میں ایم کیو ایم میں شامل ہوا تھا۔ تب وہ تیرہ سال کا تھا اور آٹھویں میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے باپ دری کی دکان کرتے ہیں۔ رات کو دیر سے لوٹتے تھے۔ مجھے گھر بار سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ بس جب ہمیں پتا چلا اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ہماری سنتا ہی نہ تھا۔
نعماں کے والدین ۱۹۵۰ میں پاکستان آئے تھے۔ اُس وقت دو بیٹے تھے ان کے۔ چھ بچے کراچی میں پیدا ہوئے۔ کئی سال کینٹ اسٹیشن کے قریب جھگیوں میں رہے۔ پھر پیسہ پیسہ جوڑ کر کورنگی میں چھوٹی سی زمین خریدی۔ اٹھارہ سال سے کورنگی میں ہیں۔
میں باہر نکل آتی ہوں۔ ایک چھ سالہ بچی ننگے پاؤں، ملگجی فراک پہنے، خاک آلود گلی میں اپنے گھر کے باہر پودا لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ خوشنما سبز رنگ کا پودا۔ غالباً سوس کی شاخ ہے۔ بچی نے زمین میں گڑھا نہیں کھودا ہے۔ بلکہ شاخ کے نچلے سرے کو پتھریلی زمین پر رکھ کر مٹی سے ڈھانپ دیا ہے۔ وہ ننھے ننھے ہاتھوں سے مٹی کو جما رہی ہے اور پلاسٹک کے ایک پرانے مگ سے اس پر پانی انڈیلتی جا رہی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی صرف ایک چھوٹی سی بنیان پہنے، مٹی بھرے پاؤں لیے اس سارے عمل کو بغور دیکھ رہا ہے۔
دوپہر کی چبھنے والی دھوپ میں چمکیلی سبز شاخ، خاک آلود، بے رنگ گلی میں اتنی بے جوڑ لگ رہی ہے کہ تقریباً مضحکہ خیز نظر آ رہی ہے ــــ اتنا لاحاصل، اتنا بے مصرف کام۔
ماحول ایک اداس کرنے والی کیفیت سے بوجھل ہے۔ بنجر زمین، نہ آگہی، نہ وسائل۔ صرف ایک موہوم سی آرزو۔
میں آگے بڑھتی ہوں۔ گلی کے موڑ پر سوس کی ایک اور شاخ زمین پر پڑی ہے۔ خاک اور دھول سے اٹی سبز پتیاں تیز دھوپ میں مرجھا چکی ہیں۔

***

ڈسٹرکٹ سنٹرل

حسن اسکوائر سے لیاقت آباد کی طرف آتے ہوئے، غریب آباد سے گزر کر اگر آپ مین روڈ پر سیدھے چلتے ہوئے الکرم اسکوائر کی طرف آئیں تو آپ کو بائیں طرف فٹ پاتھ پر جا بجا سرخ جھنڈوں

والے اسٹال نظر آئیں گے۔ پہلی دفعہ ان پر میری نظر چند سال پہلے پڑی تھی۔ اُس رات مجھے یوں لگا تھا جیسے یہ اسٹال لیاقت آباد غریب آباد کے تشدد آمیز لاوے سے اچانک نکل کر وجود میں آ گئے ہوں۔ لکڑی کے چبوترا جس کے چار کونوں پر بانس نکلے ہوئے، ان پر خوشنما سرخ چادر تنی ہوئی، چبوترے پر دھرا ایک بڑا سا مٹکا جس کا منہ سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا، اور مٹکے کے پاس کرتے پاجامے میں ملبوس، سفید دو پلی ٹوپی سر پر اوڑھے، ڈاڑھی والا شخص بیٹھا ہوا۔ میں ستائشی نظروں سے ان قلفی والوں کی قطار کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ مجھے ان کی ہمت، ان کے استقلال اور ان کے طمطراق پر رشک آ رہا تھا۔ کراچی، ڈسٹرکٹ سنٹرل، میں اتنے تباہ کن، پُرتشدد حالات کے باوجود سلیقے سے روٹی کمانے کے فن پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ دو چار گاہک، جو غالباً قریبی گلیوں کے مکین ہوں گے، اسٹال کے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھے تھے، اور ایک دو گاڑیاں فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اور ان میں بیٹھے لوگ غریب آباد کی خاص دلبہار قلفی کے مزے لے رہے تھے۔ قلفی واقعی بے حد خوش ذائقہ تھی۔

ایک اور دفعہ ہم دی شاہ ساحل کو الکرم اسکوائر کے پیچھے ان کے گھر چھوڑنے کے لیے اس راستے سے گزرے تھے۔ اُس دن شہر کے حالات بے حد خراب تھے۔ ایم کیو ایم کا ایک سرگرم کارکن تحویل میں مارا گیا تھا اور افواہوں کا زور تھا۔ لیاقت آباد میں دو بسیں جلائی جا چکی تھیں اور دوسرے دن ہڑتال کی تصدیق ہو چکی تھی۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی، گلیوں اور فٹ پاتھوں پر کوئی چلتا پھرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور ایسے میں دلبہار قلفی والے اپنے اپنے چبوتروں پر خاموشی سے بیٹھے خالی سڑک کو تک رہے تھے۔ چبوتروں کے بانسوں سے بندھی ٹیوب لائٹوں کی نیلی دودھیا کرخت روشنی میں وہ پراسرار سے، کسی دوسرے سیارے کی مخلوق معلوم ہو رہے تھے۔

آج نومبر کی ستائیس تاریخ ہے، سن 1995، اور صبح کا وقت۔ میں اسی جگہ سے گاڑی چلاتی ہوئی گزر رہی ہوں۔ وہ تمام اسٹال اس وقت اُجڑے پڑے ہیں۔ بانسوں پر سے سرخ چادریں غائب ہیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ والی آٹو گیراج اور مکینک کی دکانیں ابھی بند ہیں۔ میں سوچتی ہوں، کیا آج کل بھی شام میں قلفی والے ایسے ٹھیے جما کر روزی کماتے ہیں؟ میں دس نمبر لیاقت آباد کے چوراہے سے بائیں طرف مڑتی ہوں۔ چوراہے پر رش ہے۔ منی بسیں، کوچ، سوزوکی پک اپ، گاڑیاں، گدھا گاڑیاں، موٹر سائیکلیں، پولیس موبائلیں، رینجرز کی کنستر بند گاڑیاں اور پیدل چلنے والوں کی ملی جلی بھیڑ۔ یہ لیاقت آباد ہے۔ داہنی طرف لیاقت آباد کی سپر مارکیٹ ہے جس میں چھوٹی بڑی دکانوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے اور جہاں ہر نوعیت کا سامان دستیاب ہے، جیسا کہ لیاقت آباد کے ایک مکین نے برمحل کہا، بیٹی کا پورا جہیز یہاں سے خریدا جا سکتا ہے ___ فرنیچر، ساری جوڑے، سوتی کپڑے، زیورات، برتن، الیکٹرانک کا سامان، گھریلو اشیاء، خشک میوہ، سوئی، دھاگے ___ لیاقت آباد سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

اور واقعی لیاقت آباد ___ جو آج تک لالوکھیت کے نام سے مشہور ہے ___ اور اس سے ملحق

علاقے، ناظم آباد، پاپوش نگر، گولی مار، غریب آباد شہر کے اندر ایک شہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پولیس کے چھاپوں، دہشت گردوں کی فائرنگ، رینجرز کے محاصروں، ڈاکوں، بھتوں، قانونی اہلکاروں کے ناجائز دباؤ اور رشوت خوری کے باوجود کاروباری سرگرمیوں سے بھرپور، خود پرور اور بظاہر حسبِ معمول۔ یہ ہے کراچی ڈسٹرکٹ سنٹرل۔

لیکن اس سطح کے نیچے، اگر آپ اس علاقے کے رہنے والوں سے بات کریں تو آپ کو احساس ہو گا کہ ایک نظام ہے جو آہستہ آہستہ ڈھے رہا ہے ___ معیشت میں جمود، بکھرتا ہوا سماجی ڈھانچا اور تنزل پذیر تعلیمی نظام۔

کاروبار تقریباً ٹھپ ہے۔ ہڑتال کے دن پوری مارکیٹ ہی بند ہوتی ہے۔ عام دنوں میں بھی اگر ذرا سی افواہ پھیل جائے کسی گڑبڑ کی تو کوئی مارکیٹ میں قدم ہی نہیں دھرتا۔ دکاندار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں، عبدالقدوس کہہ رہے ہیں۔ وہ پچپن ساٹھ برس کے ہوں گے، سرمئی اور سفید بال، موٹی شیشوں کی عینک چڑھائے، چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں ہیں۔ لیاقت آباد سپر مارکیٹ میں عبدالقدوس کی دکان ہے جس میں سلے سلائے، کام دار، ریشمی جوڑے بکتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹوں اور کاریگروں کے ساتھ مزدوری اور سلائی کا کام کرتے ہیں۔

پہلے تو دور دور سے لوگ لیاقت آباد خریداری کرنے آیا کرتے تھے۔ کہاں کہاں سے گاہک آتے تھے ہمارے پاس، نارتھ ناظم آباد، کورنگی، اورنگی، لانڈھی، لیاری، ملیر۔ لیکن اب تو قریبی علاقوں کے لوگ بھی آتے ہوئے گھبراتے ہیں کہ خدا جانے کس وقت کیا ہو جائے۔

قدوس لیاقت آباد میں اسی مربع گز کے مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے آٹھ لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں۔ دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ ہمارا علاقہ تو پھر بھی قدرے محفوظ ہے۔ وہ اس طرح کہ ہماری گلی اور آس پاس کی گلیوں کے لڑکے ان چکروں میں نہیں ہیں۔ لیکن غریب آباد سے پہلی کوٹھی تک کے علاقے میں حقیقی والوں کا زور ہے، قدوس کی بیوی بچوں کو ناشتہ دیتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔

یہاں آج کل قدرے محفوظ کا مطلب ہے کہ آپ کے گھر کے عین سامنے کوئی پولیس مقابلہ نہ ہوا ہو اور رینجرز نے آپ کی گلی کا محاصرہ نہ کیا ہو۔

'ورنہ گولیوں کی آوازیں تو معمول کی بات ہیں۔ اگر کہیں دور بھی فائرنگ ہو رہی ہو تو لگتا ہے سر پر ہو رہی ہے، ان کی ستائیس سالہ لڑکی صغرا اپنے دو سالہ بچے کو سہلاتے ہوئے ہنس کر بتا رہی ہے۔ صغرا کا شوہر مرچنٹ نیوی میں ملازم ہے اور عموماً جہاز پر ہوتا ہے۔ صغرا اپنے دو کمروں کے گھر میں تالا ڈال کر زیادہ تر میکے میں وقت گزارتی ہے۔ حالات اتنے خراب ہیں۔ اکیلے رہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ رات میں بھی ادھر ہی سوتی ہوں۔

فائرنگ کے بعد یہاں کا دوسرا معمول ڈاکے ہیں۔ یہی لڑکے ڈاکا ڈالتے ہیں۔ سُسرے سب بدمعاش ہیں۔ جس گھر میں گھس جائیں، سب کچھ لے جاتے ہیں، زندگی بھر کی جمع پونجی، قدوس

بڑبڑاتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے دروازہ بند رکھنا پڑتا ہے۔ ایک زمانہ تھا باہر سے کنڈی لگا کر میں پڑوس چلی جایا کرتی تھی'، ان کی بیوی پرانے وقتوں کو یاد کرتی ہیں۔ قدوس لالوکھیت میں چالیس سال سے رہائش پذیر ہیں۔ پاکستان آکر یہیں ڈیرا ڈالا تھا۔

یہاں کا تیسرا معمول ہے رینجرز اور پولیس کی کارروائیاں، وہ استہزائیہ انداز میں کہہ رہے ہیں۔ جس کو چاہیں پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ چھوٹتے ہی لاکھ دو لاکھ مانگتے ہیں اور دس پانچ ہزار لیے بغیر نہیں چھوڑتے۔

اور اگر لڑکے کچھ کہنے کی کوشش کریں تو کاٹ مار کر پھینک دیتے ہیں اور کہتے ہیں ایم کیو ایم نے مارا۔ ابھی پچھلے دنوں بند ھی ہوٹل کی طرف ایک بوری ملی تھی۔ لوگ کہنے لگے ہاتھ پاؤں مل رہے ہیں۔ رینجرز آئے۔ بوری اٹھا کر لے گئے۔ کیا کیا ہوگا اس کے ساتھ؟ کیا پتا۔ مار مور کر پھینک دیا ہوگا، ان کی بیوی بولے جارہی ہیں۔

اگر رینجرز سے آپ بچ نکلے تو علاقے کے لڑکے تو کہیں نہیں گئے۔ وہ تو بیٹھے ہیں آپ کے پیسے پر موبگ وَلنے کے لیے۔ پچھلے ہفتے میری دکان کے قریب ایک بڑی دکان ہے سوٹ کے کپڑوں کی، وہاں تین لڑکے مغرب کے وقت گاہک بن کر آگئے۔ مارکیٹ کی دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ ان لونڈوں نے کئی ہزار کے سوٹوں کے کپڑے خریدے۔ پیسے بھی نہیں دیے اور ساتھ میں دکان کی تجوری بھی لے گئے، ہتھیار لہراتے ہوئے۔ کون جیوں جیرا کر سکتا ہے ان حالات میں؟ چند دنوں پہلے تک یہ لڑکے تمام دکانداروں سے بھتا وصول کرتے تھے لیکن اب لوگ عاجز آگئے ہیں ان مشٹنڈوں سے۔ گزارے بھر کے لیے ہی آمدنی ہوجائے تو بڑی بات ہے۔ ایسے میں کون بھتا دے؟ اب دکاندار مزاحمت کرنے لگے ہیں۔ ایک ماہ پہلے حیدری کی دکانیں اسی وجہ سے چار دن تک بند رہیں۔ دکانداروں نے بھتا دینے سے انکار کیا اور دکانیں بند کر کے بیٹھ گئے کہ جاؤ، کاروبار ہی نہیں کریں گے تو بھتا کہاں سے لوگے۔ لیکن کتنے دن یہ معاملہ چل سکتا ہے؟ اور پھر لڑکے بھی کوئی کم نہیں ہیں۔ بھتا نہ دو تو دن دہاڑے لُوٹ کر لے جاتے ہیں۔

عبدالقدوس کے تین بڑے بیٹے مزدوری اور سلائی کا کام کرتے ہیں۔ دو بیٹے ایک چھوٹی سی اسٹیشنری کی دکان چلاتے ہیں۔ چھوٹے بیٹے نے انٹر سائنس کا امتحان پاس کیا ہے۔ اُسے ڈی ایس سی میں داخلہ نہیں مل سکا ہے۔

'کالجوں میں پڑھائی کہاں ہوتی ہے اب؟ قدوس کی بیوی بولیں، آئے دن تو ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ فائرنگ کے خوف سے والدین خود بھی زیادہ زور نہیں دیتے کہ کالج جاؤ۔ ا ، تو ٹیوشن سنٹروں کا راج ہے۔ یہ بھی جاتا ہے ٹیوشن سنٹر۔

سترہ سالہ عدنان اردو سائنس کالج کا طالب علم ہے۔ وہ کالج کی زندگی سے بیزار ہے۔ کالج میں گروپ بنے ہوئے ہیں۔ جمعیت، پنجابی پختون، ایم کیو ایم، حقیقی۔ آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جو

پڑھنے والے ہیں وہ گھبرا جاتے ہیں۔ کل میں کالج گیا تھا۔ فائرنگ ہو گئی۔ لڑکوں نے آپس میں کی۔ کیا کرتا؟ الٹے قدموں گھر کو لوٹ آیا۔ کالج میں داخل ہو تو مختلف پارٹیوں کے لڑکے کونے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں آؤ، ہمارے ساتھ بیٹھو۔ جو لڑکے ان چکروں میں نہیں ہیں اور پڑھائی کرنا چاہتے ہیں وہ کسی نہ کسی سورس سے حاضری پوری لگوا لیتے ہیں اور گھر یا ٹیوشن سنٹر میں کورس پورا کرتے ہیں۔

اگر لڑکے پڑھنے کے لیے کالج آ بھی جائیں تو ٹیچر اکثر غائب رہتے ہیں۔ یا پھر جلدی چلے جاتے ہیں۔ کلاس میں لڑکے کم تعداد میں ہوں تو ٹیچر پورا پیریڈ نہیں لیتے۔ بہرحال، بات صرف اتنی ہے کہ پڑھنا تو آپ کو خود ہی ہے۔ اگر آپ بغیر ٹیوشن کے پڑھ سکتے ہیں تو خود ہی سر کھپائیں ورنہ ماں باپ کے پیچھے پڑیں کہ ٹیوشن کے پیسے دو۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ اگر مجھے بی ایس سی میں داخلہ مل بھی جاتا تو کیا مجھے اس کے بعد نوکری مل جاتی؟ وہ پوچھتا ہے۔

عدنان پاکستان امریکن کلچرل سنٹر میں داخلہ لے رہا ہے۔ انگریزی بہتر کرنا چاہتا ہوں۔ آج کل کیا مشاغل ہیں؟ دوپہر میں اسٹیشنری کی دکان پر بیٹھتا ہوں۔ مال لینے بھی جاتا ہوں۔ گھر میں ہوتا ہوں تو رسالے وغیرہ پڑھتا ہوں اور میوزک سنتا ہوں۔ جمعے کو کرکٹ ہوتی ہے۔ محلے میں ٹیمیں بنی ہوئی ہیں۔ روز رات کو بیڈمنٹن کھیلی جاتی ہے۔ فلیش لائٹ محلہ کمیٹی نے حفاظتی اقدام کے طور پر لگائی ہے۔ آٹھ سے دس بجے تک کھیلتے ہیں۔

لیاقت آباد کے بچے اور نوجوان گھر میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ بچیوں کے تو باہر نکل کر گلی میں کھیلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ والدین کی کوشش ہوتی ہے کہ لڑکے بھی باہر گلیوں میں نہ جائیں۔ میرے کئی دوست لیاقت آباد کے مختلف علاقوں میں رہتے ہیں۔ کوئی دس نمبر میں ہے تو کوئی چار نمبر میں۔ لیکن میں ان سے ملنے ان کے گھر نہیں جا سکتا کیوں کہ اُن علاقوں میں زیادہ گڑبڑ رہتی ہے۔ خدا معلوم کسی وقت کوئی گولی کہاں سے آ جائے اور آپ اللہ کو پیارے ہو جائیں۔ گولی کے علاوہ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ کہیں رینجرز آپ کو اٹھا نہ لے جائیں۔

عدنان کا خیال ہے آج کل حالات قدرے بہتر ہیں کیوں کہ آس پاس کی گلیوں سے بوریوں میں بند لاشیں ملنا کم ہو گئی ہیں، اور ہم دس بجے رات تک گھر کے سامنے کھیل سکتے ہیں۔ لیاقت آباد میں ایسا وقت بھی آ چکا ہے کہ آٹھ بجے گلیوں میں ہُو کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

میں اب لیاقت آباد فرنیچر مارکیٹ سے گزرتی ہوئی، بڑا میدان اور ریلوے پھاٹک عبور کرتی ہوں۔ یہ پاپوش نگر کا آخری سرا ہے۔ بائیں جانب اورنگ آباد ہے۔ سڑک تنگ ہے اور دونوں طرف سے ٹریفک آ جا رہا ہے۔ سڑک کے اطراف چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں ــــ حجام، حلوائی، اسٹیٹ ایجنسیاں، بیکری، درزی، وڈیو، ویلڈر۔ ہر بلاک کے بعد تنگ متوازی گلیاں ہیں جو رہائشی علاقے میں کھلتی ہیں۔ اورنگ آباد کی گلیوں کے دونوں طرف ساٹھ مربع گز پر بنے ایک منزلہ، دومنزلہ مکانات ہیں۔ گلیاں پکی ہیں۔ عقبی تنگ گلیاں بھی صاف ستھری ہیں۔ گٹر کے ڈھکن بند ہیں اور کوڑا کرکٹ بھی نظر نہیں آتا۔

حالانکہ مختصر عرصے کے لیے ایم کیو ایم کی لوکل باڈیز میں حکومت رہی، یہاں کی حالت سدھری تھی۔ لوگ اب تک صفائی ستھرائی کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن ان چھوٹے چھوٹے گھروں کی پختہ دیواریں مکینوں کے ذہنی تناؤ اور خوف سے گونج رہی ہیں۔ اس علاقے میں کئی مرتبہ پولیس چھاپے مار چکی ہے۔ رینجرز محاصرہ بھی کر چکے ہیں۔

چھوٹے قد اور گھٹنے ہوئے جسم والی نسیمہ پچاس کے پیٹے میں ہیں۔ ان کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے ہیں، جو بتدریج سیاہ ہو چکے ہیں۔ وہ کبھی سرگوشیوں میں اور کبھی اچانک تیز ہوتی ہوئی آواز میں مجھے اپنی روداد سناتی ہیں۔ رات کے گیارہ بجے آئے تھے۔ ذرا سوچو، یہ چھوٹا سا گھر، اور دس موٹے تازے سپاہی تلاشی لے رہے ہیں! چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ الماریاں، درازیں، صندوق، سب کچھ کھلوا لیا۔ پھر ایک نے چلا کر پوچھا، لڑکے کدھر ہیں تمہارے؟ میں نے کہا صاحب، رات کی ڈیوٹی پر گئے ہوئے ہیں بچے۔ سلیمان کہاں ہے؟ دوسرے نے غرا کر پوچھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ انہیں سلیمان کا نام کیسے معلوم ہوا؟ نسیمہ کا بیٹا سلیمان گزشتہ پانچ سال سے سعودی عرب میں محنت مزدوری کر رہا ہے۔ وہ ارسلان کو اٹھا کر لے گئے۔ تئیس سالہ ارسلان ایک فیکٹری میں ملازمت کرتا ہے۔ نسیمہ کے شوہر تین سال سے بے روزگار ہیں اور بیمار رہتے ہیں۔ نسیمہ نے بڑے بیٹے کو اطلاع دی جو بیوی بچوں کے ساتھ قریب ہی گلی میں رہتا ہے۔

رات گزر گئی تھی اور ہم کچھ نہ کر سکتے تھے۔ میں نے اپنے حواس یکجا رکھے اور سلیمان کے کاغذات کی فائل بناتا رہا۔ اس کے بھیجے ہوئے ڈرافٹ کی نقلیں، سعودی عرب سے ساتھ لائے ہوئے کیسٹ ریکارڈر اور دوسری چھوٹی موٹی چیزوں کی رسیدیں، اس کے خطوط اور لفافے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اکٹھا کیے۔ اماں پوری رات بیٹھی روتی رہیں، سبحان مجھے بتاتا ہے۔

صبح سویرے سبحان اماں کو موٹرسائیکل پر بٹھا کر ارسلان کی تلاش میں نکلا۔ لے جاتے وقت بتاتے تھوڑا ہی ہیں کہ کہاں لے جا رہے ہیں۔ ہم کراچی کے سولہ تھانوں میں گئے۔ زیادہ تر تھانوں کی پولیس بری طرح پیش آئی۔ کوئی ہماری کہانی سننے کو تیار ہی نہ تھا کہ سلیمان، جس کو رینجرز نے پوچھا تھا، پانچ سال سے ملک سے باہر ہے اور ارسلان جس کو لے گئے، اس کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں۔

چند ایک تھانوں میں پولیس نے ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور بتایا کہ فلاں تھانے میں جاؤ۔ آخرکار ایک تھانے کے انچارج نے تفصیل سے ہماری کہانی سنی۔ اس نے سلیمان کے تمام کاغذات غور دیکھے اور ہمیں یقین دلایا کہ اگر تمہارے بھائی کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں ہے تو تمہیں تمہارا بھائی واپس مل جائے گا۔ سات بجے شام کو آنا۔

شام کو جب نسیمہ اور سبحان پولیس اسٹیشن پہنچے تو ارسلان کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ انہوں نے ہم سے کچھ نہیں مانگا، گو کہ ہمیں بتایا کہ یہ کیس اتنا پیچیدہ تھا کہ انچارج کو سی آئی اے کے افسران کو کیس سمجھانے میں پورا ایک گھنٹہ لگا۔ اور یہ کہ اس کیس کے ہم سے دو لاکھ روپے طلب کیے جا سکتے

تھے۔

فرشتہ تھا، فرشتہ، خدا اس کو زندگی دے۔ اس کو ایسی اماں میں رکھے! کچھ تعجب نہیں کہ نسیمہ ہاتھ اٹھا کر اس کو دعائیں دیتی ہیں۔ اب یہاں وہ شخص جو ایسی ڈیوٹی سیدھے سادے طریقے سے، قانونی ضوابط کے تحت انجام دیتا ہے، انسان نہیں فرشتہ ہے۔ تھانے کے انچارج نے بتایا کہ سلیمان کا نام اور ٹیلی فون نمبر ایک لڑکے کی جیب سے نکلا تھا جو پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ لہذا اب سلیمان کے نام کی فائل کھل گئی ہے اور یہ سرکار اس کو لینے آئے تھے۔

وہ لڑکا جس کی جیب سے سلیمان کا نام اور ٹیلی فون نمبر نکلا، اس کی فیملی دس سال پہلے اورنگ آباد میں رہتی تھی۔ سلیمان کی بچپن میں اس سے جان پہچان تھی۔ پھر وہ لوگ لیاقت آباد منتقل ہو گئے۔ اور پھر سلیمان پانچ سال سے سعودی عرب میں ہے لہذا کوئی رابطہ بھی نہ رہا تھا۔

ارسلان کی آنکھوں میں پٹی باندھے رکھی اور اسے بہت مارا۔ چوبیس گھنٹے اسے پانی پینے کو نہ دیا۔

کس سے مارا تھا؟

ہاتھوں سے کب مارتے ہیں؟ نسیمہ میرے احمقانہ سوال پر مسکراتی ہیں۔ لاتوں سے مارتے ہیں وہ۔ جب ارسلان گھر آیا تو اس کی حالت غیر تھی۔ بولا نہیں جا رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے، کپڑے میلے۔ پورے جسم میں درد اور نیل۔ ایک ہفتہ بخار میں پڑا رہا۔ چارپائی سے اٹھنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ میں نے آج زبردستی اٹھا کر ڈیوٹی پر بھیجا ہے۔ جتنے دن نہیں جائے گا، پیسے کٹیں گے۔

ارسلان کو پچیس سو ماہانہ تنخواہ ملتی ہے، غیر حاضری پر تنخواہ کٹتی ہے اور، جیسا کہ چھوٹے کارخانوں میں رواج ہے، کسی قسم کی کوئی سہولت نہیں دی جاتی۔

نسیمہ کے دو لڑکے شادی شدہ ہیں لیکن وہ چھوٹے تین لڑکوں کی طرف سے بے حد پریشان رہتی ہیں اور ان کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ اکیس سالہ فرقان نے ساتویں کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ پانچ سال طارق روڈ کے ایک گیراج میں میں نے مکینک کا کام کیا۔ لیکن وہ مجھے صرف گیارہ سو دیتے تھے اور نو بجے صبح سے نو بجے رات تک کام لیتے تھے۔ تنگ آ گیا تھا اس لیے کام چھوڑ دیا۔ کئی گیراجوں کے چکر لگا چکا ہوں لیکن اب کام نہیں ملتا۔ آج کل سائٹ ایریا کی ایک مل میں پارٹ ٹائم نوکری کر رہا ہوں، دبلا پتلا، شرمیلا فرقان مجھے رک رک کر بتا رہا ہے۔

میں زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔ اماں نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ ہر وقت باہر نہ نکلو گھر میں بیٹھو، کی رٹ لگائے رکھتی ہیں۔ جب سے بھیا کو یہ سرکار لے گئے میری اور بھی شامت آ گئی ہے۔ کیا کروں؟ اس کسوتر خانے میں چوبیس گھنٹے بند ہو کر گزاروں؟ میرا دم گھٹتا ہے۔ اور پھر میں جاتا ہی کہاں ہوں بھلا؟ تازہ ہوا کے لیے گلی ہی میں تو کھڑا ہوتا ہوں۔ اگر گھر میں رہ کر وی سی آر دیکھوں تو اس پر بھی اماں چیختی ہیں کہ فلمیں مت دیکھو۔

ہاں میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے تمام وقت انڈین فلمیں دیکھتے رہیں۔ کبھی کبھار دیکھ لیں تو کوئی بات نہیں۔

نسیمہ کا چھوٹا بیٹا تیرہ سال کا ہے اور اس نے بھی پڑھائی چھوڑ دی ہے۔ تمام وقت گلیوں میں آوارہ گردی کرتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اس کی وجہ سے مجھے بلڈ پریشر رہنے لگا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں ارسلان کی جلد از جلد شادی کر دوں اگر پکی نوکری لگ جائے اس کی۔ شادی کے بعد گھر تو بیٹھے گا بال بچوں کے ساتھ، نسیمہ کا خیال ہے۔ لڑکیاں مسئلہ نہیں ہیں۔ بڑی کی شادی ہو چکی ہے۔ ایک نویں میں پڑھ رہی ہے اور سب سے چھوٹی چھٹی جماعت میں۔ اسکول کے علاوہ وہ تمام دن گھر میں بند رہتی ہیں اور گھر کے کام کاج میں اماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔

میں تو اس کا آج اسکول چھڑا دوں۔ مگر آج کل معلوم نہیں کیا ہو گیا کہ جو بھی رشتہ آتا ہے پڑھی لکھی لڑکی مانگتا ہے۔ اس کی منگنی کر دی ہے میں نے، لیکن لڑکا کہتا ہے جب بی اے کر لے گی تب شادی کروں گا، نسیمہ کہہ رہی ہیں۔ دس سال پہلے کالج یونیورسٹی کی پڑھی لڑکی سے کوئی شادی کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔

پاپوش نگر میں بھی ڈاکازنی عام بات ہے۔ لڑکے چاہتے ہیں سب کچھ چھین کر لے جائیں۔ لوگ ڈرتے بھی ہیں ان سے۔ کیوں نہ ڈریں؟ بندوقیں جو ہوتی ہیں ان کے پاس۔ لیکن اب تو ان کی دیدہ دلیری کا یہ عالم ہے کہ ڈنڈے اور پتھر ہی سے کام چلا لیتے ہیں۔ پچھلے ہفتے ہماری گلی میں ڈھائی بجے رات ایک گھر میں لڑکا گھس آیا۔ وہ تو خیر ہوئی، خاتون خانہ کتھا پکا رہی تھیں۔ انھوں نے جو شور مچایا تو پتھر پھینک کر واپس چلا گیا۔ خیریت ہوئی کہ ان کے لگا نہیں۔

نسیمہ کے پاس ایسی لاتعداد کہانیاں ہیں۔

ساجدہ بیوہ ہیں اور اپنے دو غیر شادی شدہ بیٹیوں اور دو بیٹوں کے ساتھ پاپوش نگر میں گزشتہ پچیس سال سے رہ رہی ہیں۔ یہ مکانات اسی مربع گز پر بنے ہوئے ہیں اور گلیاں نسبتاً چوڑی ہیں۔

دو سال پہلے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ایم کیو ایم اور حقیقی والے آپس میں لڑ رہے تھے اور بیچ میں ہم لوگ تباہ ہو رہے تھے۔ کاؤنسلر کے آفس پر قبضے کی جنگ جاری تھی۔ یہ ایک دن زبردستی آئے۔ آفس خالی کروایا۔ تالا ڈالا، لڑکوں کو اٹھایا اور چلے گئے۔ تب سے نسبتاً سکون ہے۔

ساجدہ پچاس کے قریب ہوں گی۔ بال ان کے سارے سفید ہیں۔ وہ ایک نرم گو خاتون ہیں، ٹھنڈے مزاج کی۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں نے ان کو مضبوط بنا دیا ہے۔

ہم یہاں پچیس سال سے ہیں۔ دو سال کے اندر اندر کئی پرانے مکین گھروں کو بیچ کر چلے گئے۔ جن علاقوں میں زیادہ گڑبڑ ہے وہاں سے لوگ ادھر منتقل ہو گئے ہیں۔ اب اس محلے میں کسی کو کسی کا پتا نہیں رہا، وہ کہہ رہی ہیں۔

پاپوش نگر کے وہ مکین جو ایسا برسوں پرانا گھر اونے پونے بیچ کر کہیں اور مکان خریدنے کی استعداد

رکھے ہیں، یہاں سے جا چکے ہیں۔ ان گھروں میں وہ لوگ منتقل ہو رہے ہیں جو گنجان ترین علاقوں میں ساٹھ مربع گز کے مکانوں میں رہ رہے تھے۔ اسی مربع گز کے رقبے والے ایک سو بیس مربع گز کے مکانوں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اس غیر معمولی اور جبری منتقلی سے محلوں کے سماجی ڈھانچے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ یگانگت، اپنائیت، پڑوسیوں کا وقت پڑنے پر ایک دوسرے کے کام آنا، مل جل کر محلے کے مسائل کو حل کرنا، یہ ساری قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور ان کی جگہ بے حسی، لاتعلقی، خوف، اندیشوں اور بے اعتمادی نے لے لی ہے۔

چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ میں گھر میں بچیوں کے ساتھ اکیلی تھی۔ بڑا بیٹا کام پر گیا ہوا تھا اور چھوٹا نوکری کی تلاش میں نکلا تھا۔ گلی میں شور ہونے لگا۔ ہمارے گھر کے باہر کچھ لڑکے کھڑے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ اس گھر کو آگ لگا دو! میں نے کھڑکی سے جھانک کر پوچھا کیا بات ہے، تو بولے آپ کے گھر کی چھت سے کسی نے ہم پر پتھر پھینکا ہے۔ ساجدہ نے حواس جمع رکھتے ہوئے، ضبط و تحمل کے ساتھ لڑکوں کو بتایا کہ چھت پر کوئی نہیں ہے سوائے ان کے بوڑھے سسر کے جو عرصے سے بیمار ہیں اور چارپائی سے لگے ہوئے ہیں۔ وہ چھت پر بنے ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ وہ اٹھ بھی نہیں پاتے تو پتھر کیا پھینکیں گے۔ لڑکوں نے کہا وہ خود آ کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے لڑکوں سے کہا انہیں ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دوں گی۔ جب میرا بیٹا کام سے آ جائے تو گھر آ کر تلاشی لے لینا۔ ابھی جاؤ یہاں سے۔ غالباً اس کی آواز کے تحکم اور رعب سے لڑکے ڈھیلے پڑ گئے اور یوں معاملہ رفع دفع ہوا۔

اگر پرانے محلے والے ہوتے تو یہ واقعہ میرے ساتھ ہرگز نہ پیش آتا۔ لیکن اب سب نئے لوگ ہیں۔ سوائے دو چار خاندانوں کے اور کوئی ایک دوسرے کو نہیں جانتا، انہوں نے بتایا۔

عبدالسلام کا گھرانہ خوش قسمت ہے۔ وہ اس طرح کہ دو سال پہلے وہ اپنا تیس سال پرانا، مین روڈ پر واقع، چھوٹا سا مکان بیچ کر سڑک کے اس پار ایک سو بیس گز کے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ پرانے گھر میں زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ آئے دن فائرنگ ہوتی۔ ہڑتال کے دن گھر سے ایک قدم باہر نہ نکال سکتے۔ ہم اسکرین پرنٹنگ کا کام بھی گھر پر ہی کرتے تھے اور خریداروں نے مال لینے کے لیے آنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک چھوٹی خاندان اپنا مکان بیچنے کے لیے پریشان تھا۔ بے حد مناسب قیمت میں مل گیا ہمیں، عبدالسلام کے موجودہ دو منزلہ گھر میں کافی گنجائش ہے۔ تیسری منزل پر ٹین کی چھت ڈال کر ہال میں اسکرین پرنٹنگ کے لیے میزیں قطار سے لگی ہیں۔ کیمرا نچلی منزل کے کمرے میں سیٹ کیا ہے اور رنگ ساری علیحدہ حصے میں ہوتی ہے۔ اس علاقے میں گھر کے باہر آہنی گیٹ لگے ہوئے ہیں اور گلی کافی چوڑی ہے۔ یہ بہتر علاقہ ہے۔ محفوظ بھی ہے، گو کہ ہیں تو اب بھی پاپوش نگر میں۔ لہذا جب ہڑتال ہوتی ہے تو ان کا لڑکا جو کلفٹن میں واقع ایک غیر ملکی کمپنی میں کام کرتا ہے، دو تین دن کے لیے گھر نہیں آتا۔ کمپنی کی طرف شہر کے ہوٹل میں کمرہ بک کرا دیا جاتا ہے۔ فون پر رابطہ رہتا ہے۔ پچھلے دنوں ان کے علاقے کی تمام ٹیلی لائنیں ہفتوں خراب رہیں۔ لڑکوں نے ٹیلی فون کی تاریں کاٹ ڈالی

تھیں۔ اب ٹیلی فون والوں نے زیر زمین تاریں بچھائی ہیں۔

ٹیلی فون کے کٹے ہوئے تاروں کی واردات کراچی میں معمول بن گئی ہے۔ لیاقت آباد کے کئی علاقے، پی آئی بی کالونی، ایف سی ایریا، شاہ فیصل کالونی اور نارتھ ناظم آباد میں ہفتوں اور مہینوں ٹیلیفون کو، لڑکوں، دہشت گردوں، خدا جانے کون، کی کارستانی کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے۔

ڈسٹرکٹ سنٹرل کے باسیوں کے لیے زندگی دشوار تر ہوتی جا رہی ہے۔ کراچی کے حالات کی وجہ سے ان کو متفرق مسائل کا سامنا ہے۔

جب آپ کو ملازمت کے واسطے انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے تو سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے آپ کہاں رہتے ہیں؟ جیسے ہی آپ کے منہ سے لیاقت آباد، ناظم آباد، پاپوش نگر کا نام نکلتا ہے تو آپ کو دروازہ دکھایا جاتا ہے، معاف کیجیے کا ڈسٹرکٹ سنٹرل کے رہنے والوں کے لیے یہاں جگہ نہیں، ستائیس سالہ شمشاد تلخ لہجے میں بتا رہا ہے۔ جب نوکری کی تلاش میں چار پانچ جگہ اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تو آخر مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔ میں نے کہا میں سوسائٹی میں رہتا ہوں۔ سوسائٹی میں شمشاد کے رشتے دار رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں جب تین دن کی ہڑتال ہوئی تھی، الطاف حسین کے بھائی کے قتل کے ردعمل میں، تو شمشاد بڑی مشکلوں سے دفتر پہنچ سکا تھا۔ اب شمشاد کی زندگی میں یہ مشکل بھی شامل ہو گئی ہے۔ شمشاد اپنی بیوہ ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ ناظم آباد کے ایک کمرے کے مکان میں رہتا ہے۔

بہت سے خاندان، جن کے لڑکے سیاست سے کسی طور وابستہ نہیں ہیں، اپنے لڑکوں کی طرف سے فکرمند رہتے ہیں۔ اگر اتفاق سے آپ کا لڑکا ایم کیو ایم میں کسی کو جانتا ہے، خواہ یہ واقفیت سرسری اور عارضی نوعیت کی ہی کیوں نہ ہو، آپ کسی بھی مشکل سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کب گلی میں چھاپا پڑ جائے، محاصرہ ہو جائے، فاطمہ کہتی ہیں۔ فاطمہ بیوہ ہیں اور ان کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ ان کے ساتھ دوسری نوعیت کا واقعہ پیش آیا۔ ایک دن محلے کے لڑکے ان کے گھر آ گئے۔ کہنے لگے، آپ کے دو بیٹے ہیں، ایک بیٹا الطاف بھائی کو دے دیجیے۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ پریشانی سے برا حال کہ کیا کروں۔ بدقت تمام فاطمہ نے بیٹے کے لیے ریل کے ٹکٹ کا بندوبست کیا اور اسے پنڈی کسی دور کے رشتے دار کے پاس بھیج دیا۔

سیکنڈ ایئر کا طالب علم راشد چار ماہ کرب اور اندیشوں میں گزار کر واپس چلا آیا۔ مجھ سے وہاں نہیں رہا جاتا۔ اور پھر کب تک چھپوں؟ رہنا تو ماں کے ساتھ ہی ہے، راشد پریشان ہے کہ پڑھائی کا جو حرج ہوا ہے اس سے کس طرح نمٹے۔

سو زندگی جاری ہے۔ ڈسٹرکٹ سنٹرل میں۔

**

عیسیٰ نگری کی زمانی تاریخ

کراچی تضادات کا منظر نامہ ہے۔ اس میں دو شہر بیک وقت موجود ہیں۔ ایک طرف دولت اور تمول کا شہر ہے برقی روشنیوں میں نہایا ہوا، کئی منزلہ رہائشی منصوبوں اور تجارتی مراکز کا شہر، وڈیو کلچر کا نمائندہ۔ اس کے برعکس دوسرا کراچی ہے جسے بعض لوگ دیکھ نہیں پاتے اور بعض لوگ دیکھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، جس کے مناظر یکسر مختلف ہیں ننگے اور پھٹے کپڑوں میں بچے کوڑے کے ڈھیر پر کھیلتے ہوئے، کچی گلیاں، اُبلتے گٹر اور نالیاں، کچے پکے مکانوں میں گنجائش سے زیادہ افراد ٹھنسے ہوئے، مناظر، بُو اور آوازوں کی مسلسل یلغار۔ یہ کچی آبادیوں کا کراچی ہے۔ شہر میں جابجا نمایاں دولت کی علامات سے قطع نظر، شہر میں بنیادی سہولتوں سے محروم افراد کی تعداد اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اسے بحرانی صورت حال کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ سماجی تجزیے کے ماہرین کے الفاظ میں، کراچی اُس ترقی کی کلاسیکی مثال ہے جو عدم ترقی میں اضافہ کرتی ہے۔

کراچی میں شرحِ پیدائش تقریباً ۳۵ فی ہزار افراد اور شرحِ اموات تقریباً ۱۰ فی ہزار افراد ہے، چناں چہ شہر کی آبادی صرف قدرتی اضافے کے سبب ہر سال ۲.۵ فیصد کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ ملک کے دوسرے مقامات سے نقل مکانی اس کے علاوہ ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ شہر میں ہر سال تقریباً دو لاکھ بچے پیدا ہوتے ہیں اور تقریباً ڈھائی لاکھ افراد نقلِ مکانی کر کے کراچی میں داخل ہوتے ہیں۔ اس بے تحاشا اضافے سے نمٹنے کے معاملے میں شہری انتظامیہ بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔ نقل مکانی کر کے آنے والے افراد کی تقریباً دو تہائی تعداد کا مقدر وہ کچی آبادیاں ہیں جو پورے شہر میں جابجا خودرو پودوں کی طرح اُگ آئی ہیں۔ کراچی میں چار جانب کچی آبادیوں کی افراط ایک مانوس منظر ہے۔ دیہی علاقوں سے آنے والے وہ افراد جو کسی خصوصی مہارت کے حامل نہیں ہوتے اور چھوٹی موٹی محنت مزدوری کر کے اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے خواہاں ہوتے ہیں، سر چھپانے کی تھوڑی سی جگہ حاصل کرنے کی غرض سے غیر معیاری اور کام چلاؤ قسم کے انتظامات بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ دلی میں ایسی بستیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے جگ موہن نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ کراچی پر بھی صادق آتے ہیں غربت کے مارے ہوئے دیہی علاقوں سے آنے والے افراد ہر ممکنہ خالی جگہ کو گھیر لیتے ہیں اور اس پر لکڑی، ٹین یا دفتی کی تعمیر راتوں رات کر ڈالتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی بھی جگہ کیچڑ بھری، گندی یا خطرناک نہیں ہے۔ ابتدائی برسوں میں کچی آبادیاں ریل کی پٹریوں کے ساتھ، گندے نالوں کے کنارے، کوڑے کے ڈھیر کے برابر، شہر کے مضافات میں اور اُس ترقی کے لیے مخصوص کیے گئے خالی پلاٹوں پر بھی بن جاتی ہیں جو کبھی عملی صورت اختیار کرنے کا نام نہیں لیتی۔ ان میں سے بیش تر آبادیاں وقتی اور عارضی تھیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بنیادیں مضبوط ہوتی گئیں اور ان میں سے بعض پکی بستیاں بن چکی ہیں۔

اپنی ابتدائی صورت میں کچی آبادیاں کراچی کے لیے وہی حیثیت رکھتی تھیں جو دہلی کے لیے جھگی جھونپڑی، بمبئی کے لیے جھونپڑ پٹی، مدراس کے لیے چیری اور کلکتے کے لیے بستی کی حیثیت ہے۔

کچی' کا لفظ ان آبادیوں کی غیر قانونی اور عارضی حیثیت کے ساتھ ساتھ ادھورے، نامکمل اور کسی طے شدہ معیار سے کم تر درجے کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔ اس نام ہی سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان آبادیوں کی بہتری اور ترقی کی ضرورت ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کراچی میں ان آبادیوں نے اپنی بنیادیں مضبوط کر لی ہیں اور جوں جوں لوگوں کو ملکیت کا تحفظ ملتا گیا، انھوں نے اپنے مکانوں کو بہتر بنانے پر رقم لگائی ہے اور دوسری سہولتوں کے باقاعدہ حصول کی بھی کوششیں کی ہیں۔ ۱۹۸۲ میں حکومت سندھ کے مطابق کراچی میں ۴۳۶ کچی آبادیاں تھیں جو ۱۴۰۰۰ ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں اور شہر کی آبادی کا ۳۷ فیصد حصہ ان میں مقیم تھا۔ ایک اور حالیہ اندازے کے مطابق شہر میں ایسی آبادیوں کی تعداد تقریباً بارہ سو ہے اور ان میں رہنے والوں کی تعداد شہر کی کل آبادی کے نصف کے قریب پہنچ رہی ہے۔

کراچی جیسے کوسموپولیٹن شہر میں کچی آبادیاں بھی متنوع طبعی اور سماجی خواص رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود ان میں بہت سے خواص مشترک بھی ہیں جو انھیں شہر کے منصوبہ بند علاقوں سے بڑی حد تک مختلف بنا دیتے ہیں۔ عارف حسن کے الفاظ میں خوش حال علاقے اور کم آمدنی والی آبادیاں دو مختلف دنیائیں ہیں۔ اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں رہنے والوں کے رویوں، ترجیحات اور دنیا کو دیکھنے کے انداز کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا یقینی ہے۔ جو شہری سہولتیں منصوبہ بندی کے تحت وجود میں آنے والے علاقوں میں میسر ہیں، کچی آبادیوں میں ان کا فقدان ہے۔ پانی، نکاس، بجلی، علاج، تعلیم جیسی سہولتوں کے معاملے میں یہ آبادیاں منصوبہ بند علاقوں سے بہت پیچھے ہیں۔ پینے کے صاف پانی کی کمی یوں تو مجموعی طور پر پورے شہر میں ہے، لیکن کچی آبادیوں میں شدید تر ہے۔ پائپ کے ذریعے پانی کی فراہمی محدود ہے۔ لوگ چند ایک اجتماعی نلکوں پر انحصار کرتے ہیں اور پانی بھرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنے والی عورتوں اور بچوں کی لمبی قطار عام نظر آتی ہے۔ انتظار کی طویل مدت اور پانی کی غیر یقینی دستیابی بعض اوقات دنگے فساد کا موجب بن جاتی ہے۔ جن آبادیوں میں یہ اجتماعی نلکے بھی میسر نہیں وہاں پانی برتنوں میں بھر بھر کر خریدا جاتا ہے اور یہ پانی دوسرے علاقوں کی بہ نسبت زیادہ مہنگا ہے۔ جہاں جو چنیسر گوٹھ کے ایک کمہار جیسے واگھری پاڑا میں ۱۵ روپے کی اوسط روزانہ آمدنی میں سے تین یا چار روپے ہر روز پانی پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ جن آبادیوں کو مستقل کر دیا گیا ہے وہاں بجلی کا قانونی کنکشن میسر ہے مگر وولٹیج بہت کم ہے۔ دوسری آبادیوں میں لوگ اوپر سے گزرنے والے تاروں پر کنڈے ڈال کر بجلی حاصل کرتے ہیں۔ گندے پانی کے نکاس اور سوکھے کوڑے کے اٹھائے جانے کا مستقل انتظام عموماً دیکھنے میں نہیں آتا۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، کچی آبادیاں کم آمدنی، کم تعلیم، ناکافی سہولتوں، گنجان آبادی اور آبادی میں تیز رفتار اضافے سے عبارت ہیں، لہٰذا یہاں کے باشندے بیماری کا زیادہ بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ مختلف ماہرین نے ترقی پذیر ملکوں کے شہری غربا (urban poor) کی صحت کا تجزیہ کرتے ہوئے مختلف عوامل کے تین گروہوں کی نشان دہی کی ہے جن کے باعث ان کی صحت کو اضافی خطرات لاحق رہتے ہیں۔ پہلے گروہ میں وہ عوامل ہیں جو براہ راست غربت کا نتیجہ ہیں جیسے کم آمدنی، محدود تعلیم اور ناقص غذا۔ دوسرا گروہ ان عوامل پر مشتمل ہے جو انسانی عمل کا نتیجہ ہیں مثلاً ناقص مکانیت، کم جگہ میں زیادہ افراد، صنعتی اثرات، آلودگی، شور، ٹریفک اور وبائی امراض کے خطرات۔ تیسرے گروہ میں وہ عوامل ہیں جو سماجی اور نفسیاتی عدم استحکام اور

غیر محفوظ زندگی کے اثرات ہیں اور ذہنی بیماریاں، منشیات، سماجی جرائم وغیرہ ان عوامل سے براہ راست متعلق ہیں۔ کراچی کی کچی آبادیوں میں عوامل کے اس پورے سلسلے کے اثرات واضح ہیں۔ یہ اندازہ لگانا تو آسان ہے کہ کچی آبادیوں کے مکین بیماریوں کا اضافی بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں، لیکن اس بوجھ کی مقدار کے بارے میں صرف قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ کراچی شہر کے باشندوں کی صحت کے اعداد و شمار ناکافی بھی ہیں اور آسانی سے دستیاب بھی نہیں ہوتے۔

کراچی کی مختلف کچی آبادیوں کا جائزہ لینے کے لئے ۱۹۸۵ میں شہر کی ایک اعلیٰ غیر سرکاری طبی درسگاہ (آغا خان میڈیکل یونیورسٹی) اپنی چھ آبادیوں ـــــ اورنگی، گریکس، چینیسر گوٹھ، عیسیٰ نگری اعظم بستی اور بابا جزیرہ ـــــ اور ایک متوسط طبقے کے محلے ـــــ کریم آباد ـــــ میں بنیادی صحت کے ترقیاتی منصوبے کا مرحلہ وار آغاز کیا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کے کیے ہوئے سروے کے نتائج سے ایک ہی شہر کے الگ الگ حصوں کے درمیان تفاوت کی واضح نشان دہی ہوتی ہے۔ اس سروے کے مطابق مذکورہ کچی آبادیوں میں پیدا ہونے والے ہر ایک ہزار بچوں میں سے اوسطاً ۱۲۴ بچے سال بھر کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں، جبکہ متوسط طبقے کی آبادی میں ایسے بچوں کی تعداد ۳۳ فی ہزار ہے۔ کچی آبادیوں میں ہونے والی تمام اموات میں سے تقریباً نصف ایک سال تک کی عمر کے بچے ہوتے ہیں، جبکہ متوسط محلے میں کل اموات کا ۱۷ فیصد حصہ اس عمر کے بچوں پر مشتمل ہے۔

کم آمدنی والی آبادی عیسیٰ نگری اور متوسط طبقے کا محلہ کریم آباد ایک دوسرے سے بمشکل چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں، لیکن بیماریوں کی نوعیت (disease pattern) میں کئی دہائیوں کا فاصلہ ہے۔ عیسیٰ نگری میں اموات زیادہ تر چھوٹے بچوں میں ہو رہی ہیں اور ان اموات کا سبب اسہال، جیسی کی بیماریاں وغیرہ ہیں جن سے بچاؤ کے طریقے بہت عرصہ پہلے دریافت کیے جا چکے ہیں۔ انیسویں صدی کے یورپ کی طرح یہ چھوت کی بیماریاں ہیں۔ اس کے برخلاف کریم آباد میں اموات زیادہ تر بڑی عمر کے افراد میں ہو رہی ہیں اور ان کا سبب ہائی بلڈ پریشر، امراضِ قلب، ذیابیطس، سرطان وغیرہ ہیں۔ ۱۹۶۰ کی دہائی کے شمالی امریکا اور برطانیہ کی طرح یہ غیر متعدی بیماریاں ہیں اور ان کی بنیاد طرزِ زندگی اور طرزِ عمل پر ہے۔ مذکورہ کچی آبادیوں میں سے ایک، چینیسر گوٹھ، میں کیے گئے سروے کے مطابق بڑی عمر کے افراد میں غیر متعدی بیماریوں کا تناسب بھی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ کچی آبادیوں میں کم عمر بچے متعدی امراض میں اور بڑی عمر کے لوگ غیر متعدی بیماریوں میں تیزی سے مبتلا ہوتے جا رہے ہیں اور یہ آبادیاں خرابیِ صحت کے دوسرے بوجھ تلے دبی ہوئی ہیں۔

کچی آبادیوں میں ذہنی اور نفسیاتی عوارض میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ منشیات کا استعمال اتنی تیزی سے پھیلا ہے کہ ماہرین نے اسے بھی ایک قسم کی وبا قرار دیا ہے۔ سماجی عدم استحکام، ذہنی دباؤ، ترقی اور بہتری کے مواقع کا آگے چل کر محدود ہو جانا اور خاندان کی بنیادی اکائی کو لاحق طرح طرح کے خطرات وہ عوامل ہیں جن کے باعث لوگوں میں نشہ آور اشیا کی طلب بڑھی ہے۔

اس سروے کو بنیاد بنا کر بنیادی صحت کے منصوبے کا آغاز کیا گیا۔ علاقے کی کچھ خواتین کو صحت کی کارکن کے طور پر تربیت دی گئی۔ علاقے کے بااثر اور سرگرم افراد کی بھی نشان دہی ہوئی اور ان کے ساتھ گفتگو میں وقتاً فوقتاً علاقے کے مخصوص مسائل، لوگوں کے رسم و رواج اور یہاں آباد ہونے کے تجربے کی تفصیل

دریافت کی جاتی رہی۔ عیسیٰ نگری کے لوگوں کے ان تجربات کو دستاویزی شکل میں محفوظ کر لینے کا خیال ایسی ہی کسی گفتگو کے دوران آیا۔

عیسیٰ نگری کراچی شہر کے جغرافیائی وسط میں حسن اسکوائر اور سبزی منڈی کے قریب واقع ہے۔ بلدیہ عظمیٰ کراچی (KMC) کا صدر دفتر ایوانِ شہر اور ادارہ ترقیات کراچی (KDA) کا نو تعمیر شدہ سوک سنٹر بھی یہاں سے نزدیک ہے۔ شہر کے نسبتاً ترقی یافتہ محلوں کے نزدیک واقع ہونے کے باوجود یہاں بنیادی شہری سہولتیں خاصی تگ و دو کے بعد اب کہیں جا کر میسر آنا شروع ہوئی ہیں۔ بارہ ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل یہ بستی چوبیس ایکڑ رقبے پر آباد ہے۔ مروجہ سماجی اشاروں (social indicators) کی رو سے اسے اگرچہ کراچی کی تمام کچی آبادیوں کی نمائندہ نہیں سمجھا جاسکتا کیوں کہ مختلف کچی آبادیاں شہری ترقی کی مختلف منزلوں سے گزر رہی ہیں، تاہم اس آبادی کے جائزے سے بعض ایسے مسائل اور حالات کی نشان دہی ضرور ہو جاتی ہے جن سے کچی آبادیوں کے مکینوں کو گزرنا پڑتا ہے۔ عیسیٰ نگری کے جائزے کے مطابق وہاں ایک مکان میں اوسطاً سات افراد رہتے ہیں جبکہ کمروں کی تعداد عموماً دو یا اس سے کم ہے۔ ایک گھرانے کی اوسط آمدنی ۱۹۸۶ کے سروے کے مطابق ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار ہے۔ یہاں کے ۴۷ فیصد باشندے ۱۵ سال سے کم عمر کے ہیں اور پانچ برس سے کم عمر کے بچے کل آبادی کا تقریباً ۲۰ فیصد حصہ ہیں۔

عیسیٰ نگری کے کچھ خواص کراچی کی دوسری آبادیوں سے مختلف ہیں۔ یہاں کی آبادی پنجابی مسیحی افراد پر مشتمل ہے جو ایک یا دو پشت پہلے شمالی پنجاب سے نقل مکانی کر کے کراچی میں آباد ہوئے۔ آئندہ صفحات میں پیش کیے جانے والے متن کو اس علاقے کی زبانی تاریخ (Oral History) کے طور پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی گفتگو ڈاکٹر آصف اسلم نے شمس الصوفی کے ساتھ ریکارڈ کی اور پھر اس کا متن تیار کیا۔ اس متن کو سامنے رکھ کر عیسیٰ نگری کے آصف شہار اور محمد جان نے دوسرے راویوں سے گفتگو ریکارڈ کی۔ ریکارڈ کی ہوئی گفتگو کو کاغذ پر منتقل کرتے ہوئے پوری احتیاط برتی گئی ہے کہ تلخیص اور تدوین کے باوجود ان راویوں کی باتیں انہیں کی زبان اور انداز بیان میں سامنے آئیں۔ اس لحاظ سے اس متن کے ذریعے کراچی کی کچی آبادیوں میں بولی جانے والی عام زبان کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

راویوں کی گفتگو کا تدوین شدہ متن ڈاکٹر آصف اسلم نے تیار کیا اور اسے راویوں کی رضامندی اور تعاون سے حتمی شکل دی گئی تاکہ حقائق کے بیان میں کوئی غلطی نہ رہ جائے اور ان کا نقطۂ نظر پوری طرح سامنے آسکے۔

(ا۔ ف۔)

بنجمن انتھونی　　شریف سوز
لیاقت منوّر　　بیکسٹر بھٹی　　نسرین اسٹیفن
آصف شہباز　　محبوب جان

انٹرویو اور تدوین آصف اسلم، آصف شہباز، محبوب جان

عیسیٰ نگری کی زبانی تاریخ

جس وقت آپ چھوٹے تھے، اس کچی آبادی کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی، اس وقت لوگ کیسے رہتے تھے، کیا کام کاج کرتے تھے، وقت کس طرح گزارتے تھے۔ آپ اپنے بچپن کے حوالے سے اس کچی آبادی کے بچپن کے بارے میں بتائیے، میں نے شمس سے پوچھا۔

یہ کچی آبادی جب وجود میں آئی تو ہم اس کے چار سال کے بعد اس علاقے میں آئے۔ ۱۹۶۰ میں دوسرے علاقوں سے لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے۔ ہم لوگ ۱۹۶۴ میں یہاں آئے۔ اس وقت یہ علاقہ جو ہے، بالکل ایک گاؤں کی سی شکل تھی اس کی۔ ہمیں ایسا ہی لگ رہا تھا کہ ہم پنجاب کے ایک گاؤں سے نکل کر دوسرے گاؤں میں آ گئے ہیں۔ ہمارا تعلق سیالکوٹ کے علاقے نارووال اور اس کے ایک گاؤں کھوکھر والی سے ہے۔ تو ہمارا گاؤں بالکل اسی طرح تھا، بلکہ ہے، اب بھی موجود ہے۔ گاؤں میں بھی تھوڑی ترقی ہوئی ہے۔ لیکن اس وقت جو ہم نے آ کر دیکھا تو بہت کم لوگ یہاں تھے۔ تقریباً چار پانچ گلیاں تھیں، لیکن چھوٹی چھوٹی گلیاں۔ اور پنجاب کے طریقے سے لوگ یہاں رہتے تھے، یعنی کہ کافی کھلی گلیاں ہوتی تھیں شروع میں، لوگوں کے گھروں میں درخت ہوتے تھے، کچے مکان سے ہوئے تھے، لوگوں کے پاس بڑی بڑی حویلیاں ہوتی تھیں اور حویلی کی شکل میں جگہ ہوتی تھی۔ جیسے جیسے لوگ یہاں آباد ہوئے تو ان کے رشتہ دار آنے لگے اور وہ اپنے رشتہ داروں کو پنجاب سے بلانے لگے۔ لوگوں نے یہاں آ کر جگہ خریدی نہیں بلکہ لوگوں کو کسی اور جگہ سے شفٹ کیا گیا تھا جہاں وہ سرکاری زمین پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ نئے لوگ جو آتے تھے وہ اس طرح کرتے تھے جیسے ابھی میرا گھر یہاں پر ہے، میرے رشتہ دار آئے

نہیں تو وہ میرے ہی ساتھ آ کر رہیں گے۔ لوگوں کے پاس بڑے بڑے پلاٹ تھے۔ بڑی بڑی جگہیں لی ہوئی تھیں اور زمین کی قیمت بھی بہت ہی کم تھی۔ جس طرح آج لوگوں کے پاس گھر ہیں جن کی مالیت لاکھوں روپے ہے تو اس وقت پچاس روپے میں بھی گھر ملتا تھا، سو روپے میں بھی گھر ملتا تھا۔ ہم جس گھر میں آئے تھے وہ ہم نے تین سو روپے میں خریدا تھا، جب کہ آج اسی گھر کی قیمت لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہو گی۔ تو اس طرح لوگ آتے گئے۔ پھر جس کام کی طرف لوگ بڑھے وہ پنجاب کی بہ نسبت یہاں ان کے لیے کرنا آسان تھا۔ کیوں کہ پنجاب میں ایک طرح کا سلسلہ تھا کہ جن لوگوں کی زمینیں ہیں اور جو کھیتی باڑی کرتے ہیں ان کے انڈر میں یہ لوگ کام کرتے تھے اور بزرگوں کے بزرگ اور خاندانوں کے پورے سلسلے وہ کام کرتے تھے۔ زیادہ تر لوگ کاشتکار کی حیثیت سے زمینوں کے مالک چودھریوں کے پاس کام کرتے تھے۔ اُجرت بھی کم تھی۔ پیسہ بھی دیکھنے میں کم آتا تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں موسم کے حساب سے مل جاتی تھیں۔ لیکن یہاں آ کر لوگوں کے پاس پیسہ آیا۔ یہاں آ کر لوگوں نے کم محنت میں زیادہ پیسہ دیکھا۔ اور پھر انھوں نے یہ فرق دیکھا کہ یہاں پر ٹائم بھی ہے۔ یعنی کہ آپ صبح جائیں اور شام تک گھر آ جائیں۔ یہ نہیں کہ صبح سے شام تک پھر رات تک لگے رہیں، اوپر سے جب جی چاہے کام کے لیے بلا لیں۔ وہاں تو اپنے گھر میں بھی کام ہوتا تھا تو اس کے لیے چودھری سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ یہاں ٹائم ایسا تھا۔ تو یہ چیزیں لوگوں کے لیے نئی تھیں۔ پھر ہمارے لوگوں کے لیے تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے مواقع بھی کم تھے اور شہر کراچی کا آپ کو پتا ہے، ان دنوں ہم نے سنا تھا کہ کراچی بڑا شہر ہے، وہاں جانا مشکل ہے، جو چلے جاتے ہیں وہ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ ان دنوں ہمارے لیے کراچی ایسا تھا جس طرح آج دُبئی کو اور یورپ کو سمجھتے ہیں۔ تو ہم اس شہر میں آئے۔

اس علاقے میں جو لوگ آ کر آباد ہوئے وہ پنجابی تھے اور ان میں سے بھی کرسچین، کیوں کہ شروع میں جو لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے تھے وہ کرسچین تھے۔ لوگوں کا رہن سہن ویسا ہی تھا جس طرح گاؤں میں چھوڑ کر آئے تھے، مثلاً مویشی پالنا۔ گلیوں میں بھی لوگ جانور پال لیتے تھے۔ شروع میں تو گھروں میں بھی اتنی جگہ ہوتی تھی کہ جانور رکھ لیں۔ رسم و رواج میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پانی بجلی کی سہولت تو آپ کو پتا ہے، اب بھی پوری طرح نہیں ہے۔ اُس وقت تو بالکل نہیں تھی۔ اُس وقت اس علاقے کے لوگ بہت دور دور سے پانی لاتے تھے۔ آدمی کام پر چلے جاتے تھے، عورتیں سارا دن یہاں سے دو کلومیٹر دور اور تین کلومیٹر دور سے پانی لاتی تھیں۔ بڑی کوشش کے بعد لوگوں نے ایک نلکا لگوایا جو روڈ پر تھا۔ پوری آبادی کے لیے ایک نلکا۔ لیکن اُس وقت آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔

آج کوئی دیکھے تو یقین بھی نہیں کرے گا کہ یہاں بالکل آبادی نہیں تھی۔ کھلا علاقہ تھا۔ ادھر ملک پلاٹ کی عمارت تھی اور اس کے بعد تین چار کلومیٹر آگے چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا جہاں اب سنا ہے کراچی سنٹرل اسٹیشن بن رہا ہے۔ آگے سیمیناری تو تھی۔ وہ تو پاکستان سے پہلے کی ہے۔ غریب آباد کا علاقہ جس طرف سے وہاں تک کھیت تھے۔ حسن اسکوائر اور گلشنِ اقبال تو ہمارے سامنے بنا ہے۔ اس

طرف فوجیوں کا کیمپ لگا ہوا تھا، سن ۶۵ کی جنگ میں بہت فوجی ادھر آئے تھے۔ بہت سال پہلے جب نمائش لگی تھی جہاں اب سوک سنٹر سا ہے اس کے سامنے، اور یہاں سے لوگ وہ نمائش دیکھنے گئے تو رات کے وقت بندر ان کا راستا روک لیتے تھے۔ اس طرف گیدڑ بھی بہت تھے۔ جھاڑیاں سی جھاڑیاں تھیں اور گھپ اندھیرا ہوا کرتا تھا۔ اس علاقے میں بجلی بھی بہت دنوں کے بعد آئی اور ناجائز کنکشن سے شروع ہوئی۔ گھروں میں لالٹینیں جلا کرتی تھیں اور دکانوں میں گیس کی بتی استعمال ہوتی تھی۔ یا کوئی پروگرام ہوتا تھا تو اس میں گیس استعمال کرتے تھے اور جس شخص کے پاس گیس ہوتی تھی، اس کی دوسرے لوگوں میں بڑی اہمیت ہوتی تھی اور لوگ کہتے تھے اس کے گھر میں گیس جل رہی ہے، جب کہ آج کسی کے گھر میں ٹیوب لائٹ بھی جل رہی ہو تو کوئی نہیں دیکھتا

اُس وقت یہاں گھروں میں وہ بہت والی گندی نالیوں کا سلسلہ نہیں تھا بلکہ لوگ گھروں میں کنویں سے کھود لیتے تھے، وہ رفع حاجت کے لیے بھی استعمال ہوتے تھے لیکن زیادہ تر ایمرجنسی کے لیے۔ ورنہ اس کام کے لیے باہر جاتے تھے۔ پورے علاقے میں کوئی ٹائلٹ سسٹم نہیں تھا۔ عورتیں شام کے وقت ٹولیوں کی شکل میں باہر جاتی تھیں۔ کپڑے دھونے اور نہانے کے لیے لوگوں نے جو کنویں سے بنائے ہوئے تھے ان کے اوپر چھت ڈال دیتے تھے اور جب وہ بھر جاتے تو یہ سب گلی میں چھوڑ دیتے اور یہ پانی گلی میں بہنے لگتا تھا اور نالے میں چلا جاتا تھا۔ یہ نالا شروع سے ہے۔ اور نیوٹاؤن کے علاقے کا ڈرینیج یہاں سے گزرتا تھا۔ اس نالے میں پہلے صاف پانی آتا تھا، پھر گندا پانی آنے لگا۔ صاف پانی اس لیے آتا تھا کہ کے ڈی اے کا جو پلاٹ ہے یہاں، ایک چشمہ تھا اور اس چشمے کا پانی اس نالے سے گزرتا تھا۔ عورتیں یہاں پر کپڑے دھونے اور برتن دھونے جاتی تھیں جس طرح ندی پر جاتے ہیں۔ اب سارے علاقے کا کوڑا کرکٹ اس میں بہتا ہوا آتا ہے۔ آبادی بڑھنے لگی تو پھر اس طرح ہو گیا۔

جب میں یہاں آیا تھا تو مجھے لگا کہ میں ایک گاؤں سے نکل کر دوسرے گاؤں میں آگیا ہوں۔ لیکن یہ گاؤں چپکے چپکے شہر بن گیا اور میں نے بھی گاؤں والے سے شہر والے ہونے کا فاصلہ طے کر لیا۔ لیکن یہ آہستہ آہستہ ہوا۔ مجھے خود بھی بعد میں پتا چلا۔ ہم کو ایک خوف رہتا تھا۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے تک بھی یہ خیال تھا کہ یہ علاقہ مسلسل آباد نہیں رہے گا، لوگوں کو یہاں سے بھی مٹا دیا جائے گا۔ اس لیے کہ ہم لوگوں کے پاس لیز نہیں تھی اور گورنمنٹ کا کچھ پتا نہیں، مختلف حکومتیں آتی تھیں، جاتی تھیں، لوگ وعدے کرتے تھے اس کو مستقل کرنے کے لیے، کہ اس کا الاٹمنٹ ہو جائے اور اس کو لیز مل جائے۔ اس کے باوجود لوگ اس بات پر توجہ نہیں دیتے تھے کہ ہمیں اس کو پکا کرنا ہے، ہم پکے گھروں میں شفٹ ہو جائیں۔ لیکن ساتھ ساتھ جب لوگوں کی آمدنی بڑھنا شروع ہوئی، کیوں کہ اس وقت مہنگائی کم تھی اور اخراجات بھی زیادہ نہیں تھے اور پیسے کی ویلیو بھی تھی، تو لوگوں نے آہستہ آہستہ گھروں کو بہتر کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد جس کا گھر ٹوٹتا تو اس نے یہی کوشش کی کہ اس کو بلاک سے بنایا جائے مٹی کے بجائے۔ وہ تبدیلی کا وقت تھا جب لوگوں نے ٹوٹتے ہوئے گھروں کو مٹی کے بجائے سیمنٹ کے بلاکس سے بنانا

شروع کیا۔ لیکن یہ آسان کام نہیں تھا۔ وہی بات تھی کہ لوگ اتنے عرصے سے رہ رہے تھے اور یہ خطرہ تھا کہ یہاں سے اٹھا نہ دیے جائیں۔ پھر چکنی مٹی آسانی سے مل جاتی تھی، ارد گرد سے مل جاتی تھی۔ بلکہ چکنی مٹی کا ایک حادثہ بھی ہوا۔ وہ اس طرح کہ جیسے لوگ کھودتے کھودتے رہتے ہیں اور اتنے گہرے چلے گئے کہ وہ تودہ گر گیا اور اس میں ایک دو بچے اور چند بڑے دب کر فوت ہو گئے۔ تو اس طرح ایک حادثہ بھی ہوا اور تبدیلی بھی آتی گئی۔ اور چکنی مٹی کا استعمال کم ہوتا گیا۔ اس کی جگہ لکڑی کی چھت بننے لگی اور ٹائلز بھی استعمال ہونے لگے۔

پانی کی تو بڑی مشکل تھی لوگوں کو۔ ساری ہی مشکلیں تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہ کوشش بھی کرنے لگے کہ کسی طرح مسائل کو حل کریں۔ شروع میں تو لوگ اس لیے خائف تھے کہ آبادی کم تھی۔ ان کو ڈر تھا کہ حکومت یہاں سے بے دخل کر دے گی۔ تو جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی اور یہ مسائل بھی بڑھتے گئے تو لوگوں میں یہ احساس بھی ہوا کہ اپنے حقوق کے لیے لڑنا چاہیے۔ دس سال پہلے لوگوں نے اپنے طور پر وہ کنویں والا سسٹم ختم کیا اور گٹر لائنیں ہوائیں۔ نلکے کے لیے بھی کام کیا اور گلیوں میں نلکے لگوائے۔ لوگوں کے گھروں میں نلکے نہیں تھے لیکن گلیوں میں نلکے ایک ایک دو کر کے لگوائے۔ اس میں گورنمنٹ کی بھی مدد تھی لیکن زیادہ تر ہمارے اپنے لوگوں کی محنت تھی۔ اپنی مدد آپ کے تحت لوگ پیسہ جمع کرتے تھے، چیزیں خرید کر لاتے تھے، کھدے نکالتے تھے، اس میں ڈالتے تھے۔ اور اس طرح نکاسی کے لیے بھی خود کام کیا اور پانی کے لیے بھی۔ پنچایت سسٹم اب بھی ہے لیکن اُس وقت زیادہ مضبوط تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ ہمارے مسئلے جو ہیں ہم ان کو مل کر اپنے طور پر حل کر سکتے ہیں۔ کافی دنوں تک یہ سلسلہ رہا۔ اس وقت لوگ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ تھانا پولیس سے لوگ ڈرتے تھے۔ درمیان میں ایک وقت ایسا آیا کہ لوگ ایک دوسرے کے بھی خلاف ہو گئے، ایک دوسرے سے ڈرنا اور عزت کرنا چھوڑ دیا اور لڑائی جھگڑا جو ہوتا تھا تو پولیس تھانوں تک پہنچنے لگا۔ عیسیٰ نگری کا وہ وقت بھی ہم کو یاد ہے جب سیوٹاؤن تھانے کی پولیس اس علاقے کو سونے کی چڑیا کہنے لگی، اس لیے کہ لوگ آپس میں اتنی نااتفاقی رکھتے تھے اور پولیس والوں کو ذرا ذرا سی بات پر اچھی خاصی رقم سٹورنے کا بہانہ مل جاتا تھا۔ یہ سلسلہ کم ہوا ہے لیکن اب بھی چل رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بیماری اسی وجہ سے ہے، یہ ہمارے نوجوانوں کے مسائل میں جن کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے مسائل میں، ہمارے بزرگوں کے مسائل ہیں اور ہمارے سیاسی لیڈروں کے مسائل ہیں۔

پچھلے کرسمس پر چرچ کے سامنے پہرہ دینے کے بہانے پولیس آ گئی۔ آنے کو تو آ گئے لیکن سارا دن لوگوں کو تنگ کرنا، عورتوں کو گھورنا، بہانے بہانے سے مانگنا کہ یہ لادو، وہ لادو جس وقت شروع میں ہم آئے ہیں تو دو تین چرچ تھے۔ اب آپ دیکھیں جیسے جیسے لوگ بڑھے ہیں چرچ میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ پہلے تین چرچ تھے، اک یونائیٹڈ پریسبی ٹیرین، ایک چرچ آف پاکستان اور ایک کیتھولک۔ اب دس گیارہ چرچ ہیں، اور ہر ایک میں نماز کا الگ اپنا سلسلہ ہے۔ اسی طرح تعلیم کا بھی ہے۔ لوگ زیادہ تر

ان پڑھ تھے لیکن انھوں نے کراچی میں آ کر دیکھا کہ دوسرے علاقوں میں جو لوگ آباد ہیں، وہ چاہے امیر ہوں یا غریب، ان میں تعلیم کا رجحان بہت ہے۔ تو اس علاقے میں بھی یہ رجحان پیدا ہوا، اور لوگوں نے سمجھا کہ بے شک وہ خود تعلیم نہیں حاصل کر سکے لیکن اپنے بچوں میں تعلیم کا انتظام کریں۔ تو لوگوں نے بہت کوشش کی۔ گورنمنٹ نے یہاں ایک اسکول سوا کر دیا جو پرائیوٹ بھی چلتا تھا اور گورنمنٹ کی طرف سے بھی تھا۔ تو گورنمنٹ کا ایک ہی اسکول ہے لیکن پرائیوٹ اسکول چار پانچ ہیں۔ تو وہ اسکول ایک شفٹ میں گورنمنٹ کی طرف سے چلتا تھا اور ایک شفٹ میں پرائیوٹ طور پر چرچ کی طرف سے۔ میں نے اس اسکول سے پڑھا۔ پھر علاقے کے باہر کے اسکول سے بھی پڑھا۔ اس وقت علاقے سے باہر کے اسکول میں بچوں کو نہیں بھیجا جاتا تھا۔ اب تو فلیٹس میں بھی اسکول سے ہوئے ہیں اور بنگلوں میں بھی اسکول سے ہوئے ہیں۔ اس وقت ارد گرد بھی کوئی اسکول نہیں تھا۔ اب تو ساری سہولتیں مل سکتی ہیں۔

اب تو عیسیٰ نگری تقریباً کراچی کے وسط میں آ گئی ہے۔ پہلے یہ شہر کا غیر آباد کونا تھی۔ یہاں تک کا روڈ بھی کچا ہوا کرتا تھا، کوئی بس بھی ادھر نہیں آتی تھی۔ یہاں بس اتنا ٹریفک ہوتا تھا کہ ریتی بجری لے جانے والے ٹرک کبھی کبھی گزرا کرتے تھے رات کے وقت۔ سبزی منڈی کے بس اسٹاپ تک جانا پڑتا تھا۔ ایک نمبر بس اسٹاپ تھا پہلے، اس کے بعد دو نمبر بس اسٹاپ بھی ہو گیا۔ کنٹری کلب روڈ بنی ہوئی تھی جس کا نام یونیورسٹی روڈ ہو گیا ہے۔ اب تو یہاں سے ہر طرف کو راستے نکلتے ہیں۔ کچی آبادی سے بستی بن گئی۔

آپ نے ٹھیک کہا، جس وقت یہ ساری تبدیلیاں ہو رہی تھیں تو ان کے ساتھ ساتھ میں بھی بڑا ہو رہا تھا۔ پرائمری اسکول میں نے یہاں سے کیا۔ اس وقت یہاں پر مڈل اسکول نہیں تھا۔ ہمارے اسکول کا کانٹریکٹ تھا سولجر بازار کے ایک اسکول سے، ہم وہاں شفٹ ہوئے۔ اپنے علاقے سے باہر نکل کر پڑھنا، وہ بھی بہرحال ایک نئی چیز تھی ہمارے لیے۔ بسوں میں سفر کرنا، آنا جانا، یہ سب۔ اس وقت یہ تو نہیں تھا جس طرح اب گلی گلی میں ٹیپ بال فٹ بال کھیلا جا رہا ہے، کیرم چل رہا ہے۔ ہم فٹ بال کھیلتے تھے اور ٹیمیں بنی ہوئی تھیں۔ کرکٹ اتنا عام نہیں تھا۔ گلی ڈنڈا ہم کھیلتے تھے۔ جہاں آج نعمان سنٹر آپ کو نظر آ رہا ہے، یہ ہمارا فٹ بال گراؤنڈ ہوتا تھا۔ گلی ڈنڈے کے لیے کھلی جگہ چاہیے تو وہ یہاں بہت تھی۔ ہم گولیاں بھی کھیلتے تھے۔ بڑوں میں کشتی ہوتی تھی۔ یہاں پہلوانی کا شوق عام تھا۔ ہم سے جو بڑے تھے وہ کبڈی کھیلتے تھے اور پہلوانی کرتے تھے۔ ریلوے کراسنگ کے پاس اکھاڑا بنایا ہوا تھا۔ وہاں شام کے ٹائم پر تمام نوجوان جاتے تھے اور تیل مالش کرنا، کشتی سیکھنا اور استادی شاگردی والے سارے سلسلے۔ پھر عیسیٰ نگری کا اتنا نام ہوا کہ کمپٹیشن شروع ہو گیا۔ دوسرے علاقوں سے لوگ آتے تھے۔ اتوار کے دن یہاں دنگل ہوتا تھا۔ ڈھول ڈھمکا ہوتا تھا، میلے کا سماں ہوتا تھا۔ دور دور سے لوگ آتے تھے۔ اس طرح کے کھیل ہوتے تھے۔ بچے کیا کرتے تھے، ہم چھوٹے تھے تو ہم سائیکل کے خالی ٹائر میں راڈ لگا کر گاڑی گاڑی کھیلا کرتے تھے۔ یہ روڈ کچی تھی تو اس پر چلایا کرتے تھے۔ موٹر سائیکل تو بڑی بات ہے کسی کے

پاس سائیکل بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ لڑکیاں گھروں کے اندر رہتی تھیں اور کہانیاں ہوتی تھیں اور یہ جانی میں ہم کہتے ہیں ماتاں پاسیاں ، تو یہ سب ہوتا تھا۔ لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بڑا ہوتا تھا۔ اور مکانوں کی چھت اس طرح ملی ہوتی تھی کہ ایک چھت سے چلیں تو پوری گلی کراس کرتے ہوئے پہنچ جاتے تھے۔ ہم اپنے گھر سے اسلم مارٹن کے گھر چھت سے ہی جاتے تھے۔ اب نہیں جاسکتے۔ جگہ کم پڑ گئی ہے اور لوگ بلڈنگوں کی شکل میں رہنے لگے ہیں۔ ہمارا جو گھر تھا اس میں گراؤنڈ فلور پر ایک کمرہ اور ایک اور چھوٹا سا کمرہ ہوتا تھا۔ شروع میں تو ہمارے پاس ایک کمرہ تھا اور ایک ورانڈا اور ایک ہم نے چھوٹا سا کچن سا بنایا ہوا تھا اور اس میں چولہا جلتا تھا تو دھواں سارے گھر میں پھیل جاتا تھا۔ مٹی کا تیل استعمال کرنا بعد میں شروع کیا ہے۔ اُپلے جلاتے تھے اور لکڑی۔ مٹی کا تیل مہنگا سمجھا جاتا تھا۔ لکڑی آسانی سے مل جاتی تھی، آس پاس کے علاقے میں جھاڑیاں تھیں ان سے کاٹ کر لاتے تھے۔ یہ بھی ہمارا کام تھا۔

دنگل ہوتے تھے، کشتی ہوتی تھی، اور باتیں ہوتی تھیں۔ یہ ساری باتیں بزرگوں کے سامنے ہوتی تھیں۔ ماشاءاللہ جوان تو آپ بھی رہے ہیں۔ آپ کو پتا ہوگا کہ نوجوانوں کی باتیں اور بھی ہوتی ہیں، جن کا بزرگوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔ اُس وقت نوجوانوں میں زیادہ تر بس یہی تھا کہ فٹ بال میں، کبڈی میں اور ادھر ادھر۔ اور کچھ دوست جو اندر رہتے تھے ان کا کام تھا تاش کھیلنا، پاشا کھیلنا، بیٹھے رہنا۔ آج کل جس طریقے سے لڑکے کاروبار نظر آتے ہیں، اُس وقت بہت کم ہوتے تھے۔ دو چار دوست آ کر ساتھ ہوتے تھے تو وہ کسی کے گھر میں بیٹھ جاتے تھے، یہاں تک کہ کھانے کا ٹائم ہے تو وہ بھی وہیں پر گزر جائے اور اگر سونے کا ٹائم ہے تو وہ بھی۔ کبھی کبھی اسی کے گھر سو جانا یا پھر اسکول کا کام مل کے کرنا۔ میں اٹھ کر عارف کے گھر چلا جاتا تھا اور اُدھر سے انور بھی آ جاتا تھا کہ چلو جی، عارف کے گھر میں اسکول کا کام کریں گے۔ اور وہیں پر گانا بجانا ہو رہا ہے، وہیں پر کیسی ڈنڈے ہو رہے ہیں اور وہیں پر کھیل کود ہو رہا ہے۔ اور پھر اگر آپ دوسرے سلسلوں کے بارے میں پوچھنا چاہیں تو وہ بڑے مختلف تھے۔ بہرحال انہیں اچھا تو نہیں کہنا چاہیے، اُس وقت کے حساب سے وہ بھی بُرے تھے لیکن آج کل کے حساب سے وہ بہتر لگتے ہیں۔ اس وقت جو جوان تھے تو وہ عشق اور محبت کا سلسلہ ہوتا تھا لیکن آج کل لوگ محبت کا نام لے کر جنسی خواہش کی تسکین کی بات کرتے ہیں۔ اُس وقت لوگ واقعی محبت کرتے تھے، اور کوئی بندہ کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا تو وہ اس کی محبت صرف یہ نہیں ہوتی تھی کہ اس کو لپیٹے، اس کو پکڑے۔ یہ سب تھا لیکن آج کی طرح نہیں تھا۔ خط و کتابت کا چکر زیادہ ہوتا تھا۔ جو لوگ پڑھے لکھے ہوتے تھے وہ ایسا چھوٹا بچہ ڈھونڈتے تھے جس کا اُس گھر میں آنا جانا ہوتا تھا اور اس پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔ تو اس وقت یہ ہوتا کہ قاصد بیچ میں ہے اور رقعے چل رہے ہیں۔ اُدھر سے پورا پورا نورجہاں کا گانا آ رہا ہے تو اس طرف سے پورا پورا مہدی حسن کا گانا لکھا ہوا جا رہا ہے۔ اُس وقت فلمی گانوں میں بھی مرثیے کا سلسلہ ہوتا تھا۔ اور گانے بھی ایسے ہوتے تھے، ساون بہاروں والے پُل پر بُلا کے اور 'تیرے سایوں گھڑیاں بیتیں جیسے صدیاں بیت گئیں۔' انتظار کا بڑا سلسلہ تھا۔ اور جو لوگ ان پڑھ تھے ان کا کام تھا چکر بازی، اس گلی سے نکلے اور

گھوم کر چکر کاٹ کر پھر اسی گلی میں آ گئے۔ اور وقت اس کو پتا ہوتا تھا، جھلک دیکھ لی کہ آ رہا ہے تو مسکرا لیے، اشارہ کر دیا۔ دیواروں سے جھانکنا زیادہ ہوتا تھا۔ عیسیٰ نگری میں اب لوگوں کی چھتیں زیادہ اونچی ہو گئی میں تو چھت سے اشارے ہوتے ہیں، ایک دوسرے کی طرف ٹارچیں مارتے رہتے ہیں۔

یہ نہیں کہ اُس وقت یہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا، لیکن اتنی بے حیائی نہیں تھی۔ جس طرح اب علاقے میں کبھی کبھی کوئی لڑکا لڑکی رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں تو اُس وقت اتنے زیادہ کیس نہیں ہوتے تھے۔ یہ ضرور ہوتا تھا کہ کسی کا کسی کے ساتھ نام چل گیا۔ کچھ لوگ اُس وقت بھی ہیرو ہوتے تھے۔ اس وقت کے ہیرو ٹیڈی پینٹ پہنتے تھے اور جس نے پینٹ پہن لی وہ ہیرو ہو گیا، چاہے وہ انگوٹھا چھاپ کیوں نہ ہو۔ پھر یہ فیشن نکلا کہ گلے میں رومال باندھ کر گھوم رہے ہیں۔ ایک کو چھوڑا، دوسرے سے محبت کی، پھر اس کو چھوڑا۔ اُس وقت کے کچھ پرانے عاشق اب بھی زندہ ہیں۔ بڈھے ہو گئے ہیں پر زندہ ہیں۔ ہیرو تو آج کل بھی بہت گھوم رہے ہیں۔

پھر ڈرامے پارٹیاں بڑی ہوتی تھیں۔ ڈرامے کرتے تھے اور اس میں ملاپ ہوا کرتا تھا۔ پھر چرچ میں بھی ملنے اور دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ اور چرچ چھوٹنے کا ٹائم ہوتا تھا تو سارے عاشق باہر کھڑے ہوئے ہیں۔ آج کل بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ چرچ میں بھی چٹھیاں فلانی ہوتی تھیں یا پھر گلی میں۔ لڑکا گزرتے گزرتے چٹھی کا کام کر گیا۔ چرچ تو بعد میں بن گئے ورنہ کرسمس کے دن بھی لوگ سینٹ پیٹرک جایا کرتے تھے۔ جلوس کی شکل میں جا کر نماز کیا کرتے تھے۔ جب یہاں پر چرچ بن گئے تو ان میں بھی نماز شروع ہو گئی۔ گھوڑوں والا اتوار ہوتا تھا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ جلوس کی شکل میں جاتے تھے، بڑا اچھا لگتا تھا۔ اب لوگوں کے پاس وقت بھی کم ہے اور اچھی رسومات ادا کرنے کا رواج بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مذہبی ڈرامے بھی ہوتے تھے اور سوشل ڈرامے بھی۔ علاقے میں جو شہزادے گھوم رہے ہوتے تھے وہ کوشش کرتے تھے کہ ہمیں ہیرو کا چانس ملے۔ جب آبادی بڑھنے لگی تو لوگوں میں گروپ بازیاں بھی ہونے لگیں۔ تہوار والے دن خاص طور اسکول والے پروگرام سجا لیتے تھے یا چرچ کمیٹیاں پروگرام سجا لیتی تھیں۔ کرسمس والے دن میلہ لگنے لگا۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس میں ہر طرح کے اسٹال ہوں۔ جھولے، کھانے پینے کی چیزیں، بچوں کے لیے کھیل، گانا بجانا، اسٹیج کے آئٹم وغیرہ ہوں۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ کسی کے گھر خوشی ہوتی تھی تو رات بھر ناچ ہوتا تھا اور ایک لڑکا لڑکی بن کر ناچتا تھا، اور پرانے قصے، ہیر رانجھا اور لیلیٰ مجنوں وغیرہ کے سانگ جاتے تھے۔ اس کو "راس ڈالنا" کہتے تھے۔ پھر یہ ہونے لگا کہ کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا تو لاؤڈ اسپیکر لگا کر خوشی کا اعلان کر رہے ہیں۔ بچے کی چھٹی پر بیوندرا کا طریقہ اس وقت سے بھی پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ اس رسم سے وقتی طور پر مدد مل جاتی ہے لیکن بدلہ قرض میں بھی بدلہ جاتا ہے۔ اب راس ڈالنے کے بجائے میوزیکل ایوننگ کرتے ہیں، باہر سے گلوکار بلاتے ہیں اور ٹکٹ رکھتے ہیں۔ جو پیسے گانے والوں کے سر پر سے پھینکتے تھے وہ اب ٹکٹ میں لگا دیتے ہیں۔

ایک کرسمس میلہ ہم نے بھی کیا تھا۔ آج سے اٹھارہ انیس سال پہلے کی بات ہے۔ سڑک کے

سامنے کیتھولک سوشل سروس والوں نے معذوروں کے لیے سنٹر بنایا تھا جہاں ان کو دن بھر رکھنے کا انتظام تھا۔ سلائی سنٹر تھا اور ڈاکٹر بھی بیٹھتا تھا۔ اسی سنٹر کو مزید ڈیولپ کرنے کے لیے ہم نے میلہ کیا۔ اس میلے میں اسٹالز لگائے۔ کھیلیں رکھیں۔ اور ہم نے ایک اسٹال لگایا ناچنے کا۔ اس وقت ٹیپ ریکارڈر کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ٹیپ ریکارڈر پر گانے سننے کے لیے بہت لوگ آتے تھے۔ تو ہم نے سوچا کیوں نہ ٹیپ ریکارڈر لگا کر اس سے آمدنی کی جائے۔ اس پر ناچنے کا کردار میں نے کیا۔ میرے ساتھ دوسرے بھی تھے۔ میں نے مونچھیں صاف کر کے لیڈیز کپڑے پہنے اور ڈانس کیا۔ اس کے اوپر ٹکٹ لگائی۔ اس میں بہت لوگ آئے اور ایک گانا ختم ہوتا تھا تو پچاس لوگ دوسرے گانے کی فرمائش کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ بڑا عجیب تھا اور عیسیٰ نگری میں پہلی مرتبہ اس طرح ہوا۔ لوگوں نے اس کا بُرا نہیں مانا بلکہ بہت پسند کیا۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں تو مجھے خود عجیب سا لگتا ہے۔

> باہر سے ایک جیسی نظر آتی ہیں کچی آبادیاں لیکن اگر سطح کے نیچے ذرا کریدا جائے تو ایک دوسرے سے خاصی مختلف معلوم ہوتی ہیں۔ روزمرہ زندگی کی بنیادی سہولتوں کے حصول کی جنگ ہر جگہ ایک کہانی ہے جو زمین پر پیر ٹکانے کی کوشش سے شروع ہو کر بہت آگے تک چلی جاتی ہے۔ عیسیٰ نگری پہلے ایک کچی آبادی تھی جہاں آج بنیادی سہولتیں میسّر ہیں بلکہ سندھ اسمبلی میں منتخب ہونے والے دو اقلیتی نمائندے اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تمام عمل کے پیچھے جو تنظیمی اور سماجی کام ہوتا رہا ہے اس کے بارے میں محبوب خان اور آصف شہزاد کے سوالوں پر شریف نور نے تفصیل بیان کی۔

میں ۱۹۶۲ میں عیسیٰ نگری آیا۔ اس وقت کچھ بھی نہیں تھا، ایک میدان تھا جس میں آ کر ہم نے ڈیرا ڈالا تھا۔ ہم نے جھگیاں بنائیں، پھر آہستہ آہستہ مٹی کے گھر بنائے۔ اُس وقت کسی قسم کی ضروریاتِ زندگی حاصل نہیں تھیں، اس وقت جتنی آبادیاں ہیں ان کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یوں سمجھیے کہ ہم ایک قسم کے جنگل میں آ کر آباد ہوئے تھے جہاں چوری، خوں ریزی اور ڈکیتیاں عام تھیں۔ اور ناجائز کاموں کی وجہ سے جن لوگوں کو قتل کر دیا جاتا تھا، انھیں یہاں ہزارے والے قبرستان میں پھینک جاتے تھے۔ یہاں پر آباد ہونے کا مقصد تو یہ تھا کہ یہاں اس وقت کُل اسی نوے گھر تھے۔ جو خاندان آباد ہوئے تھے انھوں نے اپنے رشتے داروں کو کراچی کے دوسرے علاقوں سے اور پنجاب سے بلوایا۔ چوں کہ یہاں زمین کے معاملے میں بندش نہیں تھی لہٰذا جس کا جتنا جی چاہا اس نے زمین حاصل کر لی اور اس طرح عیسیٰ نگری آباد ہو گئی۔ یہاں صرف چند لوگ تعلیم یافتہ تھے جن میں ڈاکٹر چین، ڈاکٹر ہدایت اور لال دین شامل تھے۔ باقی تمام ان پڑھ لوگ تھے جن کا آبائی پیشہ کاشت کاری تھا لیکن یہاں کراچی میں صرف محنت

مزدوری کرنے کے لیے آئے تھے۔

ضروریات زندگی تو کسی نہ کسی طرح پوری ہوتی تھیں لیکن ہمارا زیادہ رجحان زمین کی لیز کی طرف تھا کہ کسی طرح ہم اس کو لیز کروالیں۔ جب ہم یہاں آئے تھے تو ہمیں پتا چلا کہ یہ جگہ گئوشالا کی ہے، یعنی یہ ہندوؤں کی جگہ تھی۔ تو ہمیں اس بات کا ڈر رہتا تھا کہ کہیں وہ لوگ واپس نہ آجائیں۔ تو اس مشکل کو ہم پہلے حل کرنا چاہتے تھے جو صرف لیز کی صورت ہی میں ہوسکتی تھی۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو ضروریات زندگی خود بخود حل ہوجائیں گی۔ اس سلسلے میں ہم نے کافی لوگوں کو یہاں بلایا جن میں لیڈر اور مختلف سیاسی وسماجی جماعتوں کے لوگ شامل تھے لیکن ہمارا کوئی مسئلہ حل نہ ہوسکا۔

ہم نے یہ کام ایک جماعت کی صورت میں کیے تھے جس کے صدر جناب لال دین تھے۔ اس جماعت کی وجہ سے دوسری برادریوں سے اختلاف بھی پیدا ہوئے، اس کے نتیجے میں دوسری جماعت بھی بنی جس کے صدر جناب اللہ رکھا صاحب تھے۔ ان دونوں جماعتوں میں لڑائی جھگڑے بھی ہوئے اور کام بھی چلتا رہا۔ ہم نے اسی تنظیم کے ذریعے بہت کام کیے جن میں سب سے پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ لوگوں کے راشن کارڈز بنوائے۔ یہ سارے کام سی گروپ کی محلہ کمیٹی کے لوگ کیا کرتے تھے اور یہ رجسٹرڈ تنظیم بن گئی۔ اس تنظیم کے ذریعے تمام لڑائی جھگڑے جو ہوا کرتے تھے حل کیے جاتے تھے اور پولیس کو موقع نہیں ملتا تھا کہ وہ یہاں آکر مداخلت کرے۔ اس کے علاوہ ہم نے ایک اور تنظیم کی بنیاد رکھی جو طالب علموں کے لیے تھی اور یہ تقریباً ١٩٦٦ میں قائم کی گئی۔ اس کے علاوہ ہم نے کمیونٹی سنٹر کے ذریعے نرسری، سلائی سنٹر اور ڈسپنسری کھولی۔ یہ کام ہم نے مسٹر ٹیکسٹر کے ساتھ مل کر کیا جن کا تعلق کیتھولک سوشل سروسز سے تھا۔ دوسرے لڑکے لڑکیوں کی طرح میں نے بھی سوشل ورک کی ٹریننگ لی، اس میں شامل لوگوں نے ہم سے کہا، آپ مکانات نہ بنائیں کیوں کہ جب لیز ہو گی تو مشکل پیش آئے گی۔ لیکن موسم کے لحاظ سے اور دوسری مشکلات کے پیش نظر کچے مکانات رہنے کے قابل نہیں تھے، بارش وغیرہ میں بہت نقصان ہوتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ بھٹو صاحب نے بیرون ملک جانے کا راستا کھول دیا تو یہاں کے لوگ بیرون ملک جانے لگے اور وہاں سے پیسہ بھیجا جس سے مختلف لوگوں نے اپنے گھر بنائے۔ اُس زمانے میں لوگ تعلیم سے زیادہ ناآشنا تھے اور ان کے پاس کوئی ہنر نہیں تھا۔ زیادہ تر لوگ کے ایم سی میں سینیٹری ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ تھے، لیکن آج کل بہت سے نوجوان ڈرائیونگ اور سلائی کے پیشے سے وابستگی اختیار کیے ہوئے ہیں۔

عیسیٰ نگری کی تنظیم کے علاوہ ایک اور تنظیم ہم نے سارے کراچی کے لیے بنائی جو کہ کرسچین ویلفیئر آرگنائزیشن تھی۔ اس میں تیرہ دوسری تنظیمیں شامل تھیں جن کا تعلق سلاٹر ہاؤس، ناظم آباد، لیاقت آباد اور دوسرے علاقوں سے تھا۔ اس وقت کے ایم سی میں لوکل باڈی کے الیکشن ہونے والے تھے لہذا ہم نے لوگوں سے کہا کہ ہم لوگوں کو اپنا آدمی کھڑا کرنا چاہیے اور جو الیکشن لڑنا چاہتا ہے وہ سامنے آئے۔ لیکن کسی نے ہماری بات نہ مانی۔ صرف جوزف گل تھے۔ اس نے الیکشن میں کھڑے ہونے کی

خواہش کا اظہار کیا جو ہم نے قبول کر لی۔ لہٰذا جب وہ الیکشن جیت گیا تو اس نے عیسیٰ نگری کی ترقی کے لیے جو سب سے پہلا کام کیا وہ پانی کا تھا۔

باہر سے لوگوں کو بلوا کر کمیونٹی سنٹر میں جلسے کیا کرتے تھے۔ تو ہوا یہ کہ سی ایس ایس والوں سے ہمارے اختلافات ہو گئے جس کے نتیجے میں انھوں نے ہمیں جگہ دینی بند کر دی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم سیاست میں نہ آئیں۔ لیکن جب تک ہم سیاست میں نہ آتے ہم ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ہمیں سیاسی لوگوں کو بلانا پڑا۔ اس زمانے میں سی ایس ایس والوں کا ایک تعلیم یافتہ سوشل ورکر ہوا کرتا تھا جس کے انڈر تمام کام ہوتے تھے اور اس وقت یہ مائیکل جاوید ان کے ساتھ کام کرتا تھا اور پڑھتا بھی تھا، جی ہاں، یہی ایم پی اے مائیکل جاوید۔ اس نے ہمارے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس وقت ہم ایک رسالہ بھی نکالتے تھے۔ یہ لوگ نام کے اس رسالے کا ایڈیٹر مائیکل جاوید ہوا کرتا تھا۔ اسسٹنٹ کے طور پر میرا نام آتا تھا۔ رسالے کا سارا کام میرے ہاتھوں سے ہوتا تھا اور اس کی تقسیم وغیرہ مائیکل جاوید کے ذمے تھی۔ یہ رسالہ تقریباً ڈیڑھ سال تک چلا۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ اس کا سارا رکارڈ میں نے غصے میں جلا دیا تھا۔ اس رسالے سے مائیکل جاوید کو خوب فائدہ ہوا۔ بند اس لیے ہو گیا کہ رسالے کے لیے فنڈ نہیں تھا۔ وہ روپیہ کہاں گیا، یہ مجھے نہیں معلوم۔

چھوڑیں جی اس بات کو۔ بتانا میں یہ چاہ رہا تھا کہ اس علاقے کا نام عیسیٰ نگری کیسے رکھا گیا۔ یہاں ہمارے چودھری غلام تھے جو اب فوت ہو چکے ہیں۔ ہوا یہ کہ گلی نمبر ۱ میں پیر بخاری کی طرف بلوچوں نے یہاں آ کر تندور اور ہوٹل کھولا جسے ہمارے لوگوں نے پسند نہیں کیا اس لیے کہ وہ لوگ باہر سے آئے تھے۔ شام کو چودھری غلام مسیح اور یوسف مسیح چوپال میں بیٹھے تھے جو کہ موجودہ کیتھولک چرچ کی جگہ پر کھلی زمین تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا اور پھر یہ لوگ تنگ کریں گے، تو وہاں فیصلہ ہوا کہ جو کوئی ان کے ہوٹل سے خریداری کرے گا اسے ۵۰ روپیہ جرمانہ ہو گا اور ۵۰ جوتے مارے جائیں گے۔ اس فیصلے پر لوگوں نے متفقہ طور پر عمل کیا اور تین چار دن بعد ہوٹل والے یہاں سے چلے گئے تو چوتھے دن ہم شام کو چودھری غلام کو لے کر آئے۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ لوگوں نے ان کے فیصلے پر عمل کیا ہے۔ ان کے منہ سے اچانک نکلا کہ ہم عیسائی ہیں اور یہ عیسیٰ نگری ہے، سو اس دن سے ہم نے اس کا نام عیسیٰ نگری رکھ دیا۔ اس سے پہلے چوں کہ ہم لوگ لیاقت بستی سے آئے تھے اس لیے عام طور پر لوگ اسے بھی لیاقت بستی کہنے لگے تھے۔ وہاں سے ہم لوگ اس لیے اٹھ گئے تھے کہ وہ جگہ گورنمنٹ کو پریس کے لیے درکار تھی اور اس وقت مہاجرین کی آبادکاری کا سلسلہ بھی تھا۔ ایوب خان صاحب نے لانڈھی میں مکان بنوائے تھے اور وہاں مہاجرین کو آباد کیا جا رہا تھا۔ ہماری کوشش تھی، اس میں میرے والد دولت مسیح اور حاکم مسیح، اور لوگ بھی شامل تھے، انھوں نے بی ڈی ممبر جو تھے، نام مجھے یاد نہیں، ان کے تھرو ہمارے بزرگوں کا پولیس سے رابطہ ہوا تو بی ڈی ممبر نے کوشش کی کہ ان لوگوں کا بھی کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ تو ان کی کوششوں سے ہمارے لیے بھی لانڈھی میں مکان منظور ہوئے۔ جب بزرگوں نے اس کی

اطلاع لوگوں کو دی تو لوگوں نے کہا ہم وہاں نہیں جائیں گے، وہ بہت دور ہے، قریب ہی کوئی جگہ مل جائے تو بہتر ہے۔ بی ڈی ممبر اور تھانیدار نے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ کوئی اور جگہ دیکھ لیں، ہم آپ کو وہاں بٹھا دیں گے۔ یہاں ہمارے آنے پر آس پاس کے گوٹھ میں سندھیوں نے مخالفت کی۔ لیکن دوسرے دن ہم لوگ لیاقت بستی سے جو پیر الٰہی بخش کالونی کے قریب تھی، یہاں آکر بیٹھ گئے۔ پھر آہستہ آہستہ یہاں آباد ہو گئے۔

اُس وقت سب کچھ ہم لوگ کیا کرتے تھے۔ میں جنرل سیکرٹری تھا، ایک صدر تھا۔ اس وقت لوگ ہماری بات مانتے تھے، ہماری عزت کرتے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ وہ تو کام میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی ہمارے لیے کام کرے۔ تو یہ کام ہم نے کیے اور میرے پاس کافی ریکارڈ موجود ہے۔ گورنمنٹ یا تھانے کی طرف سے کوئی چودھراہٹ نہیں تھی۔ بلکہ یہ ہماری خود ساختہ تھی۔ جو کہ ہمارا سسٹم پنجاب میں ہے کہ زمیں دار کو چودھری کہتے ہیں، تو یہاں بھی سب کھاتے پیتے لوگ چاہتے تھے کہ ان کو بھی چودھری کہا جائے، لیکن ایسا نہیں تھا۔ جو کام مسائل کے حوالے سے چودھریوں کے کرنے کے تھے وہ لڑکوں نے کیے۔ بیس پچیس سال ہم لوگوں کی طرف دیکھتے رہے، چودھری لوگوں نے ہمیں صرف نقصان دیا ہے۔ بڑی مشکل سے چودھریوں نے ہمیں قبول کیا اور کام کرنے دیا۔ کام نوجوان کرتے تھے اور مشورہ ان سے لیتے تھے بلکہ ہم ان کو باقاعدہ رپورٹ دیتے تھے کہ ہم نے یہ کیا ہے، اتنا چندہ جمع ہوا ہے۔

پچھلے بیس پچیس سال میں جو ہم نے محنتیں کی ہیں اور کوششیں کی ہیں تو اس دوران ہم نے سب کو آزمایا ہے، لیکن مسائل حل نہ ہوئے تو پھر ہمیں یہ سمجھ میں آئی کہ جس مجلس میں ایسا آدمی نہ ہو وہاں بات اپنی نہیں ہوتی۔ تو پھر ہمارے ذہن میں آیا کہ یہاں سے لیڈرشپ لائی جائے اور یہاں سے ایک نمائندہ کے ایم سی میں ہو یا ایم پی اے لایا جائے۔ اس وقت ہمارا کونسلر اقبال لال تھا جس کا تعلق دوسرے علاقے سے تھا۔ اقبال لال سے میری بات ہوئی تو اس نے مخالفت کی کہ ہم اپنا آدمی کھڑا کریں، لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے کچھ ایسی باتیں بھی کیں جس سے ہمیں غیرت آئی اور غصہ بھی آیا، تو میں نے اپنے لڑکوں سے اسی کمرے میں بیٹھ کر پروگرام بنایا۔ سب سے پہلے میں نے اسلم سے کہا آپ کونسلر کے لیے تیار ہوں، تو اس نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد مقصود گوہر سے کہا کہ آپ الیکشن لڑیں، کیوں کہ یہ لڑکے پڑھے لکھے تھے، تو انھوں نے بھی انکار کر دیا۔ پھر نیکسٹر سے کہا گیا، اس نے بھی انکار کر دیا۔ تو پھر میں نے انھیں شرم دلانے کے لیے کہا کہ میں کھڑا ہو جاتا ہوں، تو کہنے لگے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں نے کہا شرم کرو، میں بوڑھا آدمی ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ میں ایک نام اور پیش کرتا ہوں۔ آپ متفق ہو کر اس کی منظوری دیں۔ پھر میں نے سلیم کھوکھر کا نام دیا، تو انھوں نے کہا ٹھیک ہے۔ اور پھر ہم نے ڈنا بجا کر لوگوں کو گلی نمبر ۶ میں رات گھر میں جمع کیا اور لوگوں کو بتایا کہ ہماری جماعت کا فیصلہ ہے کہ آئندہ الیکشن میں سلیم کھوکھر کو کونسلر کے لیے کھڑا کیا جائے گا، تو لوگوں نے اس

کو قبول کیا۔ پھر ہم نے ووٹ سارے شروع کر دیے اور دوسرے علاقوں مثلاً سولجر بازار میں بھی گئے۔ سلیم کھوکھر نے الیکشن لڑا اور کامیاب ہوئے۔ آج وہ ایم پی اے ہیں۔ سلیم کھوکھر کی کامیابی کے بعد وہ لوگ جو ہمیں ڈراتے تھے انہوں نے یہ بھی دیکھا اور علاقے میں ترقیاتی کام ہونے لگے۔ یہاں پانی آیا، گٹر بنے، بجلی آئی، گیس آئی۔ جب گورنمنٹ دیکھتی ہے کہ بستی لیڈر ہو گئی تو اس قسم کی ایجنسیاں خود بخود آجاتی ہیں اور منتخب نمائندے سے رابطہ بھی ہو جاتا ہے۔

میں تعلیم کی بات بھی کرنا چاہتا ہوں۔ آرگنائزیشن کے پلیٹ فارم سے ہم نے یہاں ایک پرائمری اسکول کھولا جو گلی نمبر ۴ کے برات گھر میں تھا۔ اس وقت ہمارے پاس دریاں بھی نہیں تھیں۔ اُس وقت جو ٹیچر رکھا گیا وہ مائیکل جاوید تھا لیکن جب ایک اور تنظیم بن گئی تو اس نے ہم پر کیس کر دیا۔ ہم یہ کیس لڑے جس کی وجہ سے پڑھائی کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک دفعہ ہم سیر و تفریح کے لیے بچوں کو چڑیا گھر بھی لے کر گئے۔ وہاں پر چھ سال کا ایک بچہ گم ہو گیا۔ باوجود کوشش کے وہ ہمیں نہ مل سکا۔ دوسرے دن ایک پٹھان اس کو ہمارے پاس لا کر چھوڑ گیا۔

اسکول دوبارہ اس طرح کھلے کہ یہاں صرف ایک ہی مشن تھا، کیتھولک مشن۔ ان کی خواہش تھی کہ انہیں وہ جگہ مل جائے جس پر اس وقت چرچ آف پاکستان ہے لیکن وہ نہیں مل سکا۔ کیتھولک مشن میں اس وقت فادر ریگس ہوا کرتے تھے، انہوں نے یہاں دو پلاٹ لیے۔ یہ دو یہاں مشن ہو گئے۔ اس وقت جو چرچ آف پاکستان تھا وہ میتھوڈسٹ مشن تھا، اس نے یہاں ایک اسکول کھولا، وہ ایسے کہ پادری واکر کی جو بیوی تھی وہ تعلیم بالغاں کا سلسلہ شروع کیے ہوئے تھی تو اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے پرائمری اسکول بھی شروع کیا۔ جب یہ ہوا تو میں اس وقت کیتھولک چرچ کمیٹی کا جنرل سیکرٹری تھا۔ اس وقت ہم نے مسٹر جشک لال کو رکھا اور سمس انتھنی کے والد صاحب تھے، انہوں نے اسکول کھول لیا۔ یہاں سب سے پہلے دریاں ڈالی گئیں اور سب سے پہلے جو استاد تھے وہ ماسٹر یوسف تھے اور ماسٹر جران تھے، ان کی بیوی تھیں۔ اس طرح ان اسکولوں نے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر پادری واکر سے میتھوڈسٹ والوں سے اختلاف ہو گئے تو انہوں نے نیا چرچ بنالیا اور اس کو یوتھی چرچ کا نام دیا۔ اس میں اسکول بھی تھا۔ اس طرح سیونتھ ڈے والوں نے اسکول کھول لیا اور ان کے اسکول کا ایک آدمی تھا اس نے ان کا اسکول چھوڑ کر اپنا اسکول کھول لیا۔ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا۔ اب میں عوامی چرچ میں اپنا اسکول چلا رہا ہوں۔ وہاں چپڑاسی سے لے کر ہیڈ ماسٹر تک سارے کام کرتا ہوں۔

میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ خدا نے مجھے خاص طور پر عیسیٰ نگری کی خدمت کے لیے پیدا کیا ورنہ میں کسی اور جگہ بھی جا سکتا تھا، تو یہاں پر ایک عجیب بات ہے کہ میں بزرگوں کی تنظیم کا بھی جنرل سیکرٹری رہا ہوں، نوجوانوں کی تنظیم کا بھی، لڑکیوں اور خواتین کی تنظیم کا بھی جنرل سیکرٹری رہا ہوں۔ ہر قسم کی تنظیم کی میں نے نمائندگی کی ہے۔ اس وقت کے نوجوان کے ذہن میں تفکرات تھے۔ اس وجہ سے بھی کہ اسے پانی دور دراز علاقوں سے لانا پڑتا تھا۔ لیکن آج کا نوجوان اٹھ کر سوچ بچار کر نا پسند

نہیں کرتا کہ موٹر سے پانی بھر لیا جائے۔ وہ سہل پسند ہو گیا ہے۔ میں اس کو یوں دیکھتا ہوں کہ وہ سوچتے ہیں ہمارے بزرگوں نے بہت کچھ کر دیا ہے۔ اس سے گیپ پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں ہماری غلطی ہے۔ ہم نے یہ کیا کہ جب ہمارا کونسلر بن گیا، ایم پی اے بن گیا، تو ہم یہ سمجھنے لگ گئے کہ ہمارے تمام مسائل حل ہو گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ یہاں کی تنظیم پاورفل ہوتی۔ جب تک ایک مضبوط تنظیم نہ ہو گی ہمارے مسائل حل نہ ہوں گے۔ ایم پی اے ہمارے لیے آرڈر لے سکتا ہے، پیسے لے سکتا ہے، گٹر لائن لے سکتا ہے، لیکن وہ اس کو سنبھال نہیں سکتا۔ اس کو صرف علاقے کی تنظیم سنبھال سکتی ہے۔

آج کل کے نوجوانوں میں سب سے پہلی برائی تو یہ ہے کہ جو لوگ کے ایم سی میں ملازم تھے وہ یا تو ریٹائر ہو گئے یا باہر چلے گئے۔ جو ملازمت خالی ہوئی اس پر ایسے بیٹوں کو لگا دیا ہے۔ ان کو تنخواہ تو ملتی ہے، چاہے وہ کام کریں یا نہ کریں۔ تو جب کوئی فارغ ہو گا تو اس کا ذہن خالی رہے گا۔ کہتے ہیں خالی ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ ان کے پاس جو پیسے ہوتے تھے تو انھوں نے ڈرگز کا استعمال شروع کر دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی اَوروں نے بھی یہ کام شروع کر دیا۔ پچھلے چار پانچ سال میں ڈرگ کلچر حاوی ہو گیا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں اشعار بھی لکھے ہیں۔ ایک نظم آپ کو سناتا ہوں۔ میں پنجابی میں بھی شاعری کرتا ہوں اور اردو میں بھی۔ شریف میرا نام ہے اور نور میرا تخلص ہے۔

> انسانی زندگی کے لیے بنیادی سہولیات آج بھی عیسیٰ نگری میں محدود ہیں۔ اور یہ محدود سہولتیں بھی بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد حاصل ہوئی ہیں۔ ان سہولتوں کے حصول اور علاقے کی ترقی کے بارے میں لیاقت مسور نے، جو سیاسی اور سماجی کاموں میں فعال رہے ہیں، انٹرویو کے دوران بعض تفصیلات بتائیں۔

ماضی میں عیسیٰ نگری میں جھونپڑیاں تھیں، اس کے بعد لوگوں میں تھوڑا شعور پیدا ہوا اور اس شعور سے یہ ہوا کہ لوگوں نے محسوس کیا یہاں مکان ہونے چاہییں، جھونپڑیاں اچھی نہیں ہیں، محفوظ نہیں ہیں۔ لوگوں نے کچے مکان مٹی سے گارے سے بنائے۔ یہ لوگوں کی اپنی ایک سوچ تھی۔ چودھری سسٹم یہاں پر رائج تھا اور چودھریوں کی پنچایت ہوتی تھی، وہی فیصلہ کرتے تھے۔ لوگوں نے پھر اس کے بارے میں بھی ۷۰ء کے بعد محسوس کیا۔

جہاں تک آپ کا سوال ہے کہ یہ شعور کیسے آیا، تو بات یہ ہے کہ جب لوگ مل کر بیٹھتے ہیں، گفتگو کرتے ہیں، باتیں نکلتی ہیں تو سوچ پیدا ہوتی ہے اور شعور آتا ہے۔ ہم لوگ تو نہیں، ہمارے بزرگ جنہیں کہہ لیں، بیٹھتے تھے۔ آپس کی باتوں کا فیصلہ تھانے کے بجائے پنچایت میں ہو جاتا تھا۔ جب ایک جگہ لوگ بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے لوگ باہر زیادہ کام کرتے تھے، اپنا بس کسی کا

نہیں تھا۔ تو ان کو احساس ہوا کہ لوگ اچھے مکانوں میں رہ رہے ہیں، ہم جھونپڑیوں میں ہیں تو اس کے لیے ہمیں بھی کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے، اور مل کر کرنا چاہیے۔ تو سوسائٹیز تو ہر دور میں رہی ہیں۔ مسلمانوں کی بھی رہی ہیں اور یہ کلکٹ، ڈیفنس کی بھی رہی ہیں۔ تو لوگوں کا اکٹھ جو ہے ہر دور میں، ہر جگہ موجود رہا ہے۔ تو اس وجہ سے جب یہ لوگ بھی بیٹھتے تھے تو اِدھر اُدھر کی کہانیوں کے بعد، یا کہانیوں سے پہلے، یہ اپنے مسائل بھی ڈسکس کرتے تھے اور مسائل کے حل کے لیے بھی گفتگو کر لیتے تھے۔ اس زمانے میں جو مسائل تھے، ان میں تین مسائل اہم تھے۔ پانی نہیں تھا، گٹر لائن نہیں تھی اور بجلی نہیں تھی۔ اس وقت پانی کا مسئلہ حل تو نہیں ہوا، لوگ دور سے پانی لاتے تھے، مستقل بنیادوں پر یہ مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ایک نل تھا جس پر پوری عیسیٰ نگری گزارا کر رہی تھی۔ جبکہ آبادی بھی کم تھی۔ پانی بھی انھوں نے توڑ کر لیا تھا۔ پائپ لائن گزر رہی تھی، لوگوں کو ضرورت تھی اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ لوگوں نے پائپ لائن توڑی اور وہاں سے نل لیا، پورے علاقے کے لوگوں کو پانی ملتا تھا۔ اس کے بعد لوگوں کے لیے سیوریج لائن کا مسئلہ اہم تھا۔ لوگوں نے گھروں کے سامنے کنویں کھدوائے اور سارا فضلہ، پانی وغیرہ اس میں گرتا تھا۔ سال چھ مہینے بعد اس کو ختم کر دیتے تھے یا خالی کروا لیتے تھے۔ شارٹ ٹرم میں کام کروا لیتے تھے۔

اس کے بعد میں دوسرے دور کی بات کروں گا۔ سن ۷۰ کے بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ مکان بھی ہیں اور یہ کنواں سسٹم اچھا نہیں ہے، یہ بھر جاتا ہے اور مستقل نہیں ہے۔ سیوریج لائن ڈالی گئی اور لوگوں نے اپنے طور پر پانی بھی جاری کروایا۔ اس سلسلے میں جو لوگ سیاسی طور پر کام کر رہے تھے ان کا کیا کنٹری بیوشن تھا تو میرے نظریے میں صحیح سیاست شروع ہوئی ہے ۱۹۸۵ کے بعد۔ اس سے پہلے سیاست ہوتی رہی ہے، سیاسی شخصیات ہوتی رہی ہیں، ۸۵ سے اس لیے شروع ہوئی ہے کہ ہمیں جداگانہ انتخاب ملے۔ جب جداگانہ انتخاب ملتے ہیں تو، ظاہر ہے اب آپ اور میں بھی سیاست پر بات کر رہے ہیں اور جداگانہ انتخاب نہیں ہوتے تو ہمیں بھی کسی مسلمان ایم پی اے، یا ایم این اے یا کونسلر کے پاس جانا پڑتا۔ اور باہر جا کر بیٹھنا پڑتا۔ آج کم از کم یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے ایم پی اے، ایم این اے کے پاس بیٹھتے ہیں، ان کو بات بھی سنا سکتے ہیں اور سن بھی سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ میں جداگانہ کی حمایت اس لیے کر رہا ہوں۔ اس وقت سیاسی شخصیت اسلم مارٹن تھے اور مقصود فرار۔ میرے نزدیک ان کی کوئی خدمات ایسی نہیں ہیں جو لوگوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی ہوں۔

سیاست کی وجہ سے یا سماجی سرگرمیوں کی وجہ سے لوگوں کی زندگی میں تبدیلی آئی تو سماجی سرگرمیوں سے چینجنگ آئی۔ شروع میں ہم نے ایک سماجی تنظیم بنائی تھی جس کا میں فاؤنڈنگ ممبر ہوں۔ اس کا نام تھا، انجمن مسیحی نوجوانانِ کراچی۔ انجمن نے یہاں کی نوجوان نسل کو شعور دیا ہے۔ ہر کام میں، یعنی سیاست میں، کھیل میں، ادب وغیرہ میں۔ انجمن نے یہ کیا، سیاسی طور پر انجمن نے یہ کام کیا کہ بلدیاتی الیکشن تو شروع ہو چکے تھے ۸۰ کے بعد، تو پہلے دوسرے علاقوں کے کونسلر ہوا کرتے تھے تو ۱۹۸۷ میں انجمن کے پلیٹ فارم سے ہم نے سلیم کھوکھر کو نامزد کیا، سلیم کھوکھر جیتا۔ اس کے بعد

لوگوں کی زندگی میں تو نہیں، عیسیٰ نگری کی زندگی میں یہ تبدیلی آئی کہ عیسیٰ نگری کو لیبرلی سلیم کھوکھر نے آنے کے بعد اور پانی بجلی، یہ وہ حاصل ہوئے۔ تو سیاسی سرگرمی سے ترقیاتی کام ہوئے۔

۷۰ سے ۸۰ تک عیسیٰ نگری کا ایک دور ہے۔ اس دور میں یوتھ کے حوالے سے بھی ایکٹیویٹیز تھیں۔ اس زمانے میں یوتھ ڈرامے کرتی تھی، زیادہ تر مذہبی تھے لیکن سوشل کم ہوا کرتے تھے۔ پانچ سال میں ایک ہو گیا۔ مذہبی ڈراموں میں بھی سماجی پہلو سے کچھ نہ کچھ پیغام مل جایا کرتا تھا۔ اس دور میں اسلم مارٹن، شمس اور مقصود قرار ڈراموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ یہ ایکٹیویٹی سال میں ایک دو بار ہوا کرتی تھی، مذہبی تہوار کے وقت۔ عام دنوں میں نوجوان یہ کیا کرتے تھے کہ امتحاں کے دن نزدیک آیا کرتے تو کیتھولک چرچ میں کلاسیں لے لیا کرتے، کمیونٹی سنٹر جو گلی نمبر ۶ میں ہے اور جس پر اب ایک بااثر شخص کا ناجائز قبضہ ہے، وہ عیسیٰ نگری کے نوجوانوں کے پاس تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو مجھے یاد ہے کہ یہاں کے جو پڑھے لکھے لڑکے تھے، وہ چھوٹے لڑکوں کو، مطلب یہ کہ ساتویں آٹھویں کے لڑکے بلکہ پرائمری سے لے کر دسویں تک، ان کو وہاں چھٹیوں میں پڑھاتے تھے۔ ایک ہیلتھ کلب بھی تھا اسی کمیونٹی سنٹر میں جس پر ناجائز قبضہ ہے۔

میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ سیاست کی وجہ سے تمام ترقی ہوئی ہے۔ سماج جو ہے، لوگوں کا اکٹھ، یہ اہم چیز تھی۔ سیاست میں آنے کے بعد یہ ہوا ہے کہ تیزی آئی ہے کاموں میں۔ مطلب یہ کہ کام تو پہلے بھی ہو رہے تھے۔ پانی تو پہلے بھی آ گیا تھا، وہ گلیوں میں تھا، سلیم کھوکھر کے جیتنے کے بعد گھروں میں بھی آ گیا۔ مطلب یہ کہ شروع سے ابھی تک ترقی کا عمل جاری رہا ہے اور بعد میں آنے والے لوگوں نے اسے آگے بڑھایا ہے۔

اس دور میں خواتین کا کیا کردار رہا ہے، یہ مشکل سوال ہے۔ خواتین کے لیے کسی نے باقاعدہ کوشش نہیں کی، نہ ہم نے اس سلسلے میں کوئی کوشش کی ہے۔ ہیلتھ سنٹر تھا تو اس کے بعد سے ہمارا رابطہ قائم ہوا۔ جب سنٹر تھا تو خواتین ٹائم بھی دیتی تھیں، میٹنگ میں بھی آتی تھیں۔ آج بلا کر تو دیکھ لیں۔ دس کو بلائیں گے تو دو آئیں گی۔ ہمارا معاشرہ خواتین کو اجازت نہیں دیتا۔ وہ ایسی مشکلات پیش کریں گی کہ میرا بچہ بیمار تھا، خاوند نے اجازت نہیں دی۔ خواتین کام تو کرنا چاہتی تھیں۔ ۷۰ میں تو لڑکیاں یوتھ میں شامل تھیں، ۸۰ میں آ کر پھر کٹ گئی ہیں۔ بھرپور تو نہیں کہہ سکتے لیکن ۷۰ میں لڑکیاں سوشل کاموں میں شامل رہی ہیں۔ اب خواتین موجود ہیں، کام بھی کرنا چاہتی ہیں، آنا چاہتی ہیں، لیکن اب پلیٹ فارم نہیں ہے۔ اب ایک تنظیم بنائی ہے جس کا میں صدر ہوں، اس میں خواتین ممبر بھی ہیں، وہ بھی ہمارے ساتھ کام کریں گی۔ ہماری تنظیم ہیلتھ اور ایجوکیشن کے لیے، منشیات کے خلاف کام کر رہی ہے اور انسانی حقوق کے لیے کام کر رہی ہے۔

جیسے جیسے عیسیٰ نگری میں ترقی ہوئی ہے، شہر بھی ایسی ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ پہلے کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ کچی بستی میں رہنے کے حوالے سے یا پیشے کے حوالے سے لوگ تعصب یا تنگ

نظری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ عام سطح پر، محلوں کی سطح پر تعصب رہا ہے، لیکن اب کم ہو گیا ہے۔ اس وقت شاید ایجوکیشن کم تھی اور پیشے کے حوالے سے لوگ تنگ کیا کرتے تھے۔ ہمارے بزرگوں نے جو میونسپل کارپوریشن میں ملازم تھے، انھوں نے کوشش کی ہے کہ اپنے بیٹوں کو تعلیم دلوائیں۔ جو تعلیم نہیں حاصل کر سکے انھوں نے کوشش کی، کوئی ڈرائیور بن گیا، کوئی مکینک بن گیا، کسی نے سبزی کا ٹھیلا لگا لیا، اس طرح پیشے بدلنے کی کوشش کی۔ اب اس طرح کے الفاظ کہ بھنگی وغیرہ کم ہیں۔ اب جو یہ ڈائریکٹ تعصب آ گیا ہے کہ آپ نوکری کر رہے ہیں اور مسیحی کوئی دیتیں ہے تو لوگ اس سے جلنے لگتے ہیں کہ یہ ترقی کیوں کر رہا ہے، یہ ہے تو بھنگی۔ پچھلے دنوں مائیکل جاوید کے ساتھ ہوا تھا کہ اس نے کچھ دیر کے لیے سندھ اسمبلی کے اسپیکر کے بجائے صدارت کی تو پرچم 'اخبار میں سرخی لگ گئی کہ بھنگی نے صدارت کی۔ مائیکل جاوید کچھ بھی ہیں، لیکن وہ مسیحیوں کے نمائندے ہیں، ووٹ لے کر کامیاب ہوئے ہیں، تو سب کو شاک لگا کہ یہ لوگ ہمارے نمائندے کے ساتھ ایسی حرکت کر سکتے ہیں۔ اگر پڑھے لکھے لوگوں کی ایسی سوچ ہے تو عام لوگوں کے ساتھ یہ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ اس تعصب سے نجات کے لیے ہمیں تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ ہمارے نوجوان انٹیلی جنٹ ہوں گے تو ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، اس کام سے نکل سکتے ہیں۔ جب تعلیم آتی ہے تو شعور آتا ہے، شعور آتا ہے تو پھر بندہ ترقی کی سوچتا ہے اور جب ترقی کی سوچتا ہے تو اپنے حالات بدلنے کی سوچتا ہے۔ علاقے کے حالات بدلتا ہے، ملک کے حالات بدلتا ہے۔

ترقی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ علاقے میں مسائل بدل گئے ہیں۔ ۶۴ سے ۹۵ تک بہت سفر کیا۔ آج ہمارے پاس سب کچھ ہے، لیبر ہے، بجلی ہے، پانی ہے لیکن ایک چیز کی میں کمی محسوس کر رہا ہے اور اس پر حیرت بھی ہے اور افسوس بھی ہے کہ پہلے جو اتحاد تھا عیسیٰ نگری کے نوجوانوں میں اور بزرگوں میں اور علاقے کے لوگوں میں، اس کی کمی میں شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ اب نہ ہی ایک پلیٹ فارم ہے۔ دو ایم پی اے ہیں، دونوں کی الگ الگ پارٹی ہے، دونوں کے الگ الگ بندے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جو اپنے فائدے کے لیے کبھی مائیکل کے پاس چلے جاتے ہیں، کبھی سلیم کے پاس آ جاتے ہیں۔ باقی ہماری تنظیم بھی کام کر رہی ہے، ایک پلیٹ فارم ہے ہمارے پاس اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ لوگوں کو پہلے کی طرح، جو پہلے ہماری انجمن نے شعور دیا تھا لوگوں کو تو آج ہم اس ترقی تک پہنچے، ہم پھر کوشش کر رہے ہیں ایسے لوگوں کو ساتھ ملا رہے ہیں تاکہ ہم پھر اسی ڈگر پر آ جائیں۔

اتحاد اس لیے متاثر ہوا کہ پارٹی بن گئی اور جہاں طاقت آتی ہے وہاں پارٹیشن ہوتی ہے۔ آپ دیکھیں کہ ایم کیو ایم کی مثال ہے۔ جب حقیقی والوں کے ساتھ فوج آئی، انہیں فوج کی طاقت ملی تو وہ علیحدہ ہو گئے۔ یہی سلیم کھوکھر کے ساتھ ہوا۔ اس کو انجمن نے یہاں تک پہنچایا۔ اس کے پاس جب طاقت آئی تو اس نے ساتھیوں کو اگنور کیا۔ ساتھیوں نے دیکھا کہ ہمیں اگنور کیا جا رہا ہے مسلسل تو ساتھی علیحدہ ہو گئے۔ اتحاد کا یہ فقدان طاقت کے آنے سے ہوا۔ پھر یہ ہوا کہ دو سیٹیں آ گئیں اور دو

سیٹوں سے دو پارٹیاں بن گئیں۔

اتحاد کے علاوہ اور بھی مسائل آئے ہیں۔ ہیروئن کا ایک بھرپور دور گزرا ہے جس کی آج بھی علامات باقی ہیں۔ لوگوں نے خاصی مقدار میں ہیروئن بیچی، یہاں پر ایک لائن لگی ہوتی تھی ہیروئن بیچنے والوں کی اور ہیروئن خریدنے والوں کی۔ عیسیٰ نگری میں دو سو کے قریب لوگ ہوں گے جو ہیروئن دیتے ہیں۔ ان میں چرس اور کچی دینے والے بھی ہیں۔ ٹھکیرے سے کچی ساتے ہیں اور تین لوگ پوری کچی پی جاتے ہیں۔ ہماری تنظیم اس کے خلاف بھی کام کر رہی ہے۔ ہم ایک ٹورنامنٹ کروا رہے ہیں نوجوانوں کو نشے سے دور رکھنے کے لیے۔ نوجوان بڑھ چڑھ کر تیاری کر رہے ہیں، پریکٹس کر رہے ہیں اور دوسرے علاقوں سے بھی فٹ بال کی ٹیمیں آئیں گی۔ جب ٹورنامنٹ ہوگا تو ہم ایک صحت مند سرگرمی دیں گے نوجوانوں کو۔ ایسی سرگرمیاں ہوں گی تو لوگ لازمی طور پر یہ ہیروئن، شراب، پان، سگریٹ وغیرہ کو اچھا نہیں سمجھیں گے۔

میں نوجوانوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں، اپنے مسیحی نوجوانوں کو، کہ وہ آگے آئیں۔ اب ہماری قوم کے نوجوان باشعور ہیں، کافی ترقی کی ہے انھوں نے۔ اب وہ لوگوں کو بتائیں کہ ان کے حقوق کیا ہیں، ان کے ایم پی اے ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں، ان کے ایم این اے ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں، ان کے کونسلر ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں، ملک کی بیوروکریسی پر اُن کا کتنا اختیار ہے۔ یہ بیوروکریسی پبلک سرونٹ ہے، انھیں پبلک سرونٹ بن کر رہنا چاہیے، نہ کہ ہمارے حاکم بن کر۔ یہ فریضہ نوجوانوں پر عائد ہوتا ہے کہ لوگوں میں یہ شعور عام کریں، سماجی تنظیموں سے یہ اپیل ہے کہ وہ لوگوں کو ان باتوں سے آگاہ کریں کہ جو لوگ سیاست میں ہیں ہم ان سے کس طرح کام لے سکتے ہیں اور آئندہ جب انتخابات ہوں تو ان کا احتساب کیا جائے، ان سے پوچھا جائے کہ قوم نے آپ کو مینڈیٹ دیا تھا، آپ نے قوم کے لیے کیا کیا۔ ہمیں شراب خانوں کے پرمٹ سے مطمئن نہیں کر سکتے۔ اور ہم لوکل لیڈرشپ پر قناعت نہیں کر سکتے۔ میں ان لوگوں سے بات چیت کر رہا ہوں جن کے دل دُکھے ہوئے ہیں۔

> شہر کراچی کی طرح عیسیٰ نگری بھی ایسے سماجی عمل سے گزرتی رہی ہے جس کی رفتار بظاہر آہستہ ہے لیکن جس کے نتیجے میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ عیسیٰ نگری میں کئی لوگ ایسے ہیں جو اس سماجی عمل کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے ساتھ ساتھ فعال بھی رہے ہیں۔ ان لوگوں میں بیکسٹر بھٹی کا نام بھی آتا ہے۔ بیکسٹر بھٹی نے سیاسی اور سماجی عمل اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ سیاسی اور سماجی حوالے سے جو بات ہم کر رہے ہیں، ان دونوں کا آپس

میں گہرا تعلق ہے۔ عیسیٰ نگری کا ماضی یہی تھا کہ جو لوگ یہاں آ کر بسے وہ پنجاب کا پسا ہوا طبقہ تھا۔ وہاں کے جاگیرداروں کا ستایا ہوا اور کچلا ہوا طبقہ تھا۔ جیسے ہم ذہنی پسماندگی کہہ سکتے ہیں، وہ اپنے ساتھ لائے تھے، اس کا جو اثر تھا وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ وہ خود جاگیردار تو نہیں تھے، لیکن ان کا جو مزاج تھا اس پر جاگیرداری کا اثر تھا اور یہ جو بگڑا ہوا مزاج تھا اس کی وجہ سے شروع میں یہاں کافی رکاوٹیں پیش آئیں۔ لوگ آپس میں بٹے ہوئے تھے، ایک دوسرے کی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اور باہمی اعتماد جو ہوتا ہے اس کا فقدان تھا۔

ایسے کام بھی تھے جو اس علاقے کے مفاد میں تھے لیکن اس چودھری سسٹم اور چودھراہٹ کی وجہ سے ختم ہو گئے۔ یہاں پر ایک فادر جان ڈیکرور ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے بڑی اچھی کوشش کی کہ بیرونی امداد سے اس علاقے کی اَپ لفٹ ہو جائے۔ وہ ہاؤسنگ کا ایک پروجیکٹ بھی لائے تھے یہاں پر۔ اور یہ جو کمیونٹی سنٹر ہے جس پر آج کل ایک ایم پی اے صاحب کا قبضہ ہے، اس کو اسٹور سا دیا گودام ٹائپ کا کہ سارا جو بلڈنگ میٹیریل ہو گا وہاں پر جمع کیا جائے گا اور وہ کمیونٹی کے استعمال میں آئے گا۔ لیکن ایسا ہوا کہ یہاں پر چودھراہٹ سسٹم جو تھا اس نے اس کو فیل کر دیا۔ کیوں کہ لوگوں نے کہا کہ عیسیٰ نگری میں فلیٹ بن گئے اور ہم کو وہاں رہنا پڑا تو ہم بکری کہاں باندھیں گے۔ کسی نے اس کو یوں سبوتاژ کرنے کی کوشش کی کہ ہم صفائی کریں گے تو کچرا نیچے والے کے گھر پر کرے گا۔ کسی نے کہا ہم بھینس کہاں پر باندھیں گے۔ تو یہ وہ چیزیں تھیں جو لوگوں نے کہیں۔ اس کے پیچھے محرکات وہی تھے کہ لوگوں کی ذہنی پسماندگی بہت تھی۔ یہ لوگ تعلیمی لحاظ سے پسماندہ تھے، معاشی لحاظ سے پسماندہ تھے، سماجی لحاظ سے پسماندہ تھے جس کی وجہ سے وہ اس پروجیکٹ کو سمجھ نہیں سکے اور ہمارا وہ پروجیکٹ چودھراہٹ کی نذر ہو گیا۔

یہ چیزیں ہمارے مشاہدے میں تھیں۔ اُس وقت ہم لوگ چھوٹے تھے اور جو لوگ ہم سے بڑے تھے یا تھوڑے بہت پڑھے ہوئے دوست تھے وہ بھی یہ دیکھتے تھے کہ پسماندگی اور بگڑے ہوئے مزاج کا آپس میں ایسا اسٹرلنک تھا کہ اس کو توڑنا بہت مشکل نظر آتا تھا اور جو یہ تھوڑے بہت سمجھ دار دوست تھے اپنا فرسٹریشن ڈراموں میں نکالتے تھے، وہ بھی کرسمس آ گیا، ایسٹر آ گیا تو مل بیٹھ کر کام کرتے تھے اور یہاں تک ان کی ایکٹویٹی ہوا کرتی تھی۔ تو اس باہمی ربط کو توڑنے میں بڑی مشکل تھی۔ لیکن میں نے عرض کیا ہے اس سارے عمل میں کچھ تو پلاننگ ہوتی ہے اور قدرتی فیکٹرز بھی ہوتے ہیں۔ تو ایسا ہوا کہ ۷۵ میں یہاں ایک واقعہ ہوا کہ کچھ ہمارے مسیحی غیر ذمے دار لوگ اور کچھ ہمارے پڑوس میں جو مسلم ہیں ان میں سے غیر ذمے دار لوگوں میں لڑائی ہوئی اور تین مسیحی نوجوان شہید ہوئے جو اس وقت عوامی چرچ میں دفن ہیں۔ اس وقت جو عیسیٰ نگری کی قیادت تھی وہ چودھراہٹ سسٹم کے پاس تھی اور وہ اس واقعے کا سامنا کرنے میں ناکام رہی۔ انھوں نے کہیں پر مفاہمت کر لی جس کا لوگوں میں ری ایکشن ہوا۔ یہ واقعہ ایسا ہے میری نظر میں جس نے اس سسٹم پر ضرب لگانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ اور یہی واقعہ تھا جس کی

وجہ سے ہم جیسے نوجوان جو تھے، یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ کم از کم ہمیں ہی آگے آنا پڑے گا اور کم از کم ہمیں ہی بدلتے ہوئے حالات میں کچھ کرنا پڑے گا۔ ہمارے چودھری جو تھے ان کا بس یہی تھا کہ بندے کو پکڑوا دیا تھانے میں، پیسے دیے، چھڑوا دیا، یا کوئی انصاف بھی کیا تو غلط طریقے سے۔ تو یہ ساری چیزیں لوگوں میں اندر ہی اندر دبی ہوئی تھیں لیکن لوگ اس قابل نہیں تھے کہ اس کو توڑتے۔ اب یہ اجتماعی مسئلہ بن گیا اور اس کے بعد جیل ہو جیل ہوا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ جو نوجوان ہمارے ساتھ ملے اس وقت، انھوں نے بہت سارے initiatives لیے کیوں کہ یہاں سماجی برائیاں، بہت زیادہ تو آپ نہیں کہہ سکتے لیکن کچھ ایسی سماجی برائیاں یہاں تھیں جن کو ختم کرنے کا بیڑا نوجوانوں نے اٹھایا۔ مثلاً جب ضیا صاحب کا دور آیا تو شہر میں فحاشی کے جتنے اڈے تھے انھوں نے ختم کیے تو وہاں سے کرپٹ لوگ بھاگے تو انھوں نے slum ایریا میں جگہ ڈھونڈنی شروع کر دی جہاں انھیں کوئی پکڑ نہ پائے۔ یہاں ہمارے نوجوانوں نے اس مسئلے پر کام کیا اور لوگوں میں اعتماد بحال ہوا۔ پیسہ لیے بغیر انھوں نے رضاکارانہ طور پر کام کیا۔ یہاں پر انھوں نے صفائی کی بھی بات کی، ایجوکیشن کی بھی بات کی، انھوں نے مختلف طور پر ایسے کام کیے کہ لوگوں کا شعور بھی بلند ہوا اور آگے چل کر انھوں نے محسوس کیا کہ ہمیں ایک تنظیم بنانی پڑے گی تاکہ اس سلسلے کو ہم مستقل جاری رکھ سکیں۔ اس طرح راہ ہموار ہوئی اور انھوں نے متفقہ پلیٹ فارم تیار کیا۔

اس پلیٹ فارم سے ہم نے حقوق کی بات کی، سیاسی شعور کے حوالے سے بات کی، کیوں کہ ایک ایک گھر سے ہی معاشرہ بنتا ہے اور معاشرے سے ملک ہوتا ہے۔ سماجی مسائل کے ساتھ ہم نے سیاسی حقوق کی بھی بات کی۔ ہمارے لوگ سمجھتے تھے کہ ہم کٹے ہوئے لوگ ہیں۔ ہم نے مین اسٹریم کی بات کی۔ اس حوالے سے ہم نے کام کیا۔ تھوڑی بہت جدوجہد کی۔ میں وہ طوائفوں والی بات آپ کو بتا رہا تھا۔ مارشل لا اتھارٹیز فیل ہو گئیں، مقامی پولیس کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔ نوجوانوں کی جدوجہد تھی کہ ہم نے اپنے علاقے سے ان کا جرائم پیشہ اڈا ختم کیا۔ ہماری تنظیم کے مقاصد یہی تھے کہ اپنے علاقے کی فلاح کے لیے اور بہبود کے لیے کام کیا جائے اور لوگوں کا شعور بلند کیا جائے۔ تو ان مقاصد میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم ناکام رہے، ہم بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو ترقی ہوئی ہے یہ ان ہی عوامل کی بدولت ہے اور ترقی کا عمل ایسا ہے کہ کبھی جامد نہیں ہوتا، بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے بہت زیادہ کیا ہے، لیکن کم از کم ماضی کے مقابلے میں بہتر کام کیا ہے۔

نوجوان جو لوگ تھے، ان کی میں نے پہلے بھی بات کی ہے، ان کا گراف بہت نیچے تھا۔ اس کے بعد ہمارا طبقہ پیدا ہوا اور ایک دور میں ہم نے جدوجہد کی۔ وہ دور تھا جدوجہد کا۔ آپ بار بار میری بات کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس میں میرا اتنا کوئی عمل دخل نہیں تھا، ایک مشترکہ جدوجہد تھی۔ جو کچھ ہم نے کیا دوستوں اور ساتھیوں کی مدد سے کیا۔ ابھی تعلیم کا گراف بہت اوپر گیا ہے، لیکن وہ جو چیز تھی،

میں ۷۷، ۷۸ کی بات کر رہا ہوں، اُس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے لوگوں نے محسوس کیا ۔ کہ دو ایم پی اے کے آنے سے ہماری جدوجہد رک گئی ہے۔ اب لوگوں کی تربیت اس طرح کی جا رہی ہے کہ ان میں جدوجہد پیدا نہ ہو۔ لوگ ان ہی کی طرف دیکھتے ہیں اور وہ بھی لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ طاقت ہم میں ہی ہے۔ لوگوں کو جب آپ یہ جا کر کہہ دیں گے کہ آپ کا کام میں کر دیتا ہوں تو آپ تو گھر جا کر سو جائیں گے۔ تو آپ تو یہ سمجھیں گے کہ ایم پی اے ہے ہمارے پاس۔ ہمارا کوئی اور کام نہیں رہا۔ نوجوان طبقہ ایک طرح سے بے عمل ہو کر رہ گیا ہے کہ ہمارے دکھوں کا مداوا ہمارے لیڈر ہی ہیں۔ جب تک یہ لیڈرشپ ہے ہمارے لیے بھی بہت مشکل ہے۔ لوگ مفادات کی توقع رکھتے ہیں۔ اب نوجوان بھی کام کرنے کے بجائے یہ سوچ کر آتے ہیں کہ جس طرح ان کو فائدے ہوئے ہیں اور پیسہ کمایا ہے، وہ بھی اس طرح کریں، تو اس کام میں بھی ایم پی اے کی وجہ سے ایک چمک دمک آ گئی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ ہمارے لیڈرز نے کوئی اچھا کام کیا ہے۔ جو کچھ پاکستان میں ہو رہا ہے، عیسیٰ نگری بھی اسی سسٹم کا حصہ ہے، چھوٹا سا حصہ۔ ہم جس طرف جا رہے ہیں تو لوگوں کی محرومیاں کسی منطقی نتیجے پر پہنچیں گی۔

> علاقے کی دوسری عورتوں کی طرح نسرین اسٹیفن کی زندگی بھی ایک مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے، ایسی جدوجہد جس کا محور اس کا گھر اور بچے ہیں۔ عیسیٰ نگری کی گلی نمبر ۶ میں رات گھر کے سامنے ایک چھوٹی سی دکان ہے جہاں روزمرہ کی ضروریات کا عام سامان ملتا ہے۔ یہ دکان نسرین چلاتی ہے۔ اس دکان کے اوپر اس کا گھر ہے۔ گھر اور کام کی اس جدوجہد کے بارے میں نسرین اسٹیفن نے تفصیلات بتائیں۔

علاقے میں سی ایچ ڈبلیو (کمیونٹی ہیلتھ ورکر) کا کام شروع ہوا تو سنٹر میں میری بڑی بہن جوزیفین صدیق نے چائے وغیرہ بنا کر دینے کا کام لیا۔ ٹریننگ شروع ہوئی تو وہ بھی ساری باتیں سنتی تھی۔ اس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا امتحان لیا اور وہ سی ایچ ڈبلیو بن گئی۔ وہ مجھے بھی اس کام میں لے آئی۔

اسٹیفن اور میں ۱۹۷۶ میں کراچی آئے۔ ہم نے عیسیٰ نگری میں رہنا شروع کیا۔ اسٹیفن چھوٹی موٹی مزدوری کرتا تھا۔ ہمارے پاس کوئی رقم نہیں تھی کہ اپنا کام شروع کریں۔ وہ پھل، سبزیاں بیچتا تھا یہاں سبزی منڈی سے لے کر۔ لیکن ٹھیلا لگانا بھی اتنا آسان نہیں تھا جتنا ہم سمجھتے تھے۔ اسٹیفن کے پاس اپنا ٹھیلا نہیں تھا۔ اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ ٹھیلا خرید لے۔ ٹھیلا اچھا خاصا مہنگا آتا ہے۔ ٹھیلا کرائے پر بھی مل جاتا ہے لیکن اس کے لیے ضمانت ضروری ہوتی ہے۔ ٹھیلے کا مالک ضمانت کے بغیر

ٹھیلا نہیں دیتا، اس لیے کہ کوئی اس کا ٹھیلا لے کر واپس نہ آئے تو وہ کیا کرے گا؟ اسٹیفن ابھی ابھی پنجاب سے آیا تھا، اس کا ضمانتی کون ہوتا؟ کسی نہ کسی طرح وہ ٹھیلا پھر بھی لگاتا تھا۔ لیکن پورا نہیں پڑتا تھا۔

یہاں ساری عورتیں کام کرتی ہیں۔ جو باہر نہیں جاتیں وہ بھی کچھ نہ کچھ کام ضرور کرتی ہیں۔ میرے شوہر نے باہر کام کرنے کی اجازت نہیں دی اس لیے میں نے دکان کے بارے میں سوچا۔ گاؤں میں میری امی نے گھر میں چھوٹی سی دکان کھولی ہوئی تھی۔ گھر کے صحن میں لکڑی کے تختے لگا کر چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھ لیں۔ یہی دکان بن گئی۔ ہمارے لیے جگہ تو کم پڑ گئی لیکن لگی بندھی آمدنی ہونے لگی۔

گھر کے ساتھ ساتھ دکان چلانا بڑا مشکل تھا۔ گھر کا کام بھی کرتی تھی، دکان بھی دیکھتی تھی۔ ایک دفعہ میرا چھوٹا بچہ تیل کے کنستر میں گر گیا۔ بڑی مشکلیں اٹھائی ہیں میں نے۔ پندرہ سال ہو گئے ہیں دکان چلاتے ہوئے۔ اب اسٹیفن کو بھی کوئی اَور کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ دکان پر بیٹھتا ہے۔

میرا ہاتھ خالی ہوا تو میں نے سی ایچ ڈبلیو کا کام کیا۔ دائی کا کام بھی میں نے سیکھا ہے۔ لیکن زیادہ کیسز نہیں کراتی۔

دوکان پر بیٹھ کر میں نے دیکھا کہ عورتیں کتنی مجبور ہیں اور کتنی مشکل سے گھر چلاتی ہیں۔ دکان والوں سے قرض چلتا رہتا ہے۔ اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ سارے مہینے کا سودا شروع میں منگا کر رکھ لیں، اور مہینے کی آخری تاریخوں میں اُدھار زیادہ چلتا ہے۔ یہاں کے دکان دار تھوڑا مہنگا بھی اس لیے بیچ لیتے ہیں۔ میں نے گیارہ گھروں کا سروے کیا کہ ان کے یہاں مہینے بھر میں گھی، چاول، آٹا، چینی، مٹی کا تیل، صابن وغیرہ کا کتنا خرچ ہے۔ پھر حساب لگایا کہ اگر میں جوڑیا بازار/جونا مارکیٹ سے تھوک کے بھاؤ یہ چیزیں لا کر دوں تو ان کی بھی بچت ہو گی کیوں کہ ان کو بازار سے کم دام پر چیزیں مل جائیں گی اور یہ لوگ مہینے کے شروع میں مجھے پیسے ادا کر دیں گے۔ اس طرح ہم بچت اسکیم شروع کر سکیں گے۔ سنٹر والوں نے میری مدد کی، بینک سے قرض دلوایا اور خود بھی قرضے کا انتظام کیا۔ سنٹر میں کام ختم ہو گیا اور بچت اسکیم بھی چل نہیں سکی۔ میں نے بینک کا قرضہ اتار دیا ہے۔ بچوں کو تعلیم دلوا رہی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میری بیٹی نرسنگ کی تعلیم مکمل کر لے۔

> عیسیٰ نگری کے سماجی عمل اور سماجی تاریخ کو اس کمیونٹی کی خودشناسی کی داستان بھی کہا جا سکتا ہے۔ گفتگو کے دوران یہ سوال بھی ضمنی طور پر اٹھا کہ شناخت کے اس لمحے میں کیا ہوتا ہے جب کمیونٹی کو یہ پتا چلتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہیں، یا ان میں اور دوسروں میں کوئی فرق ہے۔ یہ فرق اور اس کا احساس عیسیٰ نگری کے لوگوں میں مختلف طور پر ظاہر ہوتا ہے اور وہ اس کے بارے میں کئی حوالوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ ایسی شناخت اور فرق

سے کے بارے میں شمس استھوی نے تفصیل کے ساتھ بات کی۔

جب ہم کراچی میں شروع شروع میں اسکول جایا کرتے تھے تب بھی اس قسم کی بات ہوتی تھی اور کئی واقعات دیکھنے میں آئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لوگ ہوٹل میں بیٹھتے تھے اور کسی کو پتا چل جاتا تھا کہ یہ عیسیٰ نگری کے ہیں یا کرسچن ہیں تو اس وقت لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ تبدیل ہو جایا کرتا تھا۔ بعض دفعہ وہ منع کر دیا کرتے تھے کہ بھئی آپ لوگوں کو کس نے کہا ہوٹل میں بیٹھنے کے لیے۔ اس طرح ایک اندرونی فرق کا احساس ہوتا تھا۔ بعض دفعہ مارپیٹ بھی ہو جاتی تھی۔ میرے ایک دوست کے ساتھ ایسا ہوا۔ وہ لوگ کسی ہوٹل میں گئے۔ ہمارے علاقے کے ارد گرد بہت سی آبادیاں ہیں۔ بلوچ بھی ہیں، پٹھان بھی ہیں، ہندوستانی بھی ہیں۔ تو وہاں کے کسی آدمی نے دیکھ لیا اور ہوٹل کے مالک سے کہہ دیا کہ یہ لوگ جو یہاں کھانے کے لیے بیٹھے ہیں اور جس آبادی سے آئے ہیں اور ان کے تو برتن علیحدہ ہونے چاہییں۔ ہوٹل کا مالک آیا اور اس نے اتنے بُرے طریقے سے بات کی کہ گرما گرمی ہوئی اور جھگڑا ہو گیا۔ وہاں موجود سارے لوگ ہمارے خلاف ہو گئے کہ تم کو کس نے کہا ہوٹل میں بیٹھو۔ اس وقت سے اب تک خاصا فرق پڑا ہے۔

میں نے جس اسکول سے پڑھا ہے اس میں مسلم بھی تھے اور ہندو بھی تھے۔ ہندو بہت تھے کیوں کہ ان کی آبادی نزدیک تھی۔ ہمارے ساتھ جو مسلم پڑھتے تھے ان میں کبھی یہ بات نکل کر نہیں آئی تھی کہ آپس میں فرق سمجھا ہو یا اونچ نیچ کی بات کی ہو۔ اس وقت ہمارے ماسٹر دیہاتی اسٹائل کے تھے۔ اب تو زمانہ بڑا ماڈرن ہو گیا ہے اور لوگ انگریزی کو ساری لفٹ کراتے ہیں، اُس وقت ایسا نہیں تھا۔ ہمارے حساب کے ماسٹر بڑے اچھے تھے، بہت اچھے ٹیچر تھے۔ ایک دفعہ اسکول کے پرنسپل اور گورنمنٹ کی طرف سے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے کچھ لوگ آئے چیکنگ وغیرہ کے لیے تو اس وقت ماسٹر صاحب جس طریقے سے پڑھا رہے تھے تو وہ سندھی اسٹائل میں بیٹھ کر پڑھا رہے تھے۔ ان لوگوں نے بھی ماسٹر کو اس نظروں سے دیکھا اور پرنسپل نے بھی انگریزی جھاڑی جیسے ماسٹر کو کچھ آتا جاتا نہیں ہے۔ ماسٹر صاحب اس طرح سے پوچھتے تھے کہ وھاٹ ار یور نیم او نے؟

ہمارے کمیونٹی میں دوسری کمیونٹیز کے برخلاف بہت سی عورتیں گھروں سے باہر نکل کر کام پر جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سے واقعات ہوئے اور اب بھی پیش آتے ہیں۔ ہمارے ہاں پردے کا کوئی اتنا رواج نہیں ہے، میل جول، گھروں میں آنا جانا ہوتا ہے، گلی میں نکل کر بیٹھنا، چھتوں پر بیٹھنا یہ سب ہوتا ہے۔ آس پڑوس کی آبادیوں میں اس طرح کی آزادی نہیں ہوتی تھی۔ عورتیں جب گھروں سے کام کے لیے نکلتی تھیں تو دوسرے لوگ ان کے لیے رکاوٹ بھی بنتے تھے۔ یہاں تک کہ خواتین جب گھروں سے نکلتی تھیں تو کچھ لوگوں کا کام تھا پیچھے سے ہوٹنگ کرنا یا پتھر مارنے یا کوئی ٹوں مارتی یا ان کے لیے ایسے الفاظ نکالنے یا مذاق اڑانا ان کو پریشان کرنے کے لیے۔ ہمارے علاقے میں ایک تبدیلی

شروع سے یہ آئی ہے کہ بہت سی لڑکیاں پڑھنے کے لیے جاتی ہیں۔ اُس وقت بھی جب لڑکیاں جاتی تھیں تو ایک بڑا ظلم ہوتی تھی کہ بچیاں جب گھر سے یونیفارم پہن کر نکلتی تھیں تو ان کو دور جانا پڑتا تھا کیوں کہ ان کے لیے نزدیک کوئی اسکول نہیں تھا، تو لڑکیوں کا گھر سے اسکول جانا اور اسکول سے گھر آنا ایک مسئلہ ہوتا تھا۔ اس طرح کے کئی واقعات پیش آئے۔

ایک دفعہ بات بڑھ گئی۔ باہر کے علاقے کے جو لڑکے تھے ان کی آہستہ آہستہ اتنی ہمت بڑھی کہ ساری گلیوں تک آنا شروع ہو گئے۔ پھر چند لڑکیوں کی وجہ سے اس علاقے میں جھگڑا ہوا۔ یہ ۱۹۷۵ کی بات ہے اور عیسیٰ نگری کی تاریخ میں بنیادی واقعات میں سے ایک ہے، میں سمجھتا ہوں۔ دوسرے علاقے کا ایک لڑکا تھا جو مسلسل ہماری لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہوئے گلی میں اندر تک آ گیا۔ اور اسے جب روکا گیا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی کو مانتا، اس نے اپنے آپ کو ہم سے برتر جانا اور اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے کے بجائے اس گلی کے نوجوانوں اور بزرگوں سے بدتمیزی بھی کی۔ بدتمیزی کرتے کرتے بات یہاں تک بڑھی کہ لڑائی جھگڑے پر چلی گئی۔ اس لڑکے کا بیک گراؤنڈ کچھ اس قسم کا تھا، خاصا آوارہ لڑکا تھا۔ ہتھیار بھی اپنے پاس رکھتا تھا۔ بات بڑھ گئی تو اس نے ہتھیار نکال لیا۔ خنجر ٹائپ کوئی چیز اس کے پاس ہوتی تھی۔ جس آدمی نے اس کو روکا تھا اس کو بھی شدید زخمی کر دیا۔ وہ وہاں سے بھاگا تو لوگ اس کے پیچھے بھاگے اور وہ بھاگتے بھاگتے سیدھا مسجد میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ عیسیٰ نگری کے کارنر پر دوسرے علاقے کے ساتھ مسجد ہے۔ وہ وہاں جا کر گھس گیا۔ اتنے سال سے یہ مسجد آباد ہے، لوگ بھی آتے ہیں، کبھی کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ یہ شخص اپنی جان بچانے کے لیے مسجد میں چھپ گیا تو اس نے شور مچایا کہ یہ جو عیسائی لوگ ہیں انھوں نے مسجد کو شہید کرنے کے لیے ہتھیار اٹھا لیے ہیں، مسجد کو بچاؤ۔ اس نے یہ کہا تو ارد گرد کے مسلمان بھائیوں نے دیکھا کہ عیسیٰ نگری سے اتنے آدمی ہتھیار اٹھا کر آ گئے ہیں، مسجد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی نکل آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ علاقہ میدانِ جنگ کی شکل اختیار کر گیا۔ دوپہر کا ٹائم تھا۔ ساتھ میں جو دوسری بستیاں ہیں، کرمال کالونی اور بلوچ کالونی، پٹھانوں اور ہندوستانیوں کی بستیاں ہیں، وہاں جا کر یہ لوگ کہہ آئے کہ عیسائیوں نے مسجد پر حملہ کر دیا، مسجد کو شہید کر رہے ہیں۔ بات پھیلتی پھیلتی سبزی منڈی تک پہنچ گئی۔ سبزی منڈی میں دوپہر کے ٹائم مزدور آرام کر رہے ہوتے ہیں۔ انھوں نے جب یہ سنا کہ مسجد پر حملہ ہو گیا ہے تو لاٹھیاں، ڈنڈے، جو بھی ان کے پاس تھا وہ لے کر میدان میں آ گئے۔ یہ میدان جو تینوں علاقوں کو لگتا ہے، یہ جنگ کا میدان بن گیا۔ پولیس بھی اس وقت وہاں پر پہنچ گئی۔ پولیس والوں کا کردار آپ کو پتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ لوگوں کو روکتے، انھوں نے مسجد پر حملے کا سن کر بدلہ لینے کے لیے فائرنگ کر دی۔ ہمارے لوگوں کے پاس ڈنڈوں کے سوائے کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اصل بات دب گئی اور مذہبی فساد شروع ہو گیا۔ اس میں تین لوگ مارے گئے جو اس لڑائی سے واقف بھی نہیں تھے۔ ان تین میں سے دو تو اسی وقت بےچارے اپنے کام سے تھکے ہارے آئے تھے تو ان پر لاٹھی ڈنڈے چارج کیے گئے اور وہ بھاگے تو پولیس نے ان پر فائر کر دیا۔ آج بھی ان کی

قبریں عیسیٰ نگری میں موجود ہیں اور اس بات کی شہادت ہیں۔ آج بھی ہر سال شہیدوں کے لیے دعا ہوتی ہے۔ انھیں کے نوجوان سالانہ پروگرام کرتے ہیں۔

تعصب صرف مذہبی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ کام کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو ہمارے مذہب کے ہیں لیکن ہمیں اپنے برابر کا نہیں سمجھتے۔ اتنا زیادہ تو نہیں لیکن اونچ نیچ کا، امیر غریب کا فرق ہوتا ہے۔

پہلے جو حالات تھے اور اب جو حالات ہیں ان میں تبدیلی آئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنے عرصے لوگوں کا ایک جگہ رہنا اور وہاں کے ماحول کو اپنانا، اس سے فرق پڑتا ہے۔ ساتھ ساتھ تعلیم سے بھی فرق پڑا ہے۔ تعلیم کا رجحان بڑھا ہے اور مسلم اور غیر مسلم میں یہ بھی ہوا ہے کہ ایک دوسرے کو قبول کرنے لگے ہیں۔ پنجاب میں یہ تھا کہ صرف ایک ہی پیشہ تھا جس میں جا سکتے تھے۔ یہاں لڑکے لڑکیوں کو ایک حد تک یہ موقع ملتا ہے کہ دوسرے پیشے بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ پنجاب میں یہ لوگ چودھریوں کے پاس کام کرتے تھے تو ایک ہی کام کر سکتے تھے۔ یہاں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ بہت سے شعبے ہیں جن کو اپنا سکتے ہیں۔

اس بات کی مزید وضاحت آصف شہباز نے کی۔

عموماً اس سلسلے میں ہماری خواتین کو جو پریشانیاں پیش آئیں وہ یہ تھیں کہ جن گھروں میں بھی یہ کام پر جاتی تھیں ان سے صفائی، جھاڑو پوچا اور ٹائلٹ کی صفائی جیسے کام کرائے جاتے تھے۔ یہ احتیاط کی جاتی تھی کہ برتنوں کو نہ چھولیں یا گھر میں کوئی خاص کمرہ ہے تو اس میں نہ گھس آئیں۔ اس کی وجہ سے یہ احساس پیدا ہوتا تھا کہ ہم کو فرق سمجھا جا رہا ہے۔

بلدیہ میں، کے ایم سی میں یا لوکل باڈیز میں جو لوگ کام کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ وہ گٹر کی صفائی بھی کرتے ہیں، کچرا بھی اٹھاتے ہیں، روڈوں پر صفائی بھی کرتے ہیں، وہ زیادہ نشانہ بنتے ہیں۔ اب بھی جن علاقوں میں یہ لوگ کام کرتے ہیں ان کے ساتھ اس امتیازی سلوک میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جو ان کے ساتھ پہلے روا رکھا جاتا تھا۔ تبدیلی جہاں آئی ہے وہ اس وجہ سے آئی ہے کہ صفائی کا کام کرنے والوں نے اپنے بچوں کو تعلیم دلوائی جس کی وجہ سے ان کو اپنے آپ کو دوسرے شعبوں میں شامل کرنے کا موقع ملا۔ ڈرائیور سے، کارپنٹر سے، مکینک سے اور اس طرح کے جو دوسرے ٹیکنیکل کام ہیں ان میں آگے بڑھے۔ نرسنگ اور پیرامیڈیکل میں ہمارے بہت سے لڑکے جاتے ہیں۔

تعصب اور قبولیت کے بدلتے ہوئے تعلق کے حوالے سے شمس استھوی نے کچھ اور تفصیلات بتائیں۔

بعض لوگوں نے تعصب برتا اور چھوت چھات کے باوجود فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکے۔ فرق سمجھنے کے باوجود جب اپنے فائدے کی بات آتی ہے تو پھر سب ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ہمارے لوگوں کے وسیلے سے جن کو شراب حاصل کرنی ہوتی ہے وہ ضرور کرتے ہیں۔ یا پھر ہیروئن خریدنے آتے ہیں۔ وہ ہمیں نیچا سمجھتے ہوں گے لیکن ان چیزوں کے لیے ہم سے مدد مانگنے سے نہیں گھبراتے۔ رمضان کے دنوں میں علاقے کی گلیوں میں چھوٹی چھوٹی دکانیں کھلی ہوتی ہیں تو جن اسکوائر سے یا سوک سنٹر سے وہ لوگ کھانے کی تلاش میں آ جاتے ہیں جو ویسے کبھی یہاں آنے کا تصور بھی نہ کریں۔ نعمان سنٹر اور ارد گرد اب تو بہت فلیٹ بن گئے ہیں۔ رمضان میں عیسیٰ نگری میں گہما گہمی رہتی ہے۔ لوگ ان ہی ہاتھوں کے بنے ہوئے پان خریدنے آ جاتے ہیں جو ویسے عام دنوں میں تصور بھی نہ کریں۔ شراب کا بھی ہم سے زیادہ ہمارے مسلم بھائیوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔

تعصب کے حوالے سے ایک مثال ہے جو زیادہ مناسب تو نہیں ہے لیکن بہرحال حقیقت ہے۔ ہمارے ایک دوست حیدر آباد گئے اور وہاں ایک بدنام سی جگہ وہاں گئے، یعنی کہ سمجھ لیں طوائف کے پاس گئے۔ بات چیت ہوئی اور سارے معاملات طے ہو گئے، ریٹ وغیرہ جب کام کرنے لگے تو اس طوائف کی نظر ان کے جسم پر پڑی۔ اس طوائف نے کہا کہ ابھی ہم اتنے بے غیرت بھی نہیں ہوئے کہ عیسائیوں کے ساتھ کرنے لگیں۔ اور یہ کہہ کر اس نے ان صاحب کو وہاں سے واپس کر دیا۔

ان ہی لوگوں کو جب سروس کی طلب ہوتی ہے یا اپنے دوستوں اور سہیلیوں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ یہاں آنے سے نہیں شرماتے۔ برائی بہت سی دیواروں کو توڑ دیتی ہے۔

اس مسئلے سے بیکسٹر بھٹی کو اختلاف ہے اور وہ تعصب کے سوال کو دوسرے حوالے سے دیکھتے ہیں۔

اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ تعلیم بڑھی ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن آپ کیسی تعلیم کی بات کر رہے ہیں؟ پروفیشنل تعلیم کی بات کر رہے ہیں یا ذہنی ترقی کی بات کر رہے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس بات کو ذہن میں رکھنا ہو گا کہ عیسیٰ نگری ایک چھوٹا سا علاقہ ہے اور اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس سے دوسری پسماندہ بستیاں تعلق رکھتی ہیں۔ آپ لیاری ندی کے علاقے میں جو لوگ رہ رہے ہیں ان کو دیکھ لیں، جیسیسر گوٹھ چلے جائیں، یا لیاقت آباد کے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں چلے جائیں۔ آپ ان کو اس تناظر میں نہ دیکھیں کہ وہ کرسچین ہیں یا مسلم ہیں۔ یہ جو چیز چل رہی ہے یہ طبقاتی مسئلہ ہے۔ اس میں آپ کو پاکستان کے پچانوے فیصد لوگوں کو دیکھنا پڑے گا۔ جو بچہ بھی پیلے اسکول میں پڑھے گا وہ ایسے مسائل کا شکار ہو گا۔ تعصب تو ہے۔ امیر غریب کا تعصب، جاگیردار کا اور ورکنگ کلاس کا تعصب چل رہا ہے۔

کراچی کی حد تک تعصب ختم ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی آدمی گندا ہو گا تو اس کے پاس کوئی بھی بیٹھنا نہیں پسند کرے گا۔ اس کو آپ تعصب نہیں کہہ سکتے۔ میرے بچے مسلم اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تعصب نہیں ہمارا احساسِ کمتری ہے۔ یہ تعصب صرف عیسیٰ نگری کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ ٹرینڈ بن گیا ہے کہ جس کی سفارش ہے اسی کا کام ہو گا، چاہے وہ مسلم ہو یا کرسچن۔ جس کی سفارش نہیں ہے اس کو کوئی پوچھتا نہیں۔ ہاں، اگر میں پنجاب کے کسی پسماندہ علاقے میں ہوتا تو دوسری بات تھی۔ میں کراچی میں بیٹھا ہوں اس لیے آپ کی بات سے اختلاف کر رہا ہوں۔

علاقے میں تبدیلی کے عمل نے لوگوں کی زندگی پر مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب کیے ہیں۔ بعض مرتبہ یہ اثرات ایک ہی شخص کی زندگی میں بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور عُمر کے مختلف مراحل پر ان کا تناسب گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ ماحول کے مثبت اور منفی اثرات کے بارے میں محبوب جان نے اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔

۱۹۶۵ میں کراچی ایسٹ کے علاقے پیر الٰہی بخش کالونی میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ ہم لوگ ویسے تو پیچھے پنجاب سے ہیں، گوجرانوالہ کی طرف کے، لیکن ہمارے باپ دادا کراچی سیٹ ہو گئے تھے۔ پی آئی بی کالونی میں ہمارا گھر بہت چھوٹا سا تھا۔ ہماری پوری فیملی، تائے چچا، وہ سب پی آئی بی کالونی سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر عیسیٰ نگری ہے، وہ نئی نئی آباد ہوئی تھی، وہ وہاں شفٹ ہو گئے تھے تو پھر ہمیں بھی مجبوراً یہاں شفٹ ہونا پڑا۔ اور یہاں پانچ سال کی عمر میں، میں نے سینٹ میری اسکول میں ایڈمیشن لیا۔ پانچویں تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ یا ۷۶ میں، بھٹو صاحب کا زمانہ تھا، پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد طارق روڈ پر سیکنڈری اسکول تھا، چھٹی جماعت میں میں نے وہاں داخلہ لیا اور میٹرک تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ ۸۲ میں میٹرک کی۔ اس کے بعد اسلامیہ آرٹس کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا۔ انٹر تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ یہ ہے میری تعلیمی کارکردگی۔

جب میں نے میٹرک پاس کیا تو میرے کچھ دوست تھے، لیاقت مسور تھا، عمانوئیل استھوتی تھا، تو یہ کیوں کہ مجھ سے ایک سال سینیئر تھے تو انھوں نے کیا کیا کہ لیاقت اسپتال میں جنرل نرسنگ کا کورس ہو رہا تھا، انھوں نے وہاں ایپلی کیشن دی اور مجھے بھی کافی مجبور کیا کہ تم بھی چلو، تم بھی چلو۔ میں نے کہا نہیں، مجھے جنرل نرسنگ نہیں کرنی۔ میرے خیالات کچھ اور تھے کہ میں کچھ بنوں۔ میں نے کہا نرسنگ میں مجھے کچھ اسکوپ نظر نہیں آتا۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھی مری کے لیے جا رہے ہیں، تین چار ماہ کا جو پی ٹی سی کورس ہوتا ہے وہ کریں گے، اس کے بعد بھاگ آئیں گے۔ میں نے کہا کہ نہیں جی، مجھے وہ بھی نہیں کرنا۔ وہ ایک سنہری چانس تھا وہ میں نے مس کیا۔ اس کے بعد کمپیوٹر میں داخلہ لیا، وہ دو

سال کا کورس تھا۔ اس میں بھی بس چھ ماہ لگائے، پھر چھوڑ دیا کہ بعد میں کر لیں گے جب کہیں کام کرنا ہو گا۔ اس طرح یہ بھی مجھ سے مس ہو گیا۔ اصل میں یہ سب چکر جو تھا وہ یہ تھا کہ میں نے جیسے ہی میٹرک پاس کی، اس دور میں انڈین فلمیں وڈیو پر لوگوں میں کافی مقبول ہو رہی تھیں، تو ہمارے گھر میں بھی اور دوستوں میں بھی انڈین فلمیں دیکھنے کا رجحان کافی بڑھ رہا تھا۔ یہ وی سی آر اور ٹی وی اس زمانے میں بہت مہنگے تھے اور ہم خرید تو نہیں سکتے تھے لیکن ہم اس کو کرائے پر لے کر آتے تھے، کافی دور سے۔ پانچ چھ سو روپیہ اس کا کرایہ ہوتا تھا۔ اس میں ہماری کافی دل چسپی بڑھ گئی۔ میں اور میرا ایک دوست تھا، ہم دونوں لے کر آتے تھے تو اپنے گھر میں یا کسی اور کے گھر میں رکھ کر لوگوں سے، لڑکوں سے بیس بیس، تیس تیس یا پچاس روپے لے کر وہ ان کو دکھاتے تھے۔ شروع ہی میں میرا ذہن پیسے کی طرف چلا گیا۔ اس وجہ سے کچھ پڑھائی میں ایک سال اسی طرح چلتا رہا۔ پھر میں فرسٹ ایئر میں آیا تو میرا ایک دوست تھا، اس کے پاس ستائیس اٹھائیس فلمیں تھیں اور میرے پاس پانچ چھ فلمیں تھیں، تو وہ مجھے کہنے لگا کہ ایسا کرتے ہیں کہ ہیبی نگری میں ایک چھوٹا سا وڈیو سنٹر کھول لیتے ہیں، تو اس طرح ہمارے اوپر کے اخراجات نکلتے رہیں گے، شوق بھی پورا ہو جائے گا اور پڑھائی بھی جاری رہے گی۔ لیکن اس نے میٹرک کے بعد چھوڑ دیا تھا اور میں فرسٹ ایئر میں تھا۔ میں نے اپنے گھر میں بات کی کہ ہم وڈیو سنٹر کھول رہے ہیں، تو میرے والد اور میری والدہ نے منع کیا کہ بھئی اس طرح تمہاری پڑھائی میں حرج ہو گا تو آپ اس طرح یہ رِسک نہ کریں۔ میں اپنے دوست کو لے کر گھر آیا کیوں کہ میری اس سے پہلے سے بات چیت ہو چکی تھی کہ وہ مجھے کالج جانے کے لیے، میری پڑھائی کے لیے اور ٹیوشن کے لیے ٹائم دیا کرے گا۔ اس نے کہا کہ نہیں جی آنٹی جی، میں اس کو کالج کے لیے اور ٹیوشن کے لیے وقت دیا کروں گا اور اس کی پڑھائی میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔ لیکن گھر والے پھر بھی نہیں مانے۔ میں نے ضد کی۔ انھوں نے پیسے نہیں دیے۔ میں نے جو میری جیب خرچی تھی، ہزار چھ سات سو روپے، اسی سے کام کیا۔ ہم نے چھوٹا سا وڈیو سنٹر کھول لیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں کافی بچت ہوئی اور اس طرح وڈیو سنٹر چل پڑا۔ پھر میرا دوست آؤٹ سائڈ ہو گیا اور میں پوری طرح انوالو ہو گیا۔ اس طرح میرے کورسز اور اسٹڈی ختم ہو گئی۔

شروع میں میرا خیال تھا کہ ڈی ایس پی یا ایس ایس پی کی رینج کا کوئی افسر بننا چاہتا تھا۔ میں پولیس میں بھرتی ہونا چاہتا تھا۔ لیکن وہ نہ ہو سکا۔ میرے خاندان کا تعلق پنجاب سے تھا۔ تعلیم تو ان کے پاس تھی نہیں۔ پھر وہی جو پنجابی کریکٹر کا کام زیادہ ہے، وہ صفائی کی طرف مائل تھے۔ تو شروع میں وہ صفائی کا کام کرتے تھے۔ اس کے بعد بھٹو صاحب کا دور آیا، پاسپورٹ وغیرہ سے تو کافی لوگ جو تھے وہ اپنی اور اپنے خاندان کی ترقی کے لیے باہر کی طرف ان کا رجحان تھا۔ اسی طرح میرے والد صاحب کو بھی شوق ہوا کہ میں بھی باہر جاؤں، اس طرح ہمارے خاندان میں بھی ترقی ہو جائے گی۔ میرے والد صاحب نے کوشش کی۔ اس ٹائم میں تقریباً چودہ پندرہ سال کا تھا۔ تو میرے والد صاحب انگلینڈ چلے گئے۔ میرے والد صاحب کے جانے سے فرق تو یہ ہوا کہ گھر میں اگر پہلے تھوڑی خوشحالی تھی تو اچھی خوشحالی ہو

گئی، پہلے ہمارا گھر کچا تھا تو ہم نے اینٹوں والا گھر بنا لیا کیوں کہ عیسیٰ نگری میں وہ دور چل رہا تھا کہ ہر گھر کو توڑ کر بنائیں، کیوں کہ پہلے کچے گھر تھے تو ان کو توڑ کر پکے بنانے شروع کر دیے۔ تو اسی دوڑ میں ہم بھی شریک ہو گئے اور اپنا گھر پکا کر لیا۔ لیکن یہ ہے کہ جہاں یہ ہوتا ہے کہ باپ کا سایہ اگر موجود نہ ہو تو اولاد کچھ ڈسٹرب ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا خاص طور پر ایسا نہیں تھا کیوں کہ شروع میں جیسے ہم نے ہوش سنبھالی تو ہمارے والد صاحب اتنے سخت آدمی نہ اس وقت تھے نہ اب ہیں۔ وہ بہت پیار کرنے والے آدمی تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ انھوں نے کبھی ہمیں مارا بھی ہو۔ ہاں، ہماری والدہ جو ہیں، بہت سخت تھیں۔ کافی ہم یوں پر پابندیاں تھیں کہ باہر نہ کھیلو۔ مار کٹائی بھی ہمیں والدہ سے ہی ملی۔

میٹرک کے زمانے میں یار دوست جمع ہوتے تھے، فرصت کا ٹائم پاس کرنے کے لیے۔ فلموں کی طرف میرا رجحان نہیں رہا، پاکستانی فلموں کی طرف۔ یہ تو انڈین فلموں کی طرف ایک دم شوق چلا گیا۔ جیسے ہم پانچویں چھٹی کلاس میں تھے تو ہاکی مقبول تھی۔ بعد میں ہم پانچ چھ دوست ایسے تھے جو ڈنڈوں کی مدد سے ہی ہاکی کھیل لیا کرتے تھے۔ تھوڑی سی اور ہوش سنبھالی تو اپنی ہاکیاں خرید لیں۔ کبھی کبھی وہاں پر جہاں آج کمیونٹی سنٹر ہے، مائیکل جاوید صاحب کا گھر ہے، یہاں پر ایک چھوٹا سا گراؤنڈ ہوا کرتا تھا اور وہاں ہم کھیلا کرتے تھے۔ اس کے بعد ساتویں آٹھویں میں پہنچے تو ہم لوگ کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ اسکول سے میں آتا تھا تو ٹیوشن پر چلا جاتا تھا اور ٹیوشن سے ہی، اگر کوئی خاص میچ ہمیں کھیلنا ہوتا تھا شام کو، تو میرے دوست ٹیوشن سنٹر میں ہی آ جاتے تھے اور وہاں سے ان کے ساتھ مل کر چلا جاتا تھا۔ یا رات کو کہیں بیٹھ کر گپیں مار لیتے تھے۔ یہی رہتا تھا۔ اس کے بعد پھر وی سی آر وی ویڈیو سنٹر۔ انڈین فلمیں اس زمانے میں سبھی دیکھ رہے تھے۔ نئی نئی چیز کا شوق تھا۔ ابتدا میں اور دھرمیندر اچھے لگتے تھے اور کافی ڈفرنٹ لگتے تھے۔

ہاں جی، دوسری قسم کی فلموں سے بھی تعارف تھا۔ کیوں کہ جب کرائے پر لے کر آتے تھے تو اس وقت بھی کچھ دوست ایسے ہوتے تھے جو کہتے تھے، نہیں جی، ہم تو پیسے دے رہے ہیں صرف بلو پرنٹ کے لیے، تو آپ ایسا کریں کہ اگر چار فلمیں چلائیں گے تو تین آپ انڈین چلا لیں اور ایک یہ چلا لیں، جو نہیں دیکھنا پسند کرے گا اسے باہر بھیج دیں گے اور جو دیکھنا پسند کریں گے وہ بیٹھ کر دیکھ لیں گے۔ تو وہ ہمیں لانی پڑتی تھیں اور لازمی ہم بھی، اُس وقت تھوڑا سا ینگ بلڈ تھا، تو ہم بھی دل چسپی رکھتے تھے کہ چلیں خیر ہے، دیکھ بھی لیں گے۔ ایک دفعہ تو ایسے ہوا کہ میرا ایک کزن ہے، میرا ہم عمر تھا وہ بھی، تو وہ مجھے کہنے لگا کہ آج جو پروگرام چلے گا وہ صرف اور صرف بلو پرنٹ کا چلے گا۔ کچھ اور ایسے ہی دوست تھے، انھوں نے پیسے دیے اور اس میں میں نے کوئی پیسہ نہیں دیا، میں نے بس یہ کیا کہ وی سی آر اور ٹی وی اور فلمیں لے کر آیا اور بیٹھ گیا ان کے ساتھ۔ تقریباً پوری رات انھوں نے یہی چیزیں دیکھیں۔ رہی یہ بات کہ ان فلموں کو دیکھ کر شوق ہوتا تھا کہ ہم بھی یہی سب کریں، ترلے کریں، تو یہ چیز تو ہے، اس ٹائم پر کسی فلم کو دیکھ کر وہ زمانہ ایسا تھا کہ کسی فلم کو دیکھ کر سوچا کرتے تھے کہ ہم بھی

ابتدا ہی میں یا سیرو میں تو دیکھ کر یہ چیز ذہن میں پیدا ہوتی تھی کہ کیا ہے اس میں، اس میں لذت کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یا بعد میں چھٹی کلاس میں لڑکیوں کو چھیڑنا یا لڑکیوں کی طرف دیکھنا یا ان کی باتیں کرنا، ہمارا میں چار لڑکوں کا ایک گروپ تھا، یہ بھی ہم اس طرح لڑکیوں کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس میں یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک میرا کزن ہے، اس کی بڑی سسٹر تھی، اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ہم لوگ چھوٹے تھے تو ان کو کیا پتا کہ ان کا ذہن کس طرف ہے۔ تو ہم لیٹے ہوئے تھے چارپائی پر اور وہ لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ تو میرے کزن نے کیا کیا، ذہن میں تو یہی بات تھی، انگلی ان کے پیچھے رکھ دی۔ تو ہو گا کوئی سلسلہ اس میں۔ انگلی رکھ دی اور باتیں منہ سے کر رہا ہے۔ جب انگلی لڑکی کو ٹچ ہوئی تو اس نے ہمیں ڈانٹا۔ لیکن ہم لوگ اس وقت چھوٹے تھے۔ جیسے بازاری عورتیں وغیرہ ہوتی ہیں، ہم لوگ اس طرف کبھی نہیں گئے۔ میرے کلور فرینڈ بھی نہیں گئے۔ جیسے یہ ہوتا ہے لڑکیوں کے ساتھ فرینڈشپ وغیرہ، تو یہ اٹھارہ بیس سال کی ایج میں تھے تو یہ بھی ہوئی۔

اسی زمانے میں پینے پلانے کا شوق اور اس کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی میں بتاتا چلوں۔ پہلے تو میں اپنے گھر سے بتلاتا ہوں۔ کچھ جگہ تو ایسا ہوتا ہے کہ بڑا بھائی پی رہا ہے یا باپ ہے یا چچا ہے، اس کی وجہ سے کچھ چیزیں ورثے میں ملتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی بھی ڈرنک نہیں کرتا تھا۔ میرے والد صاحب وہ بھی صرف سگریٹ پیتے تھے۔ میں نے میں جب میٹرک میں تھا یا میٹرک پاس کیا تھا، اب اتنی اچھی طرح یاد نہیں ہے، تو میرا کزن ہے وہ کسی گھر میں کام کرتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا، ایسے چار پانچ جماعتیں پڑھ کر چھوڑ دیا تھا، تو کسی گھر میں وہ صفائی وغیرہ کا کام کرتا تھا۔ وہاں جو اس کا باس تھا اس نے کہا کہ کرسچن لوگ جو ہیں ان کا کوئی خاص کوٹا سسٹم ہے، ان کا لائسنس ہوتا ہے اور اس لائسنس پر وسکی ملتی ہے، تو آپ ایسا کریں کہ آپ مجھے لا کر دیا کریں اور جو پیسے ہوں گے وہ میں آپ کو دے دیا کروں گا۔ تو میرے کزن نے کیا کیا کہ اس نے ساری انفارمیشن لی اور وہاں اسٹور پر گیا، کاغذات جمع کیے اور اس کو وہ لائسنس مل گیا۔ تو وہ مجھے بھی ایسے ہی کہنے لگا کہ کیا کر رہے ہو۔ میں نے کہا کہ فارغ بیٹھا ہوں۔ اس نے کہا، آؤ میرے ساتھ چلو۔ تو مجھے وہ ساتھ لے گیا، اس نے وسکی کی بوتلیں لیں اور اس کے باس کا دفتر تھا، وہاں پر دیں، اور اس نے اندر ہی پیسہ وغیرہ جو بھی کچھ تھا لے لیا۔ اسی طرح مجھے وہ آہستہ آہستہ اپنے ساتھ لے کر جاتا رہا۔ یا پھر ایسے ہوتا تھا کہ میرے کچھ باہر کے فرینڈ ہوتے تھے، تو وہ کہتے تھے کہ یار آپ لوگوں میں یہ چیزیں ہیں۔ تو ہمارے ایریا میں ایک دو لوگ تھے جو یہ چیزیں بیچا کرتے تھے۔ تو انھوں نے کہا کہ ہمیں وہ چیزیں لا کر دے دیں۔ تو میں نے وہ پچاس ساٹھ روپے لیے، اس آدمی سے وہ چیز لے کر اس دوست کو پہنچا دی۔ اس میں میرا کوئی اتنا انٹرسٹ نہیں تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ میں نے سوچا پھر مجھے پتا چلا کہ چالیس کی اگر وہ چیز آتی ہے تو ساٹھ کی جا رہی ہے اور بیس روپیہ پرافٹ ہے۔ تو میں نے سوچا کہ میں جاتا تو ہوں، تو کیوں نہ کچھ اپنے لیے لے لوں۔ تو اس طرح سے ایک دو بوتلیں اپنے لیے بھی لے لیں۔ اپنے گھر میں رکھ لیں۔ دوست آتے تھے، ان کو دے دیں۔ اس طرح

پیسوں کا تھوڑا سا لالچ جو سے ڈیولپ ہوا۔

خود پیسی تو میں نے کافی بعد میں شروع کی، لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ ایک قسم کا ایڈکٹ بن جاؤں۔ اس کے علاوہ جو دوسرے نشے ہیں ان کے بارے میں بتاؤں۔ شروع میں تو ہم لوگ یہ چرس وغیرہ دیکھتے تھے کہ گلی کے کونے میں لڑکے کھڑے ہوئے چرس بھر رہے ہیں اور پی رہے ہیں۔ ہیروئن کا نام سننے میں نہیں آیا تھا، اس کے بہت بعد جا کر ہمیں پتا چلا کہ ہیروئن بھی کوئی نشہ ہے۔ اس کے متعلق بھی میرا ایک چھوٹا سا تجربہ ہے، وہ بتاتا چلوں۔ میرے ایک کزن نے ہیروئن پینی شروع کر دی۔ پہلے تو میں نے اسے سمجھایا کہ نہیں پیو، کیوں کہ اس کی وائف بھی اس کے ساتھ جھگڑتی تھیں، ہم لوگ بھی اسے سمجھاتے تھے۔ یہ دور تھا جب میں وسکی کی سیل میں ملوث ہو چکا تھا، وڈیو سنٹر بھی میرا چل رہا تھا۔ وڈیو سنٹر کی وجہ سے کچھ دوست ایسے الٹے سیدھے بھی آنا شروع ہو گئے اور کچھ سے دوست بھی بن گئے۔ تو ایک دوست ہے میرا، اس دوست کا ایک دوست پولیس میں تھا، سی آئی اے میں۔ اس نے کہا کہ کل رات ایک کار آ رہی تھی ایئرپورٹ کی طرف سے، اسے روکا تو اس کار میں سے چرس برآمد ہوئی ہے، آپ کے علاقے میں پیتے بھی ہیں اور بیچتے بھی ہیں تو آپ ایسا کرو کہ یہ جو چرس ہے میری یہ بکوا دو۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، میں بکوا دیتا ہوں۔ میں نے دو ایک بندوں سے بات کی تو انھوں نے کہا ہم لے لیں گے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اگر یہ بکوا دو گے تو اتنے فی صد تم لے لینا۔ کیوں کہ وہ ڈیلنگ میں نے کروائی تھی تو اس میں پیسے مجھے مل گئے۔ ایک اور دفعہ پھر تھوڑا سا میرے پاس آ گیا۔ وہ کہنے لگا کہ میرے دوست نے پاؤڈر پکڑا ہے۔ اس وقت علاقے میں اس کی سیل ہو رہی تھی، عیسیٰ نگری میں اس کا عروج تھا۔ وہ مجھے کہنے لگا کہ اگر یہ کروا دو تو اس میں بھی تمھارا پرسینٹ ہے۔ میں نے علاقے کے کچھ لڑکوں سے کہا کہ ایک بندہ ہے، اس کو ٹیسٹ کر لو۔ اگر اس کے پاس صحیح ہے تو تم اس سے لے لو۔ انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ اس کا تھوڑا سیمپل لے لیں۔ وہ دوست آیا تو میں نے اس سے کہا کہ تھوڑا سیمپل دے دو، وہ لڑکے چیک کریں گے اور سیٹ ہوا تو تم سے لے لیں گے۔ اس وقت یہاں کے لوگ سہراب گوٹھ کی طرف جاتے تھے اور اس میں کافی خطرہ بھی تھا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر کوئی بندہ یہاں دے رہا ہے تو ہم یہاں لے لیتے ہیں، ہماری پریشانی کم ہو گی۔ خیر کچھ اس طرح کی بھی ڈیلنگ ہوئی اور ایک دو دفعہ میں اس میں بھی رہا۔ لیکن ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میرا ایک کزن بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کیا کیا کہ تھوڑا سا نکال لیا۔ کیوں کہ میں یہ چیز گھر تو نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے وہ اپنے کزن کے پاس رکھوائی ہوئی تھی کہ تم رکھ لو، کل وہ آدمی آئے گا تو اس کو واپس کرنا ہے۔ میرے دوست نے کیا کیا کہ لالچ کی بنا پر اس میں سوئی مار کر تھیلی میں سے تھوڑا سا پاؤڈر نکال لیا اور اس نے بیچنے کی کوشش کی۔ کسی نے اسے دیکھ لیا۔ کیوں کہ ہم لوگ تو یہ کام نہیں کرتے تھے، تو انھوں نے گھر میں اطلاع کر دی کہ ان کے پاس اتنا سا پاؤڈر ہے اور یہ اسے بیچ رہے ہیں۔ گھر میں ہماری کافی جھاڑ جھپڑ ہوئی کہ کیوں کر رہے ہو۔ ہم نے کہا کہ نہیں، ایک آدمی یہاں رکھ گیا تھا، وہ بھول گیا ہے تو ہم نے سوچا کہ اسے پھینکنے سے بہتر ہے کہ بیچ دو۔ خیر، پھر ہم نے

اسے پیچا نہیں بلکہ گھر والوں کے سامنے پھینک دیا۔ اس کے بعد میں نے توبہ کرلی کہ کوئی بھی آئے گا، میں اس کیس میں نہیں پڑوں گا۔

ہیروئن میں نے خود کبھی نہیں پی۔ البتہ یہ ہے کہ چرس ہوتی تھی تب میں وسکی وغیرہ پی لیتا تھا تو میرے کچھ دوست ایسے تھے جو ریگولر چرس پیتے تھے، وہ کہتے تھے کہ وسکی کے بعد چرس پینے سے نشہ بڑھ جاتا ہے۔ ایسے ہی ٹرائی کرنے کے لیے میں نے بھی پی۔ تقریباً پندرہ بیس دن پیتا ہی رہا۔ میرا ایک دوست ہے، میں تو سمجھتا ہوں وہ اچھا ہی تھا، تو جیسے ہی ہم پی کر نکلتے تھے، ہمارا گھر بن رہا تھا، گھر والے نہیں تھے، تو ہم تین چار دوست اندر چلے جاتے تھے، پانچ چھ سگریٹیں پیں اور باہر آ گئے۔ تو یہ دوست اس چیز کو برا سمجھتا تھا۔ برا تو ہم بھی سمجھتے تھے لیکن انوالو ہو گئے۔ تو جیسے ہی ہم باہر نکلتے تھے وہ کہتا تھا اوئے چرسی آ گئے، چرسی آ گئے۔ پھر مجھے کافی شرم آئی۔ میں نے ان دوستوں سے کہا کہ بھئی اگر تم چھوڑتے ہو تو صحیح ہے ورنہ میں تم میں نہیں بیٹھوں گا۔ ان دوستوں میں سے کچھ لوگوں نے تو چھوڑ دی، کچھ پی رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد میں نے بھی اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

میں اب خود تو نہیں پیتا لیکن میں نے بہت سے لوگوں کو پیتے ہوئے دیکھا ہے اور بعد میں ان کے ساتھ کام بھی کیا ہے، اس لیے مجھے اندازہ ہے کہ یہ لوگ کس طرح پیتے ہیں، کہاں سے لاتے ہیں، اس عادت کے لیے کیا کیا کرتے ہیں، اس میں کیسے پھنس جاتے ہیں۔ میرا ایک چچازاد بھائی تھا، اس کا ایک واقعہ آپ کو سنا دیتا ہوں، بقول اس کے، میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیوں استعمال کی۔ اس سے آدمی بہت ساری پیسے محدود ٹائم میں اور شارٹ کٹ میں کما لیتا ہے۔ میرا یہ چچازاد بھائی بھی خریدنے اور بیچنے کی لت میں شریک ہو گیا۔ اس نے بیچنی شروع کر دی۔ تین چار دفعہ پولیس نے پکڑا بھی۔ پھر چھڑا کر ہم لوگ لایا کرتے تھے۔ وہ معافیاں مانگتا تھا کہ اب نہیں بیچوں گا، لیکن پھر بیچنی شروع کر دیتا تھا۔ کچھ عرصے بعد ہمیں پتا چلا، کچھ لڑکوں نے ہمیں بتلایا کہ آپ کا بھائی جو ہے، اس نے پینی بھی شروع کر دی ہے۔ ہم لوگوں نے پوچھا کہ تو پیتا ہے۔ اس نے کہا نہیں نہیں، کسی نے جھوٹ بولا ہے۔ لیکن آخرکار ہمیں پتا چل گیا۔ اس کا میں نے ایک دفعہ ٹریٹمنٹ بھی کروایا تھا ڈاکٹر سلیم اعظم کے ہاسپٹل سے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تو نے کیسے یہ لگالی؟ تجھے تو پتا بھی تھا کہ اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں، ارد گرد کے حالات تو نے دیکھے ہوئے ہیں، تجھے پتا ہے کہ بیوی بچوں پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے، دوسرے رشتہ دار بھی نفرت کرتے ہیں، پھر تو نے کیوں اس کو پینا شروع کر دیا؟ اس نے بتایا کہ اصل میں اس کی سالی تھی، اس کے ساتھ اس کی کچھ لَو اسٹوری وغیرہ چل رہی تھی۔ تو اس کی بیوی کو پتا چل گیا تو اس نے ڈانٹا ڈپٹا اور اس لڑکی کو گھر آنے سے منع کر دیا۔ دوسرے یہ کہ اس کی سالی نے بھی سوچا ہو گا کہ یہ تو بالکل غلط چیز ہے، شادی بھی نہیں ہو سکتی اور اس سے ایسی مارک سی رشتہ داری بھی ہے تو اس نے بھی پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ بقول میرے کزن کے، اس نے اپنی سالی کی نفرت کی وجہ سے یہ شروع کر دی کہ وہ ذہنی طور پر اس سے دور ہو جائے۔ کچھ لوگوں نے اس سے کہا تھا کہ یہ ذہنی تسکین پہنچاتی ہے۔ اس نے یہ پینا شروع

کی تو ایک دو دفعہ اسے کافی تسکین ملی اور بعد میں وہ اس کا ایڈکٹ ہو گیا۔

علاقے میں کئی لڑکے ایسے ہیں جو لاتے ہیں، بیچتے ہیں، اپنی زندگیاں تباہ کر لیتے ہیں۔ بہت سارے تو اسی طرح کے چکروں کی وجہ سے اس میں پڑ گئے۔ بعض لوگ چرس وغیرہ استعمال کر رہے تھے تو وہ بھی اس طرف آ گئے۔ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کا ٹیسٹ یہ ہے، تو ایک ٹائم آتا ہے کہ آدمی کہتا ہے میں بھی اسے چیک کر لوں۔ آج چیک کر لوں، کل اس کو نہیں پیوں گا۔ اس وجہ سے آج پیتے ہیں، پھر کہتے ہیں کل بھی لیتا ہوں، پرسوں نہیں پیوں گا۔ اس کے بعد وہ ایڈکٹ ہو جاتے ہیں۔ چرس کو چھوڑ کر بہت سے لوگ ہیروئن کی طرف آئے۔ یہ تو نہیں کہ چرس ختم ہو گئی، لیکن اس کی جگہ بڑی حد تک ہیروئن نے لے لی۔

بدقسمتی ہم لوگوں کی یہ ہے کہ ہیروئن عیسیٰ نگری میں بہت عام ہو گئی ہے۔ پہلے یہ لوگ دوسری جگہوں پر جاتے تھے، جیسے سہراب گوٹھ۔ افغانستان سے جو مہاجر آئے تھے، یہ چیزیں تو وہی لے کر آئے تھے اور سہراب گوٹھ پر ان کے کیمپ ہوا کرتے تھے۔ اس وقت عیسیٰ نگری میں بھی پینے والوں کی کمی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ یہاں تعداد بڑھتی گئی۔ اس کے بعد یہ ہوتا تھا کہ جس ایڈکٹ کے پاس تھوڑا سا پیسہ ہے، وہ وہاں سے اکٹھا لے آتا تھا۔ اور اس کے بعد دوسرے نشئی جو ارد گرد کے علاقوں سے آتے تھے، بازار میں جو سندھی بلوچی ایریا ہیں وہاں بھی یہ چیز آ گئی تھی۔ جب یہ چیز عیسیٰ نگری میں بڑھ رہی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ عیسیٰ نگری میں ہی بڑھ رہی تھی، یہ ارد گرد اور پوری کراچی میں بڑھ رہی تھی۔ پوری کراچی میں ہیروئن پینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تو ان لوگوں نے وہ بیچنی شروع کر دی۔ ایک ایڈکٹ نے ایک تھیلی پچیس یا پچاس گرام کی لے کر آتا تھا تو اس کا اپنا حصّہ بھی نکل جاتا تھا اور دوسرے لوگ بھی سمجھتے تھے کہ ہمیں ایزی مل رہا ہے، کہیں اور نہیں جانا پڑ رہا۔ سہراب گوٹھ یا ناظم آباد نہیں جانا پڑے گا۔ تو ان لوگوں کی پوری چین سی ہوتی ہے، اگر وہ ایک آدمی کو کہہ دے گا کہ ہاں، میرے پاس ہے تو وہ دوسرے کو کہہ دے گا کہ تُو وہاں نہیں جانا، وہ دو نمبر گلی میں فلاں آدمی ہے وہ بیچ رہا ہے، اس سے لے لو اور اس کا مال بھی اچھا ہے۔ تو اس طرح سب تک خبر پہنچ جاتی ہے۔

بیچنے کے لیے لانے میں ایک میرا ایکسپیرئینس ہے۔ ایک پٹھان تھا جو جس اسکوائر پر رہتا تھا۔ میرا ایک دوست کالج میں میرے ساتھ پڑھتا تھا تو اس سے میں نے ذکر کیا کہ یار ہمارے علاقے میں یہ کام ہو رہا ہے۔ اس وقت میں شراب کے کام میں کافی ملوث تھا، لے کر آتا تھا اور بیچتا تھا۔ روزانہ کی تقریباً آٹھ دس بوتلیں نکل جاتی تھیں۔ میرے دوست نے کہا کہ ایک پٹھان ہے میرا جاننے والا، اگر وہ تمہیں دے دے تو تمہیں ایک چکر کے کم از کم چار سو پانچ سو مل جائیں گے۔ میں نے بھی کہا، چلو ٹھیک ہے، پیسے بھی ملیں گے اور خطرہ بھی نہیں ہے، تو میں یہ کام کر لیتا ہوں۔ تو میں کالج سے سیدھا اس کے گھر جاتا تھا۔ تو اس نے کہا کہ یہ جرنل جو ہے تمہارا، اس میں رکھ لیا کرو۔ تو میرا سائنس کا جو جرنل تھا، اس میں وہ پڑیاں اور پیکٹ پچیس گرام والے رکھ کر لے آتا تھا اور دوسری جگہ جا کر بیچ آتا تھا۔ اس طرح

وہ بھی کمیشن دے دیتے تھے۔ اس طرح تقریباً ایک ہفتہ یہ کام کیا۔ یہ تو ہے غلط ہی، لیکن میرا یہ بہت شارٹ ٹرم تھا اس وجہ سے پولیس تک تو بات نہیں پہنچی، لیکن وسکی کا میرا کافی لانگ پیریڈ تھا اور اس میں میں پولیس والوں کے ساتھ کافی اٹیچ رہا۔ لاتے ہوئے بھی میں تین چار دفعہ پکڑا گیا۔

ایک دفعہ تو جیسے ہی اسٹور سے نکلے، پکڑے گئے۔ پرمٹ ہوتا تھا اور پرمٹ پر تین بوتلیں ملتی تھیں لیکن ہمیں کچھ زیادہ لینی ہوتی تھیں تو وہ اسٹور والے ہمیں بلیک پر دیتے تھے۔ جیسے ہی ہم اسٹور کی حدود سے نکلے تو پولیس نے ہمیں پکڑ لیا۔ میں تھا اور میرا کزن تھا۔ مجھے وہ کہنے لگے کہ تو چل ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن۔ میں نے کہا ٹھیک ہے بھئی، اور کزن سے کہا تم جاؤ، میں ان کے ساتھ جاتا ہوں۔ وہ کھار اور پولیس اسٹیشن لے گئے اور مجھے وہاں بند کر دیا۔ بعد میں مجھے کہنے لگے، قصور تیرا نہیں ہے، جو تمھیں دیتا ہے قصور اس کا ہے، تو تمھیں گواہ کی حیثیت سے رکھیں گے اور ایف آئی آر اسٹور والوں کی کاٹیں گے۔ اصل میں ان کا پھڈا چل رہا تھا۔ وہ اسٹور والوں سے ہفتا لیتے تھے اور اسٹور والے ہفتا دیتے نہیں تھے۔ خیر، پھر اسٹور کا مالک آیا، اس نے ہفتے کی بات کی اور مجھے بھی چھڑا لیا۔ یہ بالکل ایک دو گھنٹے میں کیس ہوا تھا اور اس کے بعد میں واپس گھر آ گیا۔ لیکن جیسے میں وڈیو سنٹر پر ہوا کرتا تھا اور ہم بیچتے تھے تو لازمی طور پر پبلک کو بھی پتا چلتا تھا کہ یہ چیز یہاں سے مل رہی ہے۔ تو ایک دو دفعہ جو ہمارے کسٹمر ہوا کرتے تھے جیسے ہی لے کر نکلے، راستے میں پکڑے گئے۔ ہاں بھئی، کہاں سے لے کر آئے؟ جی وہ وڈیو سنٹر ہے وہاں پر، اور یہ یہ آدمی کا نام ہے۔ ہم تو اس سے لے کر آئے ہیں۔ وہ میرے پاس آئے تو میں نے کہا جی میں تو نہیں بیچتا۔ خیر، وہ کچھ مخبر بھی تھے ایریا میں تو اس وجہ سے بھی اور ہم لوگوں نے سمجھا اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ وہیں وڈیو سنٹر میں تین چار سو روپیہ دیا اور پولیس والے چلے گئے۔ اتنا بڑا کیس نہیں ہوا۔ لیکن ایک دفعہ میں اور میرا دوست گلشن میں جا رہے تھے۔ ایک اور دوست کے ہاں ہماری کرسمس پارٹی تھی۔ تو اس نے مجھے کہا کہ تُو ایسا کر، تُو وسکی لے آنا، میں کھانے کا سامان لے آؤں گا اور یہیں بیٹھ کر کھا پی لیں گے۔ میں آ رہا تھا تو گلشن اقبال کے موڑ پر پولیس موبائل کھڑی تھی۔ ہم اسکوٹر پر تھے۔ انھوں نے رکنے کا اشارہ دیا۔ میں نہیں رکا کیوں کہ مجھے تو پتا تھا کہ میرے پاس شراب کے دو چھوٹے پائنٹ ہیں۔ میں رکا نہیں، وہ سمجھے پتا نہیں کیا بات ہے۔ انھوں نے موبائل میرے پیچھے لگا دی۔ میں نے اپنے دوست سے کہا بھی کہ اس کو پیچھے سے پھینک دے۔ اس سے وہ پھینکی نہیں گئی۔ پولیس نے ہمیں پکڑ لیا۔ دیکھا تو دو پائنٹ نکلے۔ انھوں نے کہا یہ شراب ہے تمھارے پاس، تم بیچتے ہو۔ میں نے کہا نہیں، ہم تو پینے کے لیے لائے ہیں۔ اس چکر میں انھوں نے میری ایف آئی آر کاٹ دی اور مجھے کورٹ جانا پڑا۔ پھر تین چار ہزار میں کیس ختم ہوا۔ تو یہ ہے۔ پولیس کے ساتھ میں یہاں تک پہنچا۔ باقی ہمارے ایریے کی پولیس ہمارے پاس آتی تھی اور کہتی تھی کہ بس تم ایسا کرو کہ روزانہ کا پائنٹ یا دو سو روپیہ ہمیں دے دیا کریں، پھر بیچیں یا جو مرضی آئے کریں۔ وہ خود آتے تھے، پیتے بھی تھے اور پیسے لے کر چلے جاتے تھے۔ اس وجہ سے پولیس کی طرف سے پریشانی نہیں رہی۔ لیکن یہ

ایک پیریڈ تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوئے۔ جیسے جیسے میں نے اپنے آپ میں تبدیلی لانی شروع کی تو میں نے یہ کام بالکل بند کر دیا۔ لیکن یہ پولیس والے تو نہیں مانتے کہ آپ نے بند کر دیا ہے۔ ان کو تو یہ ہوتا ہے کہ بھئی آپ کام کریں، ہمیں ہمارا شیئر چاہیے۔ پولیس والے میرے پاس آئے تو میں نے کہا کہ بند کر دیا ہے۔ جب تک یہ کام کیا آپ کو بھتا دیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہے تو کہاں سے دیں؟ وہ مانتے نہیں تھے۔ خیر جی، ان سے کافی منہ ماری ہوئی۔ اس وقت وہ چلے گئے۔ تین چار دن بعد میرے گھر چھاپا مارا۔ ایک چیز بھی میرے گھر سے نہیں ملی لیکن پھر بھی پکڑ کر لے گئے۔ پھر کچھ پیسے مجھے دینے پڑے۔ پھر میں اپنے دوست کو ساتھ لے کر گیا اور ایس ایچ او سے بات کی۔ پھر معاملہ رفع دفع ہوا۔

میں نشے کی طرف گیا اور اس طرف سے واپس آ گیا۔ اس کی دو تین وجوہات تھیں۔ ایک تو اس کی وجہ سے میری تعلیم ختم ہو گئی۔ میں نے شروع میں بتایا کہ میرا ایک خواب تھا، وہ ادھورا کیا بالکل ختم ہو گیا۔ مجھے پتا تھا کہ میں اب اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ دوسرا یہ کہ شروع سے گھر والوں کی طرف سے میری کوئی سپورٹ نہیں تھی کیوں کہ گھر والے تو مجھے شروع سے منع کرتے تھے، لیکن میں تھوڑا ضدی تھا تو میں نے کسی اور کے گھر میں رکھ کر یا وڈیو سنٹر میں رکھ کر گھر والوں کو پتا بھی نہیں چلنے دیا اور الٹے سیدھے کام کر لیے۔ لیکن گھر والوں کو جیسے ہی پتا چل گیا کہ اب یہ زیادہ آگے نکل گیا ہے تو مجھ پر پابندیاں بھی عائد ہونا شروع ہو گئیں اور ان پابندیوں کے ساتھ ساتھ میری وہ ایک ایج تھی میرج کی، کیوں کہ ہم لوگوں میں بیس بائیس برس کی عمر میں شادی ہو جاتی ہے۔ بائیس سال کی میری عمر تھی کہ گھر والوں نے رشتے کی بات کی۔ میں ایریا میں کافی پاپولر ہو چکا تھا وسکی کے حوالے سے کہ یہ لڑکا وسکی بیچتا ہے۔ بات بھی پکی ہو گئی، دو تین ماہ کے بعد لڑکی والوں کو پتا چلا کہ یہ لڑکا وسکی بیچتا ہے، تو انھوں نے انکار کر دیا۔ تو گھر میں بھی کافی پریشانی آ گئی۔ اب وہ ہر وقت مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تمھاری وجہ سے ایسے ہوا، اگر تم نہیں بیچتے تو آج یہ تو نہیں ہوتا۔ پھر اسی طرح میرج کے حوالے سے تین چار سال کا یہ پیریڈ گزر گیا۔ مجھے بھی کافی ٹینشن تھی کہ یہ غلط کام ہے جس کی وجہ سے رشتے کی بات میں ایسے واقعات آ جاتے ہیں۔ ایک واقعہ تو یہ ہوا کہ میری ایک جگہ بات چلی تو وڈیو سنٹر میں ہم تین چار دوست بیٹھے پی رہے تھے کہ دو آدمی آئے۔ کہنے لگے کہ جی پہلے تو انھوں نے نام پوچھا۔ میں نے سمجھا کہ پولیس والے ہیں۔ کہنے لگے کہ جی، محبوب کس کا نام ہے۔ کہنے لگے کہ اچھا، پھر مجھے گھور گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔ کہنے لگے ہمیں فلمیں چاہییں، بے حیائی کی۔ میں نے پوچھا کہ آپ پڑھے ہو؟ انھوں نے کہا ہاں، تو بے حیائی فلموں کی لسٹ دے دی۔ اس آدمی کے دیکھنے کا اسٹائل اور تھا۔ اس نے لسٹ رکھ دی اور کہا، میں چلتا ہوں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا کہ آپ ہیں کون؟ پہلے مجھے یہ بتلائیں، کیوں کہ آپ فلمیں لینے تو نہیں آئے۔ تو وہ آدمی ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ میں فلمیں لینے ہی آیا ہوں اور بعد میں لے لوں گا۔ میں نے کہا نہیں، آپ نے اس میں سے ایک فلم بھی نہیں لی اور نہ مجھ سے پوچھا ہے۔ تو وہ آدمی کہنے لگا میں سلاٹر ہاؤس سے آیا ہوں، وہ پتا نہیں اس لڑکی کا نام کیا تھا، اس کا ماموں ہوں۔ تو مجھے کافی شرمندگی

ہوئی کہ یہ بات تو ابھی چل رہی ہے اور یہ ہو سکتا ہے مجھے چیک کرنے آئے ہوں اور میں ایسی حالت میں ان کے سامنے آیا ہوں۔ تو میں نے کہا اصل میں میرے دوست کی شادی تھی اور ہم لوگ یہاں پی رہے ہیں۔ وہ کہنے لگا نہیں نہیں، کوئی بات نہیں۔ میں نے اپنی والدہ کو بتلا دیا۔ مجھے کافی شرمندگی ہوئی اور میری والدہ نے بھی رونا شروع کر دیا۔ خیر، وہ رشتہ بھی گیا۔ اسی وجہ سے کہ سب کہتے تھے لڑکا تو بیچتا بھی ہے اور پیتا بھی ہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد میں نے چھوڑ دی۔ میں یہ سمجھ رہا تھا دو تین دفعہ میں نے بریک بھی کیا تھا اس سلسلے کو لیکن پھر دوبارہ آ کر لوگ مجھے مجبور کر دیتے تھے۔ ارے یار، تو نے چھوڑ دی ہے، تیرے پاس نہیں ہے۔ جاؤ، وہ آدمی ہے، تجھے سستی بھی دے دے گا اور اصل مال بھی دے گا، تو تُو مجھے لا دے۔ باہر کے دوست بھی آتے تھے۔ تو میں پھر جاتا تھا اور کسی آدمی سے لا کر دے دی تو پھر دوبارہ وہ چیز ڈیولپ ہوتی تھی کہ کسی اور سے حوالا کر دیا ہے تو بدنامی تو وہی رہی، تو کیوں نہ میں اپنا لے کر آؤں۔ پھر دوبارہ اسی چیز میں آ جاتا تھا۔ تو میں نے سوچا اور یہ تجزیہ کیا کہ برائی اصل میں کہاں سے ہو رہی ہے۔ تو دیکھا کہ یہ وڈیو سنٹر سے بڑھ رہی ہے یہ بیماری۔ میں نے اپنا بہت سارا پیسے کا نقصان کیا اور وڈیو سنٹر کو بند کر دیا۔ کچھ اور دوست بھی تھے جنہوں نے میری مدد کی۔ جیسے ہی میں نے بند کیا، تو شروع سے میرے ذہن میں شوق تو تھا مختلف تنظیموں میں کام کرنے کا اور اس میں رہتے ہوئے بھی ہلکا سا میرا اٹیچمنٹ تو رہتا تھا، براہ راست نہیں تھا، لیکن میرے دوست تو وہی تھے جو میرے بچپن کے دوست تھے۔ جیسے ہی میں نے وڈیو سنٹر بند کیا اور فارغ ہوا تو پھر دوبارہ تنظیم میں چلا گیا اور آج تک خدا کا شکر ہے کہ اس چیز سے ہٹا ہوا ہوں۔

میں پانچویں جماعت میں تھا جب عیسیٰ نگری میں آیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک بہت سی تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ ان میں اچھی تبدیلیاں بھی ہیں اور بُری تبدیلیاں بھی۔ اصل میں یہ جو برائیاں آ رہی ہیں، اس میں یہ ہے کہ آدمی جب بالکل فری ہو گا تو اس کے سوچنے کا زیادہ رجحان غلط چیزوں کی طرف جائے گا۔ ویسے تو پورے پاکستان میں بے روزگاری کا مسئلہ ہے لیکن عیسیٰ نگری میں کافی زیادہ ہے۔ یا پھر یہ کہ جو ماں باپ ریٹائر ہو گئے ہیں کے ایم سی وغیرہ سے، تو انھوں نے اپنی اولاد کی ملازمت میں انٹری تو کروا دی ہے، لیکن وہ کام کرنے بھی نہیں جاتے۔ وہ اگر پڑھے لکھے بھی ہیں اور صفائی کے کام کو برا بھی سمجھتے ہیں، پھر بھی نام لکھوا دیا اور جاتے نہیں ہیں۔ گھر میں بیٹھے بٹھائے ہزار پندرہ سو روپیہ آ جاتا ہے۔ اس وجہ سے بھی ان کا رجحان غلط چیزوں کی طرف ہے۔ تاش بیٹھ کر کھیلیں گے۔ اگر جیت کر دکھا دو تو۔ اسی طرح وہ آہستہ آہستہ جُوئے کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ جوئے سے ہی نکل کر اگر کسی نے پیسے زیادہ جیت لیے ہیں، ہزار پندرہ سو، تو وہ یہ کہتے ہیں کہ آج تو نے جیتا ہے تو ہمیں پارٹی دے دے۔ تو وہ پارٹی کیا ہو گی، شراب کی ہو جائے گی۔ اسی طرح بڑھتے بڑھتے وہ آدمی مختلف برائیوں کی طرف چلا جاتا ہے۔

ان برائیوں میں ہیروئن بھی ہے، عیاشی بھی ہے۔ ہمارے علاقے میں کم سے کم دس پندرہ ہیں

جس کو ہم اپنی زباں میں مُورت کہتے ہیں۔ سکے ٹو بھی کہتے ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ وہی لوگ جو زیادہ عیاشی کی طرف مائل ہوتے ہیں، شراب ناچ گانا یا اداکاری کی طرف شوق رکھتے ہیں، ان کی دوستی ہو جاتی ہے اور وہی مُورتوں کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ ان کی ملاقات ہو جاتی ہے اور پھر ملاپ ہو جاتا ہے۔ اصل میں ترقی کے ساتھ ساتھ کچھ اچھی باتیں بھی ہوئی ہیں اور کچھ بری باتیں بھی ہوئی ہیں۔ پورے پاکستان میں، لیکن میں فی الحال اپنے علاقے کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارے علاقے میں ترقی ہوئی جس سے مراد یہ ہے کہ ایجوکیشن میں ترقی ہوئی، سماجی ترقی ہوئی۔ پانی نہیں تھا، گیس بجلی نہیں تھی، یہ چیزیں ملی ہیں ہم کو۔ تو اس کے ساتھ ساتھ کچھ بری چیزیں بھی ڈیولپ ہوئیں۔ جیسے دیکھا جائے تو چرس پینے والے لڑکے چوری چھپے استعمال کرتے تھے جیسے اگر کوئی پی رہا ہے اور دور سے دیکھا کہ وہ آدمی آ رہا ہے تو اسے چھپا لیتے تھے۔ جیسے ہی وہ آدمی کراس ہو کر ان کے پاس سے چلا گیا، دوبارہ سگریٹ بھرنی شروع کر دی۔ اور کہیں دور کونے کھانچوں میں بیٹھ کر پیتے تھے۔ اب یہ ہے کہ پینا تو دور کی بات ہے، دوسروں کے سامنے بیچتے ہیں۔ پچھلے دنوں تو یہ تھا کہ ہمارے ایریا میں جو لڑکے بیچتے تھے، ہاتھوں میں آدھے کلو کی تھیلی ہوتی تھی اور اس میں پڑیاں ہیروئن اور چرس کی ہوتی تھیں، تو ایک طرف کھڑے ہو کر اور خریدنے والے لڑکوں کی لائن ہوا کرتی تھی۔ ان کی بلا سے کوئی لیڈر آ رہی ہیں یا کوئی معزز بندہ آ رہا ہے، یا باہر سے کوئی مہمان آ رہا ہے۔ اکثر تو ایسا ہوا کہ کسی کا کوئی مہمان آ رہا ہے باہر سے اور اس کی صحت تھوڑی سی ڈاؤن ہے تو دوسرا آدمی یہی سمجھے گا کہ یہ باہر سے آیا ہے اور پینے والا ہے تو اس سے کہتے تھے، چل بھئی لائن میں لگ جا۔ تو ایسی اطلاع ہمیں ملی۔ لڑائی جھگڑے بھی ہوتے۔ اور دوسری برائی یہ ہے کہ ابھی ہمارے علاقے میں یہ مُورتیں بہت زیادہ ہیں۔ اور ان کا رہنے سہنے کا جو ڈھنگ ہے وہ بھی ترقی کر چکا ہے۔ شروع میں جہاں تک ہم نے دیکھا ہے کہ ہمارے علاقے میں تین چار اس قسم کے فی الحال تو ہم آدمی ہی کہہ سکتے ہیں تین چار آدمی تھے جن میں یہ چیزیں تھیں، عورتوں والے اسٹائل میں بولنے کے، چلنے پھرنے کے، یہ ان میں تھیں۔ تو اس کا یہی دیکھنے میں آیا تھا کہ گھر میں لڑکیاں زیادہ ہیں تو وہ بھی لڑکیوں کی طرح بولتے تھے یا لڑکیوں کے ساتھ کام کرتے تھے، آٹا گوندھ لیا یا برتن دھو لیے جھاڑو لگا لیا، تو اس سے وہ چیزیں پیدا ہو گئیں۔ لیکن وہ جو تین چار مُورتیں تھیں انہوں نے کیا کیا کہ ان کی جو ایج تھی میرج کی، اس پر ان کے گھر والوں نے ان کی شادی بھی کی، ان کے بچے بھی ہوئے لیکن وہ تھیں مورتیں۔ لیکن اب دیکھتے ہیں کہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں، وہ جو ان کی نشانیاں ہیں، وہ رونما ہو گئیں تو جو بڑی عمر کی مورتیں ہیں ان کے ساتھ چلے جاتے ہیں، شامل ہو جاتے ہیں ان کے گروپ میں اور گھر سے تقریباً نکل جاتے ہیں، آوارہ ہو جاتے ہیں۔ ان مورتوں نے گھروں کی قریب ہی ایسی جگہ بنالی ہے۔ ہمارے علاقے میں کرائے پر مکان لے لیا، وہیں رہنا شروع کر دیا۔ وہیں ان کے برتن ہیں، کھانا پینا ہے۔ جس طرح کوئی دوسرا آدمی اپنا گھر بنا کر رکھتا ہے، اسی طرح یہ بھی اپنے گھر کو بنا سنوار کر رکھتی ہیں اور نئی مورتوں کو وہاں پر رکھ کر باتیں سکھاتی ہیں۔ تو یہ ہے کہ اب وہ شرماتے نہیں ہیں۔ اپنے گھر والوں کو بولتے ہیں ہم

ہو رہی ہیں۔ اپنے بھائیوں کے سامنے بھی اور سارے رشتے داروں کے سامنے بھی وہی لیڈیز والے کپڑے پہنتے ہیں اور وہی لیڈیز والی چال۔ ان میں سے اکثر نے تو اپنا آپریشن تک کروا لیا ہے۔ اور اب بالکل آزادی ہے۔ ہم کوئی جرائم بھی کر رہے ہیں تو بالکل آزادی سے۔ یہ چیز ڈیولپ ہوئی ہے۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر صاحب نے سروے کیا، اس سلسلے میں وہ ان کا انٹرویو کرنا چاہ رہے تھے۔ تو ہم انھیں وہاں لے کر گئے تو وہاں پتا چلا کہ ہو رہی ہیں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو سیکس کے حوالے سے ہیں اور دوسری وہ ایسی ہیں، کسی کے گھر چلی گئیں، کسی کا بیٹا پیدا ہوا یا کسی کی خوشی ہے تو وہاں ناچ گا کر پیسے لے لیے۔ تو یہ ایک سماجی برائی ہے۔

شروع سے میں نے آپ کو بتلایا میرا زیادہ تر رجحان سوشل ورک کی طرف تھا۔ میں ساتویں آٹھویں کلاس میں تھا اس وقت ہمارا ایک گروپ سا ہوا تھا آٹھ دس لڑکوں کا، کوئی آٹھویں میں تھا، کوئی نویں میں تھا۔ تو ہمارے ذہنوں میں بھی یہی کام تھا کہ علاقے کے مسائل جو بھی ہیں، ان سے نمٹنے کے لیے چھوٹا موٹا گروپ ڈیولپ کیا جائے۔ اسی زمانے میں مائیکل جاوید، جو موجودہ ایم پی اے ہیں، ان کی عیسیٰ نگری میں انٹری ہوئی۔ یہ اصل میں کوئٹہ کے رہنے والے ہیں۔ ہم لوگ چھوٹا سا گروپ بنانے کی کوشش کر رہے تھے تو یہ انٹر ہوئے۔ ہم لوگ کرکٹ کھیلتے تھے اور یہ بھی وہیں کرکٹ کھیلنے آتے تھے تو دوستی بڑھی۔ اور یہ ہم سے آپ ہو کر یکسٹر اور اسلم مارٹن کی طرف چلے گئے لیکن یہ کہ ہم لوگوں نے بھی ان کے ساتھ کام کیا۔ جیسے ہی ہم لوگ چھوٹا سا گروپ بناتے تھے تو اس میں بہت جلدی ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جاتی تھی۔ یا تو ہم لوگ ناتجربہ کار تھے یا کوئی چیز سوچتے تھے تو فوری طور پر کرنے کے چکر میں آ جاتے تھے تو اس وجہ سے گڑبڑ شروع ہو جاتی۔ مطلب یہ کہ میٹنگ نہیں ہو پاتی تھی، یا کوئی کام کرنا ہے تو اس کی پلاننگ کر لی، پھر اس کو چھوڑ دیا۔ کافی لڑکوں نے دیکھا کہ اس میں کام نہیں ہو رہا تو انھوں نے اپنی اپنی راہیں منتخب کر لیں اور ان میں چلے گئے۔ اس وجہ سے میں بھی کافی بددل ہو چکا تھا اس سوشل ورک کے چکر میں۔ کچھ لڑکوں نے سوچا کہ عیسیٰ نگری کے پلیٹ فارم پر پھر دوبارہ کوئی تنظیم بنائی جائے۔ تو اس وقت انجمن کی تنظیم موجود تھی جسے بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے پاس بھی آئے، سلیم کھوکھر تھا اور دو تین لڑکے بھی تھے۔ تو میں نے کہا کہ نہیں جی، مجھے تو کافی پریشانی ہوئی ہے، اگر یہ تنظیم تین چار ماہ چلے گی تو میں خود آ جاؤں گا، اس لیے کہ مجھے یہ تجربہ ہے کہ کوئی بھی تنظیم ہو ایک دو ماہ کے بعد بالکل بیٹھ جاتی ہے۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ میری وہ بات غلط نکلی اور انجمن کافی عرصہ چلی۔ بس پھر کچھ اسٹیج آ گیا کہ میں دوسری طرف چلا گیا اور آٹھ دس سال کا پیریڈ میں نے سماجی کاموں سے دور رہ کر گزارا۔ پھر غلط کام چھوڑ دیے، سوشل ورک کی طرف واپس آ گیا اور کمیونٹی اسٹریٹیجی ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس پروجیکٹ میں کام کرتا رہا ہوں کہ علاقے کے نوجوانوں کو مثبت سرگرمیاں فراہم کریں تاکہ ان کو نشے کی طرف جانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

**

ذی شان ساحل

کراچی

اور دوسری نظمیں

سرورق اور ڈرائنگز
نعیمہ شاہ

قیمت: ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سماری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

کراچی کے مسئلے کو درست تناظر میں دیکھ پانے کے لیے اس اہم حقیقت کا سامنا کرنا ضروری ہے کہ شہر کے تقریباً نصف باشندے کچی آبادیوں میں رہنے پر مجبور ہیں جنہیں غیر قانونی قرار دیے جانے کے باعث شہر کے وسائل پر ان غریب باشندوں کا حق سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ان باشندوں کی تعداد، تخمینے کے مطابق، شہر کی قانونی آبادی کے مقابلے میں کم از کم دگنی رفتار سے بڑھ رہی ہے، اور اگر یہ رجحان جاری رہتا ہے تو آئندہ ایک دہائی کے عرصے میں شہر کی آبادی میں ان کی اکثریت ہو گی۔ چناں چہ کراچی شہر کو سمجھنے کے لیے کچی آبادیاں قائم ہونے کے عمل اور اس کے مضمرات پر پوری توجہ دینا لازمی ہے۔ اگلے چار مضامین میں یہی کوشش کی گئی ہے۔

تسنیم احمد صدیقی حکومت سندھ کے محکمے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے سربراہ ہیں۔ ان کا مضمون کچی آبادیاں کیوں؟ ان عوامل پر روشنی ڈالتا ہے جو کچی آبادیوں کے وجود کا باعث ہیں۔

کچی آبادیوں کو، جب وہ شہر کے ایسے علاقوں میں واقع ہوں جہاں زمین کی مالیت بڑھ رہی ہو، انہدام اور بے دخلی کے خطرے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ اپنے مالی فائدے کے لیے غریب باشندوں سے یہ زمین خالی کرانا چاہتے ہیں وہ رائے عامہ کو بیدار ہونے سے روکنے کے لیے ہر قسم کے لسانی، نسلی یا مذہبی اختلاف کو نفرت میں تبدیل کرنا روا رکھتے ہیں۔ عارف حسن اور کینتھ فرنانڈیز (Kenneth Fernandes) نے اپنے مضامین میں ایسی ہی دو آبادیوں کے انہدام کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

عارف حسن کا مضمون The Sohrab Goth Massacre کے عنوان سے کراچی کے ماہ نامہ ہیرلڈ کے فروری ۱۹۸۷ کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ کینتھ فرنانڈیز کا مضمون Katchi Abadis living on the edge کے عنوان سے شہری مطالعات کے ایک بین الاقوامی جریدے *Environment and Urbanization* کی جلد ۶، شمارہ ۱ (اپریل ۱۹۹۴) میں شائع ہوا۔

کینتھ فرنانڈیز کراچی کی مقامی مسیحی کمیونٹی کے فرد ہیں جو پچھلی ایک صدی کے دوران گوا سے آ کر کراچی میں آباد ہوئی اور اس شہر کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ وہ کراچی کے ایک غیر سرکاری ادارے Urban Resource Centre کے انتظامی سربراہ ہیں۔ اس ادارے کا کام کراچی کے شہری مسائل اور معاملات کے بارے میں حقائق، اعداد و شمار اور تجزیے جمع کرنا اور اسے فوٹو اسٹیٹ نقلوں اور مطبوعات کی صورت میں دل چسپی رکھنے والے افراد اور اداروں تک پہنچانا ہے۔ URC کی جانب سے ایک ماہانہ نیوز لیٹر *Facts & Figures* کے نام سے انگریزی اور اردو میں شائع ہوتا ہے۔

چوتھا مضمون دلال آباد کراچی میں سرکاری ملکیت کی زمین پر غیر قانونی قبضے اور اس زمین کے پلاٹوں کی فروخت کے عمل پر، جس کے ذریعے سے غیر آباد زمین کچی آبادی میں تبدیل ہوتی ہے، تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ ایک ولندیزی ریسرچ اسکالر یان فان ڈر لنڈن (Jan van der Linden) کی تحقیق کا حاصل ہے۔ فان ڈر لنڈن ایمسٹرڈیم فری یونیورسٹی سے وابستہ ہیں اور ۱۹۷۰ سے ۱۹۷۵ تک کراچی یونیورسٹی کے تعاون سے جوائنٹ ریسرچ پروجیکٹ ۴ (JRP-IV) کے تحت کراچی میں رہائشی سہولتوں کی صورت حال کے موضوع پر اپنے چند ساتھیوں سمیت نہایت اہم تحقیق کر چکے ہیں۔ اس پروجیکٹ کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ *Karachi Migrants, Housing and Housing Policy* کے عنوان سے ۱۹۹۱ میں وین گارڈ بکس، لاہور، نے شائع کیا۔ دلال آباد نامی مضمون اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔

تسنیم احمد صدیقی

انگریزی سے ترجمہ اجمل کمال

کچی آبادیاں کیوں؟

کچی آبادیاں آخر کیوں بنتی ہیں؟ آخر تمام شہری عمدہ مکانوں میں، منصوبہ بندی سے بسائے گئے محلوں میں، تمام شہری سہولتوں کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے؟ کیا لوگ خواہ مخواہ پسماندہ بستیوں میں رہتے ہیں؟ کیا یہ کچی آبادیوں کے باشندوں کا قصور ہے کہ وہ وہاں رہنے لگتے ہیں یا وہ کسی اَور کے عمل کا نشانہ ہیں؟ اور، کیا غریبوں کا شہر میں آنا اُن کا جرم ہے یا یہ ریاست اور اس کے اداروں کی ناکامی ہے کہ اُنھیں ان کے آبائی علاقوں میں روزگار کے موقعے فراہم نہیں کیے جا سکے اور یوں شہروں کی آبادی بے تحاشا بڑھ گئی؟

اس مختصر مضمون میں انھیں جیسے سوالوں پر گفتگو کی گئی ہے۔

مال دار اور خوش حال درمیانہ طبقے کے لوگوں کے نزدیک کچی آبادیاں شہر کی بدصورتی ہیں اور وہ ان آبادیوں کے وجود سے نالاں ہیں۔ وجہ ظاہر ہے۔ اگر اُن کے اپنے محلے کے درمیان کوئی کچی آبادی بن جائے تو ان کی جائیداد کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ وہ ان آبادیوں کو غلیظ اور ماحولیاتی طور پر آلودہ علاقوں کے طور پر دیکھتے ہیں جہاں ہر قسم کی سماجی بُرائیوں اور جرائم — منشیات، قمار بازی، عصمت فروشی وغیرہ — کے پھلنے پھولنے کے لیے سازگار ماحول ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ کچی آبادیاں سماجی اور سیاسی ہلچل کے مرکز ہیں۔

بہت سے اعلیٰ سرکاری افسر، شہری منصوبہ ساز، انجینیر اور ڈویلپر بھی کچی آبادیوں کے وجود سے متنفر ہیں۔ یہ آبادیاں ان کی حسِ جمال اور تجارتی مفادات کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ وہ انھیں بل ڈوزروں سے مسمار کروا کر اس قیمتی زمین کو کثیرمنزلہ عمارتوں یا خوب صورت باغات کے لیے استعمال کرنے کے خواہش مند ہیں۔ کچی آبادیوں کا وجود ان کی ناقص کارکردگی کی بھی عکاسی کرتا ہے کہ وہ شہر کے ماحول کو صاف ستھرا اور تجاوزات سے پاک رکھنے میں ناکام ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ افراد لینڈ مافیا کو ان آبادیوں کے قیام کا قصوروار ٹھہراتے ہیں اور غیرسرکاری تنظیموں (NGOs) کو ان آبادیوں کی حمایت کا۔ یہ ایسے اداروں کے بھی خلاف ہیں جو کچی آبادیوں میں کسی ترقیاتی کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو سنجیدگی سے احساس ہوتا ہے کہ ان کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ ان سے بھی کم تعداد ان لوگوں کی ہے جو یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر لوگ شہروں کا رخ کیوں کر رہے ہیں۔ کیا اپنے آبائی علاقوں کا محفوظ سماجی ماحول چھوڑ کر شہروں کی اجنبی دنیا میں قدم رکھنا آسان کام ہے جہاں دو وقت کی روٹی کے سوا کسی چیز کا آسرا نہیں؟ یہ بات جاننے کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا کہ یہ لوگ شہر کی لاکھوں کی آبادی میں شامل ہونے کے بعد کہاں رہتے ہیں۔ انہیں رہنے کے لیے زمین اور دوسری سہولتیں — پانی، ٹرانسپورٹ، بجلی — کون مہیا کرتا ہے، اور کس قیمت پر؟ اور سب سے اہم بات کہ شہر میں آنے والے لوگ اپنی دو وقت کی روٹی کیسے حاصل کرتے ہیں؟

مال دار اور اونچے درمیانہ طبقے کے لوگ اپنے الگ تھلگ، محفوظ اور صاف ستھرے محلوں میں بسی خوشی رہتے ہیں جہاں ان کے لیے ٹرانسپورٹ، علاج، تعلیم کا بندوبست ہے، زیر زمین نکاس اور فلٹر کیے ہوئے پانی کا انتظام ہے اور سپرمارکیٹوں، کلبوں، کھانے پینے اور تفریح کرنے کی عمدہ جگہوں کی دلکش دنیا موجود ہے۔ انہیں اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ غریب کن حالات میں رہتے ہیں اور ان کی روزمرہ زندگی کی دشواریاں کیا ہیں۔ اور بھلا انہیں اسے غرض ہو بھی کیوں؟ یہ تو دو شہروں کی کہانی ہے۔ دو کلچر، دو دنیائیں، دو قومیں جو ایک دوسرے کے پاس آباد ہیں۔ دولت کی بدنما نمائش کے بیچوں بیچ غریب باشندے جیتے مرتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا کچی آبادیاں اونچے طبقے کے لوگوں اور شہری منصوبہ سازوں کی نظر سے اوجھل رہ سکتی ہیں جب کہ ان میں بسنے والے لوگ کراچی کی کل آبادی کے ۴۰ فیصد سے بڑھ چکے ہیں؟ کیا وہ ان خوش حال لوگوں کی زندگیوں میں خلل ڈالے بغیر الگ تھلگ قائم رہ سکتی ہیں؟ نہیں، اب ایسا نہیں ہو سکتا۔

کچی آبادیوں کے وجود اور ان کی بڑھتی ہوئی تعداد نے حکام اور مال دار طبقوں کے لیے مسائل پیدا کرنے شروع کر دیے ہیں۔ جب آدھا شہر کچی آبادیوں پر مشتمل ہو — جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کے رہنے والے زمین پر غیرقانونی قبضہ کیے بیٹھے ہوں، اس تمام ڈویلپمنٹ کی قیمت کا ایک پیسا بھی سرکاری خزانے میں نہ پہنچا ہو، اور ان آبادیوں میں استعمال ہونے والے پانی، بجلی اور گیس کی قیمت ان کے متعلقہ محکموں کو نہ ملتی ہو — تو باقی آدھے شہر کے لیے مشکلات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ جب کوئی معاشرہ اپنے کم خوش نصیب شہریوں کو جگہ دینے میں ناکام رہے تو اس کے اقتصادی نتائج خاصے ہولناک ہو سکتے ہیں، لیکن اس مسئلے کے مضمرات سمجھنے کی کسی کو فرصت نہیں۔

یہ تباہی کا ایک مکمل دائرہ ہے۔ دیہات کے غریب باشندے روزگار کی تلاش میں شہر آتے ہیں۔ سب سے پہلے انہیں زمین کا ایک ٹکڑا چاہیے جہاں کم سے کم بنیادی سہولتیں میسر ہوں اور اس زمین کی قیمت آسان قسطوں میں ادا کی جاسکے۔ یہ لوگ محنتی، باہمت اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض ماہر ہُنرمند ہوتے ہیں، کچھ کا ہنر کم درجے کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ سرکاری نوکریاں تلاش نہیں کرتے بلکہ اپنی صلاحیت کے بل پر اپنی روزی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر انہیں ایک چھوٹا سا پلاٹ مل جائے تو وہ اس پر اپنا

مکان تھوڑا بہت سا کر وہاں رہنے لگتے ہیں اور ایسے وسائل استعمال کر کے اسے رفتہ رفتہ بہتر بناتے رہتے ہیں۔ وہ پانی، بجلی، گیس وغیرہ کے قیمت بھی ادا کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ لیکن حکومت انھیں رہنے کے لیے زمین مہیا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ جہاں جہ وہ زمینوں کے قبضہ گیروں کے ہاتھوں میں جا پڑتے ہیں جو سرکاری زمین کو اپنی ملکیت ظاہر کر کے اُن سے وہی قیمت وصول کرتے ہیں جو اگر حکومت اس کام کے لیے تیار ہوتی تو اُسے بھی مل سکتی تھی۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ کچی آبادیوں میں رہنے والے پانی، بجلی وغیرہ قیمت دیے بغیر حاصل کرتے ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ سرکاری محکمے انھیں یہ سہولتیں جائز طریقے سے مہیا نہیں کرتے۔ ان محکموں کا طریقِ کار بہت پیچیدہ ہے۔ بدعنوانی کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ روز کی مزدوری کرنے والے لوگ کنکشن حاصل کرنے کے لیے ان کے دفتروں کے بے شمار چکر نہیں لگا سکتے۔ لہذا وہ لوگ یہ سہولتیں لائن مین اور والو آپریٹر کو مروجہ ریٹ پر رقم ادا کر کے حاصل کرتے ہیں۔ انھیں قیمت ادا کیے بغیر بجلی اور پانی حاصل کرنے کا الزام دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ سرکاری ریٹ سے زیادہ قیمت ادا کرتے ہیں اور استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ اس عمل کے نتیجے میں سرکاری محکمے غریب اور ان کے اہلکار مالدار سے مالدار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اس کی ایک مختصر سی مثال یہ ہے کہ کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن (KESC) زبردست خسارے میں چلتی ہے اور ڈویلپمنٹ اور مینٹے ننس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ صرف کچی آبادیوں میں استعمال ہونے والی بجلی نہیں ہے۔ مالدار صنعت کار، سینماؤں، آئس فیکٹریوں، شادی ہالوں کے مالک اور اونچے ہاتر لوگ بجلی چُراتے ہیں، کارپوریشن کی لیبر یونینیں جعلی اوورٹائم اور میڈیکل بِل انتظامیہ سے زبردستی منظور کراتی ہیں، کارپوریشن کے اعلیٰ افسر ٹھیکے دیتے وقت بھاری کمیشن وصول کرتے ہیں۔ یہ سارا مالی بوجھ اُن صارفوں کو اٹھانا پڑتا ہے جو اپنے بجلی کے بِل باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اور سخت مہنگائی اور بے تحاشا بڑھتے ہوئے سرچارج برداشت کرتے ہیں۔ اس طرح، اگر ہم مہینے بھر استعمال کی ہوئی بجلی کے بدلے کارپوریشن کو تین سو روپے ادا کرتے ہیں تو اس کا ایک تہائی حصہ عملے کی بدعنوانی اور ناکارکردگی کی قیمت ہوتی ہے اور ایک تہائی اُس چوری کی ہوئی بجلی کی جو امیروں اور غریبوں کے کام آئی۔

کچی آبادیوں کے باشندے

مقبول عام خیال کے برعکس، کچی آبادیوں کے باشندے نہ تو جرائم پیشہ ہیں نہ منشیات فروش نہ غیر قانونی پناہ گزین نہ دہشت گرد اور نہ مائیں مارو کے انقلابی۔ (افسوس، انقلاب کے دن گزر چکے ہیں!) یہ بالکل عام، قانون پسند، سیدھے سادے شہری ہیں جو کسی نہ کسی طرح اپنی روزی کما رہے ہیں۔ اس میں

نہیں کہ ان آبادیوں میں بھی سماج دشمن عناصر اور بدمعاش موجود ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کچھ کچی آبادیاں غیرقانونی پناہ گزینوں کو رہنے کی جگہ دیتی ہیں۔ لیکن ان لوگوں سے کراچی کا کون سا محلہ خالی ہے؟ فرق صرف قوت برداشت کا ہے۔

ہمارے اونچے طبقے کو اس زبردست معاشی سرگرمی کی خبر ہی نہیں ہو پاتی جو ان کچی آبادیوں میں جاری و ساری ہے۔ دراصل یہ آبادیاں شہر بھر کی معاشی سرگرمی کی شہ رگ ہیں۔ یہی شہر کی صنعتوں کو بھی ہنرمند مزدور فراہم کرتی ہیں اور یہاں کے باشندے خود بھی چھوٹے پیمانے کی بے شمار اور قسم قسم کی صنعتیں چلاتے ہیں۔ یہاں تقریباً ہر مکان ایک ورکشاپ ہے جہاں پورے پورے خاندان پیداواری سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ ان آبادیوں سے بڑے صاحب لوگوں کو ڈرائیور، بیگم صاحباؤں کو آیائیں اور ماسیاں، بڑے تجارتی اداروں کو ٹائپسٹ اور سروس سیکٹر کو ہر طرح کے کارندے ملتے ہیں۔ شہر کے ماہر مکینک، پلمبر، الیکٹریشین اور موچی انہیں آبادیوں میں رہتے ہیں۔ یہ شہر میں جاری تعمیراتی سرگرمیوں کے لیے راج اور مزدور مہیا کرتے ہیں اور شہر کا پورا ٹرانسپورٹ کا نظام چلاتے ہیں۔ کیا کراچی جیسا بڑا شہر ان کے بغیر ایک دن بھی چل سکتا ہے؟

ملک کے دیہات اور قصبوں سے کراچی میں آکر بسنے والے لوگ شہر کو اپنے ہنروں، تکنیکوں، ثقافتی طور طریقوں اور قدروں سے مالامال کر رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو شہر کی زندگی کو متحرک رکھتے ہیں اور پاکستان کی معاشی ترقی اور ثقافتی اور لسانی یک جہتی کی کلید انہیں کے پاس ہے۔

شہر کی جانب نقلِ مکانی کے اسباب

کچی آبادیوں کے بیشتر باشندے دیہی علاقوں سے آئے ہیں جہاں ان کے لیے دو وقت کی روٹی کمانا دشوار ہو گیا تھا۔ ان کی شہروں کی طرف ہجرت کے کئی فوری اسباب ہوتے ہیں

* موروثی زمینوں کا بٹوارا۔
* آبادی میں اضافہ (جس کی شرح ۳٫۲ فیصد سالانہ ہے۔)
* بے تحاشا کاشت اور کیمیائی کھاد کے بڑھتے ہوئے استعمال سے زمین کا کمزور پڑ جانا یا سیم اور تھور کا شکار ہو جانا (ہر سال چالیس ہزار ہیکٹیئر زمین اس طرح سیم زدہ ہوتی جا رہی ہے۔)
* جنگلوں کا تیزی سے کٹنا، خاص طور پر شمالی علاقوں میں جہاں اس کے نتیجے میں سیلاب بار بار آنے لگے ہیں اور زرخیز مٹی اکھڑتی جا رہی ہے۔

دیہی علاقوں میں لوگوں کے پاس قابل کاشت زمین کم ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۹۵۱ میں فی کس قابل کاشت رقبہ ۰٫۴۶ ہیکٹیئر تھا جو ۱۹۸۱ تک کم ہو کر ۰٫۳۱ ہیکٹیئر فی کس ہو چکا تھا۔ ۱۹۶۰ کی دہائی میں سبز انقلاب کے تحت زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں اور کیمیائی کھادوں کے استعمال سے صورت

حال میں اَور شدت پیدا کی۔ زرعی سیکٹر کو مشینوں اور ٹیکنولوجی پر بہت سرمایہ لگانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خوش حال زمین داروں نے چھوٹے کسانوں کی زمینیں خرید لیں جو یہ خرچ برداشت نہ کر سکتے تھے۔
اُن علاقوں میں معاشی مواقع نہ ہونے کے برابر تھے اور بے زمین ہونے والے لوگ وہاں کوئی اَور پیشہ اختیار کر کے دووقت کی روٹی حاصل نہیں کر سکتے تھے، چناں چہ انھوں نے شہروں کی طرف نقل مکانی شروع کی۔

جینے کا ہُنر

جب یہ لوگ شہر میں آتے ہیں تو زیادہ تر جسمانی محنت کا کام کرتے ہیں یا ٹھیلا چلا کر چھوٹی موٹی چیزیں بیچتے ہیں یا ایسا کوئی اَور پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر قسمت زور کرے تو کسی کمپنی یا سرکاری دفتر میں چپراسی یا چوکیدار لگ جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ شہر کی زندگی سے تعلق پیدا کرتے ہیں اور اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے لگتے ہیں۔ اِن میں سے ہر قدم پر غیر رسمی سیکٹر ہی ان کی مدد کرتا ہے، کیوں کہ حکومت کی طرف سے کوئی تعاون یا امداد حاصل نہیں ہوتی۔ اِن کی زندگی کو ذرا قریب سے دیکھیے۔ رہنے کے لیے زمین خریدنی ہو یا مکان بنانے کے لیے قرض حاصل کرنا ہو، یا ٹرانسپورٹ پانی بجلی وغیرہ کے مسائل حل کرنے ہوں، ہر جگہ غیر سرکاری، غیر رسمی سیکٹر ہی ان کے کام آتا ہے۔
ان کا اپنا علاج معالجے کا نظام ہے، اپنے تعلیمی ادارے ہیں، اپنی تفریح گاہیں ہیں۔ ان میں سے ہر چیز ان کی مالی استطاعت کے مطابق ہے، گھر کے قریب واقع ہے اور رسم سے ہم آہنگ ہے۔ کم ہی لوگ اس بات پر یقین کریں گے کہ کچی آبادیوں کے بیش تر والدین اپنے بچوں کو تجارتی بنیاد پر چلائے جانے والے چھوٹے اسکولوں میں بھیجتے ہیں اور فی بچہ ۲۵ سے ۶۰ روپے تک ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ تعلیم کی اہمیت سے آگاہ ہیں اور سرکاری پرائمری اسکولوں پر انحصار نہیں کرتے جو ایک تو ہر محلے میں موجود نہیں ہیں اور جہاں ہیں بھی وہاں ان کا معیار نہایت گھٹیا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بعض کچی آبادیوں میں خواندگی کا تناسب ۸۰ فیصد تک پہنچا ہوا ہے۔

کچی آبادیوں کی قسمیں

کراچی کی کچی آبادیوں کو مجموعی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے
(۱) پرانی کچی آبادیاں جو اُس وقت وجود میں آئیں جب ہندوستان سے چھ لاکھ مہاجر شہر میں آئے۔ یہ ۱۹۵۰ کی دہائی کے وسط سے، جب کراچی میں صنعتیں لگنی شروع ہوئیں، بڑی تعداد میں لوگ

ملک کے شمالی علاقوں سے آ کر شہر میں بسنے لگے۔ دونوں موقعوں پر حکومت اتنی بڑی تعداد میں بے روزگار اور بے گھر لوگوں کا بندوبست کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ جہاں جہ دونوں موقعوں پر انھوں نے شہر کے مرکزی علاقے کے آس پاس کی خالی جگہوں پر قبضہ کر کے رہنا شروع کر دیا۔ تب یہ سرگرمی بالکل فطری طور پر ہوئی اور اس عمل میں دلالوں یا قبضہ گیروں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اس طرح آباد ہونے والے محلے تعمیر کی منصوبہ بندی کے، بالکل بے ترتیبی سے بسے اور ان میں سڑکوں یا سہولتوں کی فراہمی کی کوئی گنجائش نہ رکھی گئی۔

(۲) ۱۹۷۰ کے آس پاس، اور خصوصاً مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کے بعد، مہاجروں کی ایک نئی لہر کراچی میں داخل ہوئی۔ حکومت اس بار بھی ان کا پوری طرح بندوبست کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اب ایک نیا عمل شروع ہوا۔ رہائش کی نئی ضرورتوں اور مانگ کے پیدا ہونے سے پیشہ ور قبضہ گیروں اور دلالوں پر مشتمل ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ انھوں نے پھیلتے ہوئے شہر کی بیرونی سرحدوں پر واقع سرکاری زمین کے بڑے بڑے قطعات پر قبضہ کر لیا اور ان پر غریب اور کم آمدنی والے لوگوں کے لیے چھوٹے چھوٹے پلاٹ بنائے۔ اس منصوبہ بندی میں انھوں نے کے ڈی اے کے طریقوں کی پیروی کی اور سیدھی سڑکوں، تجارتی علاقوں اور شہری سہولتوں کے لیے کھلی جگہوں کا انتظام رکھا۔ ضرورت مند لوگ انھیں نقد قیمت ادا کرتے اور انھیں ایسے پلاٹ کا فوری قبضہ مل جاتا۔ کوئی قاعدے کی کارروائی حائل نہ ہوتی۔ تمام سہولتیں انھیں آہستہ آہستہ اور طویل عرصے میں فراہم ہوتیں۔ یہ ملیر، قصبہ، اورنگی اور لانڈھی کی بڑی کچی آبادیوں کی ابتدا تھی۔

کچی آبادیوں کا ظہور شہر کے غریب باشندوں کی رہائشی ضرورتوں کا ایک حل ہے جو غیر رسمی سیکٹر نے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شہر کی مربوط اور حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی کرنے کے سلسلے میں معاشرے کی ناکامی کا بھی مظہر ہے۔ اگر معاشی نظام معاشرے کے تمام طبقوں کی ترقی کو مدنظر رکھتا، منصفانہ ہوتا اور تمام طبقوں کی سماجی اور معاشی حالت سے ہم آہنگ ہوتا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کراچی شہر میں اس وقت ایک بھی کچی آبادی نہ ہوتی۔ آخر یہی شہر تھا جسے ۱۹۴۷ تک سوئز کے اس طرف کے علاقے کا سب سے صاف ستھرا شہر کہا جاتا تھا۔ لیکن اگر اس شہر کی منصوبہ بندی پر شروع سے طاقتور ڈویلپروں، ٹھیکے داروں، لینڈ مافیا، لالچی سیاست دانوں اور اُتنے ہی بدعنوان اور بے کردار سرکاری اہلکاروں کی بالادستی رہی ہوتی تو آج یہ شہر اس سے کہیں زیادہ بری حالت میں ہوتا۔

کچی آبادیوں کی مستقلی

۱۹۷۵ کے بعد سے کچی آبادیوں کی مستقلی اور بہتری ریاستی پالیسی میں شامل ہے۔ اس سے پہلے حکومت کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ان لوگوں کو ان آبادیوں سے ہٹا کر کہیں اور سے سائٹ مکان فراہم کیے

جائیں (جیسا کہ ۶۰-۱۹۵۹ کی کورنگی اسکیم تھی) یا ادھورے تعمیر شدہ مکان مہیا کیے جائیں (جیسا کہ ۱۹۷۰ کی دہائی کے میٹروول پروگرام کا مقصد تھا)۔ لیکن یہ کوششیں ناکام رہیں۔ کچی آبادیوں کی مستقلی کا فیصلہ کرنے کے بعد ابتدا میں میونسپل کارپوریشن کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ کچی آبادیوں کے باشندوں کو لیز اور شہری سہولتیں فراہم کرے۔ لیکن ۱۹۸۷ میں ایک نیا محکمہ سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے نام سے قائم کیا گیا جس کا کام ان تمام کارروائیوں میں ربط پیدا کرنا اور کچی آبادیوں کی مستقلی کے عمل کو تیز کرنا تھا تاکہ اسے پانچ سال کے اندر اندر پورا کیا جا سکے۔

۱۹۸۹ میں کراچی اسپیشل ڈویلپمنٹ پروگرام کے تحت ۲۰۰ کچی آبادیوں کی بہتری کے لیے ۱۳ کروڑ ۱۶ لاکھ ۶۶ ہزار روپے کی رقم فراہم کی گئی۔ یہ رقم ۵ کروڑ ۲۲ لاکھ کی اُس رقم کے علاوہ تھی جو سندھ کے سالانہ ترقیاتی پروگرام کے تحت رکھی گئی تھی۔

لیکن اس سب کے باوجود کچی آبادیوں کی مستقلی اور بہتری کے کام کی رفتار نہایت سست تھی۔ مقامی کاؤنسلوں اور کچی آبادی اتھارٹی کی کارکردگی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۵ سے ۱۹۹۳ تک کے اٹھارہ برسوں میں ۱۲۹۳ غیر قانونی بستیوں میں سے (جنہیں نومبر ۱۹۹۰ تک کچی آبادیوں کا درجہ دیا جا چکا تھا) صرف ۱۳۲ کی بہتری کا کام مکمل ہوا ہے۔ لیز یا جائیداد کی ملکیت کے کاغذات (PEC) فراہم کرنے کا کام بھی اتنا ہی سست ہے۔ کچی آبادیوں کے ۶۱۸،۸۱۵ مکانوں میں سے صرف ۲۹،۷۲۶ مکانوں کو لیز اور ۳۵،۲۲۴ کو پی ای سی مل سکی ہے۔ یہ رفتار ایک فیصد سالانہ سے بھی ذرا کم ہے۔ اس رفتار سے سندھ کی تمام کچی آبادیوں کو بہتر بنانے میں سو سال لگیں گے، بشرطیکہ اس عرصے میں کوئی نئی کچی آبادی وجود میں نہ آئے۔

ایسی ناکارکردگی، نااہلی اور بے بصیرتی کو تسلیم کرنے کے بجائے کچی آبادیوں سے متعلق سرکاری محکموں کے اہلکاروں نے کچی آبادیوں کے باشندوں کے بارے میں کچھ عجیب و غریب اور غلط تصورات پھیلا دیے ہیں جو درج ذیل ہیں

(۱) کچی آبادیوں کے باشندے لیز حاصل کرنا ہی نہیں چاہتے۔ چوں کہ حکومت کے اعلان ہی سے ان کو زمین اپنے قبضے میں رکھنے کا غیر دستاویزی حق مل جاتا ہے، اس لیے انھیں دستاویزات حاصل کرنے سے کوئی دل چسپی نہیں رہتی۔

(۲) وہ اس قدر غریب ہیں کہ لیز کی رقم ادا نہیں کر سکتے۔ یہ رقم ان کی استطاعت سے باہر ہے۔ اگر اسے کم بھی کر دیا جائے تو وہ اتنی ہمت نہیں کر سکتے کہ یہ رقم ادا کر سکیں۔

(۳) سرکاری محکموں اور لوکل کاؤنسلوں کے پاس وسائل اتنے کم ہیں کہ وہ تمام آبادیوں کی مستقلی اور بہتری کا کام انجام نہیں دے سکتے۔

ان تصورات کی جانچ کے لیے اکتوبر ۱۹۹۰ میں سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی طرف سے لیز جاری کرنے کا ایک چھوٹا سا آزمائشی پروجیکٹ شروع کیا گیا۔ کراچی کی چار، اور حیدر آباد اور سکھر کی دو دو کچی

آبادیوں کو اس مقصد سے منتخب کیا گیا۔ اسی طرح ترقیاتی بہتری کے کام کے لیے کراچی اور سکھر کی چند کچی آبادیاں چنی گئیں اور ان آبادیوں کی بیرونی ترقیاتی تعمیر کے سلسلے میں یونیسیف اور اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے تعاون سے کم لاگت کے منصوبے تیار کیے گئے۔

لیز جاری کرنے کا کام شروع کرنے سے پہلے اس بات کی تحقیق کی گئی کہ درخواست گزاروں کو لیز جاری کرنے کی راہ میں کیا رکاوٹیں ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ ان کو لیز حاصل کرنے کی کوشش سے جو چیز باز رکھتی ہے وہ ان میں دل چسپی یا لیز کی رقم ادا کرنے کی صلاحیت کا فقدان نہیں بلکہ سرخ فیتے کا پیچیدہ طریق کار ہے۔ لیز جاری کرنے کے نظام میں مندرجہ ذیل خامیاں پائی گئیں

(۱) طریقِ کار نہایت پیچیدہ اور دشوار ہے۔ درخواست گزار کو اس پورے عمل میں کم از کم دس مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہر مرحلے پر مختلف دفتروں کے کئی چکر لگانے پڑتے ہیں۔ لیز کی منظوری میں دو تین مہینے لگ جاتے ہیں۔ درخواست گزار عموماً روز کی اجرت پر کام کرنے والے لوگ ہوتے ہیں اور اپنا کام چھوڑ چھوڑ کر نہیں آسکتے۔ اور آبادی کی مالی حالت کے لحاظ سے پانچ سو سے دو ہزار روپے تک ان سے مختلف مرحلوں پر مختلف سرکاری اہلکار رشوت کے طور پر مانگتے ہیں۔ بعض صورتوں میں رشوت کی رقم لیز کی سرکاری رقم کے برابر پہنچ جاتی ہے۔

(۲) آبادی میں ترقیاتی کام کا طریق کار نہایت ناقص ہے۔ یہ بہت مہنگا بھی پڑتا ہے کیوں کہ بیشتر صورتوں میں نہ تو پہلے سے موجود ترقیاتی صورت حال کا جائزہ لیا جاتا ہے اور نہ لاگت کم کرنے کے لیے ڈیزائن میں تبدیلی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تعمیری کام ناقص ہوتا ہے کیوں کہ نگرانی نہیں کی جاتی۔

(۳) سڑکوں کو چوڑا کرنے کے لیے غیر ضروری انہدام کیے جاتے ہیں۔ اگر اس سے متاثر ہونے والے باشندوں آبادی کے بیس پچیس فیصد لوگ ہوں تو وہ باقی باشندوں کو لیز کی درخواست نہ دینے پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ ان متاثرہ خاندانوں کی رہائش کا متبادل انتظام کرنا بھی بہت دشوار کام ہے۔ عموماً اس مقصد کے لیے زمین موجود ہی نہیں ہوتی۔

ان مشکلات سے نمٹنے کے لیے پورے عمل پر نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اصل مقصد ناکامی کے اس دائرے کو توڑ کر لیز جاری کرنے کے کام کو تیز کرنا تھا۔ اس کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل فیصلے کیے گئے اور انھیں تیزی سے عمل میں لایا گیا

(۱) کام کو دفتر میں مرکوز رکھنے کا سلسلہ ختم کیا گیا۔ فیصلہ ہوا کہ لوگ درخواستیں لے کر افسروں کے پاس نہ آئیں بلکہ افسر خود ان کے پاس جائیں۔ چناں چہ کچی آبادیوں میں لیز کیمپ لگائے جائیں اور دن بھر کی تمام دفتری کارروائی وہیں کیمپ میں کی جائے۔ چھوٹے موٹے تنازعات لیز ٹیم کا سربراہ موقعے پر ہی آبادی کے باشندوں کے ساتھ مل کر طے کرے۔ صرف بڑے معاملات اور پالیسی پر اثر ڈالنے والے فیصلوں کے لیے ڈائرکٹر جنرل سے رجوع کیا جائے۔

(۲) بیر جاری کرنے کے مرحلوں کی تعداد کو کم سے کم کردیا جائے۔

(۳) تمام طریق کار بالکل شفاف ہو۔ لوگوں کو پیسروں، پمفلٹوں اور اعلانوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائیں۔

(۴) آبادی کے باشندوں اور ان کے نمایاں افراد کو لیز کے کام میں شامل کیا جائے۔ وہ ایک کمیٹی سا کر کام کے مختلف مرحلوں کی نگرانی کریں۔

(۵) انہدام صرف وہاں کیا جائے جہاں ناگزیر ہو کیوں کہ اکثر صورتوں میں یہ نہ صرف غیر ضروری ہوتا ہے بلکہ لوگ اپنے قبضے کا فالتو رقبہ چھوڑنے پر آسانی سے راضی بھی نہیں ہوتے۔

(۶) لیز کی رقم کو آبادی کے باشندوں کی مالی حالت کے مطابق رکھنے کے لیے ہر کچی آبادی کو ایک علیحدہ اکائی کے طور پر دیکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے اس سارے ترقیاتی کام کو پیشِ نظر رکھا جائے جو لوکل کاؤنسلیں یا کاؤنسلر اپنے ترقیاتی فنڈ سے وہاں پہلے ہی کر چکے ہیں۔

(۷) ترقیاتی کام کی لاگت کو مزید کم رکھنے کے لیے جہاں کہیں ممکن ہو ڈرائن میں تبدیلی پر غور کیا جائے۔ اس طرح ترقیاتی کام کے لیے رقم کی کمی نہیں ہو گی اور وہ جلد تکمیل رہ سکے گا، کیوں کہ حکومت نے زمین کی قیمت دس روپے فی مربع گز بہت معقول رکھی ہے۔

(۸) معلوم ہوا کہ آبادی کی مستقلی کا کام شروع کرنے سے پہلے صرف تین چیزوں کی معلومات فراہم ہونا ضروری ہے۔ (الف) آبادی کا حالیہ نقشہ، (ب) ترقیاتی کام کا نقشہ اور (ج) بیلڈنگ جس میں ہر پلاٹ اور اس کے مالک کے بارے میں درست معلومات درج ہوں۔

لیز کیمپ جوں ہی لگائے گئے وہاں لیز کی درخواستیں دینے اور لیز کی رقم کے چالان جمع کرانے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ آٹھ مہینے سے بھی کم وقت میں سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی تاریخ میں پہلی بار مالی طور پر خود کفیل ہو گئی۔ اس مختصر مدت میں اس نے لیز کی رقم کی مد میں ۸۹ لاکھ ۶۷ ہزار روپے جمع کیے جو اس کے سال بھر کے بجٹ کے برابر تھے۔ اس آزمائشی پروجیکٹ کے نتائج نے کچی آبادیوں کے باشندوں کے بارے میں تمام غلط تصورات کی نفی کر دی۔

**

عارف حسن

انگریزی سے ترجمہ افضال احمد سید

سہراب گوٹھ کا انہدام

سہراب گوٹھ میں قتلِ عام ۱۱ دسمبر ۱۹۸٦ کو، علی گڑھ کالونی کے قتل وغارت کے دو دن بعد، شروع ہوا۔ یہ انسانی جانوں کا نہیں بلکہ گھروں، معاشی سرگرمیوں، کمیونٹی تنظیموں، تعلیم اور صحت کے اداروں اور آکاخیل آبادی کی امیدوں اور امنگوں کا قتلِ عام تھا جو یہاں ۱۹۷۲ سے رہتی آئی تھی۔ یہ اپنے طبعی اور معاشرتی ماحول کو بہتر بنانے کی ان کی سولہ سالہ جدوجہد کا قتلِ عام تھا جس پر انھوں سات کروڑ سے زیادہ روپیے صرف کیے تھے۔ یہ قتلِ عام، علی گڑھ کالونی کے قتلِ عام کے برخلاف، مافیا کے قاتل گروہوں نے نہیں، بلکہ حکومتِ پاکستان نے، کچی آبادی کے مکینوں سے کیے ہوئے اپنے وعدوں، عوام کے آئینی حقوق اور ریاستی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، کیا تھا۔

اس قتلِ عام سے ۲۰۰ پاکستانی اور ۱۲۰۰ کے قریب آکاخیل خاندان متاثر ہوئے۔ انھیں بے دخل کر کے سپر ہائی وے پر بنائے گئے تین کیمپوں میں منتقل کیا گیا، جہاں وہ ناداروں کی طرح کھلے آسمان کے نیچے پڑے رہے۔

آکاخیل، کوُچی یا پاوندے بھی کہلاتے ہیں۔ تاریخی طور پر یہ وہ خانہ بدوش ہیں جو موسمِ خزاں میں وسط ایشیائی برفانی میدانوں سے ہندوستان کے میدانی علاقوں کو ہجرت کیا کرتے اور موسم بہار کے اواخر میں وسط ایشیا کو لوٹ جاتے۔ ۱۹۲۰ میں بالشویک حکومت نے ان کی نقل و حرکت ماوراالنہر تک محدود کر دی۔ ۱۹۴۷ میں قیامِ پاکستان کے بعد سے ان کے لیے دریائے جہلم عبور کر کے ہندوستان جانا ممکن نہیں رہا۔ ۱۹٦۰ میں حکومتِ پاکستان نے ان کی ڈیورنڈ لائن کے ساتھ نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی، اور اس طرح ان کی بڑی تعداد صوبہ سرحد میں بس گئی اور یہ پاکستانی شہری بن گئے۔

تمام خانہ بدوش گروہوں کی طرح کوچیوں کے پاس بھی کبھی غیر منقولہ جائیداد (مثلاً زمین یا مکانات) نہیں رہی، اور مستقل آباد لوگوں نے، جن کے علاقوں سے ان کی آمدورفت رہی ہے، انھیں ہمیشہ مشکوک سمجھا۔ ان کی چند ذیلی برادریوں کے افراد وسط ایشیا سے اُون لے کر میدانی ہندوستان تک آتے اور واپسی میں سوتی کپڑے لے جاتے۔ ذیلی برادری کے یہ افراد رفتہ رفتہ کپڑے اور گھریلو

اشیائے صرف کے فروخت کرنے والے بن گئے اور آج بھی پاکستان کے طول و عرض میں، ان میں سے اکثر گھر گھر گھوم کر ایسی اشیا فروخت کرتے ہیں۔

۱۹۷۱ میں تقریباً ۸۰۰ آکا خیل خاندان پشاور کے کوچی بازار سے اٹھ کر کراچی آ گئے۔ کراچی میں خانہ بدوشوں کے خلاف تعصب صوبہ سرحد کی بہ نسبت کم تھا اور یہاں بہتر معاشی مواقع میسر تھے۔ ابتدا میں انھوں نے ابراہیم حیدری میں ایک خیمہ بستی بسائی مگر ۱۹۷۲ کے اوائل میں وہ اپنے خیموں کو سہراب گوٹھ کے قریب لے گئے جو سپر ہائی وے پر بلوچیوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ برادری کا ایک بزرگ حاجی فتح خان نے اس مقام کو منتخب کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا، کوچی ہمیشہ شہر سے دور رہا کرتے ہیں اور اُن دنوں یہ جگہ ایک ویرانہ تھی۔ ابھی یہ گلشن آباد ہوا تھا اور نہ بازار کھڑے ہوئے تھے۔ یہ جگہ سڑک کے ساتھ تھی اور اس طرح ہم شہر تک ایسی اشیا فروخت کرنے آسانی سے جا سکتے تھے۔

خیموں کی جگہ بتدریج مٹی کی دیواروں اور چٹائی کی چھتوں نے لے لی۔ پھر مٹی کی دیواروں اور چٹائی کی چھتوں کی جگہ کنکریٹ کے بلاک اور ٹین کی چھتیں آ گئیں۔ ابتدائی چند برسوں تک پانی شاہراہ پاکستان کے واٹر پمپ سے خرید کر گدھا گاڑیوں پر بستی میں لایا جاتا تھا۔ ۱۹۷۸ میں بستی کے مکینوں کی طرف سے ایک کوچی بزرگ حاجی حسن نے حکومت کو پانی کی فراہمی کے لیے درخواست دی۔ ایک سال بعد بلدیاتی اداروں کے انتخابات منعقد ہوئے اور اس بستی کا ایک باشندہ عارف خان کاؤنسلر بن گیا۔ اس کی کوششوں سے ڈسٹرکٹ کاؤنسل نے سہراب گوٹھ میں، جسے کوچی حاجی حسن کالونی کہنا پسند کرتے تھے، ۱۹۸۰ میں پانی کی ایک مین لائن بچھائی۔ مین لائن سے گلیوں یا گھروں تک کنکشن لوگوں نے اپنے اخراجات سے پہنچائے۔ اس سسٹم کی نگہداشت کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ حکام پر بجلی کی فراہمی کے لیے دباؤ ڈالا گیا اور جس وقت دسمبر ۱۹۸۶ میں آبادی کو بے دخل کیا گیا، یہاں تقریباً آدھے سے زیادہ گھروں میں بجلی کے میٹر نصب ہو چکے تھے اور کے ای ایس سی کو بل باقاعدگی سے ادا کیے جا رہے تھے۔

جب شہر سپر ہائی وے کی طرف پھیلنے لگا، کوچیوں نے اپنی بستی کو ایک بازار میں تبدیل کر دیا۔ ۱۹۷۸ تک کراچی کے ہر علاقے سے لوگوں نے وہاں جا کر درآمد شدہ کپڑے اور کراکری خریدنا شروع کر دیا اور آکا خیل گشت لگا کر چیزیں بیچنے والوں کے بجائے دکاندار بن گئے۔ وہ اللہ والا اور موتن داس مارکیٹ سے پاکستانی کپڑے اور کسٹم اور ایکسائز اہلکاروں سے غیر ملکی کپڑے خریدتے۔ ربان خان، جس نے کالونی میں پہلی دکان قائم کی، یاد کرتے ہوئے کہتا ہے، ہماری زیادہ تر خریدار ڈیفنس اور کلفٹن کی بیگمات تھیں۔ وہ ہمارے ہاں اس لیے نہیں آتی تھیں کہ ہماری اشیا ارزاں تھیں بلکہ شہر سے سہراب گوٹھ تک آنا ان کے لیے ایک تفریح تھی۔ شہر کے متمول علاقوں سے اس تعلق کی بنا پر آکا خیل لوگوں کی خوش حالی میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ان میں بہتوں نے ٹی وی اور موٹر سائیکلیں خرید لیں۔ چند لوگوں نے وی سی آر، سوزوکی پک اپ بلکہ کاریں بھی خریدیں۔

بستی میں متعدد اسکول اور کلینک بھی قائم ہوئے۔ پہلا اسکول ریب خان نے ۱۹۷۶ میں قائم

کیا۔ اس میں چھ کلاس روم اور سات ٹیچر تھے۔ یہ ٹیچر غیر پٹھان تھے اور حاجی حسن کالونی سے باہر سے آتے تھے۔ ڈیڑھ سو سے زیادہ آکا خیل بچے، بے دخلی کے وقت، یہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ٹیوشن فیس دینے کے علاوہ آکا خیل باشندوں نے اسکول کی عمارت کو پختہ کرانے کے اخراجات بھی برداشت کیے اور ۴۰ ٹن روموں میں پنکھے لگوائے۔ اس علاقے میں چھ اسکول تھے اور اس کے علاوہ ۷۰ سے زیادہ آکا خیل لڑکیاں قریبی آصف اسکوائر کے ایک اسکول میں پڑھ رہی تھیں۔

۱۹۷۱ میں کراچی آنے والے آکا خیل غیر تعلیم یافتہ تھے مگر ان اسکولوں کی وجہ سے ان کے ۱۸ سال سے کم عمر کے تقریباً تمام لڑکے اور بہت سی لڑکیاں روانی سے لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کے برخلاف وہ پشتو لب و لہجے کی آمیزش کے بغیر اردو بولتے ہیں۔ اب یہ اسکول ڈھا دیے گئے ہیں اور ۳۲ طالب علم، جنھیں اس سال بورڈ کا امتحان دینا تھا، کراچی سے ۲۷ میل دور ایک ویرانے میں پڑے ہیں۔

کمیونٹی نے ممکنہ بے دخلی کے خلاف جدوجہد شروع کر رکھی تھی۔ ۱۹۷۸ میں انھیں سندھ پبلک پراپرٹی (انسداد تجاوزات) ایکٹ ۱۹۷۵ کے تحت نوٹس ملے تھے۔ ان نوٹسوں پر عمل کرانے کی کوشش نہیں کی گئی کیوں کہ، کمیونٹی کے بزرگوں کے مطابق، حکام سے سمجھوتا ہو گیا تھا۔ فروری ۱۹۸۳ میں کراچی کے شیعہ سنی فسادات کے دوران شیعہ امیولی اور سنی سہراب گوٹھ میں فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا اور سپر ہائی وے کچھ دیر کے لیے بند ہو گیا تھا۔ اس واقعے کے نتیجے میں اس کمیونٹی کو دوبارہ نوٹس بھیجے گئے جن کے خلاف اس نے عدالت میں اپیل کی۔ گورنر ایس ایم عباسی کی اس یقین دہانی کے ساتھ کہ آکا خیل برادری کو سہراب گوٹھ سے نہیں ہٹایا جائے گا، حکومت سے مذاکرات اختتام کو پہنچے۔ کمیونٹی کے بزرگوں کے مطابق کمشنر سردار احمد نے انھیں ایک خط لکھا تھا جس سے گورنر کی یقین دہانی کی تائید ہوتی تھی۔ یہ خط اب کاؤنسلر عبارہ خان کی تحویل میں ہے جسے آپریشن کے شروع ہوتے وقت گرفتار کر لیا گیا تھا۔

۱۹۸۱ میں افغان مہاجر بھی آکا خیل بستی کے قرب و جوار میں آباد ہونے لگے۔ یہ تمام تر فارسی بولنے والے لوگ تھے۔ ان کی اکثریت غریب تھی اور تعمیراتی اور صنعتی مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ چند لوگ ہوٹلوں اور چھوٹے کاروبار کے مالک تھے۔ یہ کچے مکانوں میں رہتے تھے اور اپنا پانی واٹر پمپ سے خود لاتے تھے۔ انھیں دنوں میں دیر، باجوڑ، مردان اور سوات سے آنے والے پٹھان بھی سہراب گوٹھ کے قریب آباد ہو گئے۔ یہ آکا خیل نہیں بلکہ محسود، پشاوری اور مُہمند تھے۔ ان میں بیشتر ٹرانسپورٹر یا ٹرانسپورٹ کے شعبے سے متعلق مزدور تھے۔ اس آخرالذکر بستی میں کئی متمول ٹرانسپورٹر بھی آباد ہو گئے اور انھوں نے یہاں اپنا کاروبار شروع کیا۔ ان کی آمد سے تازہ پٹھان بستیاں منشیات اور اسلحے کی تجارت کا مرکز بن گئیں اور علاقے کے غریب لوگ ان کے خدمت گزار بن گئے۔ صرف اس ایک سیکشن کی حرکتوں کی وجہ سے پورا سہراب گوٹھ بدنام ہوا اور اس کے تمام باشندوں کو سزا ملی۔

۷ اپریل ۱۹۸۶ کو وزیر اعظم جونیجو نے لاہور میں ایک عظیم الشان جلسے میں کچی آبادیوں کی بابت سرکاری پالیسی کا اعلان کیا۔ جونیجو نے عوام کو بتایا کہ سرکاری زمینوں پر ۲۳ مارچ ۱۹۸۳ سے قبل بسنے والی ۴۰ یا اس سے زیادہ مکانوں پر مشتمل تمام کچی آبادیوں کو مستقل کر دیا جائے گا۔ آکاخیل اس اعلان سے بہت خوش ہوئے اور خاص اجتماع میں انہوں نے وزیر اعظم کے حق میں دعائیں مانگیں۔ جونیجو کے ۷ اپریل ۱۹۸۶ کے اعلان اور اس کے بعد کراچی کے میئر کے بیان کے نتیجے میں آکاخیل علاقے میں زبردست تعمیراتی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ ٹین کی چھتیں اکھاڑ دی گئیں اور ان کی جگہ کنکریٹ کی چھتیں پڑیں، دیواروں پر پلاسٹر ہوئے، مٹی کے فرش کی جگہ موزائیک فرش سے، کنکریٹ کی جالیوں کی جگہ اسٹیل اور شیشے کی کھڑکیاں لگیں۔ دکانوں میں اسٹیل کے شٹر لگنے لگے اور لوگوں نے پانی کے نکاس اور گلیوں کو پختہ بنانے کے پروگرام شروع کیے۔ جن گھروں میں بجلی نہیں تھی انہوں نے کارپوریشن کو بجلی کے کنکشن کے لیے درخواستیں دیں۔ لوگوں نے اپنی پونجی اپنے مکانوں اور ماحول کو بہتر کرنے میں لگا دی۔ گلرنگ خان نے اپنے اس مکان پر ڈیڑھ لاکھ روپے صرف کیے تھے جس پر بلڈوزر چلا دیے گئے۔ اس رقم میں سے ۹۰ ہزار روپے اس نے ایک سودخور سے حاصل کیے تھے۔ اسے یہ رقم مع سود ادا کرنی ہوگی۔ عیسیٰ خان نے اپنے مکان کی چھت اور فرش پر ۶۰ ہزار روپے صرف کیے تھے اور شیر آغا خان نے اپنی قیمتی اشیا فروخت کر کے اپنے مکان اور دکان کو ٹھیک کرایا تھا۔ یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ ان افراد کا جذباتی تعلق جو اس آبادی کے ساتھ قائم تھا، دسمبر ۱۹۸۶ کے تیسرے ہفتے میں فوج کے تحفظ میں کے ڈی اے کے بل ڈوزروں نے خاک میں ملا دیا۔

۱۲ دسمبر ۱۹۸۶ کی صبح سہراب گوٹھ کے لوگوں نے جاگتے ہی یہ دیکھا کہ ان کی آبادی کو فوج نے گھیر لیا ہے اور قریبی پلازوں کی چھتوں پر پوزیشن لیے جوانوں کی بندوقوں کا رخ ان کی طرف ہے۔ مسجد سے کیے جانے والے اعلان سے انہیں پتا چلا کہ وہ کرفیو میں ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پولیس نے ان کے گھروں کی تلاشیاں لینی شروع کر دیں۔ انہیں تلاشی کا کوئی وارنٹ نہیں دکھایا گیا جو کہ ضابطۂ فوجداری کے تحت لازمی ہے۔ اس تلاشی کے آپریشن کی تفصیل، جو وہاں کے باشندوں نے بیان کی، سندھ میں ڈاکوؤں کے خلاف ہونے والے آپریشن سے ملتی جلتی ہے۔ پولیس زیورات، نقدی اور تمام قیمتی اشیا چھین کر لے گئی۔ لائسنس یافتہ بندوقیں لائسنس سمیت ضبط کر لی گئیں اور ان کی کوئی رسید نہیں دی گئی۔ شناختی کارڈ اور کئی گھروں سے بجلی کے کنکشن کے کاغذات اور موٹر سائیکلوں اور سوزوکیوں کی رجسٹریشن کے کاغذات بھی چھین لیے گئے۔ ان میں سے کئی گاڑیاں کہا جاتا ہے کہ گلزار ہجری تھانے میں موجود ہیں۔ بعض قیمتی اشیا بھی جو پولیس افسروں نے اپنے جوانوں سے بازیاب کی تھیں، تھانے میں ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ لوٹ کے خلاف احتجاج کرنے پر ان کو زدوکوب کیا۔ آکاخیل علاقے میں تلاشی کا عمل ۷۲ گھنٹوں تک جاری رہا جس کے دوران لوگ کرفیو کے باعث فاقے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد بل ڈوزروں سے مکانوں کو گرانے کا کام شروع ہوا۔ مسجد سے اعلان ہوا تھا کہ صرف سڑک کے کنارے کے مکانات

کرائے جائیں گے اور لوگوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنا سامان ہٹا لیں۔ ہائی وے کے قریب کے علاقے کو اس طرح صاف کرنے کے بعد دوسرے علاقوں کو بُل ڈوز کرنے کا آغاز ہوا۔ صرف ایک گھنٹے میں لوگوں کو اپنے اسباب کو بچانے کا بہت کم موقع ملا اور نتیجتاً دروازوں، کھڑکیوں، چھتوں کی دھات کی شیٹوں، نلکوں جیسی ہٹائے جانے کے قابل چیزیں بھی دیواروں اور چھتوں کے ساتھ تباہ ہو گئیں۔ آپریشن کے دوران جانی نقصان بھی ہوا۔ عنایت ولد طہراب خان وقت پر گھر سے نہیں نکل سکا اور ایک گرتی ہوئی دیوار کے نیچے دب کر مر گیا۔ انطار گل کی ٹانگ اپنے دیکھتے ہوئے گھر سے اسباب نکالتے ہوئے ٹوٹ گئی۔ ۷۰ سالہ آئین خان ٹرانزٹ کیمپ تک لے جائے جانے کے انتظار میں سردی سے اکڑ کر مر گیا۔

یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ آکاخیل اور دوسرے پاکستانی پٹھانوں کو ان کی حتمی منزل تک، جس کا انہیں کوئی علم نہیں تھا، لے جانے سے پہلے انہیں سپر ہائی وے پر واقع معمار کمپلیکس میں ٹھہرایا جائے گا۔ غیر آکاخیل آبادی کے رشتے دار اور برداری والے کراچی کی دوسری آبادیوں میں یا صوبہ سرحد میں موجود تھے۔ انھوں نے معمار کمپلیکس کے ٹرانزٹ کیمپ میں نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک آکاخیل بزرگ محمد گل کا کہنا ہے، ان میں سے زیادہ تر لوگ صوبہ سرحد میں اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ باقی لوگ جن کے بیوی بچے نہیں تھے، کراچی میں اپنی برادری والوں کے پاس چلے گئے۔ مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارا پورا خاندان ہمارے ساتھ ہے اور کراچی میں ہماری برداری کے لوگ نہیں ہیں اور نہ ہی سرحد میں ہمارا گھر ہے۔

۲۲ دسمبر کو آپریشن کے آغاز کے دس دن بعد، آکاخیل سپر ہائی وے پر ٹول پلازا کے نزدیک تین کیمپوں میں منتقل کر دیے گئے۔ انہیں رہنے کے لیے خیمے فراہم کیے گئے تھے جو انہیں خود گاڑنے پڑے۔ خیمے کم پڑ گئے اور ایک کیمپ میں سو سے زیادہ خاندان کھلے آسمان کے نیچے پڑے رہے۔ شروع کے تین دنوں تک انہیں پڑوس کے فارم سے پانی کی بھیک مانگنی پڑی۔ چوتھے دن سے حکومت نے ہر کیمپ کو یومیہ پانی کے ٹینکر پہنچانے شروع کیے۔ ایک واٹر ٹینکر ڈرائیور محمد الیاس کہتا ہے، 'پانی بہت ہے، مگر ان کے پاس پانی رکھنے کے لیے برتن نہیں ہیں اس لیے میں زیادہ تر پانی واپس لے جاتا ہوں۔ ان کو ایک بڑے ٹینک کی ضرورت ہے جیسا اقوام متحدہ نے افغانیوں کو دیا ہے۔ یہ لوگ صرف اتنا پانی ذخیرہ کر سکتے ہیں جو پینے اور کھانا پکانے کے لیے کافی ہو۔

حکومت نے آکاخیل کو ان کے کیمپ کے نزدیک ۶۰ مربع گز کے پلاٹ دیے جن کی قیمت نو ہزار روپے فی پلاٹ انہیں تین اقساط میں ادا کرنی ہو گی۔ پانی، بجلی اور ٹرانسپورٹ کی سہولتیں اس ویرانے میں مستقبل قریب میں مہیا نہیں ہوں گی۔ اس کے علاوہ کیمپ سپر ہائی وے سے بہت اندر ہے اور وہاں تک کوئی پختہ سڑک نہیں جاتی۔ انہیں کوئی کاروباری پلاٹ فراہم نہیں کیا گیا ہے۔ چناں چہ یہ لوگ اپنا کاروبار اس مقام سے جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ ۳۷ سالہ زیب خان کہتا ہے، 'یہاں کوئی روزگار

نہیں ہے۔ ہم فاقے سے مر جائیں گے۔ ہم اپنے بچائے ہوئے پیسے خرچ کر رہے ہیں اور صرف قریب کے فارم سے مولیاں لے کر کھا رہے ہیں۔ ان کیمپوں میں رہنے والے لوگوں کو کوئی امداد نہیں ملی۔ صرف ابتدا میں ایدھی ٹرسٹ نے چند سو آٹے کی بوریاں دی تھیں۔ کھانے پکانے کے لیے چولھوں کی قلت ہے اور جلانے کا تیل تقریباً نہیں ہے۔

کسی کو ہماری فکر نہیں۔ ہمیں ہیروئن اور اسلحے کے اسمگلروں کے ساتھ ملوث کر دیا گیا ہے۔ ہماری تذلیل کی گئی، ہمیں ختم کر دیا گیا اور فراموش کر دیا گیا۔ ہمیں پاکستان چھوڑ دینا چاہیے اور ہندوستان یا روس چلے جانا چاہیے، حاجی فتح خان کہتا ہے۔ ہمیں ان جرائم کی سزا دی گئی ہے جو ہم نے نہیں کیے تھے، سارس خان کہتا ہے، جو پٹھان کالونی میں ایک دوست کے گھر منتقل ہو گیا ہے۔ حکومت کو علم ہے کہ اسمگلر کون ہیں۔ حکومت کے اہلکار ان کے ڈیروں میں عیاشیاں کرتے تھے اور پارٹیاں دیتے تھے اور بھتا وصول کرتے تھے۔ حکومت کے یہ دلال چوروں کی طرح آپریشن شروع ہونے سے پہلے رات کی تاریکی میں بھاگ گئے۔ انھیں ڈیفنس اور کلفٹن نے پناہ دی، اور اب بھی دے رکھی ہے۔ انھیں ہم نے پناہ نہیں دی۔

سہراب گوٹھ کو کامیابی سے ڈھا دیا گیا اور وزیر اعلیٰ نے وعدہ کیا کہ اسے ایک خوبصورت پارک میں تبدیل کر دیا جائے گا جو غالباً حیدر کی شہر پر فتح کی علامت ہو گا۔ مگر اس کچی آبادی کو ڈھانے کے طریقِ عمل سے اہم قانونی اور اخلاقی سوالات پیدا ہوتے ہیں، جنھیں نظر انداز کرنے کا مطلب، اور باتوں کے علاوہ، پاکستانی آئین کے آرٹیکل ۱۴ کی خلاف ورزی کی حمایت اور حوصلہ افزائی ہو گا جس میں درج ہے کہ انسان کی عزت نفس اور اس کے گھر کی حدود واجب الاحترام ہوں گی۔

پولیس کا کسی گھر میں داخل ہونے کا اختیار واضح طور پر ضابطۂ فوجداری میں متعین کر دیا گیا ہے۔ سرچ وارنٹ جاری کیے بغیر کوئی تلاشی نہیں لی جا سکتی، کراچی کے ایک ممتاز بیرسٹر کا کہنا ہے۔ اس کے علاوہ تلاشی کے دوران علاقے کے کم از کم دو معززین کی موجودگی لازمی ہے۔ حتیٰ کہ اگر تلاشی کسٹم ایکٹ ۱۹۶۹ کے تحت لی جا رہی ہو، تب بھی ضابطے کی ان شرائط کو پورا کرنا لازمی ہے۔

کوچیوں کے گھروں کی بغیر وارنٹ تلاشی لینے کا دفاع کرتے ہوئے پولیس کے کئی اعلیٰ عہدے داروں کی دلیل ہے کہ اگر تلاشی اسلحے، منشیات اور سمگل کیے ہوئے سامان کے لیے لی جائے تو سرچ وارنٹ کی شرط نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ مگر پنجاب ہائی کورٹ نے ۱۹۸۱ میں مقدمہ شوکت حسین بنام ذوالفقار علی میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ "قانون پولیس کا اسمگل شدہ سامان کی تلاشی کے لیے نجی املاک میں داخل ہونے کا کوئی عام حق تسلیم نہیں کرتا۔" حدود آرڈر مارشل لا حکومت نے فروری ۱۹۷۹ میں نافذ کیا تھا۔ آرڈر کے سیکشن ۲۲ میں لکھا ہے، 'اگر کوئی کلکٹر، آبکاری افسر یا مجسٹریٹ، اطلاع ملنے پر اور اس تحقیق کے بعد جو اس کے خیال میں لازمی ہو اس بات کا یقین کرنے کی وجوہ رکھتا ہو کہ کوئی جرم سرزد ہوا ہے، تلاشی کے وارنٹ جاری کر سکتا ہے۔ سیکشن ۲۲ اور ۲۷ میں اس امر کی ضمانت موجود

ہے کہ ضابطۂ فوجداری اس حالت میں بھی نافذ العمل رہے گا۔ کوجی رر کوں کے مطابق سہراب گوٹھ کے باشندوں کو کوئی سرچ وارنٹ نہیں دکھایا گیا تھا اور نہ ہی تلاشی علاقے کے دو یا اس سے زیادہ معززین کی موجودگی میں لی گئی تھی۔ اگر یہ درست ہے تو تلاشی کا آپریشن غیر قانونی ٹھہرتا ہے۔

سندھ میں کچی آبادیاں صرف سندھ پبلک پراپرٹی ایکٹ ۱۹۷۵ کے تحت مٹائی جاسکتی ہیں۔ اس ایکٹ کے سیکشن ۳ کے تحت لازمی ہے کہ ناجائز تجاوزات کے باشندوں کو کم ازکم تین دن کا نوٹس دیا جائے اور انہیں ازخود تجاوزات ہٹانے کو کہا جائے۔ سیکشن ۴ کے تحت متاثرہ افراد کو متعلقہ حکام کو نوٹس پر نظرِثانی کرنے کی درخواست دینے کا حق ہے۔ حکومت طاقت کے ذریعے بےدخل کرنے کی کارروائی صرف سیکشن ۳ کے تحت دیے گئے نوٹس یا اس پر نظرثانی کی درخواست کے سات دنوں کے بعد کر سکتی ہے۔ سہراب گوٹھ کے باشندوں کے مطابق ان کی بےدخلی اور ان کی املاک پر بلڈوزر چلائے جانے سے پہلے انہیں کوئی نوٹس نہیں دیا گیا تھا۔ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل ۴ تحت تمام شہریوں کو قانون کے مطابق سلوک کا حق ہے۔ سب سیکشن ۲(الف) کے تحت کسی بھی شخص کی جان ومال کے خلاف کوئی غیر قانونی قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔ آئین میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ جن لوگوں پر منشیات کے اسمگل ہونے کا الزام لگایا گیا ہو ان سے یا ان ملزموں کے قرب وجوار میں رہنے والے افراد کے ساتھ آئین کے خلاف سلوک کیا جائے۔

حکومت سندھ کے لیے قانون کے برخلاف آپریشن کلین اپ کس طرح ممکن ہوا اور کیوں اس کی کوئی گرفت نہیں ہوئی؟ یہ حقیقت ہے کہ سہراب گوٹھ میں اسمگلر اور بدمعاش بھی تھے، مگر اخباروں نے یہ تاثر دیا جیسے وہاں صرف جرائم پیشہ لوگ رہتے ہیں، تاکہ لوگوں کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ نہ ہوں، 'فتح خان کہتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہاں تشدد کے واقعات جان بوجھ کر کرائے گئے تھے تاکہ حکام کے لیے ہمیں بےدخل کرنا آسان ہوجائے۔ ہم تجارت پیشہ لوگ ہیں اور ہمارا روزگار تمام طبقوں کے ساتھ اچھے تعلقات پر منحصر ہے۔ مگر حکومت کیوں سہراب گوٹھ کو ختم کرنا چاہتی تھی؟ جواب بہت آسان ہے۔ سہراب گوٹھ سے متصل زمینیں بااثر افراد کی ملکیت ہیں۔ یہ زمینیں بہت قیمتی ہیں، مسز احمد خان کہتا ہے۔ اگر ان زمینوں کے پاس سے غریب لوگوں کی کالونی مٹادی جائے تو ان کی قیمت سوگنا ہو جائے گی۔

سپر ہائی وے پر سہراب گوٹھ سے ٹول پلازا تک کے ڈی اے نے اسکیم ۳۳ کے ایک حصے کے طور پر ۲۶ ہزار ایکڑ زمین، تقریباً ۱۵۰ ہاؤسنگ سوسائٹیوں کو الاٹ کی ہے۔ اس میں تقریباً ۷۰ ہزار پلاٹ نکالے گئے ہیں۔ زیادہ تر سوسائٹیاں اور پلاٹ، براہ راست یا بالواسطہ، کراچی کے ڈویلپروں کے تسلط میں ہیں۔ اسٹیٹ ایجنسیوں کا کہنا ہے کہ سہراب گوٹھ کے آپریشن کے جاتے کے بعد بڑی تعداد میں لوگوں نے ان پلاٹوں میں دلچسپی لینی شروع کی ہے اور قیمتوں کا آئندہ چند مہینوں میں کم از کم ۲۵ فیصد چڑھ جانا لازمی ہے۔ اگر زمین کی قیمت میں ۱۵ فیصد بھی اضافہ ہوتا ہے تو یہ رقم ۴۰ کروڑ روپے سے زیادہ ہو

گی۔

کے ڈی اے کی معروف گلزار ہجری اسکیم سپر ہائی وے پر واقع ہے۔ اس کے ۱۴۰۰ ایکڑ رقبے پر دوسری تعمیرات کے علاوہ وسیع کثیر منزلہ عمارتیں اور رہائشی کمپلیکس بنیں گے۔ مقامی حکام جو بیشتر صورتوں میں طاقتور مفادی گروہوں کے خدمت گزار ہیں، اعلیٰ رہائشی علاقوں یا پسندیدہ اسکیموں تک جانے والی سڑکوں پر واقع نچلی آمدنی والے علاقوں سے ناخوش ہیں۔ کراچی میں اس طرح کچی آبادیوں کو ہٹانے کی کوششیں پہلے بھی کی جا چکی ہیں۔ اس تناظر میں سہراب گوٹھ کا قتلِ عام بامعنی ہو جاتا ہے۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ آبادی کہیں اور واقع ہوتی تو کوئی آپریشن کلین اپ نہ کیا جاتا۔

اسٹیٹ ایجنسیوں کا کہنا ہے کہ اگر کوچیوں کو ہائی وے سے اور زیادہ دور بسایا جاتا تو زمینوں کی قیمتیں اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتیں۔ اگر یہ درست ہے تو ممکن ہے کہ ان کے لیے حالات اتنے دشوار بنا دیے جائیں کہ وہ دوبارہ نقل مکانی پر مجبور ہو جائیں یا دوسری صورت میں حکومت ان کی موجودہ بستی کو عارضی قرار دے کر ان کو کہیں اور بسانے کا منصوبہ بنائے۔ ان کی حتمی منزل جہاں بھی ہو، یہ حقیقت واضح ہے کہ حکومت نے کوچی آبادی اور سہراب گوٹھ کے دوسرے باشندوں کے ساتھ سخت بے انصافی کی ہے۔

کینتھ فرنانڈیز

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

بے دخلی اور بے گھری

کراچی کی متعدد پرانی کچی آبادیوں کو ڈھانے کے لیے بل ڈوزر ایک مرتبہ پھر حرکت میں آ گئے ہیں۔ انہدام اور بے دخلی کی اس حالیہ لہر سے پیدا ہونے والے ملبے میں ہزاروں تباہ شدہ زندگیوں کی، نظرانداز یا بے اثر کر دیے گئے قوانین کی، اور لالچ اور تشدد کی کہانیاں دفن ہیں۔ زیادہ تر سرکاری محکموں اور عام لوگوں کی نظر میں کچی آبادیاں غیرقانونی بستیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہیں، اور قانونی اصطلاح میں بلاشبہ ایسا ہی ہے۔ لیکن انہیں ایک اعتبار سے جائز سمجھا جانا چاہیے، کیوں کہ ریاست اپنی اس ذمے داری کو پورا کرنے میں ناکام ہو چکی ہے کہ ہر شہری کو سر چھپانے کی مناسب جگہ جائز طور پر فراہم کرے۔ انتظامیہ کی اس ناکامی کے بعد شہر کے غریب باشندوں کے پاس اس کے سوا کوئی راستا نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے اس مسئلے کا اپنے طور پر کوئی حل تلاش کریں۔

کسی خوش حال علاقے کے بیچوں بیچ قائم کچی آبادی سے اس علاقے کی زمین اور مکانوں کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔ کراچی کو خوب صورت بنانے اور زمین کی قیمت کو کم ہونے سے بچانے یا بڑھانے کے مقصد سے کچی آبادیاں، مختصر نوٹس پر یا کسی نوٹس کے بغیر، مسمار کر دی جاتی ہیں اور ان کے مکینوں کو بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ بیش تر صورتوں میں انہیں شہر کے دوردراز کنارے پر پھینک دیا جاتا ہے۔ ماضی قریب میں ہونے والی بے دخلیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا محرک صرف شہر کی زیبائش نہیں ہے۔ اس عمل کا ایک اہم عنصر غیرقانونی طور پر قبضہ کی گئی زمین کو خالی کروا کے مالی منافع حاصل کرنا ہے کیوں کہ اس زمین کی قیمت پچھلے چند برسوں میں خاصی بڑھ چکی ہے۔ اسے غیرقانونی قبضے سے آزاد کرا کر بہت بڑے منافعے پر تجارتی ڈویلپرز کے ہاتھ فروخت کیا جا سکتا ہے جو اس پر عالی شان مکان اور فلیٹ یا شاپنگ سنٹر تعمیر کریں گے۔ اس پس منظر میں یہ سمجھنا بالکل آسان ہے کہ کچی آبادیوں کو خوش حالی اور ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کیوں قرار دیا جاتا ہے۔

***

کراچی میں کچی آبادیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا سبب شہر میں آنے والی مہاجرت کی دو بڑی لہریں ہیں — پاکستان کے قیام کے وقت ہندوستان سے بہت بڑی تعداد میں آنے والے مہاجر، اور روزگار کی تلاش میں بہت بڑی تعداد میں کراچی آنے والے ملک کے شمالی علاقوں کے باشندے۔ کراچی کی آبادی، جو ۱۹۴۷ میں پانچ لاکھ سے کم تھی، ۱۹۹۱ میں ایک کروڑ تک جا پہنچی۔ شہر کی آبادی میں اس کثیر اضافے نے رہائش کے بے پناہ مسائل پیدا کیے جو اب تک موجود ہیں۔

کراچی میں آنے والے بیشتر لوگ کم آمدنی والے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور معاشی بہتری کی تلاش میں یہاں آتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس قانونی طور پر رہائش اختیار کرنے یا قانونی طور پر ڈویلپ کیے ہوئے پلاٹ خریدنے کے لیے نہ تو رقم ہوتی ہے اور نہ انھیں ایسا کوئی موقع ملتا ہے۔ سرکاری طور پر ڈویلپ کی گئی منصوبہ بند آبادیوں میں جگہ پانے میں ناکام رہ کر وہ خالی زمینوں پر آباد ہو جاتے ہیں (عموماً یہ زمین سرکاری ملکیت ہوتی ہے) اور متعلقہ حکام سے اجازت حاصل کیے بغیر اپنے رہنے کی جگہ تعمیر کر لیتے ہیں۔ ڈویلپمنٹ یا امپروومنٹ کے محکموں کی اصطلاح میں ان آبادیوں کو سب اسٹینڈرڈ علاقے اور عام زبان میں کچی آبادیاں کہا جاتا ہے۔

کراچی میں ایک تخمینے کے مطابق اس وقت ۵۵۰ کچی آبادیاں ہیں، اور ان آبادیوں میں شہر کے ۴۱ فیصد لوگ رہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کچی آبادیاں سرکاری زمینوں پر قائم ہیں جن پر لوگوں نے جائیداد کے قانونی حقوق حاصل کیے بغیر اپنے مکان بنا لیے ہیں۔ برسوں کے عمل میں ان آبادیوں کے مکینوں نے اپنی کوششوں کے بل پر ان علاقوں کی حالت میں رفتہ رفتہ بہتری پیدا کی ہے اور بجلی، گیس اور دوسری سہولتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے گھروں نے بھی بتدریج کچی جھونپڑیوں سے نیم پختہ یا پکے مکانوں کی صورت اختیار کی ہے۔

شہری آبادی میں تیز رفتار اضافے کے دباؤ کے باعث زمین کے خالی پلاٹوں کی قیمت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ زمینیں، جن میں سے بعض پر کچی آبادیاں ۲۵ سال سے قائم ہیں، اتنی بیش قیمت ہیں کہ انھیں خالی کرانے کے لیے ہر قسم کے حربے کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ غیر قانونی طور پر قبضہ کی گئی زمین کو خالی کرانے کی کوشش میں حکام ان آبادیوں کے مکینوں کی ضروریات اور حقوق کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں اور ان کے ساتھ نہایت غیر انسانی برتاؤ کرتے ہیں۔ اکثر ان لوگوں کو کسی قسم کی امداد دیے بغیر نکال باہر کیا جاتا ہے۔ (اس کی مثال رحمان آباد کے مکینوں کی بے دخلی سے دی جا سکتی ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔) جب کبھی بے دخل کیے جانے والوں کو متبادل پلاٹ دیے بھی جاتے ہیں، انھیں ان کے نقصان کا کوئی مالی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ علاوہ ازیں انھیں اپنے مکانوں اور اپنی زندگیوں کو از سر نو تعمیر کرنے کے لیے قرضے کی کوئی سہولت دستیاب نہیں ہوتی۔ ان میں سے جن لوگوں کے پاس قومی شناختی کارڈ نہ ہوں انھیں متبادل پلاٹ ملنے کا بھی کوئی امکان نہیں رہتا۔

***

حکومت کو زمینوں پر غیرقانونی قبضے یا کچی آبادیوں کے مسئلے سے نمٹنے کی کوشش کرتے ہوئے ۴۰ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ شہر بھر میں پھیل جانے والی کچی آبادیوں سے تشویش میں مبتلا ہو کر شہری اداروں نے اپنے قلیل وسائل استعمال کر کے شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کے رہائش کے مسئلے کا قابلِ عمل حل دریافت کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ کئی بار تحقیق کرائی گئی ہے، منصوبے تیار کیے گئے ہیں اور اس مسئلے کے حل کی کئی اسکیمیں تجویز کی گئی ہیں۔ لیکن یہ تمام کوششیں غیرموزوں ثابت ہوئیں اور شہر کی غریب آبادی کے رہائش کے مسئلے حل نہیں کر سکیں۔

شہر کا بلدیاتی ادارہ کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن (KMC) ہے جس کے اختیارات منتخب بلدیاتی نمائندوں کی کاؤنسل کے ذریعے استعمال ہوتے ہیں۔ دستور کے مطابق ہر چار سال بعد کاؤنسل کے انتخابات ہوتے ہیں جو شہر کے میئر اور ڈپٹی میئر کا انتخاب کرتی ہے۔ لیکن کراچی کی ترقیاتی منصوبہ بندی اور ان منصوبوں کو نافذ کرنے کا اختیار ایک سرکاری محکمے کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (KDA) کے پاس ہے جسے پیشہ ور ماہرین چلاتے ہیں اور جو عوام کو کسی بھی طرح جواب دہ نہیں ہے۔ کے ڈی اے شہر کے کسی علاقے کا منصوبہ تیار کرتا ہے اور اسے ڈویلپ کرتا ہے، جس کے بعد اس علاقے کو کے ایم سی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس انتظامی بندوبست کے تحت کراچی کے شہریوں، خصوصاً غریب باشندوں، کو شہر کے ترقیاتی پھیلاؤ کے فیصلوں میں کوئی براہِ راست یا بالواسطہ شمولیت حاصل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اگر صوبائی حکومت کے خیال میں کارپوریشن اپنا کام درست طرح سے انجام دینے میں ناکام رہے تو ایک سرکاری افسر (بلدیاتی اداروں کے صوبائی سیکرٹری) کو اسے برطرف کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔ اس طرح کارپوریشن مکمل طور پر صوبائی حکومت کے رحم و کرم پر ہے اور شہری منصوبہ بندی اور پالیسی سازی میں مقامی شہریوں کا اختیار اور بھی کم ہو جاتا ہے۔

شروع شروع میں یہ خیال کیا گیا کہ شہر کے مرکز میں قائم کچی آبادیوں کو وہاں سے نکال کر شہر سے دور کے علاقوں — کورنگی، لانڈھی اور نیو کراچی — میں منتقل کر دینا کراچی کو ترقی دینے کا بہترین لائحۂ عمل ہے۔ ان خطوط پر تیار کیے گئے منصوبے — گریٹر کراچی ری سیٹلمنٹ پلان — کے تحت غریب باشندوں کے لیے تین لاکھ مکان رعایتی قیمت پر تیار کیے جانے تھے، لیکن دس ہزار مکان تعمیر ہونے کے بعد اس منصوبے پر عمل روک دیا گیا۔ جائیداد کی سٹے بازی (speculation) کا رجحان اور اس منصوبے کے لیے ضروری وسائل مہیا کرنے میں حکومت کی ناکامی اس کے اسباب میں شامل تھی۔ لیکن اس منصوبے، اور اس قسم کے دوسرے منصوبوں، کی ناکامی کا سب سے اہم عنصر یہ تھا کہ یہ منصوبہ بندی غریب باشندوں کی زندگی کے حقائق کو سمجھے بغیر کی گئی تھی جن کو فائدہ پہنچانا تھی. اس کا اصل

مقصد تھا۔ ان ابتدائی منصوبوں میں غریبوں کے رہنے کے لیے جو علاقے منتخب کیے گئے وہ روزگار کی جگہوں سے بہت دور واقع تھے اور مکانوں کی رعایتی قیمت بھی ان کی استطاعت سے باہر تھی۔ حکومت نے ایسی منصوبہ بندی میں ٹرانسپورٹ اور پانی کی فراہمی کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ جہاں جہاں منصوبوں کو ناکام ہونا ہی تھا۔

شہر کو پسماندہ بستیوں (slums) سے پاک کرنے کے سرکاری عزم کا نتیجہ میٹروول پروگرام اور کچی آبادیوں کے مکینوں کے لیے فلیٹوں کی تعمیر جیسی اسکیموں کی صورت میں برآمد ہوا۔ لیکن ان اسکیموں پر آنے والی لاگت اتنی زیادہ تھی کہ یہ غریبوں کے بجائے نسبتاً خوش حال لوگوں کے کام آئیں۔ اس کے علاوہ شہر کے غریب باشندوں کی تعداد میں اضافہ اتنی تیز رفتاری سے ہوا کہ حکومت کے پاس ان سب کو رہائش کی سہولت مہیا کرنے کے لیے نہ تو وسائل تھے اور نہ صلاحیت۔

لیکن ان کچی آبادیوں میں رہنے والوں کی بے پناہ تعداد ــــ جو شہر کی کل آبادی کے نصف کے قریب پہنچ رہی ہے ــــ بجائے خود انہیں ایک طرح کی سیاسی قوت عطا کر دیتی ہے۔ اب ان سب آبادیوں کو بُل ڈوزروں سے مسمار کر کے ان کے مکینوں کو بے دخل کر دینا ممکن نہیں رہا۔ کوئی اور چارہ نہ پا کر حکومت اس نسبتاً انسان دوست فیصلے پر مجبور ہو گئی کہ ان آبادیوں کو ریگولرائز (مستقل) کر دیا جائے ــــ یعنی یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ کچی آبادیوں میں رہنے والوں کو مالکانہ حقوق دے دیے جائیں گے اور ان آبادیوں کی حالت میں بہتری پیدا کر کے ان کو انفرااسٹرکچر اور چند بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

۱۹۷۸ میں مارشل لا کا حکم نمبر ۱۸۳ نافذ کیا گیا جس کے تحت ان تمام آبادیوں کو جو یکم جنوری ۱۹۷۸ تک قائم ہو چکی تھیں، ریگولرائز کیا جانا تھا۔ اس تاریخ کے بعد وجود میں آنے والی آبادیاں غیرقانونی قرار دی گئیں اور انہیں زبردستی مسمار کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ ریگولرائز کی جانے والی آبادیوں میں وہ آبادیاں شامل نہیں تھیں جو بجلی کے ہائی ٹینشن تاروں کے نیچے یا دریائی زمین، رفاہی پلاٹوں یا نجی ملکیت کی زمینوں پر قائم تھیں۔ ان استثنائی شقوں کو بعد میں مفاد پرست بلڈروں نے اپنے فائدے میں استعمال کیا اور متعدد ایسی کچی آبادیوں کو بھی مسمار کرا دیا جو مارشل لا کے اس حکم کے تحت قانونی طور پر جائز قرار دیے جانے کی مستحق تھیں۔

کچی آبادیوں کو قانونی حیثیت دینے کے اس اقدام کے باوجود اُسی دور میں حکومت کی جانب سے بے دخلی کی بہت بڑی مہم چلائی گئی۔ پرائیویٹ ڈویلپروں نے اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور سرکاری اہلکاروں کو رشوتیں دے کر نہایت بیش قیمت زمینیں اپنے لیے خالی کروا لیں۔ اس عمل کے نتیجے میں بہت سی آبادیاں جنہیں ریگولرائز کیا جانا تھا مسمار کر دی گئیں اور ان کی جگہ عالی شان بنگلے اور کئی منزلہ فلیٹ تعمیر کیے گئے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومت کے جو محکمے غریبوں کا رہائش کا مسئلہ حل کرنے کے مقصد سے قائم

کیے گئے ہیں، اس مقصد کی تکمیل بھی کرتے ہوئے درحقیقت غریبوں کے خلاف استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال ۱۹۸۰ کی دہائی کے وسط میں کلفٹن میں عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے سامنے قائم کچی آبادی کا انہدام ہے جہاں دو سو خاندان مقیم تھے۔ اس آبادی کے مکینوں کو زبردستی بے دخل کیا حالاں کہ یہ لوگ اس آبادی میں دس برس سے زائد عرصے سے رہ رہے تھے اور انھیں مارشل لا کے حکم کے تحت ریگولرائز ہونے کا حق حاصل تھا۔ اس طرح خالی کرائی گئی زمین پر اب چار پر تعیش بنگلے تعمیر کیے جا چکے ہیں۔ اس قسم کی بے دخلیاں مقامی مکینوں کی زندگیوں کو کس طرح تباہ کر دیتی ہیں اس کی تفصیل آگے پیش کی جائے گی۔

کچی آبادیوں کے مکینوں اور بہت سے گروپوں اور غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کی طرف سے سخت احتجاج، اور اخباروں میں خبریں شائع ہونے پر انہدام اور بے دخلی کی اس مہم کی رفتار سست کر دی گئی تھی۔ اپریل ۱۹۸۶ میں اُس وقت کے وزیراعظم نے اعلان کیا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۳ تک قائم ہونے والی کچی آبادیوں کو ریگولرائز کیا جائے گا اور ان میں بہتری پیدا کی جائے گی۔ ۱۹۸٦ ہی کے ایک آرڈیننس کے ذریعے سندھ کچی آبادی اتھارٹی (SKAA) قائم کی گئی۔ (اس کے بعد ۱۹۸۷ کا سندھ کچی آبادی ایکٹ جاری ہوا۔) اس محکمے کو حکومت کی پالیسیوں کے مطابق کچی آبادیوں کو ریگولرائز کرنے اور ان کی حالت بہتر بنانے کا کام سونپا گیا۔ اس کے قیام سے پہلے یہ کام کے ڈی اے کے کچی آبادی ڈائرکٹریٹ کے ذمے تھا۔ تاہم نئے قائم شدہ محکمے نے اعتراف کیا ہے کہ اس کی کارکردگی کی رفتار کچی آبادیوں کی تعداد کے لحاظ سے ایک فیصد سالانہ سے زیادہ نہیں ہے۔

***

کچی آبادیوں میں رہنے والے بیشتر لوگ بہت قلیل وسائل کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ روزگار کے مواقع نہ ہونے کے باعث اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوتے ہیں اور روزی کی تلاش میں کراچی کا رخ کرتے ہیں۔ کئی برس کے عرصے میں یہ لوگ رفتہ رفتہ اپنی مالی حالت کو کسی حد تک بہتر بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں اور اپنی سخت مشقت سے کمائی ہوئی زیادہ تر رقم اپنے مکانوں کو رہنے کے قابل بنانے میں صرف کرتے ہیں۔

سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے مطابق کراچی کی بیشتر کچی آبادیاں ایسی ہیں کہ انھیں ریگولرائز کیا جانا ممکن ہے، لیکن محکمے میں مالی وسائل اور افرادی قوت کی کمی اس عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مقامی کاؤنسلروں کو اپنے حلقوں میں آنے والی کچی آبادیوں کو مستقل کرنے کا اختیار حاصل ہے، اور جب کبھی ان آبادیوں نے زور پکڑا تو وہ ان کے مطالبوں پر کان دھرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن کچی آبادیوں میں رہنے والوں میں ان مطالبوں پر زیادہ زور دینے کا رجحان نہیں ہے، کیوں کہ کسی کچی آبادی کو

ریگولرائز کرنے کا عمل بہت پیچیدہ، سست رفتار اور مہنگا ہے۔

کچی آبادیوں کے جو مکین مالکانہ حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں مندرجہ ذیل مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے

(۱) سب سے پہلے انھیں مقررہ فارم پر درخواست اور مطلوبہ کاغذات داخل کرنے ہوتے ہیں، یعنی علاقے کے کاؤنسلر کا جاری کیا ہوا تصدیق نامہ کہ مذکورہ پلاٹ واقعی درخواست گزار کے قبضے میں ہے، گواہوں کے دستخط، حلف نامہ، قومی شناختی کارڈ کی نقل، پلاٹ کی ملکیت کے بارے میں کسی بیان کے غلط نکلنے کی صورت میں تمام ذمےداری لینے کا اقرار نامہ، دوسری دستاویزات مثلاً راشن کارڈ اور بجلی کے بل جن سے یہ تصدیق ہوتی ہو کہ درخواست گزار واقعی اس پلاٹ پر کافی عرصے سے رہ رہا ہے۔

(۲) اس کے بعد متعلقہ محکمہ ان تمام کاغذات کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔

(۳) موقعے کا معائنہ کر کے پلاٹ کے سائز اور رہائشی استعمال کی تصدیق کی جاتی ہے۔

(۴) پھر سائٹ پلان تیار کیا جاتا ہے اور مقررہ فارم پر اس رقبے کا تخمینہ لگایا جاتا ہے جس کے مالکانہ حقوق دیے جائیں گے۔

(۵) منظور شدہ رقبے سے باہر کی تمام تعمیرات کو درخواست گزار خود مسمار کراتا ہے۔

(۶) تب منظور شدہ نرخ پر لیز حاصل کرنے کے اخراجات کا ڈیمانڈ نوٹ جاری کیا جاتا ہے۔

(۷) درخواست گزار یہ رقم کسی سرکاری بینک میں جمع کراتا ہے۔

(۸) یہ تمام مرحلے پورے ہونے پر مالکانہ حقوق کی دستاویز (لیز ڈیڈ) جاری کی جاتی ہے جس پر درخواست گزار کو رسیدی ٹکٹ لگوانے ہوتے ہیں۔

اس عمل کے مکمل ہونے کے بعد ہی اندراج کے بعد لیز حاصل ہونے میں چار پانچ یا اس سے زیادہ مہینے لگ جاتے ہیں۔ ہر مرحلے پر درخواست گزار کا سابقہ سرکاری اہلکاروں کی بدعنوانی اور دھونس سے پڑتا ہے۔ اس عمل میں اسے پچیس تیس دن لگانے پڑتے ہیں جس کا مطلب کم آمدنی والوں کے لیے اتنے دنوں کی کمائی کا نقصان ہے۔ اس کے علاوہ چار سو سے بارہ سو روپے تک رشوت کی مد میں ادا کرنے پڑتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے اس عمل کے مرحلوں کو کم کر دیا ہے اور لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے کے لیے تشہیری مہم بھی چلائی ہے۔[1]

اس کے باوجود کچی آبادیوں میں رہنے والے زیادہ تر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ لیز حاصل کرنے کے بجائے بجلی، پانی، گیس اور ٹیلی فون کی سہولتوں کا مطالبہ کرنا زیادہ آسان، اور شاید زیادہ فائدہ مند ہے۔ ان سہولتوں کے حاصل ہونے سے نہ صرف ان کی زندگی کی مشکلات کم ہو جاتی ہیں بلکہ اس طرح انھیں بے دخلی کے مستقل خطرے سے کسی قدر تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔

رہائش کا عدم تحفظ شہر کے غریب باشندوں کی تشویش کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگ ایسے کسی علاقے کی ترقی پر اپنی کمائی ہوئی رقم خرچ کرنے سے ہچکچاتے ہیں جہاں سے انھیں کسی بھی

وقت نکالا جا سکتا ہو۔ نچلی سطح پر حقیقی ترقی صرف سرکاری محکموں کی شراکت اور حوصلہ افزائی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

نچلی سطح پر کام کرنے والی ایک شہری تنظیم ادارۂ امن و انصاف ۱۹۸۰ کی دہائی کے آغاز سے کچی آبادیوں کے مکینوں کے حق میں کام کرنے میں مصروف ہے۔ کئی موقعوں پر اس تنظیم نے آبادیوں کو مسمار ہونے سے بچانے کے لیے عدالتوں سے حکمِ امتناعی حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بے دخل کیے جانے والوں کو قانونی اور دیگر مشورے بھی فراہم کیے ہیں۔ اس تنظیم کے علاوہ بعض وکیل انفرادی طور پر بھی بے دخلی کا شکار ہونے والوں کی قانونی امداد کرتے رہے ہیں۔ اس تنظیم اور ان افراد کا کیا ہوا کام قابلِ تعریف ہے، مگر غریبوں کی رہائش کا مسئلہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں اور گروپوں کی حمایت کی ضرورت ہے۔ رحمان آباد کے انہدام کے خلاف کئی غیر سرکاری تنظیموں، انسانی حقوق کے اداروں اور عورتوں کی انجمنوں نے اخبارات میں سخت بیانات جاری کیے تھے۔ لیکن ان بیانات کے بعد اس آبادی کے تحفظ کے لیے کوئی دیرپا مہم نہ چلائی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی شہری تنظیم کی غیر موجودگی اور دوسرے حلقوں کی بے حسی کے باعث اس آبادی کو منہدم کر کے یہاں کے مکینوں کو بے دخل کر دیا گیا۔

***

کراچی کے باشندوں کے پانچ گروہ بے دخلی کے خطرے کی مستقل زد میں ہیں

(۱) وہ لوگ جو رفاہی پلاٹوں اور ماحولیاتی اعتبار سے خطرناک جگہوں پر مقیم ہیں۔ جوں ہی ان زمینوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، پرائیویٹ ڈویلپر انہیں بے دخل کرا دیتے ہیں یا یہ جگہ خرید لیتے ہیں۔

(۲) مسطور شدہ کچی آبادیوں میں رہنے والے، جنہیں آبادی کو بہتر بنانے کے عمل میں اپنی جگہ چھوڑنی پڑتی ہے۔

(۳) شہر کے مرکزی علاقوں میں رہنے والے جہاں زمین کی قیمت بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ان میں شہر کے درمیان سے گزرنے والے دریائے لیاری کے دونوں کناروں پر قائم آبادیاں شامل ہیں۔

(۴) اُن علاقوں میں رہنے والے جہاں بڑے بڑے ترقیاتی منصوبے قائم کیے جا رہے ہیں، مثلاً سیلاب سے بچاؤ کی اسکیمیں یا شاہراہوں کے منصوبے۔

(۵) نسلی اقلیتوں، مثلاً بنگالیوں اور افغانوں، اور مذہبی اقلیتوں، مثلاً عیسائیوں اور ہندوؤں، کی آبادیاں۔

پچھلی دہائی میں بڑے پیمانے پر بے دخلی کی مہمیں بہت زیادہ نہیں چلیں۔ وجہ یہ تھی کہ شہری

حکومت کمزور اور اخلاقی جواز سے محروم تھی۔ جوں ہی شہر کے بلدیاتی اداروں کو سیاسی جواز حاصل ہو گا، آبادیوں کے انہدام کا عمل تیز ہو جائے گا۔

بد سلوکی اور توہین سے گزرتے رہنے کے باعث شہر کے غریب باشندے خود پر اور دوسروں پر اعتماد کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ ایسی حالت کو اپنے مقدر کی خرابی قرار دیتے ہیں۔ شہر کے لیے فکرمند افراد اور گروپوں کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ غریبوں کے اعتماد کو تقویت دینے کی کوشش کریں تاکہ وہ اپنے حقوق اور اپنا وقار حاصل کر سکیں۔ وسیع تر حمایت اور منظم مزاحمت کی غیر موجودگی میں ، صرف پُر تشدد اور غیر قانونی بے دخلیوں میں اضافہ ہونے کا امکان ہے بلکہ جبر اور تشدد کے اس رجحان کے بھی مزید زور پکڑنے کی توقع ہے کہ کراچی شہر میں صرف ایک قسم کی ترقی ہونی چاہیے جو مال دار اور طاقت ور لوگوں کے فائدے میں ہو۔ کچی آبادیوں میں رہنے والے مردوں اور عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کوئی قانون موجود نہیں ہے۔ بلکہ اکثر صورتوں میں قانون کو شہر کے غریب باشندوں کو ان کے بنیادی حق ـــــ یعنی سر چھپانے کی جگہ ـــــ سے محروم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ بے دخلیوں کو جائز ثابت کرنے کے لیے قوانین میں کمزور پہلو تلاش کر لیے جاتے ہیں، غیر قانونی ادائیگیاں کی جاتی ہیں اور یوں ایک اور کچی آبادی کو مسمار کر دیا جاتا ہے۔

***

۱۹۹۲ کے آغاز میں کراچی کے تقریباً دس ہزار باشندے رحمان آباد نامی چھوٹی پُرسکون بستی کے ۸۵۰ مکانوں میں رہ رہے تھے۔ اس بستی کی زندگی کے بائیس برسوں میں ان باشندوں نے اپنی زندگیوں کو ایک ایک اینٹ رکھ کر تعمیر کیا تھا اور قریب کے علاقوں میں روزی کما رہے تھے۔ اچانک، ۲۳ فروری ۱۹۹۲ کو، کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے بُل ڈوزر پولیس کی حفاظت میں وہاں آ پہنچے اور انھوں نے پوری بستی کو مسمار کر دیا۔ اس کے بعد ہونے والے واقعات میں بستی کے کئی باشندے ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے اور بہت سوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بستی کی کئی عورتوں کو جبری زنا کا نشانہ بنائے جانے کی بھی اطلاعات ملیں۔ بستی کے رہنے والوں کی سیدھی سادی زندگیاں اچانک تباہی کا شکار ہو گئیں۔

رحمان آباد فیڈرل بی ایریا بلاک ۵ میں عائشہ منزل کے پیچھے واقع ایک کچی آبادی تھی جس کے ارد گرد ۴۰۰، ۶۰۰ اور ۱۰۰۰ مربع گز کے بنگلے تھے۔ رحمان آباد کے مکینوں نے اپنی برسوں کی قلیل آمدنی کو جوڑ جوڑ کر اپنے کچے اور پکے مکان تعمیر کیے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ فیکٹریوں میں روزانہ اُجرت پر کام کرنے والے مزدور، کباڑیوں کے لیے چیزیں اکٹھی کرنے والے اور خوانچہ فروش تھے، اور کچھ عورتیں آس پاس کے بنگلوں میں گھریلو ملازماؤں کے طور پر کام کرتی تھیں۔ وہاں رہنے والے ۸۰

فیصد لوگ بنگالی، اور باقی پنجابی اور پٹھان تھے۔

سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی طرف سے جنوری ۱۹۹۲ میں جاری کیے گئے ایک نوٹیفکیشن کے مطابق رحمان آباد کو ۱۹۸۷ کے سندھ کچی آبادی ایکٹ کے تحت ریگولرائز کیا جانے والا تھا۔ لیکن بستی کے باشندوں کو اس کا قانونی حق ملنے سے پہلے اسے مسمار کر دیا گیا۔ اس سے پچھلے سال مقامی کاؤنسلر، سینیٹر زاہد اختر، جو ایک بااثر بلڈر رکن الدین کا بیٹا ہے، رحمان آباد کے مکینوں کو ہراساں کر کے یہ جگہ چھوڑ دینے پر مجبور کرتا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے کسی پیشگی نوٹس کے بغیر غنڈوں کی مدد سے رحمان آباد میں داخلے کے پانچوں راستوں پر رکاوٹی دیواریں تعمیر کرا دیں۔ اس طرح رحمان آباد میں داخل ہونے اور نکلنے کے لیے صرف ایک راستا باقی رہ گیا اور وہاں کے باشندے سخت دشواری میں مبتلا ہو گئے۔

کاؤنسلر سے کی جانے والی تمام اپیلیں بے اثر ثابت ہوئیں تو رحمان آباد کے باشندوں نے عدالت سے رجوع کیا اور حکم امتناعی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کاؤنسلر کی طرف سے ان کی بےدخلی کے حق میں یہ دلیل دی گئی کہ انھوں نے اس زمین پر غیر قانونی قبضہ کر رکھا ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ یہ زمین دراصل ایک رفاہی پلاٹ ہے اور اس پر ایک پارک بنایا جانا تھا۔

فروری ۱۹۹۲ کے شروع میں کاؤنسلر نے رحمان آباد کے رہنے والوں کو زبانی نوٹس دیا کہ زمین خالی کر دیں۔ انھوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کیوں کہ ان کے پاس عدالت کا حکم موجود تھا جو ۲۴ فروری ۱۹۹۲ تک موثر تھا۔ تب ضلعے کے ڈپٹی کمشنر نے ان سے ایک دستاویز پر دستخط کرا لیے کہ وہ اپنی مرضی سے یہ زمین چھوڑ کر چلے جائیں گے اور انھیں بدلے میں بلدیہ ٹاؤن شپ میں متبادل پلاٹ دیے جائیں گے۔ لیکن چوں کہ بلدیہ میں پانی اور بجلی جیسی بنیادی سہولتیں موجود نہیں تھیں، اس لیے یہ لوگ قدرتی طور پر وہاں منتقل ہونے میں ہچکچا رہے تھے۔ اس کے علاوہ رحمان آباد کے بیشتر باشندے اردگرد کے علاقے میں کام کرتے تھے اور دور دراز کے علاقے میں منتقل ہونا ان کے لیے سخت دشوار تھا۔

۲۳ فروری ۱۹۹۲ کو، یعنی عدالتی حکم کی میعاد پوری ہونے سے ایک دن پہلے، کے ایم سی کے بل ڈوزر پولیس کو ساتھ لے کر وہاں آ پہنچے۔ بستی کے غیر مسلح مکینوں پر فائرنگ کی گئی جس سے ایک شخص ہلاک ہو گیا اور کئی لوگ زخمی ہوئے۔ اطلاعات کے مطابق پچیس عورتوں کو اجتماعی زنا بالجبر کا نشانہ بنایا گیا اور پولیس نے گھروں کا قیمتی سامان لوٹ لیا۔ عدالت میں اپیل کرنے پر حکم امتناعی کی میعاد ۲۷ فروری تک بڑھا دی گئی تھی لیکن یہ بےفائدہ تھا کیوں کہ اس میعاد کے ختم ہونے سے پہلے ہی بستی کو مسمار کیا جا چکا تھا۔

انسانی حقوق کے کارکنوں، عورتوں کی انجمنوں اور دوسری مقامی تنظیموں نے اخباروں میں غم و غصے کے بیانات جاری کیے، لیکن ظلم کا نشانہ بننے والے خود معاملے کو آگے بڑھانے میں پرجوش نہ ہوئے۔ اس کے علاوہ بستی کے مسمار ہو جانے کے بعد رحمان آباد کے سابق مکینوں سے رابطہ قائم کرنا ممکن نہ رہا کیوں کہ وہ شہر بھر میں اپنے رشتےداروں اور دوستوں کے مکانوں میں منتقل ہو گئے تھے۔

ان میں سے بعض مکینوں کو کورنگی اور بلدیہ میں ۶۰ مربع گز کے متبادل پلاٹ دیے گئے۔ ساڑھے پانچ سو متاثرہ خاندانوں میں سے صرف چار سو کو متبادل پلاٹ الاٹ کیے گئے۔ باقی لوگوں کے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ رہی، کیوں کہ پلاٹ حاصل کرنے کے لیے قومی شناختی کارڈ کا ہونا لازمی تھا جس سے یہ لوگ محروم تھے۔ اس اثنا میں خالی کرائی گئی زمین کا صرف ایک حصہ پارک میں تبدیل کیا گیا ہے، جبکہ باقی حصے پر رہائشی پلاٹ بنا دیے گئے ہیں۔

جون ۱۹۹۲ میں کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کو برطرف کر دیا گیا اور فوج نے شہر میں امن و امان قائم کرنے کی ذمےداری سنبھال لی۔ اس اقدام سے شہر کی انتظامیہ پر مہاجر قومی موومنٹ کی گرفت ختم ہو گئی۔ مقامی کاؤنسلر بھی اسی لسانی تنظیم سے وابستہ تھا اور رحمان آباد سے بے دخل کیے جانے والوں کو محسوس ہوا کہ اب وہ اپنے چھوڑے ہوئے علاقے میں واپس آ سکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نے اس زمین پر جھگیاں ڈال لیں اور رفتہ رفتہ اسی حالت کو بحال کرنے لگے۔

تب ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو جھگیوں میں آگ لگا دی گئی۔ ساری جھگیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ دو شیرخوار بچے ہلاک اور متعدد لوگ شدید زخمی ہوئے۔ مقامی لوگوں نے آگ لگوانے کا ذمےدار سینیٹر زاہد اختر کو ٹھہرایا۔

کئی غیرسرکاری تنظیموں اور اخبارنویسوں کی دلچسپی لینے کے باعث متاثرہ افراد کو خاصی حمایت حاصل ہوئی۔ معاملہ اب عدالت میں ہے اور متاثرہ خاندان اپنے اس حق کو حاصل کرنے کے لیے قانونی جنگ لڑ رہے ہیں جس کا ان سے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے نوٹیفکیشن میں وعدہ کیا گیا تھا۔

***

رحیمہ خاتون کہتی ہے: "دیکھو، یہاں کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ نہ پانی ہے نہ بجلی۔ بس تیز ہوا ہے، دھول مٹی اور سامنے سمندر۔ کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا۔ مجھے تو یہ فکر ہے کہ میرے بچے کیا کھائیں گے۔" رحیمہ خاتون جس جگہ کی بات کر رہی ہے وہ کورنگی ہے جہاں اسے اور اس کے خاندان کو منتقل کیا گیا ہے۔ وہ تقسیمِ ہند کے تقریباً چھ سال بعد کراچی آئی تھی اور تب سے مختلف کچی آبادیوں میں رہتی چلی آئی تھی۔ آخرکار وہ غیرقانونی طور پر فیڈرل بی ایریا میں عائشہ منزل کے پیچھے رحمان آباد کے پاس جا بس گئی تھی اور رفتہ رفتہ کئی برس کی مدت میں اس نے اپنا مکان پکا کرا لیا تھا۔

پچھلے سال اگست میں ہمارے علاقے کے کونسلر نے بتایا کہ تمھیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ ہم نے پوچھا کہ آخر ہم جائیں گے کہاں۔ اس نے کہا کہ فکر مت کرو، میں اس کے بدلے میں پلاٹ دلوا دوں گا۔ کچھ لوگ تیار نہ ہوئے کیوں کہ اس نئی جگہ پر کچھ بھی نہیں تھا۔ اور پھر ہماری روزی کا کیا ہو گا؟ ہمارے کونسلر نے بتایا کہ وہاں پہنچنے کے ایک ہفتے کے اندر اندر ہمیں ساری سہولتیں مل جائیں گی۔ ہمیں اس نی

بات پر شک تھا لیکن ہم کیا کر سکتے تھے؟ ہم غریب لوگ ہیں۔ ہمارے پاس نہ پیسا ہے نہ طاقت۔ ہمارے پاس راستا ہی کیا تھا۔

یہ ۱۶ اگست کو کونسلر پولیس اور بہت سارے آدمیوں کے ساتھ آ گیا اور ہم سے کہا کہ سامان باندھ لو، تمہیں کورنگی لے جا رہے ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ میں ان کو کہاں سے کھلاؤں گی؟ میرے مکان کا کیا بنے گا؟ اور میری نوکری؟

ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اُن لوگوں کے پاس بندوقیں تھیں۔ ہمارا کون جانتا ہے؟ ہم نے اپنا جو تھوڑا بہت سامان تھا سمیٹا اور مکان کی جتنی چیزیں بچائی جا سکتی تھیں بچائیں۔ سب عورتیں رو رہی تھیں۔ ہم نے ایک ایک پیسا جوڑ کر اتنی مشکلوں سے یہ مکان بنائے تھے اور اب انھیں گرایا جا رہا تھا۔

ہمیں ایک گڑھے میں پلاٹ دیے گئے۔ یہاں کوئی کیسے مکان بنا سکتا ہے؟ دو مہینے پہلے پانی کی لائن پھٹ گئی تھی تو سارے میں پانی بھر گیا تھا۔ پلاٹ کی قیمت نو ہزار روپے ہے۔ دو قسطوں میں دینی ہے۔ ساڑھے چار ہزار روپے کہاں سے لائیں؟ ایک سال ہو چکا ہے۔ دو وقت کی روٹی ہی مشکل سے چلتی ہے۔ پیسے بچیں کیسے؟ ہمیں قرضہ بھی کون دے گا؟ ہم سڑک کے دوسری طرف آ پڑے ہیں، یہ جگہ ذرا اونچی ہے۔ مگر یہ بھی عارضی ہے۔

کونسلر نے کہا تھا کہ ایک ہفتے میں ساری سہولتیں مل جائیں گی۔ اب تک صرف پانی کا نل ملا ہے۔ اس میں بھی پانی رات کو دو بجے آتا ہے، صرف دو گھنٹے کے لیے۔ یہاں تین سو گھر ہیں۔ ہمارے حصے میں صرف تین کنستر آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو بالکل پانی نہیں ملتا۔ انھیں بھی اپنے حصے میں سے دینا پڑتا ہے۔

ہم صرف جھگیاں ہی ڈال سکتے ہیں۔ پاخانے نہیں ہیں۔ مردوں کے لیے تو زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ وہ کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ مگر ہم عورتوں کے لیے بڑا مسئلہ ہے۔ یہاں رہنا اس قدر مشکل ہے۔ ہوا اتنی تیز چلتی ہے کہ کبھی کبھی تو جھگیوں کی چھتیں اُڑ جاتی ہیں۔ پھر یہ جگہ شہر سے اتنی دور ہے کہ آنے جانے میں روز کے دس روپے لگتے ہیں۔

عائشہ منزل میں کم از کم ہم شہر میں تو تھے۔ وہاں کام بھی مل جاتا تھا۔ مرد بھی گھر چلانے کے لیے تھوڑا بہت کما لیتے تھے۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ وہاں کچھ لوگوں کی دکانیں تھیں یا چائے کے کھوکھے تھے۔ عورتیں آس پاس کے بنگلوں میں کام کرتی تھیں۔ ہم مہینے میں آٹھ نو سو روپے کما لیتے تھے۔ اب وہاں پہنچنے ہی میں روز کے دس روپے خرچ ہو جاتے ہیں اور مہینے میں پانچ چھ سو روپے بچتے ہیں۔

یہاں مردوں کو دیکھو۔ سب کے سب بے کار بیٹھے ہیں۔ پرانی آبادی میں کچھ لوگ قریب کی ملوں میں کام کرتے تھے، روز کی مزدوری پر۔ کچھ ٹھیلے چلاتے تھے۔ یہاں کہاں ٹھیلا چلائیں؟ خریدنے والا کون ہے؟ سڑک یہاں سے اتنی دور ہے۔ اور پھر مال خریدنے کے لیے بھی تو پیسا چاہیے۔ پیسا کس کے پاس ہے؟ کچھ مردوں نے مچھلیاں پکڑنے کا کام شروع کیا تھا۔ مگر اب مچھلی پکڑنے پر بھی پابندی لگ گئی

ے۔ اں کی حالت ہت حراب ہے۔

اں عورتوں ہی کو کام کرںا پڑںا ہے۔ کام پر حاںے اور واپس آںے ہی میں دو گھںٹے لگ حاتے ہیں۔ اگر میں کام ںہ کروں تو میرے ںچے ھوکے مر حائیں۔ ہر چیز اںتی مہنگی ہو گئی ہے حو لوگ سب سے زیادہ عریب تھے وہی یہاں آئے۔ حں کے پاس تھوڑا ہت پیسا تھا وہ ںہیں آئے۔ اںھوں ںے موسیٰ کالوںی میں یا کہیں اور کراںے پر رہںا شروع کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ کم از کم روزی کی حگہ سے تو قریب رہیں گے۔ اگر ہمارے پاس کچھ پیسے ہوتے تو شاید ہم ھی اپںے کام کی حگہ کے پاس ہی کہیں رہںے لگتے۔ ہماری قسمت ہی حراب ہے۔ ںہ کسی کو ہماری پروا ہے ںہ کوئی کچھ کرتا ہے ہمارے لیے۔ ہمیں حود ہی یہر سے ایک ایک پیسا حوڑ کر اپںے گھر ںںاںے پڑیں گے۔

**

یان فانڈرِ لنڈن

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص فہمیدہ ریاض

دلّال آباد

> Herzog was all too aware of the layers upon layers of reality — loathsomeness, arrogance, deceit and then —God help us all!— truth as well
>
> (Saul Bellow *Herzog*)

کراچی شہر میں کم آمدنی والے طبقوں کی رہائش کے بندوبست کا اہم ترین حصہ زمین کی غیر قانونی پلاٹ بندی اور فروخت پر مبنی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس غیر رسمی نظام نے بے حد اہمیت حاصل کر لی ہے، اور لوگوں کے (غیر منظم طور پر) زمین پر جھگی ڈال کر بیٹھ جانے کے طریقے کو قریب قریب ختم کر دیا ہے۔ اس نظام کے تحت وجود میں آنے والی کچی آبادیوں میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں:

-- یہ آبادیاں شہر کے بیرونی کناروں پر بنائی جاتی ہیں۔

-- منظم طور پر بنائے جانے کے باعث ان آبادیوں کا نقشہ بہتر ہوتا ہے اور پلاٹ کا رقبہ کسی قدر بڑا ہوتا ہے۔

-- ان کو ڈویلپ کرنے والے شخص کے اثر و رسوخ کے باعث یہاں آ کر آباد ہونے والوں کے لیے بے دخلی کا خطرہ نسبتاً کم ہوتا ہے گو کہ ان کے پاس ملکیت کا کوئی قاعدی ثبوت موجود نہیں ہوتا۔

-- نقشے کے بہتر ہونے اور بے دخلی سے قدرے محفوظ ہونے کے باعث یہ آبادیاں کم آمدنی والے طبقوں کے لیے رہنے کی پُرکشش جگہیں بن جاتی ہیں۔ لیکن شہر سے اور روزگار کی جگہوں سے دور واقع ہونے کے باعث ٹرانسپورٹ کے اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں کسی زمین پر جھگی ڈال کر بیٹھ جانے کے برعکس ان آبادیوں میں پلاٹ خریدنا پڑتا ہے۔ ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہے کہ ان آبادیوں میں آ کر بسنے والے شہر کے غریب ترین لوگ نہیں بلکہ ان سے ذرا بہتر مالی حالت والے ہوتے ہیں۔

-- اس آخری خصوصیت اور بے دخلی سے تحفظ اور بہتر ابتدائی منصوبہ بندی کے باعث ان

آبادیوں کے انفرادی مکانوں میں ڈویلپمنٹ کی سطح نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔

دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کے برخلاف، کراچی میں یہ آبادیاں قائم کرنے والے لوگ سرکاری زمین پر قبضہ کر کے اس کی پلاٹ بندی اور فروخت کا کام کرتے ہیں۔ اس لیے کراچی کی ان آبادیوں، اور ان کے قائم ہونے کے نظام، کا مطالعہ نہایت کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس مضمون میں میں نے کراچی کی ایک ایسی ہی غیر قانونی آبادی کے قیام کی کچھ تفصیلات پیش کی ہیں۔ ایک غیر قانونی طور پر چلنے والے نظام کے بارے میں جمع کی گئی تفصیلات بعض اوقات ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔ لیکن اس نظام کے مختلف کرداروں سے بات چیت کر کے میں ان تفصیلات کو معقول حد تک درستی کے ساتھ متعین کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ جہاں کہیں ضروری تھا، میں نے کرداروں کے اصل نام بدل دیے ہیں اور اس آبادی کا نام اور اس کے بارے میں بھی بعض کم اہم تفصیلات تبدیل کر دی ہیں تاکہ اسے پہچانا نہ جا سکے۔

پس منظر

کراچی کے شمال مغرب میں واقع علاقے اورنگی میں زمین کی غیر قانونی پلاٹ بندی اور تقسیم کا کام ۱۹۶۹ سے جاری ہے۔ اورنگی کا علاقہ بیشتر بنجر زمین اور پہاڑیوں پر مشتمل ہے اور پہاڑیوں کی قطاروں کے بیچ میں کہیں کہیں وسیع وادیاں ہیں۔ ۱۹۶۵ کے بعد سے کے ڈی اے نے اورنگی کے تین حصوں میں پلاٹ اورشپ اسکیمیں شروع کیں جن میں مکان بنانے کی جگہ اور کچھ سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں، اگرچہ شروع شروع میں وہاں کسی قسم کی سہولت دستیاب نہ تھی۔ ان اسکیموں کے شروع ہونے کے بعد جلد ہی ان کے ارد گرد غیر قانونی آبادیاں بسنے لگیں، اور ۱۹۷۰ کے آغاز تک اندازاً تین ہزار خاندان ان اسکیموں کے ارد گرد آباد ہو چکے تھے۔ ۱۹۷۱ کے بعد کئی لاکھ بہاری خاندان بنگلادیش سے پناہ گزین بن کر پاکستان پہنچے۔ یہ لوگ نہ صرف تعداد میں زیادہ تھے بلکہ نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور ہنرمند ہونے کے باعث لیبر مارکیٹ میں زیادہ سخت مقابلہ کر سکتے تھے، لہذا مقامی آبادی کے کئی گروہوں کے لیے ان کی آمد پریشان کن تھی۔ حکومت نے ان کو پاکستان میں داخلے کی اجازت دی تھی لیکن ان کی کراچی میں آبادکاری اور بحالی کے سلسلے میں کوئی وسیع پروگرام شروع کرنے کو تیار نہ تھی جہاں یہ لوگ اپنے شہری پس منظر کے باعث آباد ہونا چاہتے تھے۔ کئی سمتوں سے ایسی آوازیں اٹھ رہی تھیں کہ کراچی اپنے حصے سے زیادہ مہاجرین کو جگہ دے چکا ہے اس لیے ان لوگوں کو پاکستان میں کسی اور جگہ بسایا جانا چاہیے۔

ایسی صورتِ حال میں جتنے زیادہ غیر سرکاری لوگ اور تنظیمیں بہاریوں کی آبادکاری میں حصہ لے کر ان کو نظروں سے اوجھل کر سکتیں، حکومت کے لیے اُتنا ہی بہتر تھا۔ میں پٹھانوں سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا، کے ڈی اے کے ایک افسر نے کہا، اُس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آبادکاری کا کام غیر قانونی پلاٹ

سدی کرنے والوں کے لیے چھوڑ دیں اور زیادہ سیاست سمجھتا ہے جو اکثر پٹھاں دلالوں کی وساطت سے کام کرتے ہیں۔ اس طرح زمین کی غیرقانونی تقسیم کے نظام کو بڑی تقویت ملی۔

اس سے پہلے بھی یہ کام کرنے والے آباد کاروں کا دعویٰ تھا کہ وہ شہر میں آنے والے کم حیثیت باشندوں کو کم قیمت پر زمین فراہم کرکے ایک اہم سماجی خدمت انجام دیتے ہیں۔ بہاریوں کے معاملے میں یہ دعویٰ اور بھی قوی ہو گیا کیوں کہ یہ نئے آنے والے نہ صرف غریب تھے بلکہ پناہ گزیں بھی تھے جن کے پاس جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ چوں کہ حکومت علی الاعلان اور کم لاگت پر ان کی آبادکاری کا کام کرنے سے قاصر تھی، اس لیے غیرقانونی آبادکاروں کی پوزیشن اور بھی مضبوط ہو گئی اور ان میں سے بہت سوں نے اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔

غیرقانونی آبادکاروں کے لیے پہلا مسئلہ اپنے عمل کے لیے تحفظ حاصل کرنا اور دوسرا مسئلہ اوّلین خریداروں کو وہاں بسنے پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ اکثر نئی آبادیوں میں پہلے چند سو پلاٹ برائے نام قیمت پر، اور کبھی کبھی مفت، دیے جاتے ہیں۔ سو پچاس خاندانوں کے وہاں آباد ہو جانے کے بعد بنیادی سہولتوں کے سنگین مسائل ـــــ پانی، ٹرانسپورٹ، روزمرہ ضرورت کی چیزوں کی دکانیں وغیرہ ـــــ رفتہ رفتہ کم ہونے لگتے ہیں۔ یوں یہ نئی آبادی پلاٹ حاصل کرنے کے خواہش مندوں کے لیے زیادہ پُرکشش ہو جاتی ہے۔ یہ موقع آنے کے بعد سے پلاٹوں کی قیمت متواتر بڑھتی جاتی ہے اور آبادکار کو منافع حاصل ہونے لگتا ہے۔

نئی آبادی شہر سے جتنے زیادہ فاصلے پر ہو، اوّلین بسنے والوں کو آمادہ کرنا اُسی قدر مشکل ہوتا ہے۔ وہ پلاٹ حاصل کرنے کے لیے بہت کم رقم ادا کرتے ہیں، لیکن اس کے بدلے انھیں شروع شروع کی سخت دشواریاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ درحقیقت یہی لوگ ایک ویران علاقے کو شہری آبادی میں تبدیل کرتے ہیں جس کے نتیجے میں وہاں زمین کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان دشواریوں کے پیشِ نظر انتہائی غریب اور مجبور لوگ ہی اس کام پر آمادہ ہوتے ہیں، گو کہ یہی وہ لوگ ہیں جو ٹرانسپورٹ کا خرچ برداشت کرنے یا روزگار کی جگہوں سے دور بسنے کی سب سے کم استطاعت رکھتے ہیں۔

ان تمام ابتدائی مشکلات سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ شہر کے بیرونی کنارے پر بسنے والی آبادیاں اس قدر سست رفتاری سے کیوں بڑھتی ہیں۔ کسی پہلے سے قائم آبادی سے اور آگے بسنے والی آبادی میں آنے کے لیے لوگ تبھی آمادہ ہوتے ہیں جب پہلے والی آبادی کسی قدر مستحکم طور پر قائم ہو چکی ہو اور وہاں کے پلاٹوں کی قیمت نئی قائم کی جانے والی آبادی کے مقابلے میں خاصی بڑھ چکی ہو۔ ۱۹۷۴ تک نئی قائم کی جانے والی غیرقانونی آبادی میں پہلےپہل بسنے والوں کو آمادہ کرنا خاصا دشوار ہو چکا تھا۔ لیکن کئی لاکھ بہاری خاندانوں کے آجانے سے ایسے لوگ بڑی تعداد میں مہیا ہو گئے جن کے پاس رہنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ علاوہ ازیں، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، سیاست دانوں اور سرکاری اہلکاروں کی جانب سے غیرقانونی آبادکاری کے کام کے لیے تحفظ بھی آسانی سے فراہم ہونے لگا۔

ممکن ہے اس موقعے پر کچھ افراد اور تنظیمیں واقعی نیک نیتی سے بے گھر لوگوں کی امداد کرنے کے مقصد سے اس کام میں شامل ہوئی ہوں، لیکن عمومی طور پر زمین کی غیرقانونی تقسیم کا پہلے سے موجود نظام قائم رہا۔ بے گھر لوگوں کی بڑی تعداد کی آمد سے یہ نظام تبدیل ہونے کے بجائے مزید مستحکم ہوا۔ اس سلسلے میں خاص بات یہ تھی کہ اورنگی میں ہماری بے گھر لوگوں کی بحالی اور آبادکاری کے مقصد سے متعدد آبادیاں قائم کی گئیں جن میں سے ہر آبادی میں بے گھر خاندانوں کی محدود تعداد ــــ اکثر صورتوں میں صرف چند سو خاندانوں ــــ کو بسایا گیا جب کہ آبادی کا باقی رقبہ خالی رکھا گیا۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک ہی غیرقانونی آبادکار نے بیک وقت کئی آبادیاں قائم کیں۔ اس قسم کی ایک مثال اُس آبادکار کی ہے جس نے دو کالونیاں بنائیں، ایک شہر سے صرف چند کلومیٹر دور اور دوسری دس کلومیٹر کے فاصلے پر۔ آخرالذکر آبادی میں پہلے پہل بسنے والے لوگ انتہائی محتاج تھے۔ اس آبادکار کی نیک نیتی پر یقیناً شبہ کیا جاسکتا ہے جس نے ان چند خاندانوں کو دوردراز اور نہایت دشوار مقام پر بسایا اور یوں مفت فراہم کیے جانے والے پلاٹوں کے اردگرد کے وسیع قطعۂ زمین پر قبضہ کرلیا۔

دلال آباد

'دلال آباد' نامی غیرقانونی آبادی اورنگی سے بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر اور شہر کے صنعتی علاقے سے تقریباً سات کلومیٹر دور واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۸۰ ایکڑ ہے جسے ۱۲۰ مربع گز کے پانچ ہزار پانچ سو رہائشی پلاٹوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حال تک یہ علاقہ حکومت سندھ کے محکمۂ محصولات کے تحت آتا تھا۔ علاقے کے کچھ حصے پر مقامی باشندوں کو ملکیت کا دعویٰ تھا۔ بقیہ زمین پر مقامی چرواہوں کو مویشی چرانے کا سرکاری پروانہ دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۴ میں وہاب نے ایک دلال (middleman) کو بیچ میں ڈال کر یہ پورا علاقہ غیرقانونی طور پر خرید لیا۔ دلال نے مقامی باشندوں کو کچھ رقم ادا کی اور فی پلاٹ پولیس کو غیرسرکاری مگر مقررہ رقم دی۔ بعد ازاں اس نے پورے علاقے میں تعمیراتی منصوبہ، مع سڑکوں وغیرہ کے، تیار کیا۔ وہاب کو اس عمل میں سیاسی اور انتظامی عملے کی سرپرستی حاصل تھی۔ انٹرویو کرنے پر اس نے چند نہایت بااثر شخصیتوں کا نام لیا جن میں ایک صوبائی اور ایک وفاقی وزیر بھی شامل تھے۔ دوسرے لوگوں سے بات چیت میں ان ناموں کی تصدیق بھی ہوئی۔ یہ بھی دل چسپ بات ہے کہ دلال آباد میں ایک اَور سیاست داں کے رشتےدار کے کئی پلاٹ ہیں۔

اس پورے عمل میں دلال کے رول کی تصریح مشکل ہے۔ مقامی سطح کا سیاست داں ہونے کے علاوہ اس کا پیشہ غیرقانونی آبادکاری ہی ہے اور وہاب کی طرح اُسے بھی سیاسی اور انتظامی سرپرستی حاصل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ علاقے کی پلاٹ بندی اور پلاٹوں کی فروخت کا کام اُسی نے کیا۔ جب کہ وہاب کا کہنا ہے یہ تمام کام دلال نے اُس کے کہنے پر اور اس کی نگرانی میں کیا تھا۔

دلال اتنی خودمختاری سے کام کرتے ہیں کہ انھیں اصل آبادکار سمجھنا غلط نہ ہو گا۔ مگر اس خاص وقوعے میں وہاب نے سب سے پہلے یہاں کچھ خاندان آباد کیے، لہذا اصل آبادکار وہی سمجھا جائے گا۔ دراصل اس پورے عمل میں فاعل افراد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر کام نہیں کر سکتے۔

کراچی میں بنگلادیش سے آنے والے بہاریوں کی آبادکاری کے لیے متعدد کمیٹیاں بنائی گئی تھیں۔ وہاب ان میں سے ایک کا پُرجوش اور مرکزی اہمیت رکھنے والا عہدے دار تھا۔ ابتدا میں یہاں بیجنتر کے قریب بہاری خاندانوں کو سرکنڈوں کی جھگیوں میں آباد کیا گیا۔ بعد میں انھیں ایک ایک کمرے کے مکانات دے دیے گئے۔ دلال آباد میں صرف انھیں خاندانوں کے پاس ادائیگی کی رسیدیں ہیں جن پر پانچ روپے کی برائے نام رقم کا اندراج ہے (گو رقم پچیس سے سو روپے تک ادا کی گئی تھی۔) رسید پر آبادکاری کا مقصد پناہ گزینوں کی بحالی درج ہے۔

اس کمیٹی کے تیار کیے ہوئے منصوبے میں دلال آباد کے کل رقبے کا صرف ایک بٹا پانچ حصہ شامل ہے۔ اس حصے میں سڑکوں، رہائشی اور تجارتی علاقوں وغیرہ کی نشان دہی کی گئی۔ چوراہوں کی نشان دہی کے لیے پتھر نصب کیے گئے۔ ایک اسکول اور ایک مسجد کے لیے زمین مختص کی گئی۔ (غیرقانونی آبادیوں میں اکثر کسی پیر فقیر کی درگاہ کے لیے بھی زمین رکھی جاتی ہے۔ دلال آباد چونکہ منگھوپیر کے مزار کے پاس واقع ہے، اس لیے وہاں نئے پیر کی گنجائش نہیں تھی۔) منصوبے میں ایک قبرستان بھی شامل تھا، مگر باغ یا کھیل کے میدان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔

اس عمل میں جو اخراجات ہوئے اس کے بارے میں الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف اطلاعات فراہم ہوئیں۔ یہاں کے مقامی باشندوں کو فی پلاٹ تین روپے دیے گئے اور پولیس کو دو روپے فی پلاٹ۔ علاقے کو رہائشی اور تجارتی پلاٹوں میں تقسیم کرنے میں مزدوروں اور سامان وغیرہ پر دو روپے فی پلاٹ خرچ ہوئے۔ وہاب نے دلال کو آٹھ روپے سے بیس روپے تک فی پلاٹ ادا کیے۔

۱۹۷۴ ہی میں کچھ زمین سو روپے فی پلاٹ کے حساب سے بیچی گئی۔ یہ معاملہ وہاب کے ایک رشتے دار عدیل کے ہاتھوں طے ہوا جسے کمیٹی نے علاقے میں اپنا نمائندہ بنایا تھا۔ کمیٹی نے عاقل نامی ایک چوکیدار بھی رکھا جس کا کام یہ تھا کہ بلااجازت آ بسنے والوں پر نظر رکھے۔ شروع شروع میں عدیل کی سرپرستی میں کچھ پلاٹ عاقل نے بھی بیچے۔

کئی پناہ گزینوں نے دو دو اور تین تین پلاٹ خریدے تھے۔ کچھ عرصے بعد جب ان کی قیمت بڑھ گئی تو انھوں نے زائد پلاٹ منافعے پر بیچ دیے۔ کچھ افراد نے پناہ گزینوں کے گروہ کا دعوے دار بن کر پچیس سے پچاس تک پلاٹ حاصل کر لیے۔ اس طرح کے ایک واقعے میں وہاب نے پولیس کے ذریعے ان افراد کو بے دخل کیا۔

کچھ عرصے بعد وہاب کے ایما پر ایک دلال آباد فلاحی کمیٹی بنائی گئی جس میں دلال آباد کے

سر برآوردہ ساکن اور شہر کے کچھ ممتاز لوگ شامل تھے، وہاب بھی ان میں سے ایک تھا۔ جلد ہی اس کمیٹی کے ممبروں نے خود بھی پلاٹ بیچنے شروع کر دیے اور تجارتی پلاٹ آپس میں تقسیم کر لیے۔ یہ تمام خرید وفروخت عاقل، عدل اور پولیس کی خوشنودی حاصل کرنے کے بعد ہی ممکن ہو سکتی تھی۔ ابتدائی برسوں میں پولیس ہر ہفتے اپنا حصہ وصول کرنے آتی تھی۔ ایک پولیس والے نے بھی کچھ پلاٹ فروخت کیے۔

چونکہ یہ سارا معاملہ غیر قانونی تھا اس لیے پولیس کو تمام دوسرے فریقوں پر بالادستی حاصل تھی۔ لیکن وہاب اپنے اثرورسوخ سے کام لے کر پولیس کو ایک حد سے بڑھنے سے باز رکھ سکتا تھا۔ وہاب نے ہمیں بتایا کہ پولیس والوں کے چھوٹی موٹی رقم لے لینے پر تو مجھے اعتراض نہیں کیوں کہ اس ملک میں یہی چلتا ہے۔ لیکن اگر پولیس والے زیادہ پیسے اینٹھنے کی کوشش کرتے تو وہاب ان کا ٹرانسفر کروا دیتا تھا۔
وہاب نے کے ڈی اے کو قائل کر لیا کہ اس آبادی کو پانی فراہم کیا جائے۔ کمیٹی سیمنٹ کے حوض پہلے ہی بنوا چکی تھی۔ کے ڈی اے کے ٹینکر ایک دن چھوڑ کر پانی لاتے ہیں۔ پانی کے حوض سیمنٹ کے بلاکوں سے بنتے ہیں، جہاں یہ بلاک بنانے والے پانی کی تقسیم کو کنٹرول کرنے لگے۔ ان کی اہمیت یوں بھی تھی کہ مکان بنانے کا سامان وہ آبادی میں آنے والوں کو قرض پر مہیا کر سکتے تھے۔ ایک معمولی مکان پر آنے والی لاگت کا ۲۰ سے ۵۰ فیصد حصہ اسی سامان پر خرچ ہوتا ہے۔ بلاک بنانے والے بھی پلاٹ بیچنے کا کام کرتے ہیں۔ دلال آباد کا چوکیدار عاقل بلاک بھی بنانے لگا۔
سب سے اول بسائے جانے والے خاندانوں کے بعد خرید وفروخت کے تحریری ثبوت مہیا نہیں کیے گئے۔ اس سے چوکیدار کی طاقت میں بے حد اضافہ ہوا کیوں کہ بہرحال سرکاری زمین کے پلاٹ بیچنا اور ان پر مکان بنانا غیر قانونی عمل ہے۔ اب یہ چوکیدار کی مرضی تھی کہ وہ جسے چاہے پلاٹ لینے کا حقدار بتائے اور جسے چاہے غیر قانونی قابض ثابت کر دے۔ اس کی پولیس سے ملی بھگت تھی۔ پولیس کے دباؤ سے اگر معاملہ چوکیدار کی مرضی کے مطابق طے ہو جائے تو وہ ایسے خاندان کو بحالی کا حقدار قرار دے دیتا تھا۔

بعض صورتوں میں پلاٹ خریدنے کے بعد اس پر فوری قبضہ کر کے مکان بنانا شروع نہیں کیا جاتا۔ اس کی دو ممکنہ وجہیں ہوتی ہیں۔ یا تو خریدار نے پلاٹ بعد میں منافعے پر بیچنے کے لیے خریدا ہے، یا پھر اس کے پاس مکان کی تعمیر شروع کرنے کے پیسا بالکل نہیں ہے۔ فوری قبضہ نہ لینے کی صورت میں پلاٹ کے دوبارہ کسی اور کے ہاتھ فروخت کر دیے جانے کا خطرہ رہتا ہے کیوں کہ لین دین کی کوئی رسید نہیں دی جاتی۔ ہمیں اس طرح کے ایک واقعے کا علم ہوا۔ ایک پان بیڑی سگریٹ کی دکان والے نے ایک پلاٹ خریدا تو خریدتے وقت اپنے پرانے پڑوسی، ایک ریٹائرڈ فوجی افسر، کو ان کا یونیفارم پہنوا کر ساتھ لے گیا تا کہ وردی پوش عینی شاہد کے ڈر سے اس کا پلاٹ کسی اور کے ہاتھ دوبارہ نہ بیچا جائے۔
علاقے کا چوکیدار اس عمل میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔ یہاں رہنے والوں نے اس کے بارے

میں وہاب کو اتنی شکایات بھیجیں کہ آخرکار وہاب کو اسے برطرف کرنا پڑا۔ لیکن اس کی جگہ اس کے بھائی سی کو رکھا گیا، جہاں چہ کاروبار انھیں ہاتھوں میں رہا۔

دلال آباد کا کل ۱۸۰ ایکڑ رقبہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ۳۰ ایکڑ پر مشتمل ایک حصہ وہ ہے جس کی ابتدا ہی میں پلاٹ بندی کر لی گئی تھی اور اس حصّے کے سرحدی پلاٹوں پر بیشتر اولین بے گھر خاندانوں کو لا بسایا گیا تھا۔ ان پلاٹوں اور اورنگی کی پرانی آبادیوں کے درمیان کا بہت بڑا رقبہ خالی چھوڑا گیا۔ اسے دلال آباد میں زمین کی قیمت بڑھنے کے بعد پلاٹ بندی کر کے بیچا گیا۔ یہ حصہ اب جزوی طور پر آباد ہو چکا ہے۔

دلال آباد کا ۱۵۰ ایکڑ پر مشتمل دوسرا حصہ، جو اول بسنے والے خاندانوں کے پلاٹوں سے آگے واقع ہے، ابتدا میں یہ چھوڑا گیا، سوائے ایک قطعۂ زمین کے جسے قبرستان کے لیے مختص کیا گیا تھا جو بعد میں استعمال کیا جانے لگا۔ اس حصے کے پلاٹ بعد میں سرمایہ کاروں کے ہاتھ دس سے لے کر سو (یا زائد) پلاٹ فی کس اکٹھے فروخت کیے گئے۔

۱۹۷۴ کے بعد سے دلال آباد کے اس حصے میں بڑے بڑے پلاٹوں پر مرغی خانے کھلنے شروع ہو گئے۔ اورنگی کے سروے مصافات میں ڈیڑھ ہزار سے دو ہزار تک مرغی خانے ہیں۔ بڑھتے بڑھتے مرغی خانے رہائشی علاقے میں گھسنے لگے۔ دلال آباد کے ان مرغی خانوں کے مالکان میں سرکاری افسر، وکلا، ٹھیکے دار اور ملک بنانے والے شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایسی ایک تنظیم بنا لی ہے اور اس علاقے کو صنعتی علاقہ قرار دلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مرغی خانوں اور آباد رہائشی پلاٹوں کے درمیان واقع علاقہ سب سے زیادہ متنازعہ ہے۔ مرغی خانوں کے مالکان اور رہائشی پلاٹوں کے مکین دونوں اس خالی علاقے پر دعویٰ رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں زور لگا رہے ہیں۔

۱۹۷۷ میں وہاب نے بارش سے متاثرہ بے گھر خاندانوں کو ۸۰ پلاٹوں کا عطیہ دیا تھا۔ مگر جب یہ خاندان یہاں آ کر بسے تو چوکیدار کو خوش رکھنے کے لیے اُنھیں فی پلاٹ پانچ سو سے ایک ہزار روپے تک چوکیدار کو دینے پڑے۔ پلاٹ کی قیمت بھی اُس زمانے میں کم و بیش اتنی ہی تھی۔

اورنگی کا پورا علاقہ حکومت سندھ کی ملکیت ہے، یعنی بورڈ آف ریوینیو کے تحت آتا ہے۔ کے ڈی اے نے اپنی پلاٹ اونرشپ اسکیموں کے لیے اس کے کچھ رقبے کی منصوبہ سازی اور پلاٹ بندی کی تھی لیکن یہ اسکیمیں ابھی مقامی بلدیہ کے کنٹرول میں نہیں دی گئی تھیں۔ آخرکار جولائی ۱۹۸۱ میں اورنگی کو بلدیۂ عظمیٰ کراچی کے سپرد کر دیا گیا۔ دلال آباد کا کچھ رقبہ بلدیہ کی حدود میں اور کچھ اس کے باہر واقع ہے۔ مرغی خانوں والا حصہ بورڈ آف ریوینیو کے تحت آتا ہے۔ بلدیہ اور بورڈ کے درمیان علاقے کی سرحد متنازعہ تھی۔

مرغی خانوں کے مالکان نے اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے پلاٹوں کو بلدیہ کی حدود سے باہر یعنی بورڈ آف ریوینیو کے حدود میں رکھے جانے کی پُرزور مہم چلائی، کیوں کہ پلاٹوں کی سرکاری لیز ملنے کی

صورت میں کے ایم سی کو ادا کی جانے والی لیز کی رقم مقابلتاً خاصی زیادہ ہے۔ جب بلدیہ اور بورڈ آف ریونیو کے درمیان سرحدی تنازعہ کم و بیش طے ہو گیا تو بورڈ کے متعلقہ افسر نے صاف کہہ دیا کہ وہ مرغی خانوں کو ہرگز تسلیم نہیں کرے گا۔ ۱۹۸۳ کے شروع میں اس نے انہدام کے اسکواڈ بھیج کر کئی مرغی خانے تڑوا بھی دیے جو استعمال میں نہیں تھے۔ اس طرح کے ہتھکنڈے عموماً مالکان سے پیسے وصول کرنے کے لیے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بھاری رشوت دینے کے بعد مرغی خانوں کے مالکان کو تیس تیس برس کی لیز مل گئی۔ لیز کی سرکاری فیس تقریباً چار ہزار روپے فی ایکڑ ہے جب کہ بلدیہ لیز دینے کے لیے اس سے دس گنا سے زائد رقم طلب کرتی ہے۔ حکومت سندھ کی جاری کردہ لیز کی دستاویز میں یہ شق بھی درج ہے کہ لیز پر دی جانے والی زمین کو مرغی خانہ کھولنے کے سوا کسی اور مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔ اس شرط کا محرک جو بھی کچھ ہو، اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ تیس برس کی میعاد پوری ہونے سے بہت پہلے یہ تمام پلاٹ شہر کے رہائشی مکانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ مستقبل قریب میں مرغی خانوں کے مالکان اور سرکاری اہلکاروں کے درمیان لین دین کے متعدد مواقع نکلنے لازمی ہیں۔

۱۹۷۸ میں جاری ہونے والے ایک مارشل لا آرڈر کے تحت یکم جنوری ۱۹۷۸ سے پہلے قائم ہونے والی تمام کچی آبادیوں کا مستقل کیے جانے کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ اس حق کی کچھ مستثنیات بھی تھیں لیکن دلال آباد اس کی ذیل میں نہیں آتا تھا۔ اس کے باوجود دلال آباد کے متنازعہ علاقے کے مکینوں کو نوٹس ملے کہ اپنے پلاٹ خالی کر دیں ورنہ ان کے خلاف ۱۹۸۰ کے مارشل لا آرڈر نمبر ۱۳۰ (تجاوزات کے خاتمے کے حکم) کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ جب دلال آباد کے باسیوں پر ان نوٹسوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو بُل ڈوزر بھیج کر کچھ مکان گرا دیے گئے۔ دلال آباد کے مکینوں کو اپنے رہنماؤں پر بھروسا نہ تھا، نہ انہیں وہاب سے امید تھی کہ وہ ان کی مدد کرے گا۔ چنانچہ انھوں نے خود کو منظم کر کے سرکاری اہلکاروں اور مارشل لا حکام سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے ایک وکیل کی خدمات حاصل کر کے مقدمہ بھی دائر کر دیا۔ عدالت نے فیصلہ ہونے تک حالات کو جوں کا توں رکھنے کا حکم جاری کر دیا۔

دلال آباد کے غیر متنازعہ علاقے کے مکینوں کو ۱۹۷۸ کے مارشل لا آرڈر سے بےدخلی کے خلاف خاصا غیر دستاویزی تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن اس آبادی کو اب تک مستقل نہیں کیا گیا ہے۔ مارشل لا کے اس حکم کے تحت جو لوگ اپنے پلاٹوں پر یکم جنوری ۱۹۷۸ سے پہلے سے رہ رہے تھے انھیں لیز حاصل کرنے کا حق دے دیا گیا تھا۔ لیکن حکم میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ اس تاریخ کے بعد کسی کو زمین پر غیر قانونی قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ۱۹۸۰ کے تجاوزات کے خاتمے کے حکم کے تحت ایسے لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کی جا سکتی ہے۔ گویا وہاں پہلے سے آباد لوگوں کے پاس ملکیت کا غیر دستاویزی تحفظ موجود ہے، لیکن تجاوزات والے حکم کے تحت کسی سے مکان کی تعمیر کو روکا جا سکتا ہے۔ دلال آباد کے ہر پلاٹ پر ملکیت کے دعوے موجود ہیں لیکن بہت بڑی تعداد میں پلاٹ

اب بھی غیر استعمال شدہ ہیں۔ ۱۹۷۴ سے ان پلاٹوں پر مکانوں کی تعمیر کا عمل سست رفتاری کے ساتھ چل رہا ہے۔

تجاوزات کے خلاف جاری ہونے والے مارشل لا آرڈر سے پولیس والوں اور بلدیہ کے بعض ملازمین کو ایک نیا موقع ہاتھ آیا اور وہ سر سے مکان کی تعمیر کے وقت اپنا حصہ طلب کرنے کے لیے آوارد ہونے لگے۔ اگر پلاٹ کے مالک انہیں رقم ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان کے خلاف مقدمہ درج کیا جاسکتا تھا بلکہ ان کو گرفتار بھی کیا جاسکتا تھا۔ طویل مقدمے پر ضائع ہونے والا وقت اور پیسا ایک خاصا بُرا تر محرک ہے جس کے تحت لوگوں کو بھتے کی ادائیگی پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۸۴ کے وسط تک دلال آباد کے ۳۰ ایکڑ والے اولین حصے میں تیار اور فروخت کیے گئے ایک ہزار پلاٹوں میں سے آٹھ سو آباد ہو چکے تھے۔ کوئی دو سو خاندان اُس حصے میں رہ رہے تھے جو بلدیہ اور بورڈ آف ریونیو کے درمیان متنازعہ تھا۔ ۱۹۷۴ سے ۱۹۸۴ تک دلال آباد کے پلاٹوں کی قیمتیں پچاس روپے فی پلاٹ سے بڑھ کر چھ سے بارہ ہزار روپے فی پلاٹ تک پہنچ چکی تھیں۔ اس طرح قیمت میں اضافے کی مرکب شرح ۷۰ فیصد سالانہ بنتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دلال آباد کے مکینوں میں وہاب کی مقبولیت کم ہوتی گئی۔ اس کا فلاحی شخصیت کا امیج کئی برس تک قائم رہا اور بدمعاملگی کی تمام شکایات اس کے خلاف نہیں بلکہ اس کے عملے کے خلاف ہوتی تھیں۔ جیسا کہ چوکیدار عاقل کے معاملے میں ہوا، دلال آباد کے لوگ پہلے پہل یہ شکایات وہاب ہی کے علم میں لاتے تھے۔ لیکن جب عاقل کو ہٹا کر اس کی جگہ اس کے بھائی کو لگا دیا گیا تو لوگوں نے وہاب پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا۔ کچھ لوگ البتہ اب تک یہی رائے رکھتے ہیں کہ وہاب تو اچھا آدمی تھا، ساری گڑبڑ اس کے چمچوں نے کی۔

۱۹۷۹ میں بلدیاتی انتخابات کے بعد منتخب کاونسلر منظر پر نمودار ہوئے۔ اس وقت سے علاقے میں کچھ سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ ایک سیاست داں نے مسجد اور اسکول کی تعمیر کے لیے سرکاری امداد دی لیکن ان دونوں عمارتوں کی تعمیر کا کام وہاب کے آدمیوں کے ہاتھ میں رہا اور دلال آباد کے بعض لوگوں کو یقین ہے کہ امداد کی رقم کا کچھ حصہ خرد برد کر لیا گیا۔

اسی دوران دلال آباد کے رہنے والوں نے وہاب کے خلاف خود کو منظم کرنا شروع کیا۔ دوسری باتوں کے علاوہ انھوں نے آبادی کا نام بھی تبدیل کرنا چاہا اور ایک چوراہے کی رہائش کر کے وہاں نئے نام کی تختی نمایاں کر کے لگا دی۔ انھوں نے وہاب کے خلاف ایک مقدمہ بھی دائر کیا جس کے ممکنہ فیصلے کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاب نے غنڈوں کو پولیس کی حفاظت میں بھیج کر چوراہے کی رہائشی تعمیر کو مسمار کرا دیا۔ اس موقعے پر سنگین لڑائی ہوئی۔ پولیس نے بھی وہاب کے مخالفوں کو بہت تنگ کیا جس پر وہ مجبوراً خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

یہ نظام ـــــ کچھ تفصیلات

مندرجہ بالا بیان کافی اُلجھا ہوا ہے۔ بہرحال یہ ایک نہایت اُلجھے ہوئے عمل کا بیان ہے تو سُلجھا ہوا کیوں کر ہو سکتا تھا۔ لیکن اس تمام الجھاوے میں ایک قسم کا نظام یقیناً کام کر رہا ہے۔

اس عمل میں جو بنیادی بات پیش آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے تمام فاعل کردار سرکاری ملکیت کو ذاتی اثاثے میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش میں سبھی کو ایک دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے، ہر ایک کا عمل دوسرے کے عمل کا محتاج ہے اور ہر ایک دوسرے سے اس تعاون کی قیمت وصول کرتا ہے۔

یہ قیمت نقد ادائیگی کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے، اور (جیسا کہ اولیں بسانے جانے والے خاندانوں کے ساتھ ہوا) مشقت کرنے اور دشواریاں اٹھانے کی صورت میں بھی۔ یہ قیمت کسی کردار کو کسی شکل سے تجارت، دلالی کی صورت میں بھی ادا کی جا سکتی ہے اور (جیسا کہ انتظامی اہلکاروں اور سیاست دانوں کا معاملہ ہے) بڑھی ہوئی طاقت کی شکل میں بھی جسے بعد میں نقدی میں تبدیل کیا جا سکے۔ عموماً قیمت کی ادائیگی میں یہ تمام شکلیں ملی جلی ہوتی ہیں۔

وہ سیاست داں اور بڑے افسران جو غیرقانونی آبادکاری کرنے والوں کی سرپرستی کرتے ہیں یا حوصلہ افزائی کا اشارہ دیتے ہیں، اس عمل میں ریاست کی شمولیت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ سب سے پہلے یہی لوگ ریاست کی طرف سے دیے گئے اختیارات کو ذاتی اثاثے میں تبدیل کرتے ہیں۔ انہیں کسی ٹکڑے بدے کی ضرورت ہوتی ہے جو یہ کام شروع کرے۔ ٹکڑے بدے کو مددگاروں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ سرکاری زمین کو ذاتی اثاثے میں بدل سکے۔ اس عمل کے دوران انتظامی اہلکار (بشمول پولیس) اپنے اپنے سرکاری اختیار کو ذاتی اثاثے میں تبدیل کرتے ہیں۔ اور آخرکار ان تمام فاعل کرداروں کو یہاں بسنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے جو تمام ابتدائی دشواریاں اور مشقتیں اٹھا کر صحرا کو شہری محلّے میں بدلتے ہیں۔

یہ اندازہ لگانا ناممکن ہے کہ دلال آباد میں سرکاری زمین کی غیرقانونی فروخت سے کتنا منافع کمایا گیا۔ ایک نہایت سادہ تخمینہ لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ فرض کیا جائے ۱۹۷۴ سے ۱۹۸۴ تک ہر سال دس فیصد پلاٹ فروخت کیے گئے۔ ایک پلاٹ کی اوسط قیمت ۱۹۷۴ میں ۵۰ روپے اور ۱۹۸۴ میں آٹھ ہزار روپے تھی جبکہ اسی عرصے میں مرغی خانوں والے حصے میں اوسط قیمت ۲۵ روپے سے ایک ہزار روپے تک بڑھی۔ اس تخمینے میں بہت سی چیزیں شامل نہیں ہیں جن کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، مثلاً ۱۰۰ کے قریب تجارتی پلاٹوں کی قیمت، پلاٹوں کی دوبارہ یا سہ بارہ فروخت وغیرہ۔ ان مفروضات سے جو کم از کم تخمینہ لگایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس آبادی میں سرکاری زمین کی غیرقانونی فروخت سے پچاس لاکھ روپے کمائے گئے۔

فائدہ کس کو ہوا؟

دلال آباد کی نشوونما کے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ کسی ایک فرد یا گروپ کو منافع بنانے کا تنہا ذمےدار نہیں ٹھہرایا جا سکتا بلکہ مختلف کردار منافع کمانے کی اس کوشش میں نہایت پیچیدہ زیر و بم میں اُلجھے ہوتے ہیں۔ یہ یہاں اتفاق رائے سے کی جانے والی کسی سازش کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے، کچھ دور سے دیکھنے پر محسوس یہی ہوتا ہے کہ یہ نظام کسی رواں مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ بسنے والوں کو چھوڑ کر، جن کا مقصد سر چھپانے کی جگہ حاصل کرنا ہے، باقی تمام کرداروں کا مقصد ایک ہی ہے لیکن مشترکہ نہیں ـــــ زیادہ سے زیادہ منافع کمانا۔ لہٰذا ان کرداروں کا باہمی رشتہ ساز باز کا نہیں بلکہ مسابقت کا ہے۔ یہ کردار جب کبھی ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں تو وجہ یہ ہوتی ہے کہ انفرادی کرداروں کو حد سے آگے بڑھنے سے روکا جا سکے۔ ان میں سے تقریباً ہر ایک دوسرے کرداروں پر کسی نہ کسی طرح گرفت رکھتا ہے یا اُن کی گرفت میں ہوتا ہے اور یوں اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔

وہاب کا عبدل یا عاقل سے رشتہ اس کی بہترین مثال ہے۔ وہاب اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے سیاسی اور انتظامی اختیارات رکھنے والوں کا تحفظ حاصل کر سکتا تھا اور اولین بسنے والوں کو یہاں لا سکتا تھا۔ لیکن وہ ایک ایک پلاٹ فروخت کرنے اور آبادی میں روزانہ کی پیش رفت کی نگرانی کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے لیے اُسے مددگاروں (عبدل یا عاقل) کی ضرورت تھی جنھوں نے اپنی حیثیت کا بڑی حد تک فائدہ اٹھایا۔ اس حد کا انحصار اس بات پر تھا کہ مددگار تحفظ حاصل کرنے کے لیے کس حد تک وہاب کے محتاج تھے۔ یہ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے پیر مضبوطی سے پکڑ رکھے ہوں تاکہ دوسرا شخص زیادہ لمبے قدم نہ اٹھا سکے۔

اسی طرح پولیس والوں کی عاقل پر خاصی مضبوط گرفت تھی، کیوں کہ اصولی طور پر وہی قانون کے محافظ تھے۔ لیکن اگر وہ عاقل کو دبانے میں ایک حد سے آگے جاتے تو وہ وہاب کے ذریعے، جسے شہر کے اعلیٰ پولیس افسروں میں اثر و رسوخ حاصل تھا، ان کا ٹرانسفر کروا سکتا تھا۔ پولیس کے ہتھکنڈوں سے بچنے کے لیے عاقل وہاب کا محتاج تھا۔

دلال آباد میں رہائش اختیار کرنے والوں کو عاقل کی خوشنودی میں رہنا پڑتا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی مدد حاصل کر سکیں کیوں کہ ان سرکاری محکموں تک ان کی پہنچ صرف عاقل ہی کے ذریعے ممکن تھی جو سہولتیں (مثلاً پانی) فراہم کرتے ہیں۔ عاقل سے بگاڑ کر رکھنے میں ہمیشہ ان کا نقصان ہوتا تھا۔

دوسری طرف ان کی شکایات پر عاقل کو ہٹا کر اس کے بھائی ہی کو چوکیدار رکھا گیا؛ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عاقل کا خاندان وہاب پر مضبوط گرفت رکھتا ہے۔ عاقل اتنا طاقت ور کیوں کر ہو گیا؟ اس بارے میں صرف قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ وہاب کو بلیک میل کر رہا ہو۔ اتنے عرصے میں آبادی میں عاقل کی پوزیشن بھی مضبوط ہو چکی تھی؛ اس نے عبدل سے (جو وہاب کا رشتےدار تھا) اور پولیس سے تعلقات پیدا کر لیے تھے؛ پھر اس نے بلاک بنانے کا کام شروع کر دیا تھا اور اسے کئی پلاٹوں پر پھیلا لیا

تھا ممکن ہے دلال آباد کا قصہ شروع ہونے سے پہلے اُس نے وہاب کا کوئی کام نکلوایا ہو اور اب اس احسان کا بدلہ وصول کر رہا ہو۔ پھر یہ بھی اہم بات ہے کہ عاقل کا ایک اَور بھائی وہاب کے پرائیویٹ دفتر میں کام کرتا ہے۔

عاقل اور اس کے بھائی کو اتنی نفع بخش ملازمتیں کیسے ملیں؟ اسی طرح پولیس کانسٹیبل یا متعلقہ سرکاری محکموں کے اہلکار ایسی پُرکشش ملازمتیں یوں ہی حاصل نہیں کر لیتے؛ انھیں یہ ملازمتیں حاصل کرنے یا قائم رکھنے کے لیے سرمایہ کاری کرنی پڑتی ہے، یا انھوں نے بھی پہلے کسی طاقت ور افسر کا کوئی کام نکلوایا ہوتا ہے۔ گویا اس تمام عمل میں لین دین صرف پیسے ہی کا نہیں ہوتا بلکہ سابقہ احسانات بھی لین دین کا وسیلہ بنتے ہیں۔

وہاب کے باپ اور چچا نے ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کی دہائیوں میں سرکاری زمین کی غیرقانونی پلاٹ بندی اور فروخت کے ذریعے کئی آبادیاں بسائی تھیں۔ غالباً وہاب کو اپنے اثرورسوخ کا کچھ حصہ ورثے میں ملا ہے۔ خود وہاب کا پیشہ صحافت ہے۔ صحافی کے طور پر بھی وہ سیاست دانوں اور اعلیٰ سرکاری اہلکاروں کے کام نکلوانے اور انھیں اپنا احسان مند بنانے کی طاقت رکھتا ہے۔ انٹرویو کے دوران اس کے پاس مختلف قسم کے کاموں کے لیے فون آتے رہے اور وہ ہر ایک سے وعدہ کرتا رہا کہ اس کا کام ہو جائے گا۔ لگتا ہے وہاب سے اونچی اور نیچی حیثیت رکھنے والے بہت سے لوگ اس کے احسان مند ہیں۔

احسان مندی اور دباؤ اس عمل کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ نقد ادائیگی سے سودا نمٹ جاتا ہے اور طویل مدتی اثرورسوخ پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن منافع کمانا اس کھیل کا اصل مقصد ہے۔ جہاں جہاں نقد رقم وصول بھی کی جاتی ہے تو اس طرح کہ دباؤ پوری طرح ختم نہیں ہوتا۔ مثلاً پلاٹ خریدنے والوں نے پلاٹ کی قیمت ادا کر دی ہے لیکن انھیں مکان کی تعمیر کے وقت، اور پھر آبادی کے مستقل کیے جانے کے وقت، مزید ادائیگی کرنی ہو گی جس کی رقم نامعلوم ہے۔ ایک اَور مثال مرغی خانوں کے مالکان کی ہے جنھیں اپنی زمین کی قانونی ملکیت حاصل ہو گئی ہے لیکن آگے چل کر جب وہ اس زمین کو رہائشی یا صنعتی استعمال میں لائیں گے، جو ان کا اصل مقصد ہے، تو انھیں دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس طرح اس عمل کے تمام کردار پیچیدہ طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور دوسروں کا منافع کم رکھنے اور اپنا منافع بڑھانے کی متواتر کوشش کرتے ہیں۔ دلال آباد میں وہاب کو اپنے وسیع تعلقات اور اثرورسوخ کی بدولت مرکزی حیثیت حاصل ہے، لیکن اُس کی آزادی کو بھی دوسرے کردار ایک حد کے اندر رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس سب کو کسی نہ کسی طرح فائدہ ہوتا ہے۔ زمین کے مقامی دعوےداروں، دلال، وہاب، اس کے ملازموں، آزاد پلاٹ بیچنے والوں اور سرمایہ کاری کی غرض سے پلاٹ خریدنے والوں کا فائدہ بالکل عیاں ہے۔ سیاسی اور انتظامی اختیارات رکھنے والوں کو پہنچنے والا فائدہ بھی، کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔

پلاٹ خرید کر آبادی میں رہائش اختیار کرنے والوں کا معاملہ سب سے زیادہ گمبھیر ہے کیوں کہ ان کی گرفت باقی کرداروں پر سب سے کمزور ہے۔ غیر قانونی کچی آبادی کی نشوونما کے ابتدائی مرحلے میں ان کو ایک طرح کی طاقت حاصل تھی، کیوں کہ ان کے مشقت اٹھائے بغیر یہ ویران علاقہ شہری آبادی کا حصہ نہیں بن سکتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی یہ طاقت زائل ہوتی گئی۔ اب پلاٹ بیچنے والے کم قیمت پر یا مفت پلاٹ فراہم کر کے لوگوں کو یہاں بسنے پر راغب نہیں کرتے بلکہ ایک ایک پلاٹ کو کئی کئی بار فروخت کرتے تھے۔ مزید وقت گزرنے پر انھوں نے خود کو منظم کرنے کی کوشش کی لیکن پوری طرح کامیاب نہ ہوئے۔

تاہم، ان لوگوں کے علاوہ جن کے پلاٹ کسی اَور کے ہاتھ دوبارہ فروخت کر دیے گئے، باقی بسنے والے بھی فائدے میں رہے۔ یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان کے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی اور سرکاری طور ڈویلپ کی ہوئی زمین کی قیمت ان کی استطاعت سے باہر تھی۔ یہ درست ہے کہ اس عمل میں ان کا استحصال کیا جاتا ہے، انھیں سخت دشواریاں جھیلنی پڑتی ہیں اور تھوڑی تھوڑی کر کے اچھی خاصی رقم غیر قانونی ٹیکسوں (بھتوں) کی شکل میں ادا کرنی پڑتی ہے جو آبادی کی حالت بہتر بنانے کے کام نہیں آتی۔ اس کے باوجود برسوں پر پھیلا ہوا ادائیگیوں کا یہ سلسلہ ان کے مالی حالات سے مطابقت رکھتا ہے۔ پھر وہ اپنے مکان بھی اپنی سہولت سے رفتہ رفتہ تعمیر کر سکتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ ایک سے زیادہ پلاٹ خرید لیتے ہیں اور قیمت بڑھنے پر زائد پلاٹ بیچ کر اپنا مالی بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ زمین کی پلاٹ بندی اور فروخت کا یہ کام قانونی طور پر کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ باقاعدہ سرمایہ کار اس کاروبار میں اس لیے داخل نہیں ہوتے کہ سرمایہ کاری کے حساب سے اتنے زیادہ منافعے کی امید نہیں ہوتی۔ باقاعدہ اور قانونی طور پر کسی علاقے میں آباد کاری کرنے کے لیے کچھ انفرااسٹرکچر بنانا پڑے گا جس پر بہت پیسے خرچ ہوں گے۔ علاوہ ازیں انھیں متعدد قانونی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دلال آباد میں اقتصادی قوانین کے مطابق سرمایہ اکٹھا کرنے کا قدیم طریقہ استعمال ہو رہا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کا اوّلین مرحلہ ہوتا ہے۔

اس عمل میں اصل نقصان ریاست ہی کا ہوتا ہے جو اپنے ایک قیمتی اثاثے، یعنی سرکاری ملکیت کی زمین، سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

**

Facts & Figures

A monthly compilation of

Urban Resource Centre
613 City Shopping Mall
111 Depot Lines
Karachi
Tel 7788021, 7788173

کسی شہر کی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا بھی نہایت ضروری ہے کہ شہر کا انتظام کیسے چلایا جاتا ہے۔ کراچی شہر کی بدانتظامی کے ایک اہم نتیجے کی تفصیل آپ پچھلے چار مضامین میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ عارف حسن کا مضمون شہری بدانتظامی اور تشدد کراچی کے ناقص انتظام سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو غیر ترقی یافتہ دنیا کے دوسرے شہروں سے موازنے میں پیش کرتا ہے۔ عارف حسن اپنی تحقیق کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شہری انتظامیہ کی نااہلی اور ناکارکردگی، انتظامی فیصلوں میں مفاد پرست گروہوں کے عمل دخل، تعلیم یافتہ اور روشن خیال شہریوں کی شہر کے اصل مسائل سے بے اعتنائی اور بدانتظامی کا شکار ہونے والے غریب شہریوں کی بے بسی کے باعث تشدد شہر کی زندگی کا ایک ناگزیر جُز بن کر رہ گیا ہے۔

اس مضمون کا متن عارف حسن کے مندرجہ ذیل انگریزی مضامین کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے

1 "How Does a City Function?"
(Prepared for UNESCAP, August 1995)
2 "Karachi and the Global Nature of Urban Violence"
(*The Urban Age*, Urban Violence Issue Summer 1993)
3 "Asian Overview of Pattern of Violence - Special Focus on Karachi"
(Paper for the seminar on "Megacities Crises & Challenges",
Aga Khan University, 16 November 1995)

علاوہ ازیں، عارف حسن سے انٹرویو کی بنیاد پر مضمون میں کہیں کہیں اضافے بھی کیے گئے ہیں۔

عارف حسن

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین اجمل کمال

شہری بدانتظامی اور تشدد

بیشتر ایشیائی شہروں میں شہری ترقیات کی پالیسیاں وفاقی اور صوبائی حکومتیں وضع کرتی ہیں اور ان کو نافذ کرنے کا کام صوبائی یا شہری ترقیاتی ایجنسیوں کے ذمے ہوتا ہے۔ یہ پالیسیاں تیار کرنے والے افراد اونچے درمیانہ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور عموماً روایتی طور پر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ ان کی تیار کردہ پالیسیوں میں ان کے طبقے کی مخصوص سوچ اور ترقی یافتہ دنیا (First World) کے تعصبات جھلکتے ہیں۔ تیسری دنیا کی یونیورسٹیوں میں رائج تدریس کے طریقوں کے باعث (جن کا مقامی معاشرتی حالات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا) یہ تعصبات اور زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں اور بیرونی ملکوں میں، یا باہر سے آنے والے کنسلٹنٹوں کے ہاتھوں، تربیت پا کر مزید تقویت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر افراد غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کے سماجی اور معاشی حالات اور موقعے (فیلڈ) کی صورتِ حال سے بے خبر ہوتے ہیں۔

پالیسیاں وضع کرنے والوں کے علاوہ شہروں میں معاشی اور سیاسی مفادات رکھنے والے طاقتور گروپ بھی موجود ہوتے ہیں جو سرکاری پالیسیوں اور فیصلوں پر اثر ڈالتے ہیں۔ جو پالیسیاں ان کے مفادات سے مطابقت نہیں رکھتیں، وہ ان سے عملی طور پر روگردانی کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان کے مفادات عموماً شہر کے غریب باشندوں کے مفادات سے متصادم ہوتے ہیں۔ جن ایشیائی شہروں میں اسٹیبلشمنٹ مضبوط ہے اور مال دار اور طاقتور طبقوں کی علانیہ سرپرستی کرتی ہے، وہاں مفادات رکھنے والے یہ گروپ اسٹیبلشمنٹ کا باقاعدہ حصہ بن کر پالیسی سازی کے عمل میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ صورت ملائیشیا، تھائی لینڈ اور کوریا میں موجود ہے۔ اس کے برعکس جنوبی ایشیا میں، جہاں کا سیاسی کلچر نسبتاً معقولیت پسندانہ ہے اور اسٹیبلشمنٹ کی حالات پر گرفت کمزور ہے، وہاں یہ گروپ طاقتور لابیوں اور مافیاؤں کے طور پر کام کرتے ہیں اور سرکاری پالیسیوں پر باہر سے اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہ مافیا ایک

طرف ایسی سر گرمیوں پر پابندی لگانے والی پالیسیوں کو بے اثر بناتے ہیں اور دوسری طرف شہر کے اُن غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کا استحصال کرتے ہیں جن کی ضروریات پوری کرنے کے لیے سرکاری پالیسیوں میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان مافیا نما گروپوں کے علاوہ شہروں میں کاروباری اور تجارت پیشہ لوگوں کی طاقت ور انجمنیں ہوتی ہیں جو پالیسی سازی اور ترقیات کے عمل میں ایک مثبت کردار ادا کر سکتی ہیں لیکن اکثر صورتوں میں ایسے محدود روایتی کردار پر قانع رہتی ہیں جو تاریخ نے ان کے لیے متعین کر دیا ہے۔

عمومی طور پر یہ چھ فریق ہیں جن کی ایک دوسرے پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت اس امر کا تعین کرتی ہے کہ کسی شہر کا انتظام کیسے چلایا جاتا ہے: (۱) غیر رسمی سیکٹر، (۲) مافیا، (۳) شہر کے غریب اور کم آمدنی والے باشندے، (۴) غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs)، (۵) رسمی پرائیویٹ سیکٹر اور (۶) سرکاری ایجنسیاں۔

***

غیر رسمی سیکٹر

شہری منصوبہ بندی اور انتظام کے کام میں انفرااسٹرکچر، شہری سہولتوں، روزگار اور قرضوں، ٹرانسپورٹ اور وسیع تر ماحولیاتی مسائل کا بندوبست شامل ہے۔ تقریباً تمام ایشیائی حکومتیں ان سب شعبوں میں شہری آبادیوں کی ضروریات پوری کرنے کی اہلیت سے محروم ہیں۔ تاہم، شہروں کی آبادی مسلسل بڑھتی رہتی ہے اور یہ سارے کام کسی منصوبہ بندی کے بغیر، بلکہ اس سے پہلے ہی، ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں کہیں منصوبے تیار بھی کر لیے جاتے ہیں، وہاں سرکاری نظام ان کو نافذ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ رہائشی زمین فراہم کرنے کے سرکاری منصوبوں کا شہر کے غریب باشندوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اُس وقت بھی نہیں جب یہ منصوبے غریب باشندوں ہی کی رہائشی ضروریات پوری کرنے کے مقصد سے بنائے جائیں۔ حد سے بڑھے ہوئے غیر ترقیاتی اخراجات اور بدعنوانی کے باعث ان سرکاری منصوبوں پر اتنی لاگت آتی ہے کہ ان کی قیمت غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کی استطاعت سے باہر رہتی ہے۔ حکومت کے غیر ترقیاتی اخراجات اتنے بڑھ چکے ہیں کہ اب نہایت قلیل تعداد سے زیادہ روزگار فراہم کرنا پبلک سیکٹر کے بس سے باہر ہے۔ قرض کی سہولتیں ناکافی اور قرض حاصل کرنے کا طریقِ کار نہایت پیچیدہ ہے، چنانچہ سرکاری اور رسمی پرائیویٹ سیکٹر کے جاری کیے ہوئے قرضے صرف مال دار افراد کے کام آتے ہیں۔

ایشیائی شہروں میں رہائشی سہولتوں کی طلب اور رسد کے درمیان سنگین فرق موجود ہے۔ اس فرق

کے نتیجے میں نئے آنے والے غریب لوگ شہر کے بیرونی کناروں پر کچی آبادیوں میں بسائے جا رہے ہیں اور یہ کام غیر رسمی سیکٹر کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔ (بعض صورتوں میں شہروں کے مرکزی حصے بھی، جو ماحولیاتی طور پر تباہ ہو چکے ہیں، رفتہ رفتہ غریبوں کے پس ماندہ رہائشی علاقوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔) یہ پورا عمل قانونی طور پر جائز تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کے فاعل کردار دلال، قبضہ گیر اور غنڈے ہیں جنہیں بدعنوان سرکاری اہلکاروں اور پولیس والوں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اس عمل کے مالی اخراجات اکثر غیر رسمی سیکٹر کے سودخوروں، علاقے کے مال دار لوگوں اور جائیداد کے تاجروں کی معاونت سے پورے کیے جاتے ہیں۔ یہی فاعل کردار بالعموم علاقے کے لیڈرز بن کر ابھرتے ہیں اور علاقے کے غریب باشندوں اور ریاستی اداروں کے درمیان واسطہ بنتے ہیں۔ بعد میں یہی لوگ منتخب ہو کر بلدیاتی اداروں اور اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں۔ یہ صورت حال شہر کے غریب باشندوں کے لیے سخت غیر منصفانہ ہے لیکن کوئی اور چارہ نہ پا کر وہ اس سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ اس طرح پورا جمہوری عمل بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔

روزگار، جو لوگوں کے دیہات سے شہروں میں آنے کا بنیادی سبب ہے، بیشتر صورتوں میں غیر رسمی سیکٹر ہی فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کراچی میں روزگار کے ۷۵ فیصد مواقع غیر رسمی سیکٹر ہی کے فراہم کردہ ہیں۔ یہ سیکٹر ایک طرف غریب باشندوں کی روزگار کی ضرورت پوری کرتا ہے اور دوسری طرف رسمی سیکٹر کے بڑے صنعتی اور تجارتی اداروں کو ٹھیکے پر مزدور مہیا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے کارخانے اور کاروبار بھی غیر رسمی سیکٹر کے ہاتھوں میں ہیں۔ ان کارخانوں کے لیے قرض کی سہولتیں دلال اور پیشہ ور سودخور فراہم کرتے ہیں اور ۱۰ سے ۱۵ فیصد ماہانہ کی شرح سے سود وصول کرتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کو آدھی یا اس سے بھی کم مزدوری دی جاتی ہے۔

ٹرانسپورٹ کے شعبے میں بھی غیر رسمی سیکٹر اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ بسیں اور ٹیکسیاں خریدنے کے لیے قرضے دیتا ہے، ہول سیل مارکیٹوں میں جانوروں سے کھینچی جانے والی گاڑیاں، ٹھیلے اور ریڑھے مہیا کرتا ہے اور اور جن علاقوں میں پبلک ٹرانسپورٹ کم ہو وہاں سے مزدوروں کو روزگار کی جگہوں تک لانے لے جانے کے لیے ٹھیکے پر ٹرانسپورٹ فراہم کرتا ہے۔

تیسری دنیا کے شہروں میں سوکھے کوڑے کرکٹ کو ٹھکانے لگانے کا انتظام نہایت ناقص اور اکثر صورتوں میں ۳۰ فیصد سے زیادہ ضرورت پوری کرنے سے قاصر ہے۔ تاہم، یہ شہر کوڑے کرکٹ میں دفن نہیں ہو جاتے کیوں کہ غیر رسمی سیکٹر اس میں سے ہر کارآمد چیز کو اٹھا کر نہایت کم لاگت پر دوبارہ استعمال کے قابل بنا لیتا ہے۔ اس طرح لوگوں کو روزگار بھی ملتا ہے اور غریب گھرانوں کو تھوڑا بہت مالی فائدہ بھی ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنی استعمال شدہ چیزیں پھینکنے کے بجائے کباڑیوں کے ہاتھ بیچ سکتے ہیں۔ شہری ایجنسیوں کا اٹھایا ہوا کوڑا کرکٹ بھی غیر رسمی سیکٹر سرکاری اہلکاروں کو رشوت دے کر خرید لیتا ہے۔ اس طرح شیشے، پلاسٹک، کاغذ اور دھات کی چیزیں ری سائیکل کر لی جاتی ہیں۔ یہ عمل

فرسودہ طریقوں سے کیا جاتا ہے جو ماحولیاتی اعتبار سے سخت نقصان دہ ہیں۔ اکثر شہروں کی انتظامیہ ان طریقوں کو بہتر بنانے کے لیے تکنیکی امداد اور قرضے مہیا کرنے کے بجائے اس عمل پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

شہروں کے غریب اور کم آمدنی والے علاقوں میں حکومت تعلیم اور علاج کی بھی بیشتر سہولتیں فراہم کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ تعلیمی سہولتیں غیررسمی سیکٹر کی طرف سے منافع کش کاروبار یا سماجی خدمت کے طور پر مہیا کی جاتی ہیں جب کہ علاج کے لیے لوگ روایتی طبیبوں وغیرہ سے رجوع کرتے ہیں جو بے ضابطہ اور غیر تسلیم شدہ طریقوں سے کام کرتے ہیں۔ ان سرگرمیوں کو سہارا دے کر بہتر بنانے کی رسمی سیکٹر یا حکومت کی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ مثلاً کراچی کے تقریباً دس لاکھ کی آبادی کے علاقے اورنگی کے ایک جائزے سے معلوم ہوا کہ وہاں ۷۶ سرکاری اسکول ہیں جب کہ مختلف ایجوکیشن سوسائٹیاں ۵۷۹ پرائیویٹ اسکول چلا رہی ہیں۔ ان پرائیویٹ اسکولوں کی فیسیں علاقے کے لوگوں کی مالی حالت کے مطابق ہیں۔ علاوہ ازیں اورنگی میں پانچ سرکاری اسپتال اور چار خاندانی منصوبہ بندی کے مراکز ہیں جب کہ سات پرائیویٹ اسپتال، ۵۹۶ پرائیویٹ کلینک اور ۳۸ پرائیویٹ میٹرنٹی ہوم کام کر رہے ہیں۔ ایشیائی شہروں کی بہت سی غریب آبادیوں میں کم و بیش ایسی ہی صورتِ حال ہے۔

ان تمام شعبوں میں غیررسمی سیکٹر کی سرگرمیوں کو سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا اور نہ انھیں سرکاری اعداد و شمار، پالیسی سازی، منصوبہ بندی اور منصوبوں کے نفاذ کے عمل کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ غریب باشندوں کی ــــ جنھیں ایشیائی شہروں میں بجائے خود ایک بڑا مسئلہ سمجھا جاتا ہے ــــ بیشتر ضرورتیں اسی سیکٹر کے ذریعے پوری ہوتی ہیں۔ اکثر اوقات یہ سرگرمیاں سرکاری قوانین اور ضوابط کے دائرے سے باہر رہتی ہیں، لیکن اب انھیں مجبوراً برداشت کیا جانے لگا ہے گو کسی قسم کا سہارا اب بھی نہیں دیا جاتا۔ اس سیکٹر کے کرتادھرتا خارج کاروباری افراد ہیں۔ یہ سیکٹر غریبوں کا سخت استحصال کرتا ہے اور اس کا ترقیاتی کام گھٹیا معیار کا ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کی سرگرمیاں شہروں کے غریب باشندوں کی ثقافت، معاشرت اور مالی حالت سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ نامناسب طور پر ہی سہی، لیکن یہ غریب اور کم آمدنی والے شہری طبقوں کی ضروریات پوری کرتا ہے جب کہ رسمی سیکٹر یہ کام بالکل نہیں کر سکتا۔ اس سیکٹر کی سرگرمیوں کو بہتر بنانے اور سہارا دینے کے موثر طریقے وضع کیے گئے ہیں جن کے ذریعے اس سیکٹر کے کام کو بہتر بنانا اور اس کے استحصال پر قابو پانا ممکن ہے۔ اس کی ایک مثال کراچی میں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کا ہاؤسنگ پروگرام ہے جس کے تحت سیمنٹ کے بلاک بنانے والوں کو قرضے اور تکنیکی امداد فراہم کی گئی۔ اس امداد کے نتیجے میں ان کی مصنوعات کا معیار بہتر ہوا، پیداوار بڑھی اور لاگت میں کمی آئی۔

مافیا

شہروں کی نااہل اور بدعنوان سرکاری انتظامیہ غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کی ضروریات پوری کرنے میں ناکام رہتی ہے اور انہیں کسی طرح کا تحفظ نہیں دے سکتی۔ غیررسمی سیکٹر کے کاروباری لوگ اور دلال اس صورت حال کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ سرکاری زمین پر غریب باشندوں کو بسا کر زمین کی قیمت وصول کرتے ہیں جب کہ اس زمین پر بسنے والے ملکیت کے قانونی تحفظ سے محروم رہتے ہیں۔ وہ غریب باشندوں کو روزگار پر لگواتے ہیں اور اس کے بدلے میں ان سے غیرقانونی ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ وہ انہیں مکان بنانے یا چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنے کے لیے قرض دیتے ہیں اور ظالمانہ شرح پر سود وصول کرتے ہیں۔ وہ انہیں پولیس کی زیادتیوں سے بچانے کے لیے بھتا وصول کرتے ہیں جس میں پولیس کا باقاعدہ حصہ ہوتا ہے۔ ایسی ان سرگرمیوں کے لیے وہ غنڈوں کو اُجرت پر رکھتے ہیں اور سرکاری اہلکاروں سے اپنے تعلقات کو استعمال کرتے ہیں۔ ایسی سرگرمیوں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے وہ منشیات فروخت کرتے ہیں، عصمت فروشی اور قماربازی کے اڈّے چلاتے ہیں اور ہر قسم کی اسمگلنگ اور بلیک مارکیٹنگ کرتے ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں کے لیے کارندے شہر کے اُنہیں غریب باشندوں میں سے بھرتی کیے جاتے ہیں جن کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے یہ غیررسمی سیکٹر وجود میں آیا تھا۔

یہ مافیا سرکاری اہلکاروں، خصوصاً پولیس، کی مدد کے بغیر کام نہیں کر سکتے۔ یہ شہر کے خوش حال علاقوں میں بھی کام نہیں کر سکتے کیوں کہ ان علاقوں میں رہنے والے لوگ اقتدار کی مختلف سطحوں تک رسائی رکھتے ہیں۔ اس طرح ان مافیاؤں کو غریب اور کم آمدنی والے علاقوں میں حکومت کا سا اختیار حاصل ہو جاتا ہے اور شہر ان علاقوں اور خوش حال علاقوں کے درمیان تقسیم ہو جاتا ہے۔ غریب علاقوں میں تمام سیاسی جماعتیں اپنی انتخابی مہم کے لیے انہیں مافیاؤں سے مالی اور تنظیمی امداد حاصل کرتی ہیں جس کے بدلے میں ان کی سرگرمیوں کو سیاسی تحفظ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے اکادکا موقعوں کو چھوڑ کر جب واقعی کوئی عوامی تحریک موجود ہو، انتخابات میں کامیاب ہونے والے امیدوار بھی یا تو مافیا کے لوگ ہوتے ہیں یا انہیں مافیا کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔

اس طرح شہر کے غریب باشندوں کو روزگار، سہولتیں اور اقتدار تک رسائی فراہم کرنے میں ناکام رہ کر ریاست انہیں انصاف اور تحفظ مہیا کرنے سے بھی قاصر رہتی ہے۔ ریاست کی یہ ناکامی شہری علاقوں میں تشدد، ظلم اور جبری بھتوں کی وصولی کے نظام کی بنیاد رکھ دیتی ہے۔

شہر کے غریب باشندے

یہ باشندے زیادہ تر شہر کی غیر قانونی کچی آبادیوں میں رہتے ہیں۔ ایسی خریدی ہوئی زمین کی ملکیت کا قانونی تحفظ حاصل کرنے کے لیے یہ خود کو منظم کر کے سیاسی اور انتظامی اداروں پر اجتماعی دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں کہیں ان کی تنظیموں کو قانون، منصوبہ بندی اور تنظیم کے معاملات میں ماہرانہ امداد حاصل ہوتی ہے وہاں وہ خاصی حد تک کامیاب رہتے ہیں۔ ایسی امداد کی غیر موجودگی میں ایسے طور پر کام کرنے میں انھیں ہمیشہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان باشندوں کے عدم تحفظ کی صورتِ حال جس قدر شدید ہو، اتنے ہی زیادہ یہ مافیاؤں اور سرکاری ایجنسیوں ـــ خصوصاً نفاذِ قانون کی ایجنسیوں ـــ کے استحصال کی زد میں رہتے ہیں۔ ان کو ماہرانہ امداد دردمند پیشہ ور ماہروں اور غیر سرکاری تنظیموں سے حاصل ہوتی ہے۔ ان کی مداخلت سے ایک طرف غریب باشندوں کو وہ معلومات دستیاب ہوتی ہیں جو سرکاری محکموں سے معاملت کرنے کے لیے ضروری ہے، اور دوسری طرف اقتدار کے مرکزوں تک کسی نہ کسی سطح پر رسائی اور ترقیاتی کاموں کے لیے تکنیکی امداد بھی ملتی ہے۔ تاہم، یہ ماہرین اور تنظیمیں بہت کم تعداد میں ہیں اور ان کی امداد بمشکل پانچ فیصد شہری آبادی تک پہنچ پاتی ہے۔ ان کی تعداد میں اس تیزی سے اضافہ بھی نہیں ہو رہا ہے جس تیزی سے شہروں کی غریب آبادی بڑھ رہی ہے۔

غیر سرکاری تنظیمیں

روایتی طور پر غیر سرکاری تنظیمیں شہری آبادیوں اور سرکاری ایجنسیوں کے درمیان ایک پُل کے طور پر کام کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ سرکاری ایجنسیاں غیر سرکاری تنظیموں کی حکمتِ عملی کو، جو ان کے عملی تجربے کی بنیاد پر وضع کی گئی ہے، اپنے سرکاری کام کا حصہ بنا سکتی ہیں۔ لیکن چوں کہ سرکاری ایجنسیوں کو وہ عملی تجربہ حاصل نہیں ہوتا، اس لیے اگر وہ غیر سرکاری تنظیموں کی حکمتِ عملی کو قبول کر بھی لیں تو یہ کسی مخصوص علاقے یا پروجیکٹ تک محدود رہتی ہے۔ بعض صورتوں میں ان تنظیموں نے غیر رسمی سیکٹر کا کردار اختیار کر کے غریب شہریوں کو استحصال سے بچانے کی بھی کوشش کی ہے، لیکن اس طرح کی کوئی تنظیم غیر رسمی سیکٹر کا متبادل نہیں بن سکتی اور ایسی کوششیں یا تو غیر اہم رہتی ہیں یا مکمل طور پر ناکام ہو جاتی ہیں۔

حکومت کی منصوبہ بندی کی دستاویزات میں غیر سرکاری تنظیموں کی حوصلہ افزائی اور ان کو ترقیاتی کام میں شامل کرنے کا ذکر آنے لگا ہے۔ حکومت کو امداد فراہم کرنے والے بین الاقوامی ادارے

بھی ایسی امداد سے چلنے والے پروگراموں میں ان کی شمولیت پر زور دیے لگے ہیں۔ لیکن انہیں شامل کرنے کی صورت میں ان سے سرکاری پروگراموں کو سرکاری شرائط پر قبول کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ غیر رسمی سیکٹر کو استحصالی اور غیر مدد قرار دے کر اس کے ساتھ مل کر کام کرنے کے تصور کو مسترد کر دیتے ہیں۔ اس سیکٹر کی سرگرمیاں ان کے مطالعے اور تحقیق کا موضوع بھی نہیں بنتیں۔ اگر ان سرگرمیوں کے منفی پہلوؤں پر توجہ مرکوز رکھنے کے بجائے مثبت پہلوؤں کو قریبی مطالعے کے ذریعے سمجھنے اور بہتر بنانے کی کوشش کی جائے تو غیر سرکاری تنظیمیں اپنے وسائل کو زیادہ موثر طور پر استعمال کر سکتی ہیں اور رفتہ رفتہ اس سیکٹر کو غریب باشندوں کے لیے زیادہ کار آمد بنا سکتی ہیں۔

رسمی سیکٹر

ایشیائی شہروں میں رہائشی زمین کے معاملے میں سب سے اہم کردار رسمی سیکٹر کے ڈویلپروں کا ہوتا ہے۔ شہروں میں مقیم درمیانہ طبقے کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے جس کی بدولت کاروباری اور تجارتی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ چوں کہ جائیداد محفوظ ترین سرمایہ کاری ہے، اس لیے درمیانہ طبقے کے لوگ اسے منافع کمانے کی غرض سے خریدتے ہیں۔ ڈویلپر ان کی اسی طلب کو پورا کرتے ہیں اور اس طبقے کی ضرورت سے کہیں زیادہ تعداد میں پلاٹ، مکانات اور فلیٹ تیار کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ زمین کے بڑے بڑے قطعات خریدتے ہیں جنہیں شہر کے غریب باشندوں کو رہائشی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا کیوں کہ یہ زمین روزگار کی جگہوں کے نزدیک واقع ہوتی ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ڈویلپر اس میں سے بیشتر زمین غریب آبادیوں کو بے دخل کر کے حاصل کرتے ہیں۔ یہ بے دخلی عموماً ڈرا دھمکا کر غیر قانونی طریقے سے کی جاتی ہے اور اس میں ڈویلپروں کو سرکاری اہلکاروں اور پولیس کی عملی امداد حاصل ہوتی ہے۔

جائیداد کا لین دین بہت بڑی تجارت ہے اور یہ تاجر اونچے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں سیاست داں، اعلیٰ ترین سرکاری افسر اور پالیسی ساز بھی شامل ہیں۔ جو کچھ انہیں اپنے تعلقات کے بل پر حاصل نہ ہو سکے وہ اسے سیاست دانوں، سرکاری اہلکاروں وغیرہ کو رشوت دے کر حاصل کر لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ بلدیاتی اداروں اور اسمبلیوں کے انتخابات میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے امیدواروں کی انتخابی مہم کے اخراجات برداشت کرتے ہیں اور یوں انہیں پالیسی سازی میں خاصا عمل دخل حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی ایسی پالیسی وضع کر لی جائے جس سے ان کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو وہ اسے عملاً بے اثر بنانے کی بھی طاقت رکھتے ہیں۔ بیشتر شہروں میں ڈویلپروں نے ایسی ایسوسی ایشنیں قائم کر

رکھی ہیں جو مافیا کے اندر رہ کر کام کرتی ہیں۔ حکومت کی طرف سے دی جانے والی مالی رعایتیں اور قرضوں کی سہولتیں زیادہ تر انھیں کے کام آتی ہیں اور شہری پالیسیاں تیار کرنے والی تقریباً ہر کمیٹی میں ان کا ایک نہ ایک نمائندہ ضرور موجود ہوتا ہے۔ رسمی سیکٹر کے ڈویلپر غریب باشندوں کو رہائشی سہولتیں فراہم کرنے سے دل چسپی نہیں رکھتے کیوں کہ اس کاروبار میں منافعے کی شرح کم ہے۔ پھر ان کے اور غریب باشندوں کے درمیان عناد کا رشتہ ہوتا ہے کیوں کہ وہ ایسے کاروبار کے لیے بیشتر زمین غریبوں کی آبادیاں مسمار کرکے حاصل کرتے ہیں۔ شہروں کے جن علاقوں میں زمین کی قیمت میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے وہاں موجود غریب باشندوں کی جھگیوں میں آگ لگنے کے واقعات ہونے لگتے ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ آگ حادثاتی طور پر نہیں بلکہ سرکاری ایجنسیوں، بلڈروں، جائیداد کے دلالوں اور بڑے تجارتی مفادات رکھنے والوں کی سازش کے نتیجے میں لگتی ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ جائیداد کے تاجروں کی لابی کو شہر کی سطح کے مسائل سے دل چسپی نہیں ہوتی۔ شہروں کا معیارِ زندگی بلند کرنے اور ماحول کو بہتر بنانے کے سلسلے میں ان کی تمام کوششوں کا مقصد صرف منافع کمانا ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ فلاحی کاموں پر رقم بھی خرچ کرتے ہیں اور تعلیم، علاج اور تفریح کے مراکز قائم کرتے ہیں لیکن یہ مراکز غریبوں کے کام نہیں آتے اور نہ غریب علاقوں میں واقع ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں جائیداد کے تاجروں اور شہروں کے مافیاؤں کے درمیان خفیہ سیاسی اور اقتصادی تعلقات کی بھی متواتر نشان دہی کی جاتی ہے۔

بڑے صنعت کار اور تاجر اپنے کارخانوں اور تجارتی اداروں کے لیے مزدور اور کارکن غیر رسمی سیکٹر میں کام کرنے والے ٹھیکے داروں کے ذریعے روزانہ اُجرت پر حاصل کرتے ہیں۔ رسمی سیکٹر کے آجر ٹھیکے پر مزدور رکھ کر لیبر قوانین کی پابندیوں سے آزاد اور یونین بننے کے خطرے سے محفوظ رہتے ہیں اور مزدوروں کو ان کے قانونی حقوق سے محروم رکھ کر ان کا سخت استحصال کرتے ہیں۔ ان مزدوروں کو قابو میں رکھنے کے لیے ٹھیکے دار، اُجرتی غنڈے اور پولیس آجروں کی عملی مدد کرتے ہیں۔

بیشتر بڑے شہروں میں ایوانِ صنعت و تجارت ضرور موجود ہوتے ہیں۔ یہ تنظیمیں حکومت کی اقتصادی پالیسیوں اور سرمایہ کاری کی ترجیحات متعین کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان میں شامل افراد سیاست داں اور وزیر بھی بنتے ہیں۔ تاہم، یہ تنظیمیں اپنی طرزِ فکر میں نہایت قدامت پرست ہوتی ہیں اور شہر کے سماجی مسائل سے کوئی دل چسپی نہیں رکھتیں۔ بیوروکریسی کے اعلیٰ ترین افسروں سے قریبی تعلقات رکھنے کے باعث انھیں ریاستی ڈھانچے میں تبدیلی کی ضرورت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

تقریباً ہر شہر میں شہریوں اور پیشہ ور افراد کی بھی باقاعدہ انجمنیں ہوتی ہیں جو ماحول کو بہتر بنانے کے لیے یا صارفین کے مفادات کے تحفظ کے لیے لابی کے طور پر کام کرتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی انجمنیں چندے وغیرہ کے ذریعے وسائل جمع کرکے مقامی سطح کا ترقیاتی کام بھی کرتی ہیں۔ او بنیے ورمیا۔

یا صاحب اقتدار طبقوں سے تعلق رکھنے کی بدولت انھیں اقتدار کے مراکز تک رسائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ تاہم یہ انجمنیں سماجی حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حق میں ہوتی ہیں اور ایسی پالیسیاں یا ترقیاتی ترجیحات متعین کرنے کے عمل میں حصہ نہیں لیتیں جن کا تعلق شہری آبادی کی اکثریت یعنی غریب اور کم آمدنی والے باشندوں کی ضروریات اور مسائل سے ہو۔ ایسی انجمنوں کا شہر کی غریب بستیوں سے رابطہ بھی نہیں ہوتا اور نہ یہ عموماً سیاست سے کوئی خاطر خواہ دلچسپی رکھتی ہیں۔

ایشیا کے بڑے شہروں میں پیشہ ور ماہروں کی ایسوسی ایشنیں موجود ہیں۔ ان ماہرین میں ڈاکٹر، وکیل، آرکیٹیکٹ، منصوبہ سازی کے ماہر، انجینیئر، سماجی سائنس داں وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے متعدد تنظیموں کو حکومتیں پالیسی سازی کے عمل میں شامل کرتی ہیں۔ لیکن ان تنظیموں کے ارکان اونچے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے روایتی طور پر تعلیم اور تربیت حاصل کی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں، حکومت کی روایتی ترقیاتی پالیسیوں اور رویوں کو قائم رکھنے میں ان کا ذاتی مفاد بھی ہوتا ہے کیوں کہ یہ افراد حکومت کے ترقیاتی پروگراموں میں مشیر اور کنسلٹنٹ کے طور پر شامل کیے جاتے ہیں۔ ایشیا کی حد تک یہ پیشہ ورانہ ایسوسی ایشنیں دراصل ٹریڈ یونینوں کے طور پر کام کرتی اور اپنے ارکان کو حاصل مالی اور سیاسی مراعات کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ اگر ان کا کوئی رکن انفرادی طور پر یا چند ارکان گروپ کی شکل میں کوئی غیر روایتی کام شروع کریں تو انھیں ان ایسوسی ایشنوں کی جانب سے کوئی عملی امداد نہیں ملتی۔

شہروں میں تدریسی اور تحقیقی ادارے خاصی تعداد میں ہوتے ہیں جن کے کام کا تعلق شہری منصوبہ بندی اور پالیسی سازی کے مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ لیکن ان اداروں کا اندازِ نظر روایتی ہوتا ہے اور وہ اپنے اردگرد کی دنیا کو انھیں اصطلاحات اور تعصبات کی روشنی میں دیکھتے ہیں جو ترقی یافتہ دنیا کے حالات اور تجربات کی بنیاد پر وضع کیے گئے ہیں۔ ان اداروں کو مقامی حالات اور طور طریقوں سے واقفیت نہیں ہوتی چناں چہ وہ ایسے تربیت یافتہ افراد تیار نہیں کر سکتے جو آگے چل کر سرکاری منصوبہ بندی اور پالیسی سازی کا رخ تبدیل کر سکیں۔ جہاں کہیں ان تدریسی اور تحقیقی اداروں نے آبادی کی نچلی سطحوں کی تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کیا ہے وہاں صورتِ حال میں خاصی تبدیلی آئی ہے؛ لیکن بدقسمتی سے ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔

شہروں کے رہائشی مسائل کے بارے میں پرائیویٹ اور سرکاری دونوں قسم کے تحقیقی ادارے پہلے سے موجود پالیسیوں اور رویوں کے مطابق صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں اور وہی معلومات جمع کرتے ہیں جن سے ان پالیسیوں اور رویوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ان طریقوں کا مطالعہ نہیں کرتے جن کے ذریعے غریب اور کم آمدنی والے شہری باشندے کسی سرکاری اعانت کے بغیر اپنے رہائشی مسائل کا حل نکالتے ہیں۔ مثلاً یہ حقیقت نظرانداز کر دی جاتی ہے کہ یہ شہری باشندے رفتہ رفتہ ایسی بچت اور کم میعادی اور چھوٹے قرضوں کے ذریعے اپنے مکانوں کو بہتر بناتے رہتے ہیں۔ سرکاری تحقیقی اداروں کے جمع کیے

ہونے اعداد و شمار بھی مقامی حالات سے ناواقفیت یا بے اعتنائی کے باعث ناقص رہ جاتے ہیں۔

سرکاری ایجنسیاں

شہری منصوبہ بندی اور انتظام سے تعلق رکھنے والی ایجنسیوں کے افسر، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، اونچے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، روایتی تعلیم اور تربیت حاصل کرتے ہیں اور مقامی حالات سے ناواقف ہوتے ہیں۔ شہر کے غریب باشندوں کے بارے میں ان کا رویہ شک اور عداوت پر مبنی ہوتا ہے اور وہ ان باشندوں کے سماجی اور معاشی حالات اور ان میں آنے والی تبدیلیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ رہائش، قرضوں، ٹرانسپورٹ اور دوسرے شعبوں میں غریب باشندوں کے بارے میں پالیسیاں تیار کرنے کے عمل میں ان باشندوں اور ان کی ضروریات پوری کرنے والے غیر رسمی سیکٹر کی رائے تک طلب نہیں کی جاتی۔ چنانچہ یہ پالیسیاں صورت حال کو بہتر بنانے میں ناکام رہتی ہیں۔

پالیسی سازی کے مسائل سے قطع نظر، ان پالیسیوں کے نفاذ اور شہری انتظام کے شعبوں میں سرکاری ایجنسیوں (خصوصاً پولیس) کا مافیاؤں، ڈویلپروں اور جرائم پیشہ افراد کے ساتھ گٹھ جوڑ ہوتا ہے جو سرکاری طریق کار سے جواب دہی اور شفافیت کے تصور کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔ چنانچہ غریب طبقوں کے لیے انصاف حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اور طبقاتی امتیاز میں اور زیادہ شدت پیدا ہوتی ہے۔ حکومت اگر کوئی ترقی پسندانہ قانون وضع بھی کر لے تو غریبوں سے متصادم مفادات رکھنے والے گروہوں اور سرکاری حکام کا یہ گٹھ جوڑ اس کے عملی نفاذ کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، پاکستان میں لینڈ ایکویزیشن ایکٹ موجود ہے جس کے تحت حکومت غریب شہریوں کو رہائش فراہم کرنے کے لیے کسی بھی زمین کو ایک معینہ قیمت ادا کر کے (جو مارکیٹ کے ریٹ سے خاصی کم ہوتی ہے) جبراً خرید سکتی ہے۔ لیکن یہ قانون صرف کاغذ پر وجود رکھتا ہے اور کبھی عمل میں نہیں لایا گیا۔

عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ موثر بلدیاتی ادارے شہری بدانتظامی کی صورت حال بدلنے کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ شہری انتظام میں حصہ لینے والے تمام فاعل کرداروں میں بھی یہ احساس رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے کہ مستحکم اور خود کفیل بلدیاتی اداروں کا قیام موزوں شہری پالیسیوں کے نفاذ، ترقیاتی کام، انفرااسٹرکچر اور شہری سہولتوں کی فراہمی اور دیکھ بھال کے لیے لازمی ہے کیونکہ وہی شہر کے غریب اور انصاف سے محروم طبقوں کے ساتھ عملی رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ حکومت کے پنج سالہ منصوبوں، امداد و قرض دینے والے بین الاقوامی اداروں کی رپورٹوں اور غیر سرکاری تنظیموں کی مطبوعات میں بھی اس بات کا بار بار ذکر آتا ہے۔ لیکن بیشتر شہروں میں بلدیاتی ادارے مالی طور پر دیوالیہ ہیں۔ شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لحاظ سے ان کے محصولات کم ہو رہے ہیں اور غیر ترقیاتی اخراجات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس

قصبوں کا بوجھ بہت زیادہ ہے اور وہ بیوروکریسی کی سخت گرفت میں ہیں۔ منتخب بلدیاتی اداروں کو صوبائی اور قومی قانون ساز اداروں اور سیاست دانوں کا حریف سمجھا جاتا ہے۔ جہاں جہاں منتخب بلدیاتی ادارے موجود ہوں تب بھی وہ اپنے محدود اختیارات موثر طور پر استعمال نہیں کر پاتے۔

علاوہ ازیں، ایشیائی ملکوں کے حالیہ اقتصادی رجحانات ــــ پرائیویٹائزیشن، آزاد تجارت کی حوصلہ افزائی وغیرہ ــــ اور شہری انتظام میں مافیاؤں کے بڑھتے ہوئے اثر نے موثر بلدیاتی اداروں کے قیام کو مزید مشکل بنا دیا ہے۔ ان عوامل نے شہری آبادی کو دو الگ الگ دنیاؤں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک طرف غریب اور نچلے درمیانہ طبقے کے لوگ شہروں کی بیرونی سرحدوں کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں اور ان کی رہائش اور روزگار کی جگہوں کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے، اور دوسری طرف خوش حال لوگوں کے علاقے امیروں کے بند محلوں (ghettos) کی صورت اختیار کر رہے ہیں جہاں وہ مسلح پہرے داروں اور سکیورٹی کے جدید آلات کی حفاظت میں رہتے ہیں۔ نتیجتاً شہروں کے مرکزی علاقوں سے ثقافتی اور تفریحی سرگرمیاں ختم ہو گئی ہیں، یہ سرگرمیاں اب صرف چند ایسے مقامات تک محدود ہو چکی ہیں جو غریب اور نچلے طبقے کے شہریوں کی پہنچ سے باہر ہیں۔ امداد اور قرض دینے والے بین الاقوامی ادارے ایشیائی ملکوں کے مالی نظام میں جن تبدیلیوں پر زور دے رہے ہیں ان کے نتیجے میں اس تفریق میں مزید شدت پیدا ہو گی کیوں کہ ان سے پیدا ہونے والی مہنگائی نچلے طبقوں کی زندگی کو اور دشوار بنا دے گی۔

***

* ناموزوں شہری پالیسیاں
* تعلیم یافتہ اور صاحبِ حیثیت طبقات کی شہری معاملات سے بے خبری اور بے اعتنائی، اور
* سرکاری اہلکاروں (خصوصاً پولیس) کا مفادی گروہوں اور مافیاؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ

ان تین عوامل کے تحت بہت سے ایشیائی شہروں کا انتظام ایسی مسخ اور غیر منصفانہ شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں تشدد ایک لازمی عنصر کے طور پر شامل ہوتا ہے۔ یہ تشدد مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے

(۱) غیر رسمی سیکٹر کی بنائی ہوئی کچی بستیوں میں مافیا کی حکمرانی ہوتی ہے اور یہ حکمرانی وہاں کے باشندوں کو خوف کے زیرِ اثر رکھنے، منظم ہونے سے روکنے اور تشدد کے استعمال کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ مافیا کا یہ تشدد اُجرتی غنڈوں اور پولیس کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ تمام سرگرمیاں انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے موجود تمام ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کی جاتی ہیں۔ ان بستیوں میں رہنے والی کراچی کی نصف آبادی تشدد کے اسی ماحول میں زندگی بسر کرتی ہے، اور یہ بستیاں شہر کی آبادی میں ہونے والے اضافے کی شرح کے مقابلے میں دگنی رفتار سے بڑھ رہی ہیں۔

(۲) شہر کے نسبتاً خوش حال علاقوں میں زمین کی قیمت میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے اور جائیداد کے تاجر وہاں موجود غریب اور کم آمدنی والی بستیوں کو بُل ڈوزروں کے ذریعے مسمار کروا کے اپنے تعمیراتی منصوبوں کے لیے زمین کے قطعات حاصل کرتے ہیں۔ یہ انہدام اور بےدخلی بھی اُجرتی غنڈوں، انتظامی اہلکاروں اور پولیس کا تعاون حاصل کر کے کی جاتی ہے۔ خوش حال علاقوں کے درمیان قائم جھگیوں میں آگ لگنے کے واقعات بعض دوسرے ایشیائی شہروں کی طرح کراچی میں بھی بڑھتی ہوئی تعداد میں پیش آنے لگے ہیں۔

(۳) ایشیائی شہروں کے مافیا اور جائیداد کے تاجر انتخابات میں سیاسی پارٹیوں کے امیدواروں کی سیاسی مہم کے مالی اخراجات برداشت کرتے ہیں اور تنظیمی کارکن بھی فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی سرگرمیوں کو سیاسی تحفظ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک اخباری رپورٹ میں انکشاف کیا گیا تھا کہ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ۵۴۲ ارکان میں سے ۱۸۰ مجرمانہ ریکارڈ رکھتے ہیں۔ پاکستان کی قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے بارے میں اس قسم کی تحقیق کی جائے تو خاصے دل چسپ نتائج سامنے آئیں گے۔ سرکاری اہلکاروں اور مافیاؤں کے گٹھ جوڑ میں سیاست دانوں کی شمولیت قانونی عمل، شہری منصوبہ بندی اور پالیسیوں کے نفاذ کو ایک مذاق بنا دیتی ہے۔ طاقت ور تجارتی مفادات رکھنے والوں کی بالادستی کے باعث خوش حال علاقوں کو چھوڑ کر باقی شہر کی ضرورتوں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ اقتدار کی کسی بھی سطح تک رسائی نہ رکھنے والے غیر منظم غریب باشندے مفادپرست تاجروں اور مافیاؤں، بدعنوان سرکاری ایجنسیوں اور موقع پرست سیاست دانوں کے اس گٹھ جوڑ کے یرغمال بن کر رہ جاتے ہیں۔

(۴) شہری مطالعات کے غیرسرکاری اداروں کی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ایشیا کے بعض بڑے شہروں میں مافیا کی مجرمانہ اور پرتشدد سرگرمیوں میں منشیات کی تجارت سے حاصل ہونے والا سرمایہ استعمال کیا جاتا ہے۔ کراچی میں ان واقعات کے شواہد موجود ہیں کہ غریب علاقوں میں منشیات کی تجارت کے خلاف شہریوں کی چلائی ہوئی تحریکوں کو پولیس نے تشدد سے کچل ڈالا۔

شہری بدانتظامی اور تشدد کی یہ صورت حال شہر کی غریب بستیوں کے حالات پر ہولناک اثرات مرتب کرتی ہے۔ علاوہ ازیں ان آبادیوں کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد شہریوں کی دوسری یا تیسری نسل کے نوجوانوں پر مشتمل ہے جن کا ملک کے دیہی علاقوں کی معیشت اور کلچر سے تعلق ختم ہو چکا ہے۔ اس تعلق کی جگہ لینے والی شہری اقدار ریاست کے ساتھ اُن کے رشتے کو تبدیل کر رہی ہیں۔ خاندان اور برادری کے قدیم نظام سے ٹوٹ کر شہری نوجوان ایسے اداروں سے تعلق قائم کرنے کے ضرورت مند ہیں جو ان کی نئی امنگوں اور قدروں کی عکاسی کر سکیں۔ وہ ریاستی اداروں سے یہ اہم کردار ادا کرنے کی توقع کرتے ہیں مگر انہیں ہمیشہ مایوسی ہوتی ہے۔ اس طرح ان میں اجنبیت اور علیحدگی کا احساس جڑ پکڑ لیتا ہے۔ اس پورے عمل میں ان کے والدین کا کنٹرول بھی کمزور پڑ جاتا ہے اور بغاوت کے رجحان کو

تقویت ملتی ہے۔

ایک اور اہم عنصر بے روزگاری ہے۔ اوپر بیان کیے گئے حالات میں جوان ہونے والا فرد شہر کی سیاسی اور سماجی زندگی سے کوئی تعلق پیدا نہیں کر پاتا۔ بے روزگاری اس بے تعلقی اور اجنبیت کے احساس کو اور شدید کر دیتی ہے جس کے نتیجے میں یا تو متبادل سیاسی نظام کی جستجو پیدا ہوتی ہے یا پھر شہروں میں سرگرم مافیا کی زیرِ زمین دنیا سے وابستہ ہو کر، یا انفرادی طور پر، جرم کا رجحان جنم لیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ فرد شہری تشدد میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ کراچی ڈویلپمنٹ پلان ۲۰۰۰ کے مطابق ۱۹۸۹ میں کراچی میں بے روزگاری کی شرح ۱۲.۸ فیصد تھی۔ بے روزگاری کو اسی سطح پر برقرار رکھنے کے لیے ۱۹۸۹ کے بعد آنے والے پانچ برسوں میں روزگار کے ۱۱ لاکھ نئے مواقع پیدا کرنا ضروری تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس، شواہد بتاتے ہیں کہ رسمی سیکٹر میں روزگار کے مواقع کم ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، کراچی میں ۷۵ فیصد روزگار غیر رسمی سیکٹر فراہم کرتا ہے۔ ۱۹۷۴ میں غیر رسمی سیکٹر کے مہیا کیے ہوئے روزگار کے مواقع کی تعداد ۵۸ فیصد تھی۔ ان اعداد و شمار سے صورتِ حال کی بخوبی نشان دہی ہو جاتی ہے۔ جن شہروں میں ریاستی ادارے مکمل طور پر تباہ نہیں ہوئے ہیں اور نسلی، لسانی یا مذہبی تفریق نے سیاسی رخ اختیار نہیں کیا ہے، وہاں تشدد اور جرائم نے سرکاری ایجنسیوں اور سیاسی نظام کے لازمے کی حیثیت اختیار نہیں کی ہے؛ ایسے شہروں میں تشدد پر قابو پانا ممکن ہوا ہے۔ کراچی میں ایسا نہیں ہوا۔

کراچی میں موجود لسانی یا نسلی گروہوں کے تنازعات کو شہر میں آنے والی مہاجرت کی دو بڑی لہروں کا جائزہ لیے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ۱۹۴۷ کے بعد کے چار برسوں میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے چھ لاکھ مہاجر شہر میں آئے جس کے باعث شہر کی آبادیاتی صورتِ حال بالکل بدل کر رہ گئی۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۸۵ تک کے اڑتیس برسوں میں کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں کی مہاجر آبادی نے ایک کے بعد ایک آنے والی وفاقی حکومتوں اور ایسی سیاسی پارٹیوں کا ساتھ دیا جو مضبوط مرکز کی حامی تھیں۔ ان کا یہ طرزِ عمل صوبے کی سندھی اکثریت کی امنگوں سے متصادم تھا، چناں چہ صوبے کے دیہی اور شہری علاقوں کے درمیان سیاسی تقسیم گہری ہوتی گئی جس نے صوبے کی، اور خصوصاً کراچی کی، سیاست پر گہرا اثر ڈالا۔ صوبائی اسمبلی میں دیہی علاقوں کے نمائندے اکثریت میں ہیں، اور کراچی کے باشندے محسوس کرتے ہیں کہ وہ شہر کے بنیادی مسائل سے واقفیت اور ان مسائل کو حل کرنے سے دل چسپی نہیں رکھتے۔ ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کی دہائیوں میں شمال مغربی سرحدی صوبے اور وسطی پنجاب سے لوگ بڑی تعداد میں کراچی منتقل ہوئے؛ بعد کے برسوں میں کراچی آنے والوں میں پنجاب کے سرائیکی علاقے کے لوگ زیادہ ہیں۔ اس طرح شہر میں مہاجروں کی آبادی کی فیصد شرح کم ہوئی ہے اور متواتر کم ہو رہی ہے۔ صوبہ سرحد اور پنجاب سے آنے والوں نے شہر کے ٹرانسپورٹ، ہول سیل مارکیٹ،

تعمیرات اور صنعت کے شعبوں میں مختلف پیشے اختیار کیے، جبکہ مہاجروں کی بڑی تعداد سفید کالر ورکروں پر مشتمل ہے۔ کراچی کے نسلی گروہوں کے درمیان تنازعات کی کوئی حقیقی معاشی بنیاد موجود نہیں ہے۔ تاہم، سیاسی موقع پرستی، مختلف حکومتوں کی طرف سے جمہوری اداروں کی حوصلہ شکنی اور شہر کے نسلی گروہوں کے درمیان مسلسل رابطے اور مکالمے کے فقدان نے ان گروہوں کے درمیان گہری تقسیم پیدا کر دی ہے۔ جو لوگ اس تقسیم کے مخالف ہیں وہ اب شہر کے سیاسی دھارے میں شامل نہیں رہے۔

ایسا کیوں کر ہوا؟ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس صورتِ حال کا خام مواد قیامِ پاکستان کے وقت سے مسلسل تیار ہو رہا تھا۔ لیکن حالیہ بحران کی شدت اور اس بحران سے نمٹنے میں انتظامیہ کی بے بسی کراچی میں ۱۹۸۰ کی دہائی میں ہونے والے واقعات کا نتیجہ ہے۔ افغان جنگ کے دنوں میں کراچی منشیات اور اسلحے کے مافیا کا علاقائی ہیڈکوارٹر بن گیا تھا۔ اس مافیا نے بہت کم عرصے میں شہر میں موجود مافیاؤں کو اپنے اندر جذب کر لیا اور ان سب کا سرغنہ بن کر شہر کی سیاست اور معیشت میں اہم حیثیت حاصل کر لی۔ اسے اُس دور کے حکمرانوں کی مضبوط سرپرستی حاصل تھی۔ اسی زمانے میں حکومت نے تمام انتہاپسند سیاسی، لسانی، نسلی اور مذہبی گروہوں کو، جو اُس وقت تک شہر کی سیاسی اور ثقافتی زندگی کی خارجی سرحدوں پر وجود رکھتے تھے، مالی امداد اور اسلحہ فراہم کیا تاکہ آمریت کے خلاف کسی متحد اور منظم مزاحمت کا سدباب کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں سیاسی وفاداریاں خریدنے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو جبر اور تشدد کے ذریعے حاصل کرنے کے عمل کو رواج کی شکل دے دی گئی اور یہ رواج شہر کی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو گیا۔ اس عمل کے نتیجے میں سیاسی تشدد اور بے رحم ہتھکنڈوں کے استعمال کو استحکام حاصل ہوا اور شہر کی انتظامی اور شہری ایجنسیاں اس عمل کی مددگار بن گئیں۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ مارشل لا کے خاتمے کے بعد بھی یہ عمل جاری رہا اور کراچی کے ڈرامے کے تمام فاعل کردار، اپنے اعلانات کے برعکس، وہی رول ادا کرتے رہے جو مارشل لا دور میں ان کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ شہر کی معاشرتی زندگی کی شکست و ریخت، ریاستی اداروں کی ناکارکردگی، مافیاؤں پر دانستہ یا نادانستہ انحصار کرنے والی سیاسی پارٹیوں، اور انتظامی اور سیاسی نظام پر جرائم پیشہ گروہوں کی سخت گرفت کی صورت میں نکلا ہے، اور شہر کی آبادی کا بہت بڑا حصہ روزگار، سر چھپانے کی جگہ، تحفظ اور سیاسی نمائندگی سے محروم ہو گیا ہے۔ تاہم، ایسے حالات میں جہاں کہیں شہروں کے باشندے اپنے مسائل کے حل کے لیے منظم ہوئے ہیں وہاں وہ رفتہ رفتہ بحرانی صورتِ حال کے ہولناک نتائج پر قابو پانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ایسی تنظیموں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور بہت سے موقعوں پر اس کے باعث تشدد میں مزید اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

**

اگلے دو مضامین کراچی کی صورتِ حال کے دو نمایاں پہلوؤں ــــ سندھی مہاجر تنازعہ و شہر میں مہلک ہتھیاروں کی بہتات ــــ کے تجزیے پر مبنی ہیں۔

ایس اکبر زیدی کراچی یونیورسٹی کے اپلائیڈ اکنامکس ریسرچ سنٹر (AERC) سے ریسرچ سکالر اور استاد کے طور پر وابستہ ہیں۔ آئندہ صفحات میں ان کے جس مضمون کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے وہ پہلی بار بمبئی سے نکلنے والے جریدے *Economic and Political Weekly* کے ۱۸ مئی ۱۹۹۱ کے شمارے (جلد ۲۶، شمارہ ۲۰) میں شائع ہوا تھا اور بعد میں انہیں کی مرتب کردہ کتاب *Regional Imbalances & the National Question in Pakistan* میں شامل کیا گیا۔ یہ کتاب لاہور سے وین گارڈ بکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ نے ۱۹۹۲ میں شائع کی۔

یہ مضمون اگرچہ کئی برس پہلے لکھا گیا تھا، اور کراچی میں حالات کی رفتار اتنی تیز ہے کہ موجودہ صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے اس مضمون پر مکمل انحصار کرنا مناسب نہیں ہوگا، تاہم یہ مہاجر اور سندھی آبادی میں قوم پرستی کی سیاست کے آغاز کا تاریخی حوالے سے احاطہ کرتا ہے اور اگست ۱۹۹۰ میں پہلی بے نظیر حکومت کی برطرفی سے پہلے تک کی صورتِ حال کو سمجھنے میں خاصا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ مضمون کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کے کئی وضاحتی نوٹس مناسب مقامات پر، قوسین کے ساتھ، متن میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

اس مضمون کے بعد جو متن "چھوٹے ہتھیار" کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے وہ راسکل میموریل لیکچر (۱۹۹۵) کی تدوین اور تلخیص شدہ شکل ہے جو معروف ریڈیائی صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار مارک ٹلی (Mark Tully) نے ۲۲ فروری ۱۹۹۵ کو چرچل کالج، کیمبرج یونیورسٹی، میں دیا تھا۔ لیکچر کا عنوان The Arms Trade and Political Instability in South Asia تھا۔ یہ مضمون جنوبی ایشیا میں حالیہ پُرتشدد تنازعات کے نمایاں مراکز کی صورتِ حال کا ایک مجموعی تناظر میں جائزہ لیتا ہے، اور یہ ایک ایسا زاویۂ نظر ہے جو کراچی کی صورتِ حال کا تجزیہ کرنے والے دیگر ماہرین کی تحریروں میں اتنے واضح انداز میں نہیں ملتا۔

کلکتے میں پیدا ہونے اور انگلستان میں تعلیم پانے والے مارک ٹلی ۱۹۶۴ میں بی بی سی سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۷۲ میں دہلی میں بی بی سی کے بیورو کے سربراہ ہوئے۔ انہوں نے برصغیر میں ہونے والے تقریباً تمام اہم سیاسی واقعات کی رپورٹنگ کی ہے۔ ۱۹۹۴ میں ٹلی نے بی بی سی سے استعفیٰ دے دیا کیوں کہ وہاں متعارف کرایا جانے والا نیا نظام انہیں ریڈیائی صحافیوں کی آزادیِ اظہار کے منافی محسوس ہوا۔ مارک ٹلی کی مطبوعہ کتابوں میں *No Full Stops in India* (۱۹۹۱) اور *Amritsar Mrs Gandhi's Last Battle* (۱۹۸۵) شامل ہیں۔ موخرالذکر کتاب انہوں نے بی بی سی کے ایک اور نامہ نگار ستیش جیکب کے ساتھ مل کر تحریر کی۔ ان کی تازہ ترین کتاب *The Heart of India* ۱۹۹۵ میں وائکنگ پینگوئن نے دہلی سے شائع کی ہے۔ یہ کتاب اُتر پردیش کے دیہات اور قصبوں میں رہنے والے عام لوگوں کی بدلتی ہوئی زندگی کی کہانیوں پر مشتمل ہے جنہیں مارک ٹلی نے صحافیانہ تحریروں کے طور پر لکھنا شروع کیا تھا اور مکمل ہوتے ہوتے انہوں نے فکشن کی صورت اختیار کر لی۔

اکبر زیدی

انگریزی سے ترجمہ۔ فہمیدہ ریاض

سندھی بمقابلہ مہاجر

تضادات، ٹکراؤ اور سمجھوتا

پاکستان میں قومی اور نسلی (ethnic) تشخص کا اظہار جس طرح اس دور کے سیاسی عمل پر حاوی ہو گیا ہے ماضی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آزادی کے بعد سے ملک کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے پر پہلے مہاجروں اور پنجابیوں کے حکمراں طبقوں کی گرفت تھی، گو رفتہ رفتہ اب یہ بڑی حد تک صرف پنجابیوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ اس بالادستی کے باعث ملک میں گزشتہ چالیس برس کے دوران دوسری قومیتوں کی مزاحمتی یا علیحدگی کی تحریکیں اٹھیں، جن میں سے ایک کامیاب ہو کر بنگلادیش کے قیام پر منتج ہوئی۔ دوسری تحریکیں جو علیحدگی یا وسیع تر صوبائی خودمختاری حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئیں ان میں ایوب اور بھٹو دور میں چلائی گئی بلوچ تحریک کے علاوہ سندھیوں کی متعدد تحریکیں شامل ہیں۔ سندھیوں کی یہ تحریکیں ۱۹۴۸ میں کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے خلاف مہم سے شروع ہو کر جنرل ضیاالحق کی مارشل لا حکومت کے خلاف چلنے والی تحریکوں تک پہنچیں۔ ماضی میں پختونوں نے بھی گاہے گاہے اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائی، مگر (سندھ اور بلوچستان کے برعکس) صوبہ سرحد میں زیادہ ترقیاتی کاموں کے باعث اب وہ وفاقِ پاکستان میں زیادہ بہتر طور پر ضم ہو چکے ہیں۔ فی الوقت سندھیوں اور بلوچوں کی مرکز میں، اور خود اپنے اپنے صوبے میں، پنجابی بالادستی کے خلاف جدوجہد جاری ہے جبکہ پٹھانوں نے اپنے صوبے پر اقتصادی اور سیاسی کنٹرول حاصل کرنے میں جزوی کامیابی حاصل کر لی ہے، اور یوں پختون مسئلے نے ایسی شکل اختیار کر لی ہے جو دوسری قومیتوں کے مسئلے کی نسبت بہت مختلف ہے۔

پاکستان میں مختلف قومیتوں کے درمیان موجود اس صف بندی (polarisation) کی ایک بڑی وجہ نمائندہ اداروں کا فقدان اور فوجی حکمرانی کا تسلسل ہے جس نے سیاسی اور اقتصادی ترقی پر اپنی گرفت قائم رکھی ہے۔ فوج چونکہ زیادہ تر پنجابیوں پر مشتمل ہے، اور فوجی حکمرانی پاکستان کی عمر کے نصف سے زیادہ حصے پر محیط رہی ہے، لہذا علاقائی اور قومیتی عدم توازن کی صورت حال اور بگڑ گئی ہے۔ حکومتی نظام میں مرکز کے نہایت طاقتور ہونے اور اقتدار سے محروم گروہوں کو ان کی شکایات رفع کرنے کا

موقع ۔ جلسے کے باعث محروم اقتدار قومیتی یا نسلی گروہوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی ہے۔ البتہ جمہوریت، خواہ کتنی ہی مختصر اور کیسی ہی مسخ حالت میں ہو، اس ملک کے لوگوں کی صورت حال میں ایک تبدیلی ضرور پیدا کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جمہوری عمل کے ذریعے برسراقتدار آنے والی حکومتیں ریاست کے دوسرے اداروں کی طاقت کو کم یا ختم نہیں کر سکیں، تاہم جمہوریت کے آنے سے نظام کی بساط پر تھوڑے بہت ردوبدل کی گنجائش ضرور پیدا ہوئی۔ یہ بات سندھیوں پر سب سے زیادہ صادق آتی ہے جو واحد قومیت ہیں جن میں سے ۱۹۷۰ کے بعد سے تین افراد وزیراعظم ہوئے۔ ۱۹۸۵ کے انتخابات کے بعد جنرل ضیا نے ایک بالکل غیر معروف سیاست داں کو، جس کی واحد خوبی اس کا سندھی ہونا تھا، وزیراعظم نامزد کرنے پر خود کو مجبور پایا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاست میں سندھ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

سندھ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں کی آبادی ۱۹۴۷ سے لے کر نسلی بنیادوں پر سب سے زیادہ منقسم رہی ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد مہاجروں کے سیلاب نے اس صوبے کے سیاسی رنگ کو دائمی طور پر تبدیل کر دیا۔ گزشتہ برسوں میں ان دونوں گروہوں کا تنازعہ کئی گنا بڑھ گیا ہے اور قومی حقوق کے نام پر ہونے والے تشدد نے بربریت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس مضمون میں میرا مقصد اس تصادم کی وجوہ بیان کرنا اور ان کی تشریح کرنا ہے۔ اس کے لیے میں پہلے مہاجر تشخص کی مختصر تاریخ پیش کروں گا، پھر سندھی قوم پرست تحریک کے خدوخال پر روشنی ڈالوں گا، اور بعدازاں اس تنازعے میں ریاست کے کردار اور سندھی مہاجر تصادم میں تشدد کے درجات زیر بحث آئیں گے۔ آخر میں صوبے کی موجودہ صورتِ حال کا ذکر ہوگا۔

مہاجر تشخص کا ارتقا

۱۹۴۷ میں اردو بولنے والے بیش تر مہاجر صوبۂ سندھ کے مقامات، کراچی، حیدر آباد، میرپور خاص اور سکھر، میں رہائش پذیر ہوئے۔ (سندھ میں آ کر بسنے والوں میں ان کے علاوہ میمن، گجراتی، بوہرے، کاٹھیاواڑی وغیرہ بھی شامل تھے۔) ان میں اور مشرقی پنجاب سے آ کر مغربی پنجاب میں بس جانے والوں میں یہ فرق تھا کہ پنجابیوں کے برعکس یہ لوگ ایک بالکل اجنبی صوبے میں وارد ہوئے تھے۔ تہذیبی، لسانی، سماجی اور اقتصادی لحاظ سے یہ لوگ اپنے میزبان علاقے کے باسیوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس طرح سندھ آناً فاناً ایک اجنبی تہذیب کی یلغار کا شکار ہو گیا جس نے نہ صرف اس صوبے بلکہ پورے ملک پر غلبہ پانا شروع کر دیا۔ بعض مفسرین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مہاجر قائص ذہنیت

لے کر آئے تھے اور مقامی باشندوں سے حقارت کا سلوک کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سندھ پر مہاجروں کا غلبہ ہو گیا تھا، لیکن اس کے پیچھے کوئی سازش یقیناً نہیں تھی جیسا کہ زیادہ تر سندھی مبصرین اصرار کرتے ہیں۔ اس غلبے کے چند ٹھوس مادی اور فطری اسباب تھے۔

سندھ کی معیشت غالب طور پر زرعی اور جاگیردارانہ تھی، یہاں چند تاجر تو تھے اور صنعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ سندھ کے ممتاز سیاست داں جاگیردار طبقے کے نمائندے تھے، کیوں کہ بورژوا اور نچلا بورژوا طبقہ ابھی ارتقا کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ (سندھ میں ایک شہری بورژوا طبقہ موجود تھا، مگر یہ بڑی حد تک ہندوؤں پر مشتمل تھا، جو تقسیم کے وقت ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے۔ سندھ کے مسلمانوں میں اُس وقت تک یہ طبقہ پیدا نہ ہوا تھا۔) اس کے مقابلے میں باہر سے آنے والے ایک ترقی یافتہ شہری سرمایہ دارانہ کلچر کے نمائندے تھے۔ ان میں نہ صرف زیادہ بڑا سرمایہ کار طبقہ تھا بلکہ زیادہ تعلیم یافتہ متوسط منتظم طبقہ اور بہتر تربیت یافتہ ہنرمند مزدور طبقہ بھی موجود تھا۔ اس طرح ان میں اور ان کے سندھی میزبانوں میں کوئی قدرِ مشترک نہ تھی۔ مہاجروں کا یہ بھی خیال تھا کہ پاکستان کی تخلیق اُن کی بدولت ممکن ہوئی ہے اور انھوں نے اس کے قیام کے لیے تمام قربانیاں دی ہیں — اور ان میں سیاسی جوڑ توڑ کی صلاحیت اور ریاستی مشینری کو بنانے اور چلانے کی مہارت بھی زیادہ تھی — چناں چہ انھوں نے پاکستان میں اقتصادی اور سیاسی اقتدار سنبھال لیا۔ مہاجروں کے بالادست طبقے نے خارج اور لیاقت کی رسائی میں بیورو کریسی کی باگ ڈور سنبھالی جبکہ ان کے سرمایہ کاروں اور مزدوروں نے بقا کے لیے لازمی صنعت کاری کی داغ بیل ڈالنی شروع کی۔ کراچی کے پاکستان کا دارالحکومت بننے اور انتظامی طور پر سندھ سے علیحدہ کر دیے جانے نے ان کی (حقیقی اور خیالی دونوں قسم کی) طاقت کو مزید بڑھاوا دیا۔ اس طرح مہاجر تشخص نئے ملک میں تیزی سے وجود میں آ گیا اور مہاجر پاکستان کا حکمران نسلی گروہ بن کر اُبھرے۔

مہاجروں کے نزدیک سندھ ہمیشہ ملک کا ایک پس ماندہ اور کم ترقی یافتہ صوبہ رہا جس کا اُس زیادہ نفیس شہری تمدن سے چنداں واسطہ نہ تھا جس کی وہ خود نمائندگی کرتے تھے۔ مہاجروں کا یہ متکبرانہ اور احساسِ برتری سے مملو رویہ سندھیوں کے لیے ہمیشہ باعثِ توہین رہا اور اب بھی ہے۔ غیر نمو یافتہ سرمایہ دارانہ رشتوں میں الجھے ہونے اور بورژوا طبقے کی غیر موجودگی کے باعث سندھیوں میں سیاسی، اقتصادی یا ثقافتی اقتدار حاصل کرنے کے لیے مہاجروں کو چیلنج کرنے کی سکت نہ تھی۔ بلاشبہ مہاجر ان سرمایہ دارانہ رشتوں کی نشوونما یافتہ صورت کا مظہر تھے، لیکن یہ صورت اِس سرزمین سے ارتقا پذیر نہیں ہوئی تھی بلکہ باہر سے آ کر پیوند ہوئی تھی۔

مہاجر صنعت کار اور تاجر، خصوصاً کوریا کی جنگ کے بعد، اور ایوب حکومت کے اقتصادی پروگرام کے تحت، ملک کی معیشت پر حاوی ہو گئے۔ جب لیاقت علی خاں کی موت کے بعد مطلق اقتدار بیورو کریسی کے ہاتھ میں آ گیا، اُس سیاسی افراتفری کے دور میں بھی مہاجروں کی حیثیت برقرار رہی اور حکومت کے اداروں میں ان کی نمائندگی، ان کی آبادی کے تناسب (ملک کی کل آبادی کے محض ۲ فیصد) سے کہیں

زیادہ رہی۔ وہ ریاستی طاقت اور وسائل میں پنجابیوں کے بڑھ چڑھ کر حصے دار بنتے گئے، جبکہ سب سے بڑے قومیتی گروہ (یعنی بنگالیوں) کو، جنھیں ریاستی امور میں زیادہ حصہ ملنا چاہیے تھا، دانستہ طور پر نظرانداز کیا گیا۔ پیداواری رشتوں کے اس مخصوص تحرک کے باعث سندھیوں اور بلوچوں کو، اور بڑی حد تک پختونوں کو بھی، بہت کم نمائندگی ملی۔ پاکستان جس علاقے میں قائم ہوا، وہ بیش تر ـــ بنگال اور پنجاب کے استثنیٰ کے ساتھ ـــ متحدہ ہندوستان کے پس ماندہ ترین خطوں پر مشتمل تھا۔ لہذا ان علاقوں میں خواندہ (خصوصاً اہمیت رکھنے والی زبانوں میں خواندہ) افراد، اور انتظامی شعبوں میں مہارت رکھنے والے لوگ نہایت قلیل تعداد میں تھے، اور بورژوازی کم زور تھی۔ اس طرح ریاست کے اداروں میں مذکورہ گروہی تناسب ناگزیر بن گیا۔ علاوہ ازیں، انگریزوں کے نوآبادیاتی ورثے نے بھی سرتی کے پرانے طریقِ کار کو جاری رکھنے میں مدد دی جو ان دونوں نسلی گروہوں کے حق میں جاتا تھا۔ مہاجروں کے لیے ـــ جو وفاقی دارالحکومت کے دامن میں محفوظ تھے ـــ سندھی کسی بھی سیاسی یا اقتصادی اقتدار کے لیے مسابقت کرنے والا گروہ نہیں تھے۔ اس کے برعکس، انھیں پنجابیوں کی جانب سے مسابقت کا سامنا تھا۔ لیاقت علی خان کی موت کے بعد مہاجروں کے پاس اُن جیسا یا جناح جیسا کوئی لیڈر نہ رہا۔ اس طرح پاکستان کے نسلی یا قومی گروہوں کے مابین سیاسی اقتدار کے توازن میں وہ تبدیلی رونما ہونی شروع ہوئی جو ۱۹۵۸ میں غیرمہاجر فوج کے اقتدار پر قابض ہو جانے کے بعد زیادہ شدت کے ساتھ جاری رہی۔

مہاجر بالادستی کو سب سے بڑی زک ۱۹۶۰ کی دہائی میں پہنچی جب یہ یقینی نظر آنے لگا کہ پنجاب میں سبز انقلاب (Green Revolution) کے اثرات کے باعث پاکستان کے اقتصادی، آبادیاتی (demographic) اور سیاسی منظر نامے میں اہم تغیر آنا ناگزیر ہے۔ پنجاب میں سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں نے گہری جڑیں پکڑنی شروع کیں اور اس کے ساتھ ساتھ مستقبل کی بالادست قومیت، اقتصادی گروہ اور سیاسی قوت کی حیثیت سے، شدّومد کے ساتھ اُبھرنے لگی۔ پنجابیوں میں نہ صرف زیادہ فعال سرمایہ کار پیدا ہوئے بلکہ دیہات سے شہروں کی سمت ہجرت کرنے والوں کے تعلیم پانے کے باعث سرکاری ملازمتیں کمیاب تر اور ان کے لیے مسابقت سخت تر ہوتی گئی۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجر جو پہلے اس معاملے میں نسبتاً آگے تھے، اب اپنی پوزیشن کو خطرے میں محسوس کرنے لگے۔ یہ خطرہ نہ صرف سرکاری سیکٹر کے ہر درجے پر تھا بلکہ دیہات سے زراعت چھوڑ کر آنے والے پنجابی کسان زیادہ متحرک (mobile) ہو کر سندھ کے شہروں میں بھی داخل ہوئے جو اب تک مہاجروں کے قبضے میں تھے، اور ملازمتوں کے سلسلے میں ان سے کامیابی کے ساتھ مسابقت کرنے لگے۔ مزید برآں، ایوب خان کے دور میں بہت سے اعلیٰ سرکاری اور فوجی افسروں کو (جو بیشتر پنجابی تھے) سندھ میں زمینیں دی گئیں جس سے صورتِ حال اور بگڑ گئی کیوں کہ یہ زمیندار طبقہ کسان بھی پنجاب سے درآمد کرنے لگا۔ اُسی دور میں پختون مزدوروں نے بھاری تعداد میں شمالی علاقوں سے کراچی کی جانب ہجرت کی۔ تاہم، پٹھان مزدوروں اور مہاجروں کے درمیان تضاد کم تھا کیوں کہ پٹھان جن کاموں میں مشغول ہوئے وہ

مہاجر نہیں کرتے تھے۔ اس طرح سندھ اور باقی پاکستان میں سرکاری شعبے اور نجی کاروبار پر مہاجروں کا غلبہ ختم ہو گیا۔ سندھ کے شہر خالص مہاجروں کا علاقہ نہیں رہ گئے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے مزید ارتقا کے ساتھ ساتھ پنجاب نے، اپنی مضبوط معیشت کے بل پر، رفتہ رفتہ نہ صرف صنعت، زمینداری اور ملازمتوں میں فوقیت حاصل کر لی بلکہ اندرونِ ملک نقل مکانی کرنے والے مزدوروں میں بھی پنجابیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔

مہاجر لیڈر اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ مہاجروں نے ہمیشہ حکومت سے باہر رہ جانے والی جماعتوں کے حق میں ووٹ دیا ہے یعنی حزبِ اختلاف کی حمایت کی ہے۔ ۱۹۶۴ میں ان کے رہنماؤں نے ایوب خان کے مقابلے میں فاطمہ جناح کا ساتھ دیا؛ ۱۹۷۰ میں، جب پورا ملک [مغربی پاکستان] بھٹو کی لائی ہوئی سوشلزم کی لہر کے زیرِ اثر تھا، انھوں نے اسلامی پارٹیوں کے حق میں ووٹ ڈالا؛ ۱۹۷۷ میں بھی انھوں نے بھٹو کے خلاف پی این اے کے رجعتی اتحاد کی حمایت کی، اور اب، ۱۹۸۸ میں، انھوں نے اپنی جماعت کو ووٹ دیا، جسے ان کے علیحدہ تشخص کے احساس کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے۔ ہرچند کہ مہاجر تشخص نے واضح طور پر ۱۹۸۶ میں مہاجر قومی موومنٹ کے باقاعدہ قیام، اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے پُرتشدد واقعات، کے بعد ہی ٹھوس شکل اختیار کی، مگر اس کی ایک صورت مہاجروں کے ایک اکائی کے طور پر یکساں سیاسی رجحانات رکھنے کے باعث طویل عرصے سے ارتقا پذیر تھی۔

مہاجروں نے ماضی میں ہمیشہ بنیاد پرست اسلامی تنظیموں کی حمایت کی جو صوبائی رنگ رکھنے کے بجائے پاکستانیت کی دعوے دار تھیں، اور خود اپنی تنظیم سازی سے تک خود کو تمام تقسیم پسند گروہوں سے دور رکھا۔ اس کی وجوہ سمجھ میں آنے والی ہیں، کیوں کہ مہاجر پاکستان میں مسلمان اور پاکستانی ہی کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے اور یہاں اُنھیں احساسِ تحفظ کے لیے انھیں نظریات کی ضرورت تھی۔ ابتدائی برسوں میں اُنھیں ملازمتوں اور دیگر مواقعوں کی کمی نہ تھی، اور پاکستان کے ریاستی اور معاشی ڈھانچے میں ان کی حیثیت مسلّم تھی، چناں چہ یہ نظریات ان کے لیے نہایت آرام دہ بھی تھے۔ لیکن جب اقتدار اور وسائل پر مقابلہ زیادہ شدید ہو گیا تب انھیں بھی ایک نئے تشخص کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسلامی تنظیمیں ان نئی حقیقتوں کا سامنا کرنے کی اہلیت نہ رکھتی تھیں، اور جوں جوں پنجابیوں کی جارحانہ گرفت پاکستان پر مضبوط ہوتی گئی، ایک جداگانہ مہاجر شعور پروان چڑھتا گیا۔ پہلے سندھی وزیرِاعظم کے انتخاب کے ساتھ شہروں اور سرکاری ملازمتوں میں ایسے سندھیوں کی ایک بڑی لہر آئی جو اپنے دیہاتی پس منظر سے پوری طرح جدا نہ ہوئے تھے۔ ۱۹۷۲ میں سندھی کو صوبے کی سرکاری زبان بنانے کی کوشش اسی نوترقی یافتہ درمیانہ اور نچلے درمیانہ طبقے کی جانب سے اپنے تشخص کو، جسے ٹھوس شکل اختیار کرنے میں بہت سال لگے تھے، تسلیم کروانے کی کوشش تھی۔ سندھی قوم پرستی کے اس اُبھار کا مہاجروں کی امنگوں اور تصورِ دنیا سے یہ غالباً پہلا براہِ راست ٹکراؤ تھا۔ ۱۹۷۷ کے انتخابات دوسرا موقع تھے جب ان دونوں گروہوں کے سیاسی تصوّرات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے؛ مہاجروں نے دائیں بازو کی بنیاد پرست جماعتوں کا

اور سندھیوں نے پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا۔ ۱۹۸۳ اور ۱۹۸۶ کی بحالیِ جمہوریت کی تحریک (MRD) کے دوران بھی دونوں گروہوں کی سیاسی اسکیمیں واضح طور پر مختلف نظر آئیں۔ تاہم مہاجر تشخص کا واضح ترین اظہار ۱۹۸۶ کے کچھ بعد، اور پھر ۱۹۸۷ میں جب ایم کیو ایم نے بلدیاتی انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔

ایم کیو ایم کے اجزائے ترکیبی بنیادی طور پر نچلے درمیانہ طبقے پر مشتمل ہیں؛ اس تنظیم میں کارکنوں کے مدارج بہت واضح اور نظم و ضبط کا کردار نہایت بنیادی ہے؛ یہ تنظیم مقبولیت پسند (populist) ہے اور اپنے لوگوں کو دہشت اور مراعات کے ذریعے قابو میں رکھتی ہے؛ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے مہاجروں کو احساسِ تشخص دیا ہے اور ایسی شاونزم بھی پیدا کی ہے جسے کسی نہ کسی دشمن کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ یہ تمام خصوصیات وہ ہیں جو کسی بھی فاشسٹ تنظیم کی بنیاد ہوتی ہیں۔

اس میں ذرا بھی شک نہیں کیا جا سکتا کہ ایم کیو ایم نے اپنے حامیوں (مہاجروں) کے متعدد حقیقی مسائل اٹھائے ہیں۔ بے روزگاری اور شہری سہولتوں کا فقدان ایسے مسئلے ہیں جن سے نہ صرف کراچی اور حیدرآباد کے مہاجر بلکہ پورے پاکستان کے لوگ دوچار ہیں۔ مگر ایم کیو ایم کے پاس ان مسائل کو قومی یا وسیع تر سطح پر حل کرنے کا تناظر یا اس سے دل چسپی موجود نہیں۔ ہم ایسی کسی چیز کی حمایت نہیں کرتے جس میں لفظ مہاجر نہ آتا ہو۔ اپنے حامیوں کے مسائل کی سمجھ بوجھ بھی ایم کیو ایم کی نہایت محدود بصیرت کی غماز ہے۔ ایسے رہنماؤں نے اس مخصوص ادراک اور مسائل کو وسیع تر پس منظر میں دیکھنے کی اہلیت کے فقدان ہی کے باعث یہ تنظیم ایک ایسی بند گلی میں جا پہنچی ہے جہاں قطعی مایوسانہ اضطراب کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ کار دکھائی نہیں دے رہا۔ چوں کہ ایم کیو ایم مہاجروں کی حالت میں کوئی بہتری نہیں لا سکی ہے، اس لیے اس کے حامیوں میں تھوڑی بہت بددلی پیدا ہوئی ہے۔ اس سیاسی ناکامی کے بعد ایم کیو ایم کے پاس اپنی بقا کا واحد راستا یہ ہے کہ اپنے حامیوں کو شدید دہشت میں مبتلا کر کے اپنا ساتھ دینے پر مجبور کرے۔ ایم کیو ایم کا مسلح بازو، بلیک ٹائیگرز، جو چند سو نوجوانوں پر مشتمل ہے جنھوں نے مہاجر کاز کی خاطر جان دینے کا حلف اٹھا رکھا ہے، اس حکمتِ عملی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ جیسا کہ خدشہ تھا، یہ تنظیم فاشسٹ ثابت ہوئی۔

اس موقعے پر موضوع سے ذرا ہٹ کر پاکستان کے مجموعی تناظر میں کراچی شہر کی اہمیت کا ذکر کرنا اور یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ شہر ایم کیو ایم کے منصوبے میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔ کراچی کی آبادی پورے ملک کی آبادی کا دسواں حصّہ ہے، مگر ملک کا ایک تہائی معاشی اور صنعتی سرمایہ یہاں لگا ہوا ہے۔ ایم کیو ایم اس بات کا پورا احساس رکھتی ہے اور سودے بازی میں اس کی پوزیشن مضبوط ہے۔ کراچی کو بقیہ سندھ سے الگ کرنے کا سوال بھی ایم کیو ایم نے اٹھایا ہے، اور اس علیحدگی کا امکان مہاجروں کے پاکستان کی پانچویں قومیت ہونے کے دعوے کی بنیادی دلیل ہے۔ (چند پنجابی دانشور بھی کراچی کی سندھ سے علیحدگی کی حمایت کرتے رہے ہیں۔)

کراچی نے ہمیشہ سماجی، سیاسی اور تمدنی اعتبار سے باقی پورے ملک، خصوصاً سندھ، سے الگ شناخت قائم رکھی ہے۔ (یہاں اُن سندھی دانشوروں کے موقف سے اتفاق کرنا دشوار ہے جن کا کہنا ہے کہ کراچی ایک سندھی شہر تھا جہاں سندھیوں کو اجنبیوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ تاریخی حقائق اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتے۔) اسے انگریزوں نے ۱۸۳۹ میں فتح کیا جس سے پہلے یہ ایک چھوٹا سا غیر اہم قصبہ تھا، اور ۱۸۴۳ میں حیدر آباد کو فتح کرنے کے بعد ہی پورا سندھ انگریزوں کے قبضے میں آ سکا۔ انگریزوں نے کراچی کو سندھ سے الگ ایک کاسموپولیٹن شہر کے طور پر ترقی دی جہاں پوری برطانوی سلطنت سے لوگ آ کر جمع ہوئے۔ تقسیمِ ہند نے بھی اس رجحان کو برقرار رکھا جب مہاجروں نے اس شہر پر یلغار کی۔ ۱۹۴۸ میں اسے دارالحکومت بنا کر حکومت پاکستان نے اس علیحدگی کو باقاعدہ شکل دے دی۔ کراچی کی نشوونما سندھ سے مختلف طور پر ہوتی رہی، ملک کے تمام صوبوں کے لوگ کھنچ کر اس شہر میں آتے رہے اور صوبہ سندھ میں ضم نہیں ہوئے جس کی سرمایہ دارانہ معیشت پوری طرح ترقی یافتہ نہیں تھی۔

تاہم، گزشتہ برسوں میں حالات میں تبدیلی آتی رہی ہے اب کراچی سندھ سے اس حد تک جُڑ چکا ہے جتنا ماضی میں کبھی نہیں تھا۔ ملک کے دیہی علاقوں میں سرمایہ داری کے رفتہ رفتہ مضبوط ہونے کے باعث پورے ملک کی معیشت ایک تیز رفتار تبدیلی سے گزر رہی ہے۔ زرعی اجناس اور صنعتی پیداوار کی مارکیٹ کے وسیع ہونے کے نتیجے میں سندھ کے دور اُفتادہ خطے بھی اب قریب آ رہے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بننے کے عمل میں ہیں۔ زراعت میں صنعتی طریقوں کے بڑھتے ہوئے استعمال سے پیشوں، قدروں اور سماجی رشتوں میں تبدیلی آ رہی ہے۔ سندھ میں زرعی مشینوں کے استعمال کے باعث جتنے لوگ اب بے روزگار ہو رہے ہیں اتنے پہلے کبھی نہیں ہوتے تھے۔ روزگار کی تلاش میں اب وہ شہروں کی طرف آ رہے ہیں، مہاجر اکثریت کے شہروں میں ان کی موجودگی کو واضح طور پر محسوس کیا جانے لگا ہے۔ تعلیم یافتہ اور پیشہ ور سندھی اب زیادہ تعداد میں ملازمتوں کے میدان میں داخل ہو رہے ہیں اور سب سے خوشحال شہر کراچی کا رخ کر رہے ہیں۔ اس شہر سے سندھیوں کے معاشی مفادات اس سے پہلے کبھی اس قدر وابستہ نہیں تھے۔ علاوہ ازیں، صوبے میں منتخب حکومت کی موجودگی، اور بدعنوانی کے عام چلن، کے باعث کراچی سے سندھیوں کی مضبوط مالی وابستگی پیدا ہو گئی ہے جہاں انہیں جائیداد، لائسنس، پرمٹ وغیرہ سب رعایتی نرخوں پر مل جاتے ہیں۔ اس طرح کراچی سندھیوں کے لیے رقم فراہم کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے اور یہ رقم دیہی معیشت میں واپس جا کر دوسرے سندھیوں کو بھی فائدہ پہنچا رہی ہے۔ مزید براں، سندھ کے تمام ٹیکسوں کا ۶۵ فیصد حصہ کراچی سے حاصل ہوتا ہے جس کے عوض اسے بہت کم رقم حاصل ہوتی ہے۔

سندھ کی کراچی میں شمولیت (نہ کہ کراچی کی سندھ میں شمولیت) کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ایم کیو ایم کی جانب سے کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے اور ایک مہاجر صوبہ قائم کرنے کا مطالبہ اب بے موقع ہو چکا ہے۔ اس نئی حقیقت کا احساس مہاجروں میں سخت بے چینی پیدا کرے گا کیوں کہ وہ اپنی قوم

پرستی کو کسی زمینی ملکیت کے دعوے سے سہارا نہیں دے سکیں گے۔ یہ بات مستقبل میں ایم کیو ایم کی حکمتِ عملی پر کچھ نہ کچھ اثر ڈال سکتی ہے۔

سندھی قوم پرستی

سندھی قوم پرستی کا ارتقا مہاجر تشخص کے احساس کی طرح ڈرامائی نہیں بلکہ ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔ سندھ کی تاریخ پانچ ہزار سال قدیم بیان کی جاتی ہے، اور یہ خطہ ہمیشہ آزاد اور اپنی منفرد ثقافت کا حامل رہا ہے۔ تشخص کے اس احساس کو اس علاقے میں قائم سماجی اور معاشی نظام نے بے اثر بنائے رکھا۔ قومی تشخص سماجی اور معاشی ارتقا کے زیادہ ترقی یافتہ مدارج میں ایسا اظہار کرتا ہے جب ایک وسیع درمیانہ اور نچلا درمیانہ طبقہ قومی جدوجہد کی تنظیم اور رہنمائی کرنے کے لیے موجود ہو۔ (ویسے جاگیردارانہ قوم پرستی بھی وجود رکھ سکتی ہے، جیسی کہ ماضی میں سندھ میں موجود رہی ہے، مگر یہ عموماً ترقی یافتہ بورژوا قوم پرستی کے مقابلے میں کم منظم اور کم موثر ہوتی ہے۔ قوم پرستی بنیادی طور پر درمیانہ طبقے ہی کا مسئلہ ہوتی ہے۔) چوں کہ یہ طبقہ غیر موجود یا کمزور رہا ہے، اس لیے اسے سندھ کی سیاست پر کبھی غلبہ حاصل نہیں رہا اور اس کا نسبتاً پُرزور سیاسی اظہار ابھی شروع ہی ہو رہا ہے۔

۱۹۴۸ میں کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے خلاف تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ مٹھی بھر سندھی جاگیردار اور دانشور سیاسی اور ریاستی طور پر غالب مہاجروں سے مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھے۔ ۱۹۵۲ میں بنگالیوں کی جانب سے اپنی زبان کو اردو کے مساوی درجہ دلوانے کی کامیاب مہم کے بعد سندھیوں کی طرف سے سندھی کو صوبائی زبان بنانے کا مطالبہ سندھیوں کی امنگوں کو بہتر طور پر تقویت دے سکتا تھا، لیکن ان کا نے حد قلیل نچلا درمیانہ طبقہ اپنے سے کہیں زیادہ زور آور گروہ پر اپنی زبان نافذ کرنے کا حق حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ون یونٹ کے خلاف جدوجہد نے سندھی تشخص کے احساس کو زیادہ وسیع اور واضح شکل دی، جسے بھٹو نے پہچانا اور استعمال کیا۔ یہ طبقہ بھٹو دور ہی میں اتنا طاقت ور ہو سکا کہ اردو بولنے والوں کو چیلنج کر کے سندھی کو صوبے کی سرکاری زبان تسلیم کرانے کی کوشش ــــ گو ناکام کوشش ــــ کر سکے۔

بھٹو نے سندھی شعور کو ٹھوس شکل دینے میں یقیناً اہم ترین کردار ادا کیا، اور بھٹو دور میں سندھیوں کو ایسی ملازمتیں ملیں جن کے ذریعے ان کی مالی وسائل اور اسلام آباد تک رسائی ممکن ہوئی۔ صوبے میں دولت آئی جس سے جدید طبقوں کی تشکیل کا عمل تیز ہوا۔ جو لوگ زرعی حسبِ مراتب کی سب سے نچلی سیڑھی پر تھے، انھیں زمین چھوڑنے کا موقع ملا اور یوں ایک وسیع درمیانہ اور نچلا درمیانہ طبقہ وجود میں آیا۔ ٹھوس سندھی شعور کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں۔ بھٹو کی موت، اور ہمیشہ غدار ٹھہرائے جانے

والے قوم پرستوں کے ساتھ پنجاب اور اس کی فوج کے سلوک نے سندھی قوم پرستی کو مزید مضبوط کیا۔ ۱۹۸۳ کی تحریک ان واقعات کا اہم ترین ردعمل تھی جس کے دوران سندھی قوم پرستی ایسے عروج پر تھی اگرچہ ابھی تک منظم نہ ہو پائی تھی۔ سندھ کے اس ردعمل کا ایک نتیجہ ۱۹۸۵ میں محمد خان جونیجو جیسے بے اثر سندھی کی وزیراعظم کے طور پر نامزدگی کی صورت میں برآمد ہوا۔ جونیجو نے بھی سندھیوں کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ظاہری طور پر وہی انداز اپنایا گیا جو بھٹو نے اپنایا تھا۔ آج سندھی قوم پرستی صوبے کا غالب سیاسی فلسفہ بن چکی ہے اور رفتہ رفتہ زیادہ پختہ ہو رہی ہے۔ البتہ تنظیم اس تحریک کا مسئلہ معلوم ہوتی ہے، اور اس شعور کی نمائندگی کرنے والی کوئی واحد جماعت سامنے نہیں آ سکی ہے۔

ریاست کا کردار

پاکستانی تناظر میں ریاست کے کردار کا جائزہ لیے بغیر قومیتوں کے سوال کو پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کی ضرورت سے زیادہ ترقی یافتہ نوعیت اور ہمہ گیری ہی سے مختلف قومیتی گروہوں کے اختیار کردہ معاشی اور سیاسی راستوں کا تعین ہوتا ہے۔

ریاست ملک میں سب سے زیادہ ملازمتیں فراہم کرتی ہے اور ایسے اداروں کے ذریعے نجی سرمایہ کاری کی سمت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پاکستانی ریاست نے آزادی کے بعد ابتدا ہی سے نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرنے کی بہت کوشش کی، نہ صرف کئی طرح کی رعایتیں، ٹیکس اور محصول میں چھوٹ وغیرہ، سرمایہ داروں کو دی گئیں بلکہ ریاست نے خود صنعتی کارخانے قائم کر کے انہیں رعایتی قیمت پر نجی سرمایہ کاروں کے حوالے کیا۔ ایوب خان کے دور میں بھی ریاست کی جانب سے سرمایہ داروں کو تحفظ اور بونس واؤچر اسکیم کی شکل میں مراعات اور حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ زراعت کے میدان میں کاشتکاری کے جدید طریقوں کو فروغ دینے کی غرض سے ریاست نے انفرااسٹرکچر اور مشینی آلات فراہم کیے۔ اگرچہ اُس دور میں نجی شعبے نے خود کو رفتہ رفتہ مضبوط بنایا، تاہم ریاست اور بیوروکریسی کا عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ لائسنس، پرمٹ، زرمبادلہ کے قواعد و ضوابط، کوٹا وغیرہ ایسے معاملات تھے جن پر ریاست کا کنٹرول تھا اور وہ نجی سرمایہ داری کی سمت اپنی مرضی سے متعین کرنے پر قادر تھی۔

بھٹو دور میں معیشت کے تمام شعبوں پر ریاست کا کنٹرول اور بھی واضح ہو کر اُبھرا، کیوں کہ اس دور میں نیشنلائزیشن کی پالیسی اختیار کی گئی اور معیشت پر سرکاری گرفت زیادہ سخت ہو گئی۔ جمہوری تجربے نے اُن طبقوں کو فائدہ پہنچانے کا ایک کارآمد موقع فراہم کیا جنھوں نے برسرِ اقتدار آنے میں

اس حکومت کی مدد کی تھی، اور اُن کو جو مستقبل میں خطرے کا باعث ہو سکتے تھے، مراعات دے کر اپنے ساتھ ملانے کی بھی گنجائش پیدا کی۔ کارخانوں کے علاوہ بینکوں، انشورنس کمپنیوں، اسکولوں، اسپتالوں وغیرہ کے ریاستی ملکیت بن جانے سے سرکاری شعبہ اتنا وسیع ہو گیا کہ یہ کام آسانی سے کیے جا سکتے تھے۔ سرکاری شعبے کے پھیلنے کی بہت وسیع ہو جانے کی بدولت اُس درمیانہ اور نچلے درمیانہ طبقے کو روزگار فراہم کرنا آسان ہو گیا جو نیا نیا وجود میں آیا تھا، اور حکومت کے لیے سرکاری شعبے کے ممکنہ استعمال کی صلاحیت بہت بڑھ گئی۔

ضیاالحق کے دور میں ڈی نیشنلائزیشن کی کوششوں کے باوجود سرکاری شعبے کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوا۔ فوج اور بیوروکریسی ہی دو ایسے ادارے تھے جن کی طرف سے ضیا کو خطرہ ہو سکتا تھا، لہذا اُنھیں خوش رکھنا اور اُن کی طاقت اور اختیارات کو بڑھانا ضروری اور کارآمد تھا۔ ریاستی ملکیت کے بیشتر اداروں میں حاضر ڈیوٹی اور ریٹائرڈ فوجی افسروں کو پُرکشش ملازمتیں دی گئیں، یا انھیں ضیا کے مشیروں، وزیروں اور بیرونِ ملک متعین سفیروں میں شامل کیا گیا۔ اسلامی نظام کے پردے میں سرکاری سرمائے سے شروع کی جانے والی متعدد اسکیموں کا مقصد دراصل ایسے لوگوں کو ملازمتیں فراہم کرنا تھا جو اسلام اور فوج کی خدمت کر سکیں۔ ۱۹۸۸ کے انتخابات میں صوبہ سندھ اور مرکز میں پیپلز پارٹی کی فتح کے نتیجے میں سرکاری شعبوں میں پارٹی کے حامیوں کی ایک اور بڑی لہر داخل ہوئی، جب کہ پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد کی صوبائی حکومت نے بھی ایسے حامیوں کو وزارتوں وغیرہ سے نوازا۔ پاکستان کے نجی شعبے کی روزگار کے کثیر مواقع پیدا کرنے میں ناکامی کی وجہ سے (جسے بہرحال اُس کی ذمے داری بھی قرار نہیں دیا جا سکتا)، سرکاری شعبہ بڑھتی ہوئی تعداد میں بےروزگاروں کو ملازمتیں فراہم کر رہا ہے اور یوں حکومتوں کے لیے اپنے حامیوں کو انعام دینے کا موثر ذریعہ ہے۔ تاہم اب یہ گنجائش ختم ہوتی جا رہی ہے اور بحران ناگزیر ہو گیا ہے۔

سندھ کے اندرونی علاقوں میں ریاستی اداروں کی موجودگی اَور زیادہ نمایاں ہے کیوں کہ وہاں روزگار کے متبادل ذرائع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سرکاری ملازمت تک رسائی کو پورے ملک کی طرح یہاں بھی ہر فرد کا پیدائشی حق سمجھا جاتا ہے۔ حکومت فی الوقت بےروزگاروں کو ملازمت دینے سے قاصر ہے، مگر اس حقیقت کا احساس بھی سندھی باشندوں کو کوئی دوسرا روزگار تلاش کرنے کے بجائے انتظار کرنے یا سفارش اور رشوت کا آسرا ڈھونڈنے پر اکساتا ہے۔ بڑے شہروں کو چھوڑ کر، جن پر مہاجروں کا غلبہ ہے، سندھ کے اندرونی قصبوں میں بہت کم کارخانے موجود ہیں جو مقامی سندھیوں کو روزگار فراہم کر سکیں۔ علاوہ ازیں، سندھ میں زیادہ تر کارخانوں کے مالک پنجابی ہیں اور انھوں نے اپنے یہاں پنجابی مینیجر، کاریگر اور مزدور بھرتی کیے ہیں۔ اس سے سندھی بےروزگاروں کا مسئلہ اَور سنگین ہو گیا ہے۔ (میں نے کہیں اَور اس نکتے کے حق میں بحث کی ہے کہ پنجاب کی موجودہ خوش حالی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسے اپنی فاضل لیبر فورس کو دوسرے صوبوں میں بھیجنے اور یوں پنجاب میں بےروزگاری کی شدّت کم رکھنے کا موقع حاصل

ہے۔) سندھی سرمایہ دار سوور زراعت سے منسلک ہیں۔ وہ زرعی پیداوار کے طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر رہے ہیں لیکن صنعت کاری کے میدان میں سُست رفتار ہیں۔ اس طرح سندھیوں کے لیے روزگار کے نئے مواقع بہت کم پیدا ہو رہے ہیں جبکہ زراعت میں مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال سے کھیت مزدور زیادہ تعداد میں بے روزگار ہو رہے ہیں۔ اس طرح ریاست پر ان کے انحصار میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

سندھی قوم پرستوں میں طلبا، استاد، ڈاکٹر، پیشہ ور ماہرین وغیرہ شامل ہیں جن کی ایک وسیع تعداد بے روزگار ہے۔ ایک مضبوط بورژوازی کی غیر موجودگی میں، نچلے درمیانہ طبقے کی بے روزگاری کا مسئلہ سندھی قوم پرستی کا محور بن گیا ہے۔ ان کی بیشتر قیادت جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتی ہے، مگر اب اس میں درمیانہ طبقے کے افراد کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ سندھ کے اندرونی علاقوں میں گزشتہ چند برسوں میں اُبھرنے والے نچلے درمیانہ طبقے نے جو دباؤ ڈالا ہے اس کے باعث انہیں بعض ریاستی اداروں (مثلاً پولیس، ضلعی انتظامیہ، فورسٹ ڈپارٹمنٹ، پبلک کارپوریشنوں وغیرہ) میں ملازمتیں حاصل ہوئی ہیں۔ ضیاءالحق کے دور میں بھی، جب اندرونِ سندھ سندھیوں کے مفادات کو فوج کا تحفظ حاصل تھا، جونیجو حکومت ۱۹۸۵ سے ۱۹۸۸ تک کے عرصے میں سندھیوں کو ملازمتیں دینے پر مجبور ہوئی، جس سے سندھ میں قومی حقوق کی تحریک کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ کراچی میں بھی ۱۹۸۷ سے، جب ایم کیو ایم نے بلدیاتی انتخابات جیتے تھے، بلدیاتی اداروں میں مہاجروں کو ملازمتیں زیادہ تعداد میں دی گئیں۔ لیکن چونکہ بے روزگاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس لیے ریاستی اداروں کی ملازمتیں بے روزگاری کے مسئلے کو پوری طرح سے حل نہیں کر سکتیں۔

جوں جوں سندھ کا نچلا درمیانہ طبقہ زمین سے آزاد ہو کر ملازمتوں کی تلاش میں شہروں کا رخ کر رہا ہے، اس کی توقعات ریاست سے اور زیادہ وابستہ ہوتی جا رہی ہیں۔ سندھی بورژوا طبقہ اندرونِ سندھ صنعتوں کے قیام میں سرمایہ کاری نہیں کر رہا ہے، چنانچہ نجی شعبے کو نشوونما پانے میں طویل عرصہ لگے گا، اور کم از کم اُس وقت تک تمام تر انحصار ریاستی شعبے پر رہے گا۔ چونکہ ریاست بڑی تعداد میں ملازمتیں فراہم کرنے سے قاصر ہے، اس لیے بے روزگاروں کی بے اطمینانی اور اشتعال میں اضافہ ہوگا۔ فی الوقت اس معاملے میں ایک الجھاوا ہے ـــ حکومت کو سندھیوں کے ہاتھ میں سمجھا جاتا ہے (اور بہت سے سندھیوں کو اس دورِ حکومت میں ملازمتیں ملی بھی ہیں)، چنانچہ کسی غیر سندھی حکومت کی نسبت اس حکومت کے خلاف اس اشتعال کی شدت کم ہے۔ لیکن بے روزگاری بڑھ رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قوم پرستوں کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا ایک فطری نتیجہ، کم از کم فی الحال، یہ ہے کہ سندھی قوم پرست مسئلے کی جڑ تک پہنچنے کے بجائے اس اشتعال کا رخ مہاجروں اور پنجابیوں ہی کی طرف رکھیں گے۔

تشدد

گزشتہ چند برسوں کے واقعات کی ایک اہم خصوصیت سیاسی مخالفین پر کیے جانے والے تشدد کی نوعیت اور شدت ہے۔ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے ایک دوسرے پر جو ہولناک تشدد کیا، اس کا سندھیوں یا مہاجروں کے قومی حقوق کی جدوجہد سے کوئی تعلق نہیں۔ تشدد کی یہ صورتیں قومی حقوق کی جدوجہد سے الگ وجود رکھتی ہیں اور ایک دبے ہوئے کلچر اور غیر متوازن ترقی کا شاخسانہ ہیں جس سے معاشرے کے تمام حصے یکساں متاثر ہوئے ہیں۔ درحقیقت اس تشدد کی ہولناکی ایک بڑا عنصر ہے جس کے باعث سندھی مہاجر تنازعے کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی، اور ان دونوں گروہوں کے درمیان حقیقی تنازعے کی شدت میں بہت مبالغہ کیا گیا۔

پاکستانی معاشرے میں ہر قسم کے احتجاج اور تنازعے میں تشدد کا عنصر کارفرما رہتا ہے۔ صرف سندھی مہاجر تنازعے پر بس نہیں، جمہوری اداروں تک میں تشدد کی خاصی بڑی مقدار شامل ہو چکی ہے۔ خواہ قومی انتخابات ہوں، طلبا یا ٹریڈ یونینوں کے باہمی اختلافات ہوں یا فرقہ وارانہ تنازعات، حساب چکانے کا واحد طریقہ تشدد ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک جھگڑے مار پیٹ سے، یا بہت ہوا تو چاقو چھری کے استعمال یا پتھراؤ سے، طے ہو جاتے تھے۔ اب کلاشنکوف استعمال کی جاتی ہے۔ ہر قسم کا اسلحہ اور گولا بارود پاکستان بھر میں اتنی فراوانی سے دستیاب ہے کہ اگر کوئی فریق اس کا استعمال نہ کرے تو اسے خاطر میں لانے کے قابل ہی نہیں سمجھا جاتا۔ سیاسی جماعتوں کی اسلحے تک رسائی کے باعث، ان سے وابستہ طلبا تنظیمیں، مزدور یونینیں اور سماجی ادارے بھی مسلح ہو چکے ہیں۔ آج ملک بھر میں (اور خصوصاً کراچی میں) اسلحے کی اتنی افراط ہے کہ جو لوگ سیاسی ذرائع سے ہتھیار حاصل نہ کر سکتے ہوں وہ انہیں آدھے دن کے لیے کرائے پر لے سکتے ہیں ـــــ اور ان کا کرایہ رینٹ اے کار کے کرایوں سے بھی کم ہے۔ مہار اصفہانی نے لکھا ہے:

> پاکستان میں اندرونِ ملک تشدد میں اضافے کا ایک بالواسطہ سبب یہ ہے کہ پاکستان نے افغان مجاہدین کی کارروائیوں کے لیے رہیں اور ان تک اسلحے کی ترسیل کا راستا فراہم کیا۔ ایک طرف کابل انتظامیہ نے اپنے حامی پٹھان قبیلوں کے ذریعے پاکستان میں ہتھیار بھیجے، دوسری طرف افغان مجاہدین کے لیے بھیجے جانے والے اسلحے کا چالیس فیصد حصہ چوری چھپے پاکستان ہی میں رہ گیا۔ پاکستانی فوجی افسروں اور افغان مجاہدین کی بابت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہتھیار پاکستان کے کھلے بازار میں فروخت کیے منشیات کے تاجروں، دائیں

باڑہ کی اسلام پسند جماعتوں اور سرحدی اور دیہی ڈاکوؤں نے کلاشنکوف سے لے کر راکٹ لانچر اور ٹینک شکن میزائل تک حاصل کر لیے۔
(*Pakistan: Dimensions of Insecurity*, p 27)

گزشتہ دہائی میں فوجی تسلط کے زیرِ نگیں پاکستان ایک بربریت زدہ معاشرہ بن چکا ہے۔ نہ صرف سیاسی گھٹن کے باعث دبے ہوئے جذبات نے تشدد کی ہولناک صورت میں اپنا اظہار پایا بلکہ ثقافتی، تدریسی اور سماجی شعبوں میں فوجی جبر کے سبب معاشرے میں تشدد کی لہر پھیل گئی ہے۔ اپنے تسلط کا جواز پیش کرنے اور عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے فوج نے اسلام کو استعمال کیا اور صحت مندانہ اظہار کی تمام صورتوں پر پابندی لگا دی۔ موسیقی، کھیل، فنون، ثقافت، ہر چیز کے لیے قرونِ وسطیٰ کے اسلامی ضابطوں کی مطابقت ضروری ٹھہرائی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ بدعنوانی اور رشوت کی جڑیں معاشرے میں گہری ہوتی گئیں اور ہیروئن اور اسلحے کے تاجروں کو ریاستی حوصلہ افزائی اور تحفظ حاصل ہوا۔ شکایت یا اس کے ازالے کے لیے کوئی پلیٹ فارم میسر نہ تھا، اور ملکی معاملات میں عوام کی شمولیت یا احتساب کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ فوجی وردی کے بہروپ میں طاقت کی حکمرانی اخلاق اور انصاف ہر چیز کی ملک بن بیٹھی۔

اسلام کے نام پر اس جبر کے ساتھ ساتھ زیریں سطح پر ایک اَور متوازی عمل رونما ہو رہا تھا۔ اسمگلنگ (خصوصاً اسلحے اور ہیروئن کی اسمگلنگ اور فروخت) کے علاوہ، مشرقِ وسطیٰ کی آمدنی سے جو دولت پیدا ہو رہی تھی اُس سے شہروں میں ایک ایسے درمیانہ طبقے کو فروغ ملا جس کی اقدار معاشرے کی مروجہ اقدار سے الگ تھیں۔ اس نئی اصرافیت (consumerism) نے، جسے متبادل ذرائع ابلاغ کی بدولت وسیع تر دنیا تک رسائی حاصل تھی، سرکاری سطح پر پیش کیے جانے والے نقطۂ نظر سے الگ ایک اَور منظر نامہ پیش کیا۔ خاص کر بڑے شہروں میں اس تازہ، جدید، مائیکل جیکسن اور سری دیوی وڈیو کلچر نے ایک ایسا نقطۂ نظر پیدا کیا جو سرکاری پروپیگنڈے میں پیش کیے گئے فرسودہ خیالات کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا تھا۔ علاوہ ازیں، شہروں کے پھیلاؤ کا عمل بہت تیزی سے جاری تھا، جس کے باعث پرانی اقدار کو ایک نئی، بالکل مختلف دنیا کا سامنا کرنا پڑا۔ جب مشرقِ وسطیٰ سے پیسے کی آمد میں کمی واقع ہوئی تو اُبھرتے ہوئے درمیانہ طبقے کو داخلوں، ملازمتوں، مہنگائی اور عدمِ تحفظ کے مسائل نے زیادہ شدت سے ستانا شروع کیا۔ بے گانگی کی شکار، بے روزگار نوجوان نسل اسی طبقے اور نئی نسل کی نمائندہ تھی اور اسے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کوئی راستا میسّر نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تضادات کا رخ اندر کی جانب ہو گیا اور اس گھٹن کا اظہار تشدد کی صورت میں ہوا۔ سیاسی جماعتوں میں سے ایم کیو ایم طبقے، مایوسی اور تشدد کے اس شہری مظہر کی سب سے نمایاں علامت ہے۔ (سماجی علوم کے ایک ممتاز ماہر عارف حسن کا خیال ہے کہ شہروں کے پھیلاؤ سے جنم لینے والا یہ تشدد پنجاب کے شہروں میں بھی ظاہر ہو گا۔)

انتخابات اور اس کے بعد

۱۹۸۸ کے انتخابات کے بعد ایک نہایت مسخ شدہ جمہوری عمل کا آغاز ہوا۔ جنرل ضیا کی موت کے بعد سے اب تک فوج کے سیاسی عزائم اور منصوبوں کے بارے میں قیاس آرائی کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ پاکستان میں کسی نہ کسی بہانے سے فوج کے ہاتھوں سویلین سیاسی عمل کے معطل کر دیے جانے کا امکان ہمیشہ نمایاں رہتا ہے، لیکن سویلین حکومتیں فوج سے مفاہمت قائم رکھنے کے لیے جس حد تک جانے کو تیار رہنے لگی ہیں اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ جمہوری تجربہ ابھی کچھ عرصے اَور چلنے دیا جائے۔

سندھ میں انتخابات کے نتائج نے صوبے کی نسلی اور شہری دیہی تقسیم کے بارے میں کسی مغالطے کی گنجائش نہ چھوڑی۔ ایم کیو ایم نے سندھ کے شہری علاقوں میں رہنے والے مہاجروں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کیا اور پیپلز پارٹی نے سندھی اکثریت کے دیہی علاقوں میں سندھی قوم پرستوں اور ضیا حکومت کی باقیات کو واضح شکست دی۔

سندھ میں قوم پرستوں کی انتخابی شکست کی تعبیر غلط اور گمراہ کن طور پر قوم پرستی کے استرداد اور وفاقی نظام کی تائید کی صورت میں کی گئی ہے، اور اس نقطۂ نظر کو پنجاب اور ریاستی اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے بڑھاوا دیا گیا ہے۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی کے سندھی امیدوار اپنے مخالف امیدواروں سے کم قوم پرست نہیں تھے۔ انتخابی مہم کے دوران دونوں فریقوں نے ایک جیسے نعرے لگائے اور سندھ کے لیے خودمختاری کا مطالبہ کیا، دونوں نے بہاریوں کو لانے اور کالاباغ ڈیم تعمیر کرنے کی مخالفت کی۔ پیپلز پارٹی کے امیدواروں کی فتح کا سبب نہ صرف یہ تھا کہ وہ جانے پہچانے قوم پرست تھے بلکہ یہ بھی کہ پارٹی کو وفاقی سطح پر بھی اتنی حمایت حاصل تھی کہ مرکز میں حکومت بنانے کی صورت میں وہ صوبۂ سندھ اور سندھیوں کی محرومیوں کا کچھ نہ کچھ ازالہ کر سکتی تھی۔ قوم پرستوں کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کو دو اعتبار سے اَور بھی فوقیت حاصل تھی۔ بھٹو کی موت سے پیدا ہونے والا جذبۂ انتقام، اور قوم پرست جماعتوں کا انتشار۔ چناں چہ ان انتخابات میں قوم پرستی سندھ میں ایک اہم سیاسی قوت کی حیثیت رکھتی تھی، گو وہ فیصلہ کن انتخابی قوت نہیں تھی۔ مگر، جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا، حالات رفتہ رفتہ تبدیل ہو رہے ہیں۔

ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے درمیان ہونے والا معاہدہ اس تشدد کے شکار صوبے میں امن کے قیام کا حقیقی امکان رکھتا تھا۔ اس معاہدے کی ناکامی کی بڑی ذمے داری پیپلز پارٹی، خصوصاً بے نظیر بھٹو، کے تنگ نظر رویّے پر عائد ہوتی ہے۔ ایم کیو ایم، اور دوسرے پارلیمانی اتحادیوں کے ساتھ کچھ زیادہ افہام و تفہیم کا رویّہ اختیار کرنے سے سندھ کے تناؤ میں کمی واقع ہوتی اور حکومت پر خود بے نظیر کی گرفت بھی زیادہ مضبوط ہو سکتی تھی۔ اپنے اتحادیوں کے ساتھ پیپلز پارٹی کا سلوک واقعی نامناسب تھا۔ دوسری جانب ایم کیو ایم اس اتحاد سے نکل کر متحدہ اپوزیشن کے ساتھ دوسرے اتحاد میں شامل ہوئی، جو اس کی بہت

ی غلطی تھی۔ سندھ میں تشدد کی تاریخ کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے بعد ہونے والے واقعات کی پیش گوئی کی جا سکتی تھی۔

پیپلز پارٹی سے معاہدہ ختم کرنے کے بعد ایم کیو ایم ملک کے سیاسی عمل سے کٹ گئی اور اپنے حامیوں سے بھی اس کا رابطہ نہ رہا اور یہ صورت حال اپوزیشن سے معاہدہ ہو جانے کے بعد بھی قائم رہی۔ نومبر ۱۹۸۹ میں بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کی ناکامی ایم کیو ایم کے لیے سخت مایوسی کا سبب بنی کیوں کہ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ یہ تحریک کامیاب ہو جائے گی۔ دوسری جانب اپوزیشن کی اس تحریک سے سندھ میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت پر مثبت اثر پڑا۔ پیپلز پارٹی میں سخت گیر قوم پرست عناصر کو پارٹی کے ایم کیو ایم کے ساتھ معاہدے پر شدید اعتراض تھا۔ وہ اسے سندھی کاز سے بے وفائی سمجھتے تھے اور ان کی ناخوشی اتنی زیادہ تھی کہ انھوں نے عدم اعتماد کی تحریک میں بے نظیر کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عدم اعتماد کی تحریک غالباً کامیاب ہو جاتی اگر اپوزیشن اور ایم کیو ایم کے معاہدے کا اعلان غلط وقت پر نہ ہوا ہوتا۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ پنجابی اور مہاجر اکٹھے ہو گئے ہیں تو ایسی ناخوشی کی شدت سے قطع نظر، سندھی اُن نسلی گروہوں کا ساتھ سرگرمیں دے سکتے تھے جو سندھی قوم کو نیست و نابود کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ جیسا جو نئی سیاسی صف بندی ہوئی اور قوم پرست عناصر نے مخالفت ترک کر کے بے نظیر کے حق میں ووٹ دیا۔ عدم اعتماد کی تحریک کے ناکام ہونے کے بعد سندھ میں پیپلز پارٹی پہلے سے زیادہ متحد ہو کر ابھری اور اس نے قوم پرست جماعتوں کو خاصی زک پہنچائی کیوں کہ اب اس کا تاثر ایک اصلی سندھی پارٹی کا تھا جو ایم کیو ایم کی سخت مخالف تھی۔

موجودہ صورتِ حال

اس مضمون میں مَیں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ سندھی مہاجر تنازعہ صوبہ سندھ میں بنیادی تضاد بن کر نہیں ہے، اور یہ تنازعہ جو آج تشدد کے محور پر گھوم رہا ہے، بڑی حد تک مصنوعی طور پر پیدا کردہ ہے جس کی بڑی ذمے داری ایم کیو ایم پر عائد ہوتی ہے۔ ایم کیو ایم ایک فاشسٹ تنظیم ہے اور اس کے نزدیک تشدد سندھ کے مہاجروں کو اپنے قابو میں رکھنے کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کے دوسرے گروہوں کی طرح مہاجر بھی روز افزوں معاشی اور سماجی مسائل کا شکار ہیں۔ ایم کیو ایم کو انتخابات میں واضح مقبولیت بھی حاصل ہوئی، اور یہ مہاجروں کی واحد نمائندہ تنظیم ہے کیوں کہ اس نے اس نسلی گروہ کو درپیش مسائل کے لیے آواز اٹھائی۔ اس کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مہاجر سندھ کے چند علاقوں (شہروں اور قصبوں) تک محدود ہیں جس کی وجہ دوسرے گروہوں کی نسبت انھیں منظم کرنا آسان ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ تشخص کے بحران میں بھی مستقل طور پر مبتلا ہیں۔ اپنی گرفت قائم رکھنے

کے لیے تشدد کے استعمال کا سبب یہ ہے کہ ایم کیو ایم ۱۹۸۷ کے بلدیاتی انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد سے اب تک اپنے حامیوں کے مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کر سکی ہے۔ قومی انتخابات میں اس کی کامیابی سے نئی توقعات پیدا ہوئیں، لیکن منتخب نمائندوں کے کوئی ٹھوس فائدہ حاصل نہ کر پانے کے نتیجے میں سرد ہو گئیں۔ ایم کیو ایم کی قیادت اپنے لاکھوں حامیوں پر اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کو ہر گز تیار نہیں ہے، چناں چہ کبھی پختونوں، کبھی پنجابیوں اور کبھی (جیسے آج کل) سندھیوں کی صورت میں اپنے فرضی دشمن ایجاد کرتی اور اُن کی جانب سے خطرے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ ایم کیو ایم کی سیاست میں تشدد کا عنصر ہمیشہ غالب رہا ہے، اور مزید تشدد کے خوف اور تحفظ کی ضرورت کے احساس نے لوگوں کو اس کی حمایت پر اب تک مجبور کر رکھا ہے۔ (تعلیم یافتہ اور اعلیٰ تربیت یافتہ مہاجر افراد بھی ایم کیو ایم کی پُرتشدد حکمت عملیوں کا جواز یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ اگر ایم کیو ایم نہ ہوتی تو مہاجروں پر اور زیادہ سختیاں کی جاتیں۔)

تاہم یہ تشدد اپنی الگ جدلیات رکھتا ہے۔ محدود پیمانے کا تشدد خواہ سیاسی طور پر سودمند سمجھا جائے، ایک بار اس کے ہاتھ سے نکل جانے پر حکمت عملی تیزی سے تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ سندھ میں تشدد کی لہر نے اپنی ہی ایک دہشت ناک منطق اختیار کر لی ہے اور اب تشدد کرنے والوں کے حامیوں کو اپنی رو میں لے رہی ہے۔ حیدر آباد ستمبر ۱۹۸۸ کے بعد سے معاشی طور پر مفلوج ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے نتائج حیدر آباد اور اس سے ملحق قصبوں میں سب سے زیادہ مہاجر آبادی کو برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ کراچی کو بھی کرفیو اور تشدد کے واقعات کے باعث سخت نقصان اٹھانا پڑا ہے، اور اگرچہ پنجاب کی جانب سرمائے کی منتقلی کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں، اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ (انڈیا ٹوڈے نے ایوانِ صنعت و تجارت کے ایک ترجمان کے حوالے سے لکھا کہ گزشتہ سال قائم ہونے والی ۶۳ نئی ٹیکسٹائل ملوں میں سے صرف دو سندھ میں لگیں۔) لہٰذا مہاجروں کی جماعت کے شروع کیے ہوئے تشدد سے سندھ کے دوسرے گروہوں کے مقابلے میں مہاجر ہی زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یا تو مفاہمت کی صورت میں نکل سکتا ہے یا پھر انارکی کی شکل میں۔ ایم کیو ایم کو اپنا امیج اور سیاسی زاویۂ نظر تبدیل کرنا ہوگا اور حقیقی مسائل سے زیادہ پختگی کے ساتھ نبرد آزما ہونا ہوگا۔ سندھیوں کا قتل مہاجروں کے کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔

مہاجروں کا تصادم اگر کسی نسلی گروہ سے ہے تو پنجابیوں سے ہے۔ چوں کہ سندھی سندھ کی معیشت میں بنیادی اہمیت نہیں رکھتے، اس لیے مہاجروں کو سندھیوں کے اُبھرتے ہوئے اقتصادی چیلنج سے خوف زدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ پنجابیوں کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ ان کے اور مہاجروں کے درمیان نہ صرف سندھ بلکہ پورے پاکستان میں ملازمتوں، داخلوں اور معاشی اور سیاسی اقتدار کے معاملات میں حقیقی مسائل موجود ہیں۔ یہ حقیقت کہ ایم کیو ایم اس حقیقی تنازعے کا سامنا کرنے سے گریز کر رہی ہے، ملکی سیاست میں اس کے اصل کردار کے بارے میں متعدد سوالات کو جنم دیتی ہے۔

سندھی قوم پرست بھی اپنی جدوجہد کے رخ کے بارے میں غلطی پر ہیں، انھیں مہاجروں کے ساتھ مل کر مرکز پر پنجابی غلبے کے خلاف جدوجہد کرنی چاہیے، کیوں کہ اپنے بل پر وہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ سندھی قوم پرستوں کی سب سے بڑی نظری غلطی ان کا مہاجر مخالف ہونا ہے۔ سندھی قوم پرستی کی سیاسی طور پر درست اور سب سے زیادہ سودمند صورت ریاست اور مرکز کے خلاف ان کا مہاجروں سے اتحاد ہے۔ بلاشبہ، موجودہ صورت حال عقل اور منطق کی بالادستی کے لیے سازگار نہیں ہے، کیوں کہ سیاست پر جذبات کی حکمرانی ہے۔ ایم کیو ایم کے احساسِ عدم تحفظ سے پیدا ہونے والے تشدد سے سندھی قوم پرستوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے جو پیپلز پارٹی کے مقابلے میں مقبولیت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اس کے نتائج مرکز میں پیپلز پارٹی کے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں کیوں کہ پارٹی کے کمزور ہونے سے اقتدار پر اس کی گرفت بھی مزید کمزور ہو جائے گی۔ پیپلز پارٹی کو ایک کیچ ٹوئنٹی ٹو (Catch 22) قسم کی صورت حال کا سامنا ہے۔ اگر وہ ایم کیو ایم سے سمجھوتا کر کے موجودہ پُرتشدد سیاست کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کرتی ہے تو پارٹی میں موجود اور اس کے باہر کے سندھی قوم پرست اس سے ناخوش ہو جاتے ہیں۔ ایم کیو ایم کو نظر انداز کرنے یا اس سے ٹکراؤ کا طرزِ عمل اختیار کرتی ہے (جیسا کہ اس نے گزشتہ کچھ عرصے سے اختیار کر رکھا ہے) تو خواہ اسے سندھی قوم پرستوں کی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں، مگر صوبۂ سندھ کو زبردست اقتصادی نقصان پہنچ سکتا ہے جس سے خود اس کے حامی بھی شدید طور پر متاثر ہوں گے۔ مگر فی الوقت پیپلز پارٹی کے کوتاہ اندیش مفادات معاملات کو سلجھانے کے بجائے موخرالذکر طرزِ عمل اختیار کرنے کے حق میں ہیں۔

سندھیوں اور ایم کیو ایم کے مابین ایک بڑا نکتۂ اختلاف ایم کیو ایم کا یہ مطالبہ ہے کہ مہاجروں کو پاکستان کی پانچویں قومیت تسلیم کیا جائے۔ چوں کہ تمام سندھی قوم پرست قومی حقوق کا اور قومی بنیادوں پر صوبے قائم کرنے کا مطالبہ کرتے رہے ہیں، اس لیے مہاجروں کو قومیت مان لینے کا مطلب مہاجر صوبہ قائم کرنے کا مطالبہ ہوگا۔ سندھ کی تقسیم سندھیوں کے مفاد میں نہیں ہے، چناں چہ وہ اس کی مخالفت کریں گے۔ (گو سندھی قوم پرست سرائیکیوں کو پاکستان کی پانچویں قومیت مانتے ہیں اور پنجاب کی زمین کے ایک حصے پر ان کا حق تسلیم کرتے ہیں، لیکن وہ سرائیکی صوبے کے قیام کے لیے سندھ کی زمین کا کوئی حصہ دینے کو ہرگز تیار نہیں۔) دوسری طرف ایم کیو ایم کے وجود کا جواز ہی مہاجر قوم پرستی ہے، اور اگرچہ اس بات کے اشارے موجود ہیں کہ اس کی قیادت رفتہ رفتہ مہاجر قومیت اور مہاجر صوبے کا مطالبہ ترک کر دے گی، تاہم یہ عمل ایم کیو ایم کے اندر بہت سست رفتاری سے رونما ہوگا۔ اُس وقت تک سندھ میں موجودہ تناؤ متواتر چلتا رہے گا۔

چند سوالات ایسے ہیں جنھوں نے صوبے میں 'نظریۂ سازش' پر یقین رکھنے والوں کو ہمہ وقت مصروف رکھا ہے، اور ان سوالات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر گزشتہ صفحات میں پیش کیا گیا بنیادی خیال یہ ہے کہ سندھ میں بنیادی تضاد سندھیوں اور مہاجروں کے درمیان نہیں بلکہ سندھ کے باشندوں

و، پاس کے مرکز (یعنی پنجابیوں) کے درمیان ہے، تو مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ سندھ میں اتنا شدید مہاجر سندھی تنازعہ پیدا کیوں کر ہوا؟ کیا اس کی پشت پر کچھ قوتیں کام کر رہی ہیں، اور کیا یہ تنازعہ ان کے مفاد میں جاتا ہے؟ صوبے میں مہاجر پنجابی یا سندھی پنجابی تنازعہ کیوں موجود نہیں؟

جیسا کہ بہت سے لوگوں کی خواہش ہوگی، دو ریاستی اداروں ـــ فوج اور بیورو کریسی ـــ کو اس صورت حال کا ذمے دار ٹھہرانا بہت آسان ہے، مگر ان میں سے کسی کے ملوث ہونے کا کوئی بین ثبوت نہ ہونے کی صورت میں ان پر براہ راست الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ تاہم جتنی شہادتیں موجود ہیں، اور جو مخصوص رجحانات پیدا ہوئے ہیں، ان کی بنا پر قیاس آرائی کرنا اور مزید سوالات اُٹھانا ضرور ممکن ہے، جو کہ فی الوقت تشنہ جواب ہیں۔

سندھ میں گزشتہ ایک سال کے عرصے میں ایک ہزار سے زیادہ لوگ مارے جا چکے ہیں، لیکن کسی ایک فرد کو بھی سزا نہیں دی گئی۔ گرفتار شدگان کو بارسوخ افراد کی ایما پر فی الفور رہا کر دیا گیا۔ اس سے ان قیاس آرائیوں کو تقویت مل رہی ہے کہ سندھ میں تشدد کے واقعات کسی ایسے طاقتور ادارے کی ایما پر کرائے جا رہے ہیں جسے اس تشدد سے فائدہ پہنچنے کا امکان ہے ـــ یعنی فوج، آئی ایس آئی یا دوسری جمہوریت مخالف قوتیں۔

فوج اب اس پوزیشن میں ہے کہ جمہوریت کے تجربے کو کسی بھی وقت منسوخ کر سکے، اور عوام کے بعض حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ بھی زور پکڑتا جا رہا ہے کہ وہ ملک کا اقتدار سنبھال لے۔ ضیاالحق کے مارشل لا میں فوج کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا تھا، اس لیے اس کی براہ راست حکومت کرنے کی خواہش کو خارج از امکان قرار دینا دشوار ہے۔ اگر جمہوری قوتوں اور اداروں کے خلاف واقعی کوئی سازش کی جا رہی ہے تو اس میں فوج کے بعض حلقوں کے شامل ہونے کا امکان بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ سندھ کے موجودہ بحران سے فائدہ اٹھانے والا دوسرا ممکنہ عنصر بیورو کریٹ ہو سکتے ہیں جو پیپلز پارٹی کی حکومت سے عناد رکھتے ہیں۔ پنجاب کے حکمران حلقوں کو بھی اس صورت حال، خصوصاً کراچی میں ہونے والے تشدد، سے فائدہ پہنچ رہا ہے، کیوں کہ کراچی سے سرمایے کی منتقلی جو یہاں اور پنجاب کے دیگر حصوں کی سمت ہو رہی ہے۔ اگرچہ سندھ کی صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے والے کسی بھی فریق کو براہِ راست ذمے دار ٹھہرانا ممکن نہیں، پھر بھی بہت سے سوالات موجود ہیں۔

(جمہوری دور کے چند مثبت نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ پریس نسبتاً آزاد ہے جس کے باعث ایسے تجزیے شائع ہو سکتے ہیں جن میں نہ صرف حکومت پر، بلکہ کبھی کبھی فوج پر بھی، تنقید کی جاتی ہے۔ سندھ کے تشدد کے تناظر میں کئی مواقع پر فوج کے ملوث ہونے پر بالواسطہ، اشارتاً اور براہ راست اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ کراچی کے انگریزی ماہ ناموں، 'نیوزلائن' اور 'ہیرلڈ'، نے ایسے کئی اشارتی مضامین شائع کیے ہیں۔ حیدر آباد میں تشدد کے ہولناک واقعات میں ایک حاضر ڈیوٹی کرنل کو نام لے کر ملوث ٹھہرایا گیا۔ اسی طرح لاہور کے انگریزی ہفتہ وار 'فرائیڈے ٹائمز' نے اپنے ۱۴ تا ۲۰ جون

۱۹۹۰ کے اداریے میں تحریر کیا یاکستان پیپلز پارٹی کے اس الزام میں تھوڑی بہت صداقت یقیناً معلوم ہوتی ہے کہ سندھ میں اس کی حریف جماعت ایم کیو ایم کو جنرل ضیا کے دور میں آئی ایس آئی کی حمایت حاصل رہی ہے۔)

نتائج

سندھ میں خصوصاً اور ملک میں عموماً انتہائی غیر یقینی حالات کے باعث مستقبل میں کئی امکانات حقیقت بن کر رونما ہو سکتے ہیں۔ سندھ اور اسلام آباد میں سندھی درمیانہ طبقے کی نشوونما سندھی قسم پرستی کی قوتوں کو مضبوط اور پختہ کر سکتی ہے۔ سندھ کی اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ، اور قوم پرستی کے باوجود، اس صوبے کا ملک کے باقی حصوں سے رابطہ مضبوط اور پیچیدہ تر ہوتے چلے جانے کا امکان ہے۔ سندھی قوم پرستی کا علیحدگی پسند رجحان، یہ تمام رومانی اور غیر حقیقی خیالات سمیت، اپنی فطری موت مر جائے گا۔ سندھ کے درمیانہ طبقے کو رفتہ رفتہ اس حقیقت کا احساس ہو گا کہ پنجاب اور کراچی کے ساتھ معاملہ کرنا اس کے مفاد میں ہے اور سندھ کی علیحدگی کی تحریک چلانے کے بجائے استحصالی نسلی گروہوں کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنا زیادہ سودمند ہے۔ مگر پیداواری قوتوں کی نشوونما کی موجودہ سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے اس حکمت عملی سے سندھی درمیانہ طبقہ مہاجر اور پنجابی سرمایہ داروں کے زیردست ہو جائے گا۔ (واضح فرق کے باوجود، پختون مسئلے میں ایک دلچسپ مماثلت موجود ہے جو سندھ کے واقعات کی نوعیت کو سمجھنے میں کچھ مدد کر سکتی ہے۔ پختونوں میں بھی ایک قوم پرست درمیانہ طبقہ موجود تھا جو سخت مرکز مخالف اور پنجابی مخالف تھا جس کے ترجمانوں نے متعدد موقعوں پر پاکستان سے علیحدگی کی بات کی تھی۔ آج یہ طبقہ پختون معاشرے پر بورژوا طبقے کے غلبے، اور پنجابیوں اور مرکز کے ساتھ پختونوں کے اتحاد، سے فائدہ اٹھانے والوں میں سرفہرست ہے۔ اب کوئی پختون مشکل ہی سے ملک سے علیحدگی کی بات کرتا ہے۔ قومی حقوق کو پاکستان کے وفاقی ڈھانچے کے تناظر میں دیکھا جانے لگا ہے اور اب پختون موجودہ وفاق میں رہتے ہوئے اپنے لیے زیادہ بڑا حصہ حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔) دوسری طرف اگر سندھیوں نے سندھ کے اندرونی علاقوں میں بالادستی حاصل کرنی چاہی ـــــ شہروں میں، جو مہاجروں اور پنجابیوں کے قبضے میں ہیں، وہ بالادستی حاصل نہیں کر سکیں گے ـــــ تب انہیں مہاجروں کے ساتھ اتحاد کر کے صوبے اور مرکز میں پنجابیوں کے غلبے کے خلاف جدوجہد کرنی ہو گی۔

اوّل الذکر امکان ـــــ یعنی سندھی قوم پرستی کی مضبوطی کے باوجود باقی ملک کے ساتھ اتحاد کا راستہ اختیار کرنے کا امکان ـــــ صرف اس صورت میں حقیقت پذیر ہو سکتا ہے کہ سندھ اور مرکز میں پیپلز پارٹی کا اقتدار قائم رہے۔ اگر فوج یا غیر سندھی اپوزیشن نے پیپلز پارٹی کی حکومت ختم کرنے میں کامیابی حاصل

کرلی تو دوسرا امکان ـــ جو پہلے امکان کے بالکل برعکس ہے ـــ رو بہ عمل آسکتا ہے۔ اس صورت میں سندھی معاشرے پر بورژوا طبقے کے غلبے کی رفتار سست پڑ جائے گی اور ان حقائق کے پیشِ نظر کہ سندھی اپنے صوبے میں اقلیت میں تبدیل ہو چکے ہیں، معاشی طور پر کمزور ہیں اور ان کو مہاجروں اور پنجابیوں کی طرف سے سخت مسابقت کا سامنا ہے، ایک بہت دور کا امکان یہ بھی ہے کہ دوسرے نسلی گروہوں کے برعکس سندھیوں میں طاقتور درمیانہ طبقہ پیدا ہی نہ ہو سکے اور سندھی، سیاسی اور اقتصادی اکائی کے طور پر، اپنا وجود ہی کھو بیٹھیں۔ یہ سندھی قوم کے نابود ہونے کی ابتدا ہوگی۔ ایسی صورت میں سندھ میں ہونے والی تمام تر معاشی ترقی مہاجروں اور پنجابیوں کے قبضے میں آجائے گی جو صوبے پر اپنی گرفت اور مضبوط کر لیں گے۔ یہ عمل، اگر پیش آیا تو، بہت طویل عرصے میں وقوع پذیر ہوگا، لیکن اگر اس قسم کا رجحان پیدا ہوتا ہے تو اس کے قلیل میعادی اثرات کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے مایوسی کا شکار ہو کر سندھی قوم پرست تشدد کا سہارا لیں گے اور صوبے میں رہنے والے مہاجروں اور پنجابیوں پر حملے کریں گے۔ بلاشبہ یہ امکان سندھ کے باشندوں کے لیے نہایت المناک ہوگا۔

اگر جمہوری عمل جاری رہا تو چند برس کے عرصے میں قوم پرست تحریک میں اعتدال پیدا ہو سکتا ہے اور ہوش مندانہ سیاست کو تقویت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس عرصے میں سندھ کا تقسیم ہونا یا مہاجروں کا اپنے موجودہ حقوق سے زیادہ کوئی حقوق حاصل کرنا خارج از امکان ہے۔ اس کا نتیجہ نسبتاً غیر اہم مسائل پر وسیع تر خون خرابے کی صورت میں نکلے گا جس کے بعد دونوں گروہوں کے مفادات مرکز کی بالادستی کے خلاف ایک ہو سکتے ہیں۔ سیاسی شراکت اور احتساب کے فقدان نے پاکستان میں صرف ایک قسم کے ضابطے کی گنجائش چھوڑی ہے۔ طاقت اور جبر کا پُرتشدد اظہار۔ آج ملک کے تمام نسلی گروہ تاریخ کے سکھائے ہوئے اسی سبق پر عمل پیرا ہیں۔ اگر دوسرے قسم کے ضابطے، مثلاً جمہوریت، کی جڑیں مضبوط ہو پائیں تو شکایات کے ازالے کی دوسری راہیں دریافت کی جا سکتی ہیں۔ جوں جوں سندھی درمیانہ طبقے کا دباؤ بڑھے گا، مرکز کے لیے اسے اقتدار میں زیادہ حصّہ دینا لازم ہو جائے گا، اور پنجاب کو اپنی گرفت اُسی طرح ڈھیلی کرنی ہوگی جس طرح اس نے پختونوں کے معاملے میں کی ہے۔ طویل عرصے میں، زیادہ خود مختاری، اقتدار میں زیادہ شراکت اور زیادہ عملیت پسند اور احتساب کی قائل حکومت کا قیام سندھ کے مسائل کے حل کے لیے بنیادی شرط ہے۔ ان مسائل کا کوئی قلیل میعادی حل نہیں ہے۔

**

مارک ٹلی

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص اجمل کمال

چھوٹے ہتھیار

میں بیک وقت دو ملکوں کا شہری ہوں۔ میں ایک انگریز کی حیثیت سے ہندوستان میں پیدا ہوا، برطانیہ میں تعلیم پائی اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا بڑا حصہ واپس جا کر ہندوستان میں گزارا۔ میں اپنے دونوں ملکوں کے بارے میں بہت حساس ہوں۔ ہندوستان سے میری گہری وابستگی کے باعث بعض برطانوی حلقوں میں میری یہ شہرت قائم ہو گئی ہے کہ میں اس ملک سے ضرورت سے زیادہ ہمدردی رکھتا ہوں، کچھ لوگ تو مجھے ہِیوسے کا بھی طعنہ دیتے ہیں۔ اس طعنے سے یہ المناک حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہم انگریزوں میں نوآبادیاتی روح اب تک پوری طرح ختم نہیں ہوئی ہے۔ مجھے ایسے طرزِ عمل پر کسی معذرت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ میں ہمیشہ اس بات کا قائل رہا ہوں کہ کسی خطے کی خبر نگاری کرنا، جیسے میں برصغیر کے واقعات کی خبر نگاری کرتا رہا ہوں، اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آپ کو اس سے ہمدردی نہ ہو۔ میں اسلحے کی روک تھام کے موضوع پر کچھ ایسے خیالات پیش کرنے کے سلسلے میں بھی کوئی معذرت نہیں کرنا چاہتا جو برصغیر میں پائے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ، جو مغرب میں ذہنوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان خیالات سے واقف ہو کر اس بات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے کہ جنوبی ایشیا کے رہنے والے ہماری (یعنی مغرب کی) پالیسیوں کو کس طرح دیکھتے ہیں۔ اس سے شاید اُن دو موضوعات پر ایک نئے زاویے سے سوچنے کا موقع پیدا ہو جو میرے نزدیک ایک دوسرے سے قریبی طور پر منسلک ہیں — یعنی ایٹمی ہتھیاروں کی روک تھام اور چھوٹے ہتھیاروں کا پھیلاؤ۔

مغرب کے قابلِ تعریف مقاصد، یعنی وہ مقاصد جن سے مجھے ذرا بھی اختلاف نہیں، عموماً ایسے انداز سے پیش کیے جاتے ہیں کہ ترقی پذیر ملکوں میں ان کی بابت شک و شبہ، بلکہ منفی ردِ عمل پیدا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تجارت کے نئے عالمی نظام کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات کے دوران سماجی شرائط [مثلاً مزدوروں کے بارے میں شرائط] شامل کرنے سے ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں ایسے شبہات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ حیرت انگیز نہیں کہ شاید عالمی اقتصادی میدان میں ان کی سب سے فائدہ مند خصوصیت — سستی لیبر — کو بے اثر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسی طرح انسانی حقوق

کے بارے میں ایسی فکرمندی کے اظہار کے ساتھ اقتصادی پابندیاں لگانے کی دھمکیوں سے تیسری دنیا کی حکومتوں کے لیے ایمنسٹی انٹرنیشنل جیسی ملکی یا بین تنظیموں کی تحقیقات کے نتائج کو مغرب کے اقتصادی مفادات کا نتیجہ قرار دے کر رد کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

مغرب کی کوششوں کے اصل محرکات کی بابت یہ شبہات سب سے زیادہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے معاملے میں سامنے آتے ہیں۔ انھیں شبہات کے باعث ترقی پذیر ملک بین الاقوامی ایجنڈے میں چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کا معاملہ شامل کرنے پر اصرار نہیں کرتے۔ ناوابستہ ملکوں کی تحریک (NAM) میں یہ خوف پایا جاتا ہے کہ اگر چھوٹے ہتھیاروں کے معاملے پر زیادہ زور دیا گیا تو ایٹمی طاقتوں کو موقع مل جائے گا کہ دنیا کی توجہ ایٹمی ہتھیاروں سے (جن کے وہ مالک ہیں) دوسری طرف پھیر دیں۔

ایٹمی کلب کے رکن بڑے ممالک دنیا میں ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے بارے میں تشویش محسوس کرنے میں حق بجانب ہیں ــــ خصوصاً جنوبی ایشیا میں، جہاں ہندوستان اور پاکستان دونوں کے پاس ایٹمی دھماکا کرنے کی صلاحیت موجود ہے ــــ لیکن مجھے گمان ہے کہ وہ ان ملکوں کے احساسات کو سمجھنے کی کچھ زیادہ کوشش نہیں کرتے۔ ابھی پچھلے مہینے میں نے ایک اخباری مضمون پڑھا جس کے مصنف کا موقف یہ تھا کہ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہمیشہ بے گناہ لوگوں کے خلاف استعمال کیے گئے ہیں، چنانچہ ایٹمی ہتھیاروں سے محروم ملکوں کا یہ خوف بالکل بجا ہے کہ ایٹمی ہتھیار انھیں کے خلاف استعمال کیے جانے کے لیے ذخیرہ کیے جا رہے ہیں، جیسے جرمنوں نے یہودیوں کے خلاف ہائیڈروجن سائنائیڈ کا استعمال کیا تھا۔ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے چھوٹے ملکوں کو مجبور کرنا بالکل ویسا ہی ہے جیسے جرمنوں نے یہودیوں کو ستارۂ داؤد کی علامت پہننے پر مجبور کیا تھا تاکہ وہ آسانی سے پہچانے جا سکیں۔ یہ سخت الفاظ، جنھیں آپ میں سے بہت سے لوگ بالکل نامناسب قرار دیں گے، ٹائمز آف انڈیا کے ادارتی صفحے پر چھپنے والے ایک مضمون میں لکھے گئے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان جیسے ملکوں میں مغربی موقف کے بارے میں کس قسم کے احساسات پائے جاتے ہیں۔

ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے سلسلے میں ہماری اب تک کوششیں ایک اور مسئلے کی جانب سے ہماری توجہ بالکل ہٹا دیتی ہیں ــــ یعنی چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا مسئلہ۔ مجھے ایسی کوئی شہادت نہیں ملی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ مغرب کو اس مسئلے سے کوئی خاص دل چسپی ہے۔ جنوبی ایشیا کے بہت سے لوگ اس عدم دل چسپی کو اس امر کا ثبوت سمجھتے ہیں کہ مغرب کو بڑے بڑے مسائل پر صرف اُس وقت تشویش محسوس ہوتی ہے جب یا تو اُسے خود نقصان پہنچ رہا ہو یا وہ تیسری دنیا پر کسی معاملے میں فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہو۔ میں خود سے بھی یہ سوال کرتا ہوں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمیں ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے بارے میں اس قدر تشویش ہے اور چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی کوئی خاص پروا نہیں۔

میرے نزدیک اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے خود ہمیں خطرہ محسوس ہوتا ہے جبکہ چھوٹے ہتھیاروں کی پھیلائی ہوئی تباہی یوروپ کے سرحدی علاقوں اور ترقی پذیر ملکوں ـــ خصوصاً افریقا اور جنوبی ایشیا کے ملکوں ـــ تک محدود رہتی ہے۔ بلاشبہ ہم انگریزوں کو شمالی آئرلینڈ میں چھوٹے ہتھیاروں کی فراہمی روکنے کی سخت فکر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے ۷۷ ہلاکت خیز تنازعات میں سے ۶۵ تنازعات ترقی پذیر ملکوں میں پیش آ رہے ہیں۔ جنگ کے ان حالیہ میدانوں میں سپاہیوں اور شہریوں کو ہلاک اور زخمی کرنے والے ہتھیار ایٹمی نہیں بلکہ غیر ایٹمی، چھوٹے ہتھیار ہیں۔ ایٹمی ہتھیاروں کا خطرہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، دوسری جنگِ عظیم میں جاپان کے خلاف استعمال کیے جانے کے بعد سے اس کی حیثیت ایک امکانی (potential) خطرے کی رہی ہے۔ اُس جنگ کے بعد سے اصل (actual) ہلاکت چھوٹے ہتھیاروں کے استعمال سے ہوئی ہے، جن کی ہلاکت خیزی کی تکنیکی صلاحیت مسلسل بڑھتی جا رہی ہے، اور یہ ہلاکت آج بھی جاری ہے۔ اگر ہم انگریزوں کو اپنے ہم وطنوں کے اسی طرح ہلاک ہونے کا خطرہ ہوتا، جیسے کشمیر، سری لنکا، صومالیا، کمبوڈیا اور تیسری دنیا کے متعدد دوسرے ملکوں کے باشندے ہلاک ہو رہے ہیں، تو کیا تب بھی ہم چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے سلسلے میں اتنے ہی بے پروا اور بے عمل رہتے؟ کیا تب بھی ہم جنوبی ایشیا میں مسائل پیدا کرنے والی امریکی پالیسیوں کی اسی شدومد سے حمایت کرتے؟

اس مقام پر مجھے ان ہتھیاروں کی تعریف متعین کر دینی چاہیے جن کے پھیلاؤ پر مجھے اس قدر تشویش ہے۔ ناٹو (NATO) کی وضع کردہ تعریف کی رو سے چھوٹے ہتھیار وہ ہیں جن کا بور ۵۰ ملی میٹر سے کم ہو۔ لیکن اس سے زیادہ موزوں تعریف مجھے ایک ہندوستانی دفاعی ماہر نے بتائی تھی: چھوٹے ہتھیار وہ ہیں جنھیں کوئی شخص اکیلا اٹھا کر چل سکے۔

ان ہتھیاروں کی پھیلائی ہوئی تباہی کا اندازہ کیوں کر کیا جا سکتا ہے؟ حال ہی میں سیو دَ چلڈرن فنڈ (Save the Children Fund) نے تخمینہ لگایا ہے کہ پچھلے دس برسوں میں ہونے والی جنگوں میں ایک کروڑ بچے جسمانی یا نفسیاتی طور پر متاثر ہوئے ہیں، اور پانچ لاکھ بچے ہلاک ہوئے ہیں۔ اس انجمن کا کہنا ہے کہ دولت مند ملکوں کو ان ہتھیاروں کی فراہمی قطعی طور پر روک دینی چاہیے جن کے ذریعے یہ جنگیں ممکن ہوتی ہیں۔ یہ تمام بچے چھوٹے ہتھیاروں سے نہیں ہلاک ہوئے، لیکن ان کی بہت بڑی تعداد یقیناً انھیں ہتھیاروں کا شکار ہوئی ہے۔

آئیے اب جنوبی ایشیا پر نظر ڈالیں۔ سکھ علیحدگی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ہندوستان کے صوبہ پنجاب میں ایک سال کے عرصے میں ۲۴۴۷ شہری ہلاک ہوئے، تقریباً تمام چھوٹے ہتھیاروں سے۔ کشمیر میں بغاوت کے پہلے سال میں کم از کم پندرہ سو لوگ مارے گئے۔ اس بغاوت کے آغاز کے دو سال کے عرصے میں سات ہزار کلاشنکوفیں، ڈیڑھ سو مشین گنیں، پانچ سو راکٹ لانچر، ڈیڑھ ہزار راکٹ گرینیڈ اور کئی ٹن گولا بارود برآمد ہوا۔ سری لنکا کی خانہ جنگی کے ایک سال میں دو ہزار لوگ ہلاک ہوئے۔

حال ہی میں پاکستانی وزیرِ اعظم بے نظیر بھٹو نے اپنے ملک کے سب سے بڑے صنعتی شہر اور واحد بندرگاہ کراچی میں تشدد اور لاقانونیت کی صورتِ حال کو چھوٹے پیمانے کی بغاوت ("mini-insurrection") کی اصطلاح میں بیان کیا ہے۔ ایک پاکستانی جریدے کی رپورٹ کے مطابق کراچی ایسے چھوٹے چھوٹے قبائلی علاقوں میں تقسیم ہو چکا ہے جن پر مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے ٹوٹے ہوئے دہشت گرد ٹولوں کا راج ہے، اور ان کی باہمی رقابتیں بے حد پیچیدہ ہو چکی ہیں اور حکام کے بس میں صرف اتنا رہ گیا ہے کہ شہر بھر میں گھوم پھر کر لاشیں جمع کر لیا کریں۔

اس بات میں کم ہی لوگوں کو شبہ ہوگا کہ ہندوستان اور پاکستان میں تشدد کی ہولناک سطح براہِ راست اُس عمل کا نتیجہ ہے جسے میں امریکا کی طرف سے افغان مجاہدین کو نہایت غیر ذمے دارانہ طور مسلح کرنے کا عمل سمجھتا ہوں؛ اور اس عمل میں امریکا کو سعودی عرب اور برطانیہ کی بھی اعانت حاصل رہی ہے۔ لندن یونیورسٹی کے سنٹر فار ڈیفنس اسٹڈیز کے ڈاکٹر کرس اسمتھ نے ایک مقالہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے پاکستان اور شمالی ہندوستان میں چھوٹے اور ہلکے ہتھیاروں کا پھیلاؤ۔ اس مقالے میں وہ لکھتے ہیں گزشتہ برسوں میں ہونے والی ہولناک ترین بات افغان مجاہدین کو مسلح کرنے کے لیے امریکا کی قائم کی ہوئی اسلحے کی پائپ لائن تھی۔ اس خطے [جنوبی ایشیا] میں آنے والے اسلحے کے سیلاب نے پچھلے دس سال میں امن و امان کی بگڑی ہوئی صورتِ حال پیدا کرنے میں نمایاں ترین حصہ لیا ہے۔ امریکا نے افغانستان میں سوویت یونین کو شکست دینے کا عزم کر رکھا تھا، لیکن ساتھ ہی یہ عزم بھی کر رکھا تھا کہ ویت نام کی غلطی کو دُہرانے، یعنی جنگ میں براہِ راست ملوث ہونے سے گریز کرے گا۔ چنانچہ اس نے پاکستان کو اس جنگ میں اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ امریکا ہتھیار فراہم کرتا تھا اور پاکستان ان ہتھیاروں کی تقسیم کو کنٹرول کرتا تھا۔

اس اسلحے کی مقدار کیا ہے؟ اس سلسلے میں کئی تخمینے لگائے گئے ہیں، جن میں سے کوئی بھی پوری طرح درست نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ افغان مجاہدین کو اسلحے کی فراہمی ایک خفیہ آپریشن تھا۔ لیکن یہ تمام تخمینے مہلک ترین ہتھیاروں کے ایک عظیم سیلاب کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کرس اسمتھ کا خیال ہے کہ ۱۹۸۷ میں یہ مقدار ۶۵ ہزار ٹن سالانہ تک جا پہنچی تھی۔ ایک ہندوستانی دفاعی ماہر، جس نے پاکستان کے توسط سے افغان مجاہدین کو اسلحے کی فراہمی کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے، ان ہتھیاروں کی قیمت کا تخمینہ چھ ارب ڈالر لگاتا ہے۔

یہ کس قسم کے ہتھیار تھے؟ چین اور دوسرے ملکوں سے خریدی ہوئی اسالٹ رائفلیں، جنھیں پاکستان بھیجا گیا ـــــ ۱۹۹۱ تک ان کی تعداد، ایک ادارے کے مطابق، چار لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ چین سے خریدے ہوئے دوسرے ہتھیاروں میں بھاری اور ہلکی مشین گنیں، ۱۲۲ ملی میٹر کے لانچر اور زمین سے زمین پر مار کرنے والے راکٹ شامل تھے۔ سام سیون میزائل مصر سے، ۱۲۲ ملی میٹر کی توپیں اسپین سے اور ۲۰ ملی میٹر کی طیارہ شکن توپیں سوئٹزرلینڈ سے خریدی گئیں۔ ہمارے ملک برطانیہ

نے زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل فراہم کیے۔ امریکا نے ان ہتھیاروں کی خریداری کے اخراجات برداشت کرنے اور انہیں پاکستان تک پہنچانے کے آپریشن کی نگرانی کرنے کے علاوہ خود بھی پاکستان کو کچھ مہلک ترین ہتھیار فراہم کیے: کلسٹر بموں والے راکٹ، کیمیائی گرینیڈ اور اسٹنگر میزائل۔ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ افغان جنگ کے دوران ۳۴۰ اسٹنگر میزائل چلائے گئے جن سے ۲۶۹ طیارے گرائے گئے ـــ یعنی کامیابی کی شرح ۷۰ فیصد رہی جبکہ انہیں چلانے والے نشانہ باز پوری طرح تربیت یافتہ بھی نہیں تھے۔

امریکا کو اب اس بات کی بہت فکر ہے کہ حرارت کا پیچھا کرنے والے یہ مہلک ترین اسٹنگر میزائل، جو افغان مجاہدین کو فراہم کیے گئے تھے، کہیں دہشت گردوں کے قبضے میں نہ پہنچ جائیں جو ان کے ذریعے سویلین طیاروں کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ امریکی ان ہتھیاروں کو واپس خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس میں انہیں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ ایک معتبر ذریعے کے مطابق سو اسٹنگر کچھ ملکوں کے ہاتھ فروخت کیے جا چکے ہیں جن میں لیبیا، عراق، ایران اور شمالی کوریا شامل ہیں۔ جہاں جو امریکا کی تشویش سمجھ میں آتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ پاکستانی فوج کے قبضے میں بھی کچھ اسٹنگر میزائل ہیں، جبکہ ان کی خریداری کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔

اسٹنگر میزائلوں کی گمشدگی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجاہدین کو مسلح کرنے کا عمل کس قدر غیر ذمے داری سے انجام دیا گیا۔ امریکا ہتھیاروں کے کنٹرول سے مکمل طور پر دست بردار ہو گیا، اور یہ کنٹرول آئی ایس آئی کے پاس رہا۔ یہ ادارہ حکومت کو بلکہ فوج کو بھی پوری طرح جواب دہ نہیں اور بجائے خود ایک قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ فیصلہ کہ کون سے ہتھیار افغان مجاہدین کے کس گروپ کو دیے جائیں بڑی حد تک آئی ایس آئی کے ہاتھ میں تھا۔ افغانستان کی موجودہ المناک صورت حال کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ گلبدین حکمت یار کو اس کے تناسب سے کہیں زیادہ امریکی ہتھیار دیے گئے۔ اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ آئی ایس آئی نے امریکی ہتھیاروں کی ایک بڑی مقدار ـــ شاید ۴۰ فیصد مقدار ـــ خود اپنے استعمال کے لیے رکھ لی۔ جب تک فوجی ڈکٹیٹر ضیاالحق کا دور رہا، تب تک آئی ایس آئی پر حکومت کا کنٹرول کسی حد تک قائم رہا؛ اس کے بعد سے یہ کنٹرول تقریباً بالکل ختم ہو چکا ہے۔ افغان جنگ کے دوران پاکستان میں امریکی سفیر اور ہتھیاروں کی فراہمی میں نمایاں کردار ادا کرنے والے رابرٹ اوکلے نے پچھلے سال ایک انٹرویو میں کہا: ضیاالحق کے بعد پاکستانی فریق پر کوئی کنٹرول باقی نہیں رہا۔ خصوصاً آئی ایس آئی نہ تو فوج کو جواب دہ ہے نہ وزیراعظم کو اور نہ صدر کو۔ نتیجہ یہ ہے کہ آئی ایس آئی کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں۔ بدعنوانی، منشیات اور بے پناہ دولت نے صورت حال کو بے حد پیچیدہ کر دیا ہے۔

امریکا نے ان ہلاکت خیز ہتھیاروں کو جنوبی ایشیا میں بے لگام چھوڑ دینے کے بعد وقتاً فوقتاً ان کا کنٹرول حاصل کرنے کی تھوڑی بہت کوششیں ضرور کیں لیکن ان میں اسے آئی ایس آئی کی طرف سے

کسی قسم کا تعاون نہیں ملا۔ ۱۹۸۸ میں امریکا نے پاکستان میں اسلحے کے ڈھیر کا معائنہ کرنے پر اصرار کیا۔ جلد ہی بعد اسلام آباد اور راولپنڈی کی شہری آبادی کے قریب اوجڑی میں واقع ہتھیاروں کے ڈھیر میں زبردست آگ بھڑک اٹھی۔ اس آگ سے ہونے والے دھماکوں میں سیکڑوں لوگ ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ پاکستانی ایرفورس کے ایک ریٹائرڈ ایرمارشل نے لکھا ہے اوجڑی، حکام کے دعووں کے برخلاف، ہتھیاروں کی سپلائی کا کوئی معمولی ٹرانزٹ ڈپو نہیں تھا۔ آتش زدگی اور دھماکوں کے بعد، بم ڈسپوزل اسکواڈ نے تیس ہزار ایم بی آر ایل، سام میزائل، آر پی جی، ۱۵۵ اور ۱۲۲ ملی میٹر کے شیل، اور مختلف اقسام کے بم جمع کیے۔ ان کی پانچ گنی تعداد آگ اور دھماکوں میں تباہ ہو چکی تھی۔ ممکن ہے یہ تخمینہ ذرا عجلت میں لگایا گیا ہو، لیکن اس سے اوجڑی کے افغان ہتھیاروں کے ایک نہایت اہم ذخیرہ ہونے کی تصدیق ضرور ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ آگ دانستہ لگائی گئی تھی تاکہ امریکیوں کو معلوم نہ ہو سکے کہ ان کے دیے ہوئے ہتھیاروں کا کیا ہوا۔

لیکن ہمیں اپنی رائے میں توازن برقرار رکھنا چاہیے۔ جنوبی ایشیا میں عدم استحکام پیدا کرنے کا پورا الزام امریکا کی طرف سے افغان مجاہدین کو ہتھیاروں کی فراہمی پر نہیں رکھا جا سکتا۔ ہندوستان اور پاکستان بھی اس سلسلے میں یقیناً قصوروار ہیں۔ اول تو ان دونوں ملکوں نے ایسے سیاسی مسائل پیدا کیے جن سے مقامی عدم استحکام پیدا ہوا اور ایسے گروپوں نے جنم لیا جنھوں نے ان ہتھیاروں کو استعمال کیا۔ ہندوستان میں اب یہ بات مسلمہ طور پر مانی جاتی ہے کہ اندرا گاندھی، ان کے بیٹے سنجے، اور اُس وقت کے وزیراعلیٰ پنجاب ذیل سنگھ، تینوں سنت جرنیل سنگھ بھنڈراں والے کو ایک گمنام سکھ مبلغ کے مقام سے ایک اہم سیاسی شخصیت کے رتبے تک پہنچانے کے ذمے دار تھے۔ اندرا گاندھی کو پنجاب میں اپنی حریف سکھ مذہبی جماعت اکالی دل سے مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ یہی معلوم ہوا کہ اکالی دل کے اس سے بھی زیادہ کٹر فرقہ پرست دھڑے کو مستحکم کیا جائے ـــــ اس امر کے باوجود کہ اُن کی کانگریس پارٹی سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ بھنڈراں والے کے گولڈن ٹمپل پر قبضے اور اس پر فوج کی چڑھائی کی صورت میں نکلا۔ خود اندرا گاندھی کو بھی ان کے سکھ محافظوں نے دربار صاحب کی بے حرمتی پر طیش میں آ کر قتل کر دیا۔ اس طرح پنجاب کے مسئلے کی جڑ ایک بے اصول سیاسی حکمتِ عملی تھی جو اندرا گاندھی نے اپنی سیاسی حریف جماعت کو زک پہنچانے کے لیے اختیار کی۔

کشمیر کا بھی یہی قصہ ہے۔ وہاں بھی اندرا گاندھی کے اپنے سیاسی حریفوں کو برداشت نہ کر پانے سے بحران پیدا ہوا۔ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کے خاندان کی جماعت نیشنل کانفرنس کی فطری حمایت موجود ہے، اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو معزول کرنے کی مہم چلائی۔ راجیو گاندھی نے فاروق عبداللہ کی مزید تذلیل کرتے ہوئے اصرار کیا کہ وہ کانگریس کے ساتھ سیاسی اتحاد کے معاہدے پر دستخط کریں۔ اس سے کشمیری قوم پرست کے طور پر عبداللہ کا اعتبار خاک میں مل

کیا۔ ہندوستانی نقطۂ نظر سے یہ اعتبار اس خاندان کا سب سے قیمتی سیاسی اثاثہ تھا۔ اس سے جو سیاسی خلا پیدا ہوا اُسے اُن اسلامی جماعتوں نے پُر کیا جو کشمیر کے ہندوستان میں شامل رہنے کے خلاف ہیں۔

کراچی میں ہونے والے تشدد کی بیشتر ذمےداری جنرل ضیاالحق پر عائد ہوتی ہے۔ جنرل نے پیپلز پارٹی کی سیاسی قوت کو توڑنے کی کوشش کی جس کی حمایت سندھی عوام میں مستحکم ہے۔ انھوں نے سندھ کے صدر مقام کراچی میں مہاجر قومی موومنٹ کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جس نے تقسیمِ ہند کے وقت پاکستان آنے والے مہاجروں کے مسائل کے لیے آواز اٹھائی۔ جنرل ضیا نے ایک ایسے موقعے پر سندھی مہاجر تفریق پیدا کرنے والی جماعت کی تشکیل میں مدد دی جب صوبہ سرحد سے بڑی تعداد میں آنے والے پٹھانوں نے اس شہر کی خوش حالی میں زیادہ حصہ طلب کرنے کے باعث مہاجروں اور پٹھانوں کے درمیان تناؤ بڑھ رہا تھا۔ جنگجو پٹھانوں کے پاس امریکا کا فراہم کیا ہوا اسلحہ اور منشیات کی تجارت سے حاصل کردہ دولت تھی جس کے بل پر وہ کراچی کی جرائم کی دنیا کا ایک اہم عنصر بن گئے تھے۔ ایم کیو ایم کے انتشار، پٹھانوں اور پنجابیوں کے باقی تمام گروہوں کے خلاف اتحاد، شیعہ اور سنی جماعتوں کے باہمی کشت و خون اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے والے ڈرگ مافیا اور نام نہاد سماج دشمن عناصر کی سرگرمیوں کے باعث اب کراچی کی صورتِ حال انتہائی پیچیدہ ہو چکی ہے۔ لیکن اس صورتِ حال کا آغاز جنرل ضیا کے اُس اقدام سے ہوا جس کے ذریعے انھوں نے بھٹو خاندان کے خلاف نسلی فرقہ پرستی کا ہتھیار استعمال کیا۔

اگرچہ سری لنکا میں ہونے والے تنازعے کے افغان ہتھیاروں سے تعلق کی کوئی واضح شہادت موجود نہیں، تاہم ان میں سے کچھ ہتھیاروں کے وہاں پہنچ جانے کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مگر اس خطے کے دوسرے تنازعات کی ایک قدرِ مشترک وہاں بھی موجود ہے، یعنی نسلی اور مذہبی نفرتوں کو غیر ذمےداری سے ہوا دینا تاملوں اور سنہالیوں کی خانہ جنگی کا ایک اہم سبب ہے۔ صدر جے وردھنے پہلے سربراہ نہیں تھے جنھوں نے اکثریتی سنہالی گروہ میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے تامل کارڈ استعمال کیا۔ لیکن ۱۹۷۷ میں ایک مضبوط اکثریت کے ساتھ اقتدار میں آ جانے کے بعد، جب وہ آسانی سے مدبرانہ طرزِ عمل اختیار کر سکتے تھے، انھوں نے تامل یونائیٹڈ لبریشن فرنٹ کو، جو تشدد کے خلاف تھا اور انتخابات میں حصہ لے چکا تھا، خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اس اقدام سے تامل ٹائیگرز کو براہِ راست فائدہ پہنچا جو یقینی طور پر تشدد پر عمل پیرا ہیں اور اپنے جغرافیائی علاقے کے سری لنکا سے علیحدہ ہونے سے پہلے انتخابات میں شریک ہونے کے قائل نہیں۔

جنوبی ایشیائی ملکوں کے لیڈروں کا سیاسی عزائم میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے شارٹ کٹ استعمال کرنے کا رجحان ہی اس خطے میں عدمِ استحکام پیدا کرنے کے سلسلے میں ان لیڈروں کا واحد قصور نہیں۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں سرحد پار کے تشدد کو ہوا دینے میں یقینی طور پر ملوث رہے ہیں۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان نے خالصتان کی تحریک کی امداد کی تھی اور کشمیر میں بھی اس کی امداد

موجود ہے، اگرچہ اس امداد کی مقدار کے بارے میں ہندوستان کے دعووں کو جوں کا توں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات بھی شک شبے سے بالا ہے کہ مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں کو تربیت دینے میں ہندوستان نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا، اور یہ تربیت اُس وقت سے بہت پہلے سے دی جا رہی تھی جب دونوں ملکوں کے درمیان بھرپور جنگ کا آغاز ہوا اور اس کے نتیجے میں نیا ملک بنگلادیش قائم ہوا۔ پاکستان کا دعویٰ ہے کہ ہندوستانی انٹیلیجنس ایجنسی را کراچی اور سندھ کے دوسرے حصّوں میں سرگرم ہے، اگرچہ پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن نے پچھلے سال اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس دعوے کو کبھی ثابت نہیں کیا گیا ہے۔ پاکستانی وزیرِداخلہ کا بیان یہ تھا کہ مختلف نسلی اور سیاسی فریقوں کے ہندوستان سے روابط کی کافی شہادتیں ریکارڈ پر موجود ہیں۔ سری لنکا کے سلسلے میں بھی عام طور پر مانا جاتا ہے کہ تامل ٹائیگرز کو ابتدائی تربیت اور اسلحے کی فراہمی میں ہندوستان ملوث تھا، جس کے بعد انھوں نے سری لنکا کے شمالی علاقوں پر سے حکومت کا کنٹرول ختم کر دیا۔

پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن نے سرحد پار دہشت گردی کی امداد اور عدم استحکام کے فروغ کے سلسلے میں ایک اَور بھی اہم نکتہ بیان کیا۔ کمیشن کا تبصرہ تھا بیرونی ایجنٹ محض کسی تنازعے کی صورتِ حال کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر معاشرے میں ہم آہنگی موجود ہو تو کسی بھی قسم کی بیرونی مداخلت ایسے حالات پیدا نہیں کر سکتی جس سے مثبتاً معقول کارکردگی رکھنے والی امن و امان قائم رکھنے کی مشینری کے لیے ممکن نہ ہو۔ یہی بات، میرے نزدیک، ہتھیاروں کے سلسلے میں بھی درست ہے۔ جنوبی ایشیا میں ہتھیاروں کی موجودگی عدم استحکام اور تشدد کا سبب نہیں بلکہ اس صورتِ حال کا محض ایک عنصر ہے۔

لیکن یہ عنصر نہایت اہم ہے۔ بےگناہ شہریوں کو کس سطح کے تشدد سے گزرنا پڑے گا، اس کا انحصار بڑی حد تک انھیں ہتھیاروں پر ہوتا ہے۔ ہندوستانی پنجاب میں کلاشنکوف کی آمد کے بعد سے ہلاک ہونے والوں کی سالانہ تعداد ۹۱۰ سے ۲۵۰۰ تک جا پہنچی۔ چند ماہ پہلے کشمیر کے صدرمقام سری نگر میں مَیں رات کے وقت ایک گاڑی میں سابق وزیرِاعلیٰ فاروق عبداللہ کے گھر جا رہا تھا۔ پیراملٹری پولیس کے مورچوں کے سوا سڑکیں بالکل سنسان تھیں۔ ناگن جھیل کے کنارے پر ایک جنگل کے پاس سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک نوجوان کاندھے پر راکٹ لانچر اٹھائے کھڑا دکھائی دیا۔ خوش قسمتی سے ہمیں اس نے نشانہ بنانے کے قابل نہ سمجھا۔ اس قسم کے ہتھیار ہی جو شہری ہنگاموں (civil strife) کو خانہ جنگی (civil war) کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔

سندھ کی پُرتشدد صورتِ حال ۱۹۸۰ کی دہائی کے درمیانی برسوں میں ہولناک حد تک ابتر ہو گئی جب امریکی ہتھیاروں کی سپلائی لائن کے شگاف اس قدر بڑھ گئے کہ بےحد ترقی یافتہ ہتھیار شہر میں کھلے بندوں دستیاب ہونے لگے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد میرا ایک دوست کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملنے گیا۔ اُس نے وائس چانسلر کو نہایت خطرناک دکھائی دینے والے مسلح غنڈوں میں گھرا

پایا۔ میرے دوست کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ لوگ وائس چانسلر کے ہتھیار بند محافظ تھے یا جو بھی سیاسی جماعت اُس وقت یونیورسٹی کو کنٹرول کر رہی تھی اُس کے بھیجے ہوئے تھے۔ خود وائس چانسلر وحشت کے مارے اس موضوع پر بات کرنے سے قاصر تھا۔

یہاں میں ایک بار پھر مشورہ دوں گا کہ ہمیں ایسی رائے قائم کرنے میں احتیاط برتنی چاہیے۔ تشدد، بغاوت اور دہشت گردی کے بارے میں جتنی خبریں ہم دیکھتے، پڑھتے اور سنتے ہیں، ان سے جنوبی ایشیا کے علاقے کے استحکام کے بارے میں ایک حد درجہ منفی تاثر پیدا ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ وی ایس نائپال نے، جو ہندوستان کے نہایت قنوطیت پسند مبصر رہے ہیں، اپنی نئی کتاب *India A Million Mutinies Now* میں ان لاکھوں بغاوتوں میں امید کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ وقتاً فوقتاً میں بہت سے سیانوں کو ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی پیش گوئیاں کرتے سنتا ہوں۔ گیارہ سال پہلے طارق علی نے اپنے پیدائشی وطن کے بارے میں *Can Pakistan Survive?* کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا ذیلی عنوان The Death of a State تھا۔

حقیقت میں ہندوستان خاصا مستحکم معلوم ہوتا ہے۔ دو سال پہلے ہندو مذہبی جنونیوں کے ہاتھوں ایودھیا کی بابری مسجد کی تباہی، اور اس کے بعد پھوٹ پڑنے والے ہندو مسلم فسادات کے بعد بہت سے لوگوں کی یہ رائے تھی کہ اب مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے پُرامن طور پر ساتھ رہنا ناممکن ہو جائے گا، کہ مسلمان ہتھیار اٹھا لیں گے، اور یہ کہ ہندوستان میں اس بار اس قدر شدید فرقہ وارانہ تنازعہ پیدا ہو گا کہ یہ ملک باقی نہیں رہ سکے گا۔ پھر بمبئی میں دھماکے ہوئے اور بڑی تعداد میں ہتھیار برآمد بھی ہوئے۔ لیکن یہ دھماکے مسلمانوں کے کسی خاص جرائم پیشہ گروہ نے کیے تھے، شاید بابری مسجد کی تباہی کا بدلہ لینے کی غرض سے، شاید ملک کے اقتصادی صدر مقام میں انتشار پیدا کر کے حکومت کی نئی اقتصادی اصلاحات کو زک پہنچانے کے مقصد سے۔ ان اصلاحات نے بیرونی زرمبادلہ کی آزادانہ خرید و فروخت کو ممکن بنا کر اُس [illegible] بینکاری کے نظام کی کمر توڑ دی ہے جسے بمبئی کے جرائم پیشہ لوگ چلاتے ہیں۔ جن تنازعات میں ترقی یافتہ چھوٹے ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں وہ ہندوستان کے دو سرحدی علاقوں ـــ کشمیر اور شمال مشرقی ریاستوں ـــ تک محدود ہیں۔ پنجاب میں امن بحال ہو چکا ہے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہندوستان توقع سے کہیں زیادہ مستحکم ہے۔ اس کو ایسے شدید سانحوں سے گزرنا پڑا ہے جو اس وسیع و عریض اور انتہائی متنوع آبادیوں والے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتے تھے ـــ مہاتما گاندھی کا قتل، ۱۹۶۲ کی جنگ میں چین کے ہاتھوں شکست، گولڈن ٹیمپل پر فوجی حملہ، اندرا گاندھی کا قتل اور اس کے فوراً بعد سکھوں کا قتلِ عام، راجیو گاندھی کا قتل، اور حال ہی میں ایودھیا میں مسجد کی تباہی کا واقعہ اور اس کے نتیجے میں بھڑک اٹھنے والے فسادات۔ اس ملک کو صوبہ پنجاب میں دس برس طویل پُرتشدد بدامنی کا سامنا کرنا پڑا ہے اور کشمیر کی بغاوت کا اب تک سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آسام میں اب نسبتاً امن ہے، مگر یہ بات جنوب مشرقی ہندوستان کی دو چھوٹی ریاستوں، منی پور اور ناگالینڈ، کے

بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن ہندوستان تباہ نہیں ہوا۔ یہ کسی بحری جہاز کی طرح ہے جس پر طوفانی لہروں کی یلغار کبھی کبھی اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ لگتا ہے بس ڈوبنے ہی کو ہے، لیکن وہ پھر سیدھا ہو کر تیرنے لگتا ہے۔ چونکہ ہندوستان نے ہر موقعے پر اتنی سخت جانی دکھائی ہے، ہندوستان کے لوگ ان صدمات کے اصل اسباب پر زیادہ غور نہیں کرتے۔ جہاں تک سیاست دانوں اور منتظموں کا تعلق ہے، انہوں نے 'چلنے دو' کا فلسفہ وضع کر لیا ہے، جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

پاکستان کو اس سے بھی زیادہ خطرناک حالات سے، یعنی اپنے مشرقی حصے کی علیحدگی سے، گزرنا پڑا ہے۔ اس کی سیاسی زندگی بھی ہندوستان سے زیادہ متلاطم رہی ہے؛ بے پردہ یا باپردہ فوجی حکمرانی طویل مدتوں تک قائم رہی ہے۔ ایک صوبے، پنجاب، کی بالادستی نے ملک کی ترقی کو سخت غیر متوازن رکھا ہے، جس سے باقی تین صوبوں میں روز بروز کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔ مگر پاکستان قائم رہا ہے اور 'چلنے دو' کے فلسفے کا وہاں بھی خوب دور دورہ ہے۔

کیا میرا یہ تبصرہ میری اسی بات کی نفی نہیں کر دیتا؟ یعنی کیا میرے اس تبصرے کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ چھوٹے ہتھیاروں کا پھیلاؤ جنوبی ایشیا کے استحکام کے لیے کوئی حقیقی خطرہ نہیں ہیں؟ میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں نے اسی طرف سے صورت حال کا ایک متوازن نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ہندوستان یا پاکستان کی ریاستوں کے ٹوٹنے کا کوئی فوری خطرہ نہیں، تاہم چھوٹے ہتھیاروں کے پیدا کیے ہوئے خطرے آخرکار ایسے کسی سانحے کا سبب یقیناً بن سکتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہی خطرہ ہے کہ اس قدر آسانی سے دستیاب ہتھیار دور دور تک پھیل جائیں گے۔ پاکستان میں تو یہ ہتھیار کراچی اور صوبہ سندھ سے باہر پھیل چکے ہیں۔ اب پاکستانی صوبہ پنجاب میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان سخت جھڑپیں ہو رہی ہیں اور ایک دوسرے کی عبادت گاہوں پر مسلح حملے ہونے لگے ہیں۔ پچھلے سال صوبۂ سرحد کے مالاکنڈ نامی علاقے میں ایک مذہبی لیڈر مولانا صوفی محمد نے بیشتر سرکاری عمارتوں اور ایک ایرپورٹ پر قبضہ کر لیا تھا اور دو ججوں اور ایک سرکاری اہلکار کو یرغمال بنا لیا تھا۔ پاکستان میں بی بی سی کے رپورٹر ظفر عباس نے عینی شاہدوں کے حوالے سے بتایا کہ بغاوت کی خبر پھیل جانے پر سیکڑوں افراد پہاڑوں پر سے اُترنے لگے جن میں اکثر نے کالی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں اور پستول اور کاربائن سے لے کر کلاشنکوف (AK 47) رائفلوں تک، ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس تھے۔ نیم فوجی دستوں کی کئی ہزار کی نفری کو علاقے کا کنٹرول واپس لینے میں ایک ہفتے سے زیادہ وقت لگا، اور اس پر بھی انہیں مولانا کا مطالبہ ماننا پڑا کہ علاقے میں پاکستانی قانون کی جگہ اسلامی یا شرعی قانون نافذ کیا جائے۔

پاکستان کے وفاقی وزیر انصاف و قانون نے حال ہی میں کہا کہ غیرقانونی ہتھیاروں نے ہمارے معاشرے کے ہر شعبے کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب حکومت نے وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں ہتھیار لے کر چلنے پر پابندی لگا دی ہے، مگر قومی اسمبلی کے ارکان، جو ہمیشہ ہتھیاروں سے لیس محافظوں

کے گھیرے میں نکلتے ہیں، اس پابندی کو کسی خاطر میں نہیں لاتے۔ میرا خیال ہے اس سلسلے میں بھی چلیے دو کے فلسفے پر عمل کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں یہ خوف پایا جاتا ہے کہ ہتھیار مسلمانوں ـــ خصوصاً نیپال کی ڈھیلی ڈھالی سرحد پر واقع ریاستوں، اترپردیش اور بہار کی وسیع مسلمان برادریوں ـــ کے ہاتھ نہ آ جائیں۔ میں اترپردیش میں نیپال کی سرحد کے آس پاس کے علاقے میں بہت گھوما پھرا ہوں، مجھے مسلمان انتہاپسندوں کی سرگرمی کی کوئی شہادت نہیں ملی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خطرہ موجود نہیں ہے۔ بہار اور اترپردیش دونوں اب بھی ایسی لاقانونیت کے لیے بدنام ہیں اور ان ریاستوں میں عادی مجرموں کے سیاسی پارٹیوں سے روابط کے باعث پولیس کا مورال تباہ ہو چکا ہے۔ اگر نوجوان مسلمانوں نے ہتھیار اٹھا لیے تو پولیس ان پر قابو پانے میں ناکام رہے گی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ دونوں ریاستیں ـــ جنہیں کسی بھی طرح کشمیر یا شمال مشرقی ریاستوں کی طرح سرحدی ریاستیں قرار نہیں دیا جا سکتا ـــ سرکاری سکیورٹی فورسز، بشمول فوج، اور مسلح انتہاپسندوں کا میدانِ جنگ بن جائیں گی۔

ہندوستانی فوج کو ابھی تک عموماً بدعنوانی سے پاک، غیرجانبدار اور موثر سمجھا جاتا ہے۔ فسادزدہ شہروں یا قصبوں میں محض فوج کا سڑکوں پر مارچ بعض اوقات امن قائم کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ لیکن شمال مشرقی ریاستوں اور کشمیر میں فوج کا محض مارچ موثر ثابت نہیں ہوا بلکہ اسے علیحدگی پسندوں سے مقابلے کے لیے براہِ راست ملوث ہونا پڑا۔ اس میں فوج کو سوفیصد کامیابی نہیں ہوئی ہے، اور ایسی ناکامیاں فوج کے مورال کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ شہری انتظامیہ کی مدد کے لیے فوج کے بار بار استعمال سے سپاہیوں کے بدعنوانی میں ملوث ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ دس سال پہلے احمد آباد کے فسادات میں گجرات پولیس اور ہندوستانی فوج دونوں ناکام رہے، اور ایک اَور ریاست کے ایک ممتاز پولیس افسر کو صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے بھیجنا پڑا۔ فوج کی کمان کرنے والے افسر نے التجا کی کہ فوج کے جوانوں کو سڑکوں پر سے واپس بلوانے کی اجازت دی جائے کیوں کہ وہ پولیس کی طرح بدعنوان ہوتے جا رہے ہیں۔ چھوٹے ہتھیاروں کا پھیلاؤ جس قدر بڑھتا جائے گا، ہندوستانی شہروں کی سڑکوں پر فوج زیادہ دکھائی دینے لگے گی، اور زیادہ تعداد میں فوجیوں کے بدعنوانی میں ملوث ہونے کا خطرہ ہو گا۔

جیسا کہ ہیومن رائٹس واچ نامی تنظیم نے نشان دہی کی ہے، کشمیر اور پنجاب کے انتہاپسندوں کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی سنگینی میں چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوا۔ لیکن ساتھ اس تنظیم نے اپنی رپورٹ میں ہندوستانی حکومت کے انسانی حقوق کے ریکارڈ کو بھی ہولناک قرار دیا ہے۔ اگرچہ ہندوستانی فوج پر لگائے گئے اس قسم کے تمام الزامات ثابت نہیں کیے جا سکے ہیں، پھر بھی اس امر کی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ متعدد موقعوں پر ہندوستانی فوج نے سخت بربریت کا مظاہرہ کیا، اور اگر اس بربریت کو جاری رہنے دیا گیا تو یہ فوج کے ڈسپلن کے لیے نہایت خطرناک ہو گا۔

سعاکی کے واقعات حکم عدولی کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان واقعات کو برداشت کر جانے والے سینیئر افسر کسی فوج کے لیے اچھے افسر ثابت نہیں ہو سکتے۔ تاہم یہ بات بھی یاد رکھی جانی چاہیے کہ یہ بربریت اس جانی نقصان کے رد عمل میں ہوتی ہے جو پولیس یا فوج کو اس باعث اٹھانا پڑتا ہے کہ ان کے حریفوں کے پاس ترقی یافتہ ہتھیار موجود ہیں۔

پاکستانی فوج غیر سیاسی فوج نہیں ہے۔ یہ تین موقعوں پر اقتدار پر قبضہ کر چکی ہے۔ جمہوریت کی واپسی کے بعد سے یہ سیاسی اسٹیج پر دکھائی نہیں دیتی لیکن ایک پس پردہ عنصر کے طور پر اب بھی فعال ہے۔ تاہم، سیاسی کردار اختیار کرنے کے ساتھ ملنے والی طاقت اور دیگر فوائد نے اس کو ابھی اتنا بدعنوان نہیں بنایا ہے جتنی بدعنوان فوجیں تیسری دنیا کے متعدد دوسرے ملکوں میں موجود ہیں۔ اس منظم فوج میں ڈسپلن اب بھی باقی ہے۔ پاکستانی فوج اس بات پر بار بار اس لیے کہ جہاں کہیں سیاست داں اور پولیس ناکام ہو جائیں وہاں یہ امن بحال کرنے میں کامیاب رہتی ہے۔ لیکن کراچی میں وہ امن قائم کرنے میں ناکام ہوئی اور اسے واپس بلانا پڑا۔ پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ کراچی کی سڑکوں پر اُن لوگوں نے جو بیں ادوار میں فوج کا مسخر اڑایا جن پر قابو پانے کے لیے فوج کو بھیجا گیا تھا۔ پاکستانی فوج کے مورال کے لیے اس سے زیادہ نقصان دہ بات کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

جوں جوں غیر قانونی ہتھیار پھیلتے جاتے ہیں، نیم فوجی پولیس اور فوج کے لیے بھی ہتھیاروں کی مانگ بڑھتی جاتی ہے۔ کشمیری انتہا پسندوں کی اسلحے کی قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستان نے حال ہی میں ایک لاکھ کلاشنکوفیں اور گولا بارود کے پانچ کروڑ راؤنڈ خریدے ہیں۔ ممتاز صحافی مارٹن وُولاکاٹ نے پچھلے دنوں دنیا کے ملکوں میں فوج کی بڑھتی ہوئی طاقت پر تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: اسلحے کی بین الاقوامی تجارت کے باعث خریدنے اور بیچنے والے ملکوں میں فوج کی انتظامیہ کی اہمیت بڑھ رہی ہے اور ایسی فوجیں جب کنٹرول سے باہر ہو جائیں تو جنگل کے دور کی طرف واپسی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ خطرہ پوری دنیا میں موجود ہے۔ ہندوستان یا پاکستان کی فوجیں ابھی تک کنٹرول سے باہر نہیں ہوئی ہیں، لیکن اندرونِ ملک دہشت گردوں کی اسلحے کی طاقت میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی ڈسپلن کی روایات پر سخت دباؤ پڑ رہا ہے۔ ایک طرف کشمیر اور دوسری طرف سندھ میں ان فوجوں کے بربریت آمیز طرزِ عمل میں اس کی شہادت موجود ہے۔

چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ منشیات بھی ناگزیر طور پر پھیلتی ہیں۔ یہ بات پاکستان کے معاملے میں یقینی طور پر درست ہے۔ پاکستان کا شمال مغربی سرحدی صوبہ اور افغانستان دونوں کی زمین اور موسمی حالات افیون کی کاشت کے لیے انتہائی موزوں ہیں، اور ان دونوں خطوں پر ان کی مرکزی حکومتوں کا کنٹرول مضبوط نہیں رہا ہے۔ یہاں کا قانون قبائلی سرداروں کے تابع ہے۔ افغان مجاہدین کو اپنی سرگرمیوں کے لیے آمدنی کے ذریعے کی تلاش تھی، اور یوں گولڈن کریسنٹ کے اس علاقے نے

منشیات کی پیداوار میں بہت تیزی سے ہندوستان کے مشرق میں واقع گولڈن ٹرائنگل کے برابر اہمیت حاصل کرلی۔ ایک دفاعی مبصر کے الفاظ میں افغانستان کی آدھی زرعی زمین افیون کی فصل سے اور باقی آدھی بارودی سرنگوں سے بھری ہوئی ہے۔ ممتاز پاکستانی صحافی الطاف گوہر کا کہنا ہے کہ مجاہدین کی منشیات کی تجارت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے امریکی انٹیلیجنس نے انہیں مشینی آلات اور بین الاقوامی تاجروں سے تعارف کے سلسلے میں مدد دی تھی۔ ہتھیاروں اور منشیات کی تجارت کا باہمی تعلق افغان سرحد پر منشیات کے اسمگلروں سے پاکستانی سکیورٹی فورسز کی شدید جھڑپوں کی خبروں سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے ایک واقعے کے بعد ۱۴ مشین گنیں، مختلف اقسام کی رائفلیں، ۳۵ راکٹ لانچر، ایک میزائل لانچر اور گولیوں کے چھ ہزار سے زائد راؤنڈ برآمد ہوئے۔ ہندوستان میں امریکا کے فراہم کردہ ان ہتھیاروں کے پھیلاؤ اور منشیات کی تجارت کے درمیان تعلق اس بات سے ثابت ہوا کہ گولڈن ٹمپل پر فوج کے قبضے کے بعد وہاں سے دس کلو گرام ہیروئن بھی برآمد ہوئی۔

ہندوستان میں سرکاری نگرانی میں افیون کی تیاری برطانوی دور سے چلی آرہی ہے۔ پہلے یہ افیون چین بھیجی جایا کرتی تھی؛ اب اسے دواؤں میں استعمال کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ میرے پردادا اترپردیش اور بہار کے سرحد کے قریب واقع غازی پور کے قصبے میں افیون کے کارخانے کے نگراں تھے۔ اس کارخانے سے افیون پہلے بھی لیک ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ آج بھی آپ غازی پور جائیں تو کارخانے کی دیوار پر بیٹھے بندروں کو نشے میں جھومتے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب تک چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ اور منشیات کی تجارت نے اتنا زور نہیں پکڑا تھا، تب تک برطانوی حکومت کو اس سلسلے میں ہندوستانی قوانین کی خلاف ورزیوں پر کوئی خاص تشویش نہیں تھی۔ آج ہندوستان کو گولڈن کریسنٹ میں تیار ہونے والی منشیات کی اسمگلنگ کا ایک بڑا راستہ سمجھا جاتا ہے۔

افغان جنگ سے پہلے پاکستان میں ہیروئن کے نشئی تقریباً ناپید تھے؛ اب وہاں دس لاکھ سے زیادہ رجسٹرڈ افراد ہیروئن کی عادت کا شکار ہیں۔ ہم انگریزوں کو پاکستان میں منشیات کے بڑھتے ہوئے مسئلے پر لازماً فکرمند ہونا چاہیے۔ پچھلے سال برطانوی کسٹم کی پکڑی ہوئی کل ہیروئن میں سے ۴۰ فیصد پاکستان سے اسمگل ہو کر آئی تھی، اور کسٹم والوں کا تخمینہ ہے کہ برطانیہ میں داخل ہونے والی تمام منشیات کا ۹۰ فیصد حصہ وہیں سے آتا ہے۔ چھوٹے ہتھیار بھی، منشیات کی طرح، سرحدوں سے بے نیاز ہوتے ہیں، اس لیے اس بات کا معقول عملی جواز موجود ہے کہ جنوبی ایشیا میں اسلحے کی خطرناک بہتات پر بھی ہمیں تشویش ہونی چاہیے۔ یہ ہتھیار بڑی آسانی سے بین الاقوامی دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔

بموں اور بندوق کی گولیوں سے ہلاک ہونے والے لوگ، منشیات سے تباہ ہو جانے والی زندگیاں، ملکوں کا عدم استحکام، افواج کے مورال کی تباہی، ہمارے اپنے مفادات کو پہنچنے والے نقصانات ـــــ مجھے امید ہے ان سب کے پیشِ نظر آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ امریکا نے افغان مجاہدین کو مسلح کرنے کے

طریقِ کار میں سخت غیرذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کیا، اور جنوبی ایشیا کے دو بڑے ملکوں کے استحکام کو ان ہتھیاروں سے سخت خطرہ لاحق ہے۔ اب جو فوری سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان ہتھیاروں کے سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے جو اب پھیل چکے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس الزام کی تحقیقات ہونی چاہیے کہ افغانستان بھیجے جانے والے ہتھیار غیرقانونی طور پر فروخت کیے گئے، اور اس کے ذمہ دار پائے جانے والے افراد کے خلاف قانونی کارروائی کی جانی چاہیے۔ امریکی تنظیم ہیومن رائٹس واچ نے بھی امریکی اور پاکستانی حکومتوں سے یہ مطالبہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ تنظیم کا خیال ہے کہ ان ہتھیاروں کو واپس حاصل کر کے تباہ کرنے کی موثر کوشش کی جانی چاہیے۔ یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ امریکی حکومت نے صرف اسٹنگر میزائلوں کو واپس حاصل کرنے کے لیے عملی قدم اٹھایا ہے کیوں کہ ان سے خود امریکا کے شہریوں اور ہوائی مسافروں کو خطرہ ہو سکتا ہے۔

اب اس خطّے میں پاکستان کے راستے اسلحے کی ایک نئی لہر، بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ دو لہروں، کے داخل ہونے کا خطرہ ہے۔ ۱۹۹۲ میں کابل میں مجاہدین کے پہلے صدر کی آمد پر نوجوانوں نے کلاشنکوفوں سے اس قدر شدید ہوائی فائرنگ کی تھی کہ میرے کانوں کے پردے پھٹتے پھٹتے بچے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ بہت جلد یہ کلاشنکوفیں ایسا رخ انسانی نشانوں کی طرف کرنے والی ہیں اور مسرت کا یہ سیلاب آنسوؤں میں تبدیل ہونے والا ہے۔ یہ موقع فوراً ہی بعد آپہنچا۔ پشتون، ایرانی، تاجک، ازبیک اور پاکستانی، سب کے سب افغان خانہ جنگی میں اپنے اپنے پسندیدہ گروپ کو اسلحہ فراہم کر رہے ہیں۔ اس اسلحے کا کچھ حصہ ضرور پاکستان واپس پہنچے گا اور افغان پاکستان سرحد کے دونوں جانب موجود ڈرگ مافیا کے مفادات کی حفاظت اور برداشت کے لیے استعمال ہو گا۔ جنوبی ایشیا میں چھوٹے ہتھیاروں کی دوسری لہر سابق سوویت وسطی ایشیا کی سمت سے متوقع ہے جہاں اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور اپنی مارکیٹ کی تلاش میں ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، ان دونوں متوقع خطرات کے سدِباب کے سلسلے میں اب تک کچھ بھی نہیں کیا گیا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یوروپی اتحادی ممالک جنوبی ایشیا میں چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے سلسلے میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کر سکتے۔ جب ہم لیبیا کی جانب سے آئرش ریپبلکن آرمی کو ہتھیاروں کی ترسیل روکنے میں کامیاب نہیں ہوئے تو بھلا دوردراز جنوبی ایشیا میں ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے کہیں زیادہ گمبھیر مسئلے کو حل کرنے کی کیا امید کر سکتے ہیں، خصوصاً جبکہ وہاں دو ملکوں کی خودمختاری کا معاملہ بھی درپیش ہو گا۔ لیکن ہم کم سے کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اس مسئلے کو بین الاقوامی ایجنڈے میں شامل کرنے پر اصرار کریں۔ اگر چھوٹے ہتھیاروں کے مسئلے کو بھی اُسی قدر بین الاقوامی توجہ حاصل ہو جائے جتنی ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے مسئلے کو حاصل ہے تو کچھ اقدامات ایسے ہیں جن پر غور کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ چھوٹے ہتھیاروں کو بھی اقوامِ متحدہ کے روایتی جنگی ہتھیاروں کے رجسٹر میں شامل کیا جائے۔ اس رجسٹر سے بڑے ہتھیاروں کی خفیہ نقل و حمل کا بھی انسداد ممکن نہیں ہوا ہے، اور ممکن ہے چھوٹے ہتھیاروں کے

معاملے میں یہ اس سے بھی کم موثر ثابت ہو، لیکن اس کے ذریعے سے کچھ نہ کچھ کنٹرول ضرور حاصل کیا جا سکے گا۔ ابھی تک تو ہم نے اس مسئلے کی سنگینی اور پھیلاؤ کا تخمینہ لگانے تک کی زحمت نہیں کی ہے۔

سرد جنگ کے خاتمے سے امریکا اور یورپی اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں ان کی قائم مقامی کرنے والے کسی ملک کو ہتھیاروں کی فراہمی کا امکان کم ہو گیا ہے، اس لیے اب غالباً اعلان جنگ کی طرح کی سلجھی کی پائپ لائن قائم نہیں ہو گی۔ اب، جبکہ یہ خطرہ دور ہو گیا ہے کہ کسی طرح کا کنٹرول عائد ہونے سے دشمن عالمی طاقت کی فتح کے امکانات بڑھ جائیں گے، یہ موقع ہے کہ چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے مسئلے پر بھرپور توجہ دی جائے۔

ایک طریقہ ایسا ہے جس سے یورپی ملک انفرادی طور پر اور براہ راست دنیا میں ہتھیاروں کی تعداد کم کرنے میں حصہ لے سکتے ہیں: ایسے کارخانوں میں تیار ہونے والے ہتھیاروں کی پیداوار اور فروخت کم کر کے۔ اگر ـــ اور یہ بہت بڑا اگر ہے ـــ ہتھیار تیار کرنے والے بڑے ملک اپنی پیداوار کم کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو دنیا میں ہتھیاروں کی کم تعداد دستیاب ہو گی۔ گولا بارود کی فروخت کم کرنا اس سے بھی زیادہ موثر طریقہ ثابت ہو سکتا ہے، کیوں کہ اس سے دنیا میں پھیلے ہوئے کچھ ہتھیار بے کار ہو جائیں گے ـــ ظاہر ہے، کلاشنکوف کو کارتوسوں کے بغیر نہیں چلایا جا سکتا۔ لیکن موجودہ اقتصادی ماحول میں، جہاں منافع باقی تمام مقاصد پر حاوی رہتا ہے، اس بات کا امکان بہت کم ہے۔ برطانیہ میں ہتھیار بنانے والی کمپنیاں خریدنے والوں کے سرٹیفکیٹ کی قانونی پابندی کو بڑی آسانی سے بے اثر کر لیتی ہیں۔ امریکا کی نیشنل رائفل ایسوسی ایشن کے دباؤ نے اس ملک کو ایک عظیم اسلحہ بازار بنا رکھا ہے۔ حال ہی میں وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے بیان دیا کہ روایتی ہتھیاروں کی فراہمی امریکی پالیسی کا ایک جائز حصہ ہے۔ اس پالیسی بیان کا مطلب رائٹر نیوز ایجنسی کے خیال میں یہ ہے کہ امریکی اہلکار اور سفارت کار اسلحہ تیار کرنے والی امریکی کمپنیوں کی پیداوار کو سمندر پار ملکوں میں فروخت کرنے میں مدد دینے کے لیے ایک پُرزور مہم شروع کرنے والے ہیں۔ میرے نزدیک مغربی ملکوں کا صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ اگر ہم اسلحہ نہیں بیچیں گے تو کوئی اور بیچ لے گا۔

ابھی تک میں نے جنوبی ایشیا میں پیش آنے والے تنازعات میں کارفرما نسلی اور مذہبی عداوتوں کا جائزہ لیا ہے جو چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے سنگین شکل اختیار کر چکی ہیں۔ لیکن میں اس امکان کا ذکر کیے بغیر اپنی بات پوری نہیں کر سکتا کہ ان تنازعات کی تہہ میں ایک کہیں زیادہ سنگین بحران موجود ہے جسے حل کرنے پر توجہ نہ دی گئی تو جنوبی ایشیا کے ممالک انتشار کے ایک ایسے عظیم سیلاب کی لپیٹ میں آ جائیں گے جس کے سامنے موجودہ تنازعات محض مون سون سے پہلے کی ہلکی بارش معلوم ہوں گے۔ میں اُس صورتِ حال کی بات کر رہا ہوں جو افریقا کے کچھ حصوں میں ظاہر ہو چکی ہے جہاں کثیر آبادی، پانی، خوراک اور ایندھن کی قلت، اور سب سے بڑھ کر بے روزگاری ایسے تشدد کو جنم دے رہی ہے جس کے

سامنے حکومتیں محض انارکی کے بے بس تماشائی بن کر رہ گئی ہیں۔ سرحدیں بے معنی اور دیہات سر ہو چکے ہیں، اور شہر نقلِ مکانی کر کے آنے والوں کی یلغار کے بوجھ تلے دم توڑ رہے ہیں۔ امریکی مصنف رابرٹ کیپلن نے لکھا ہے: مغربی افریقا دنیا بھر کے آبادیاتی (demographic)، ماحولیاتی اور معاشرتی، ہر قسم کے دباؤ کی علامت بن چکا ہے جہاں مجموعہ انارکی ایک حقیقی جنگی خطرہ بن کر ابھر رہی ہے۔ ظاہر ہے، اس صورت حال میں آپ جتنے زیادہ چھوٹے ہتھیار شامل کرتے جائیں گے، یہ اتنی ہی زیادہ خطرناک ہوتی جائے گی۔ کیپلن کے خیال میں یہ ماحولیاتی قلت کا مسئلہ ہے۔ اور اس بحرانی مسئلے پر امریکی ردِ عمل کیا ہے؟ کیپلن نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے: خارجہ پالیسی کے حلقوں میں ذرا ماحول کا یا ختم ہوتے ہوئے قدرتی وسائل کا ذکر تو چھیڑ کر دیکھیے، آپ کو محسوس ہو گا کہ سامنے بوریت اور تشکیک کی ایک پتھریلی دیوار کھڑی ہے۔

جنوبی ایشیا ابھی مغربی افریقا کی اس مذکورہ بالا صورت حال سے کچھ دور ہے، اگرچہ کیپلن نے برصغیر کے سلسلے میں بھی ایسی ہی مایوس کن پیش گوئی کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ پیش گوئی غلط ثابت ہو گی، لیکن انتباہ کے اشارے بہر حال دیکھے جا سکتے ہیں۔ حکومتیں کم موثر ہوتی جا رہی ہیں، تشدد بڑھ رہا ہے، سرحدوں کی، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ہتھیاروں اور منشیات کی نقل و حمل کے سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں رہ گئی، قدرتی ماحول تنزل پذیر ہے، آبادی تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے، اور شہروں کے محفوظ ترین رہائشی علاقوں تک میں کچی آبادیاں پھیلتی جا رہی ہیں۔ اور ہم، مغربی ممالک، کیا کر رہے ہیں؟ ہم سٹیلائٹ ٹیلی ویژن پروگرام نشر کر رہے ہیں جن میں ہماری پُرآسائش زندگی کی جھلکیاں دیکھ دیکھ کر محروم لوگوں کا احساسِ محرومی اَور شدید ہوتا جا رہا ہے؛ ہم جنوبی ایشیا کے ملکوں سے ایسے اقدامات کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ اُن کے ہاں کی ماحولیاتی آلودگی ہمیں تکلیف نہ پہنچائے؛ اور انھیں مغرب جیسا طرزِ زندگی اختیار کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں جو ایندھن کے استعمال کے اعتبار سے بے حد مہنگا ہے۔ جہاں تک جنوبی ایشیا میں چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے مسئلے کا تعلق ہے، جو انسانی حقوق کی ان خلاف ورزیوں کا اصل سبب ہے جن کی بابت ہم بالکل جائز طور پر فکرمند ہیں، اور جن کے باعث ان ملکوں کی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہیں ـــــ یہی وہ مسئلہ ہے جو بظاہر ہمارے ایجنڈے پر وجود نہیں رکھتا۔

**

خصوصی شمارہ

سرائیوو سرائیوو

شمارہ ۱۷ : خزاں ۱۹۹۴

۵۲۶ صفحات   قیمت ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں

کراچی کی صورتِ حال اُس سنگین بحران کی نشان دہی کرتی ہے جس سے پورا پاکستان دوچار ہے، اور جس کی سنگینی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ شہری بدانتظامی، تشدد، لسانی اور نسلی گروہوں کے باہمی تنازعات اور مہلک ہتھیاروں کی فراوانی جیسے عوامل کا الگ الگ جائزہ لینے کے بعد ضروری ہے کہ اس بحران کا پورے ملک کے سماجی اور سیاسی حالات کے تناظر میں تجزیہ کیا جائے۔

اس شمارے کے اہم ترین تجزیاتی مضمون میں، جو آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے، عارف حسن نے ایسے تجزیے اور تحقیق کی بنیاد پر چند نہایت اہم نتائج اخذ کیے ہیں جو شہر اور ملک کے مسائل کو درست پس منظر میں سمجھنے اور ان کے حل کی سمت متعین کرنے میں بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس مضمون کا متن عارف حسن کے ۱۹۸۶ سے ۱۹۹۵ تک لکھے ہوئے مضامین اور ان کے ساتھ کیے گئے انٹرویو کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ ان مضامین کی تفصیل یہ ہے

1 "The Twilight of the Waderas' (*Herald* August 1986),
2 "Karachi's Godfathers' (*Hearld* September 1986)
3 'The Profits of Doom (*Herald*, January 1987)
4 'The MQM Factor' (*Herald* March 1987),
5 ' A Generation Comes of Age (*Herald*, October 1987),
6 'Power and Powerlessness" (*Herald* February 1988),
7 "The MQM An Uncertain Future?" (*Herald*, December 1988),
8 The Grand Compromise" (*Herald* May 1989)
9 "The Sindh Cauldron' (*Herald* June 1989),
10 "The Unresolved Conflict (*Dawn*, 1992),
11 "Karachi and the Global Nature of Urban Violence' (*The Urban Age* USA, Summer 1993),
12 ' Is There a Way Out?" (*Herald*, March 1995)
13 "Agreeing to Disagree", (*Herald*, April 1995),
14 "What is Karachi Really Fighting for?" (*Herald*, September 1995),
15 "The State Structure and the Processes of Socio-Economic Change' (Habitat II NGO Country Report 1995)

کئی برس کے عرصے میں لکھے گئے ان مضامین میں جابجا مختلف اعداد و شمار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ہماری درخواست پر عارف حسن نے، جہاں تک ممکن ہوا، ان اعداد و شمار کو زمانۂ حال کے مطابق کر دیا ہے۔ لیکن بہت سے مقامات پر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان میں اہم ترین حقائق وہ ہیں جو مردم شماری ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں اور نجی یا غیر سرکاری طور پر کی گئی کوئی بھی تحقیق اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ اس تلاش کے دوران یہ بھی انکشاف ہوا کہ شہر سے متعلق بہت سے سرکاری اعداد و شمار، جو چند سال پہلے تک بعض سرکاری محکموں کی لائبریریوں میں موجود تھے، اب دستیاب نہیں ہیں۔

عارف حسن

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین: افضال احمد سید

کراچی کی صورتِ حال ـــــ تناظر اور تجزیہ

۱۹۴۷ کے بعد سے، جب پاکستان وجود میں آیا، اس ملک میں بے حد اہم آبادیاتی (demographic)، معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ یہ تبدیلیاں اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی ہیں کہ انہیں انقلابی تبدیلیاں کہا جا سکتا ہے۔ تاہم، ان تبدیلیوں کو اب تک اداروں کی صورت نہیں دی گئی، بلکہ انہیں سیاسی عمل میں بھی شامل نہیں کیا گیا جو معاشرتی سائنس دانوں کے مطابق کسی معاشرے میں آنے والی تبدیلی کو ادارے کی صورت دینے کی شرطِ اول ہے۔ نتیجتاً، جس انداز میں ہمارے ملک کی تعمیر ہوئی ہے، جس طرح ہماری حکومتیں چلائی جاتی ہیں، ہمارا مالیاتی نظام کام کرتا ہے اور ترقیاتی منصوبوں کو نافذ کیا جاتا ہے، اس میں تبدیل شدہ آبادیاتی، معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی حقائق کی عکاسی نہیں ہوتی۔ ان تبدیل شدہ مگر غیر تسلیم شدہ حقائق کے دباؤ سے، ریاستی قوانین اور ضوابط کے باوجود، حکمرانی کے متوازی، غیر سرکاری نظام وجود میں آ گئے ہیں، ملکی آبادی کے بہت بڑے بڑے حصے سیاسی اور ثقافتی بے گانگی کا شکار ہو گئے ہیں، معاشرتی انتشار پھیل گیا ہے، انتظامیہ اور عدلیہ اپنے کام انجام دینے میں خود کو بے بس محسوس کرنے لگی ہیں، اور ہمارے پیوستہ مفادات رکھنے والے طبقوں کو یقین ہو چلا ہے کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے جہاں جہاں لوٹ کھسوٹ اور ایڈہاک اقدامات کا کلچر پاکستانی زندگی کے ہر پہلو میں سرایت کر گیا ہے۔

پاکستان میں رونما ہونے والی معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں کے دو نمایاں ترین مظاہر ہیں: اول، جاگیرداری نظام کا ریاستی اسٹیبلشمنٹ کے مؤثر آلۂ کار کی حیثیت سے برقرار رہنا، اور دوم، شہروں کا تیزی سے پھیلنا۔

***

جاگیرداری نظام کا زوال

جن علاقوں پر پاکستان کی موجودہ ریاست مشتمل ہے، وہاں انگریزوں کی آمد سے پہلے جاگیرداری نظام موجودہ خطوط پر قائم نہیں تھا۔ برطانوی حکومت نے زرعی زمین کے بڑے قطعات کی موروثی ملکیت کا وسیع نظام قائم کیا، اور اس نے جاگیرداری نظام اور اپنے بنائے ہوئے بیوروکریسی کے ڈھانچے کے درمیان باہمی مفادات پر مبنی قریبی تعلق کی بنیاد رکھی جس کے تحت جاگیردار اور انتظامی اہلکار دونوں مل کر کام کرنے لگے۔

جاگیرداری نظام کی طاقت ور گرفت کا ایک اہم سبب دیہی معاشرے کا ذاتوں اور برادریوں میں بٹا ہوا ہونا بھی تھا۔ مختلف دیہی ذاتوں کے درمیان تعلق نقد لین دین کا نہیں بلکہ مال، اجناس اور محنت کے باہمی تبادلے (barter) کا تھا۔ دیہی آبادی مجموعی طور پر دو گروہوں میں منقسم تھی زراعت پیشہ ذاتیں اور کاریگر ذاتیں۔ دیہی کاریگر صرف زراعت پیشہ لوگوں کی خدمت کے لیے تھے؛ مکان یا زمین کی ملکیت ان کے لیے ممنوع تھی اور وہ اپنے موروثی پیشے کے علاوہ کوئی اَور کام نہیں کر سکتے تھے۔ ہر گاؤں کی زمین ہوتی تھی جس کا انتظام گاؤں کے مقتدر لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ کسی تنازعے کی صورت میں ذاتوں اور برادریوں کے نمائندے اس کا تصفیہ کراتے تھے اور تنازعے کے بڑھ جانے پر جاگیرداری نظام کے سرکردہ افراد مداخلت کرتے تھے۔

آزادی کے وقت پاکستان کو یہی نظام ورثے میں ملا۔ جاگیرداری نظام ان علاقوں میں مندرجہ ذیل کام سرانجام دیتا تھا:

(۱) طبقات اور برادریوں کے نظام کو بحال رکھنا؛

(۲) زرعی پیداوار کو منظم کرنے، اور زراعت کے لیے درکار انفرااسٹرکچر کو قائم رکھنے اور ترقی دینے، میں معاونت کرنا؛

(۳) زرعی پیداوار کی فروخت کو براہِ راست یا بالواسطہ کنٹرول کرنا؛

(۴) ریاستی اداروں کی مدد سے اپنے علاقے میں نظم و ضبط قائم رکھنا؛

(۵) سرکاری محصولات کی وصولی کے لیے حالات سازگار رکھنا، اور

(۶) ریاستی انتظامیہ کو سیاسی عمل یا انتخابات میں مطلوبہ نتائج کی ضمانت فراہم کرنا۔

جاگیرداری نظام یہ تمام کام ماضی میں نہایت موثر طور پر سرانجام دیتا رہا ہے، لیکن ملکی معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث اب اس کا اہل نہیں رہا۔ اور اس کے غیر موثر ہو جانے سے ریاستی ڈھانچا، جس کا یہ ایک بنیادی جز تھا، تیزی سے اپنی طاقت سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ پاکستانی معاشرے میں یہ تبدیلیاں بعض اہم ریاستی اقدامات ہی کے

منطقی نتائج کے طور پر رونما ہوئیں۔ آبپاشی کے نہری نظام کی توسیع، سبز انقلاب (Green Revolution) کی ٹیکنولوجی، زراعت میں مشینوں کے استعمال، سڑکوں اور ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کی فراہمی ــــ ان عناصر نے پاکستان کے دیہی علاقوں کو بنیادی طور پر تبدیل کر دیا۔ ان اقدامات کے نتیجے میں ہونے والی اضافی پیداوار اور بیجوں، کیمیائی کھاد وغیرہ کی نقد خرید و فروخت کی بدولت گاؤں کی سطح پر بارٹر کے نظام کی جگہ نقدی کی معاشیات نے لے لی اور یوں دیہی آبادی کے لوگوں کے لیے معاشرتی اور اقتصادی طور پر اپنے طبقے، ذات اور برادری سے نکل کر ترقی کرنا ممکن ہو گیا، جس سے قبیلے، برادری اور ذات پات کا پرانا نظام ٹوٹ گیا اور خود کفیل گاؤں کا تصور ختم ہو گیا۔ کاریگر ذاتوں کے لوگ گاؤں سے نکل کر شہروں کی طرف آنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے شہروں میں صنعتیں قائم ہونا شروع ہوئیں جنہوں نے دیہات سے شہروں کو نقل مکانی کرنے والوں کو روزگار فراہم کیا۔ اضافی زرعی پیداوار کی فروخت کی ضروریات کے تحت چھوٹے شہروں اور منڈی قصبوں میں توسیع ہوئی۔ ۱۹۷۰ کے عرصے میں زرعی پیداوار کی نقل و حمل کے لیے سوزوکی پک اپ کا استعمال شروع ہوا جو بجائے خود ایک انقلابی پیش رفت تھی۔ اس نے زرعی اجناس کی فروخت کے قدیم طریق کار کو بدل کر رکھ دیا، اور منڈیوں کا محلِ وقوع بھی تبدیل کر دیا۔ منڈیوں کے پھیلنے کی بہ نسبت دور دور واقع ہونے سے دیہی آبادی کے افراد نے بڑے فاصلوں تک سفر کرنا شروع کیا۔

زرعی پیداوار اور نقل و حمل کے نئے ذرائع کو ایک جدید اور موثر سروس سیکٹر درکار تھا، جو جاگیرداری نظام اور ریاست مہیا کرنے کے اہل نہیں تھے۔ چنانچہ یہ ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک غیر رسمی (informal) سروس سیکٹر وجود میں آیا جو ٹریکٹر اور سوزوکی ڈرائیوروں، مکینکوں، کیمیائی کھاد، بیج اور کیڑے مار دوائیں فراہم کرنے والوں، زرعی اجناس کے آڑھتیوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ پرانے دیہی نظام میں خدمت گزار دکاندار اور ہنرمند کاریگر تھے، مگر اب اپنے نئے کاموں کی نوعیت کے باعث شہری معیشت سے زیادہ سے زیادہ وابستہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نئے طبقے کی قوت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۷۲ فیصد کاشتکار نقد، اشیا اور خدمات کی شکل میں ان سے قرض حاصل کرتے ہیں، اور زرعی پیداوار سے ان کا منافع کاشتکاروں کے منافعے کے مقابلے میں تین سے دس گنا تک زیادہ ہوتا ہے۔ نہری آبپاشی کے تحت آنے والے علاقوں کے سروے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۸ فیصد چھوٹے کاشتکار اپنی کھاد، کیڑے مار دواؤں، مشینی آبپاشی اور مشینی کاشت کاری کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مقامی غیر رسمی لائٹ انجینئرنگ انڈسٹری اور کیمیائی انڈسٹری کی مصنوعات پر انحصار کرتے ہیں۔ بدلے ہوئے دیہی نظام میں یہ لوگ، جو پرانے دیہی نظام میں وجود نہیں رکھتے تھے، ایک نئے طاقتور عنصر کے طور پر اُبھر رہے ہیں، گو انھوں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ ابھی پوری طرح نہیں کیا ہے۔

ان تبدیلیوں کے نتیجے میں جو نئے طبقے وجود میں آئے ہیں ان کے پاس کوئی قومی نظریہ اور سیاسی فلسفہ نہیں ہے۔ وہ صرف مادّی فوائد اور معاشی ترقی کے لیے متحرک ہوئے ہیں۔ وہ قومی اور صوبائی

انتخابات میں حصہ نہیں لیتے، مگر لوکل کاونسلوں کے انتخابات میں سرگرم ہیں اور کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اس مقصد کے لیے کوشاں ہیں کہ ضلعی انتظامیہ کا اقتدار ان کے حوالے کر دیا جائے۔

***

عام خیال کے برخلاف، نجاب کا معاشرہ جاگیردارانہ نہیں ہے۔ اس صدی کے آغاز میں انگریزوں نے وسطی پنجاب میں دنیا کا سب سے بڑا آبپاشی کا نظام قائم کیا جس نے لاکھوں ایکڑ بنجر ریگستانی زمینوں کو سرسبز کھیتوں میں تبدیل کر دیا۔ پنجاب کے زیادہ کسان آباد مشرقی حصّے کے کسان حکومت کی ترغیب پر وسطی پنجاب کو منتقل ہوئے، ان کی واحد وفاداری حکومت کے ساتھ تھی۔ اتنی بڑی زرعی برادری کے پیدا ہونے سے ٹرانسپورٹ کا نظام، منڈیاں، آڑھتی، مالیاتی ادارے اور ریونیو کی وصولی کرنے اور سرکاری نظم و ضبط قائم رکھنے والے ادارے وجود میں آئے۔ تعلیمی اداروں کے فروغ کی ذمےداری حکومت نے خود لی۔ اگرچہ برادریوں کے چودھری موجود تھے، مگر لوگوں پر ان کے اقتدار کی نوعیت سندھ کے وڈیروں، سرحد کے ملکوں اور بلوچستان کے سرداروں سے مختلف تھی جو پیداوای ذرائع پر بھی مکمل کنٹرول رکھتے تھے۔

آبپاشی کے اس عظیم نظام کی تعمیر کے لیے مشرقی پنجاب سے انجینئر اور ہنرمند کاریگر بلوائے گئے اور مقامی لوگوں کے لیے تکنیکی تربیت کے مراکز قائم کیے گئے۔ بیس سال کے عرصے میں ایک لاکھ سے زیادہ ہنرمند افراد مہیا ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم پنجاب کے کاریگروں، بالخصوص ویلڈروں اور مستریوں کو ۱۹۲۰ کے عشرے میں ہندوستان بھر میں کام کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

ان حالات کے تحت، اور کسی مضبوط سیاسی پروگرام کی غیرموجودگی میں، یہ فطری عمل تھا کہ پنجاب نے نئے ملک پاکستان کی سول انتظامیہ پر، اور یہاں کے سرکاری اہلکاروں، بیوروکریٹوں اور پولیس افسروں نے چھوٹے صوبوں کی انتظامیہ پر بھی، کنٹرول حاصل کر لیا۔ ۱۹۳۰ کے عشرے میں سکھر بیراج کی تعمیر کے وقت پنجابی ٹھیکےدار، کاریگر اور انتظامی اہلکار سندھ میں بھی داخل ہو چکے تھے اور آبپاشی کے نظام کی نگہداشت کے لیے یہیں رہ گئے تھے۔ بیراج بننے کے بعد پنجاب کے کاشتکاروں کی ایک بڑی تعداد بیراج کے علاقے میں آباد ہوئی تھی۔

۱۹۶۰ کے عشرے میں ایوب خان کے سبز انقلاب کا پنجاب پر بہت اہم اثر پڑا۔ دھان اور گیہوں کی نئی اقسام کی کاشت، ڈھائی ہزار ٹیوب ویلوں کی تنصیب اور زراعت میں مشینوں کے استعمال کی بدولت ترقی کی شرح بڑھ گئی۔ شرح (جو ۱۹۵۰ کے عشرے میں ایک فیصد سے کچھ ہی اوپر تھی) ۱۹۶۰ کے عشرے میں پانچ فیصد تک پہنچی۔

سبز انقلاب کے نتیجے میں زراعت پر بڑے زمینداروں کی اجارہ داری قائم ہوئی، کیوں کہ زرعی

پیداوار میں استعمال ہونے والے اجزا کے لیے قرضے صرف بڑے زمینداروں ہی کو میسر تھے۔ چھوٹے کاشتکاروں کی مالی حالت خراب ہوتی گئی اور انھیں اپنی زمینیں بڑے کاشتکاروں کو فروخت کرنی پڑیں۔ مشینوں کے استعمال کے باعث بے زمین کسانوں اور دیہی بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ زراعت کی اجارہ داری سے بڑے زمینداروں کو بھاری منافع ہوا، اور انھوں نے اس کا خاصا بڑا حصہ شہری معیشت میں لگایا۔ صرف ۶۵-۱۹۶۴ کے سال میں ساڑھے تین ارب روپے سے زیادہ سرمایہ دیہی علاقوں سے شہروں کو منتقل ہوا۔ ان اسباب کی بنا پر لوگوں کو پنجاب کے دیہات سے نکل کر شہروں کا رخ کرنا پڑا۔

لیکن سبز انقلاب کے نتیجے میں پنجاب کی سیاست میں جو تبدیلی واقع ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں ہوئی۔ اس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں

(۱) دیہی علاقوں میں آمدنی میں اضافے کے ساتھ ساتھ پنجاب کے تاجروں اور ہنرمند کاریگروں نے اپنی سرگرمیوں کو وسیع کیا اور مشینی زراعت کی مختلف ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لائٹ انجینیرنگ کی صنعتیں قائم ہوئیں۔ ان صنعتوں کا دائرہ بڑھنے لگا اور رفتہ رفتہ آلات جرّاحی، الیکٹرونکس کی اشیا اور دوسری صارفانہ مصنوعات کے کارخانے وجود میں آئے۔ یہ تمام چھوٹے پیمانے کی صنعتیں حکومت کی جانب سے کسی قسم کی حوصلہ افزائی یا امداد کے بغیر قائم ہوئیں۔

(۲) پاکستانی فوج کی بھرتی میں اضافہ ہوا اور پنجاب کے لوگوں کی بڑی تعداد کے لیے فوج میں گنجائش نکلی۔

(۳) پنجاب سے ہنرمند کاریگروں نے بڑی تعداد میں یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کو نقلِ مکانی کی۔

(۴) پنجاب کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں سندھ منتقل ہوئی۔

***

سندھ کا دیہی معاشرہ ۱۹۶۰ کے عشرے کے وسط سے پہلے تک مکمل طور پر جاگیردارانہ تھا۔ وڈیرے اور جاگیردار تمام زرعی زمینوں کو کنٹرول کرتے تھے۔ پنجاب کے برعکس، سندھ میں خودمختار کسان نہ ہونے کے برابر تھے۔ بڑھئی، حجام، چٹائیاں بنانے والے، چمڑا صاف کرنے والے وغیرہ اپنی خدمات کی اجرت گاؤں کے دوسرے لوگوں سے چاول یا گیہوں کی صورت میں حاصل کرتے تھے۔ کپڑا دیہات میں کھڈیوں پر بُنا جاتا، بیل گاڑیوں پر لاد کر قصبوں تک لایا جاتا اور دوسری اشیا کے بدلے فروخت کیا جاتا۔ جوتے کسی کسی کو میسر تھے اور پینے کا پانی کھلے کنوؤں اور نہروں سے حاصل کیا جاتا تھا۔

زمیندار ہاریوں کی زندگی اور موت پر اختیار رکھتا تھا۔ وہ ان سے اپنی ضرورت کے لیے بیگار لیتا، ان کے پاس صرف اتنی پیداوار رہنے دیتا جس سے وہ صرف بمشکل زندہ رہ سکیں۔ اس کے علاوہ تمام پیداوار ہاریوں سے لے لی جاتی۔ مزاحمت کرنے والوں کو سخت سزائیں ملتیں اور جرمانے بھرنے پڑتے۔

زمینداروں کے علاوہ قبائلی سردار اور مذہبی پیر بھی استحصال میں شریک تھے۔ قبائلی سردار اپنی برادری کے لوگوں سے سالانہ ٹیکس وصول کرتے، اور اس کے عوض ان کے باہمی تنازعوں کا فیصلہ کرتے اور قصوروار فریق کو سزائیں دیتے۔ پیر دیہاتیوں کے توہمات کو ہوا دے کر ان کا استحصال کرتے۔ مرید اپنے پیروں کو باقاعدگی سے نذریں دیتے اور تمام مذہبی اور نجی معاملات میں ان سے مشورہ لیتے۔ بیشتر پیر مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ زمیندار بھی تھے، اور اس طرح ان کے اقتدار کے خلاف آواز اٹھانے کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

دیہی علاقوں کی زندگی کے ہر شعبے پر جاگیرداری نظام کے موثر کنٹرول کی وجہ سے ریاستی انتظامیہ نے خود کو نظم و ضبط قائم کرنے کی ذمےداری سے بری کر رکھا تھا۔ حکومت کے تمام معاملات میں مقامی وڈیروں سے مشورہ اور امداد طلب کی جاتی اور اس کے عوض وڈیروں کی قانون شکنی کو نظرانداز کیا جاتا۔ یہ قانون شکنی زیادہ تر ہاریوں کو بےدخل کرنے، حق شفعہ غصب کر لینے، انھیں سزائیں دینے اور حن انسانی حقوق کی ملک کے آئین میں ضمانت دی گئی تھی ان کی خلاف ورزی کرنے پر مشتمل ہوتی تھی۔ وڈیرا ریاستی انتظامیہ کو علاقے میں جرائم اور شورش نہ ہونے کی ضمانت فراہم کرتا اور یوں مٹھی بھر پولیس ایک پورے ضلعے کو کنٹرول کر سکتی تھی۔ آبپاشی اور نکاس کی نہریں وڈیروں کے مہیا کردہ بیگار کے مزدوروں کی مدد سے چلائی جاتیں۔ سرکاری محکموں کے لیے مقامی مزدوروں کو براہ راست کام دینا ممکن نہیں تھا۔ وڈیرا نہیں چاہتا تھا کہ نقد رقم کے عوض اور دوسروں کے کنٹرول میں کام کرنے سے اس کے ہاریوں کی عادتیں خراب ہوں، اس لیے اکثر اوقات سرکاری محکموں کو ملک کے دوسرے حصّوں سے مزدور منگوانے پڑتے۔

وڈیرا ہاریوں کے ووٹوں کو کنٹرول کرتا اور ریاستی انتظامیہ کو انتخابات میں مطلوبہ نتائج فراہم کرتا۔ دیہی آبادی کے اکثریت میں ہونے کے باعث شہری علاقوں میں مخالفانہ نتائج بےاثر ہو جاتے۔ دیہی علاقوں میں وڈیرے کی مرضی کے خلاف ووٹ دینا ممکن نہیں تھا۔ نظام سے بغاوت کرنے والے کو بےدخل کر دیا جاتا اور اس کے پاس سوائے اس کے کوئی راستا باقی نہ رہتا کہ جنگل میں جا کر ڈاکو بن جائے۔

سندھ میں نیشنل ہائی وے کے سوا کوئی سڑکیں نہیں تھیں اور نقل و حمل کا انحصار بیل گاڑیوں اور اونٹوں کے کاروانوں پر تھا۔ اس طرح شہری منڈیوں تک رسائی کم تھی اور فاضل زرعی پیداوار کے لیے کوئی مارکیٹ نہیں تھی۔ مثال کے طور پر کراچی کے لیے احساس دادو یا لاڑکانہ کی نہ نسبت پنجاب سے حاصل کرنا زیادہ آسان تھا۔ کاٹن جننگ اور دھان چھڑنے کے کام بڑے شہری مراکز میں مشینی طور پر کیے جاتے تھے۔ شہری مصنوعات دیہی منڈیوں تک نہیں پہنچ پاتی تھیں۔ دیہات میں اسکول، اسپتال اور ڈسپنسریاں نہیں تھیں اور ٹیلی کمیونی کیشن کی سہولتیں بہت کم تھیں۔

ان حالات میں سماجی طبقے کا دیہی علاقوں سے اُبھرنا اور شہری معیشت سے تعلق قائم کرنا ناممکن

نہیں تو سخت دشوار تھا۔ اس خلا کو مہاجر اور پنجابی کاروباری طبقوں نے پُر کیا اور وڈیروں اور ریاستی انتظامیہ کے ساتھ مل کر دیہی سندھ کی صورتِ حال کو برقرار رکھنے میں مدد دی۔

ایوب خان کے دور میں کئی نئے تصورات اور ادارے سندھ میں متعارف کرائے گئے: خاندانی منصوبہ بندی، ولیج ایڈ پروگرام، ٹیلی کمیونی کیشن، سڑکوں کی تعمیر، ہینڈ پمپوں کی تنصیب، زرعی ترقیاتی بینک وغیرہ۔ چوں کہ دیہی آبادی کے شعور کو بلند کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی، ان پروگراموں کا جو حصہ جاگیرداروں کے حق میں جاتا تھا اس پر عمل ہوا اور دوسرے حصے رد کر دیے گئے۔ پھر بھی ان پروگراموں کا دیہی معاشرت پر کچھ اثر ضرور پڑا۔ جاگیردار خاندانوں کے لڑکے بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کرنے کراچی، لاہور اور حیدر آباد گئے۔ ہاریوں کو سرکاری محکموں میں کام ملا۔ بہت سے لوگ کراچی کی ملوں میں کام کرنے آئے اور ٹریڈ یونین تحریکوں سے متعارف ہوئے۔ ۱۹۶۵ کی پاک بھارت جنگ نے ٹرانزسٹر انقلاب برپا کیا اور دیہات کے بہت سے لوگ باہر کی دنیا سے آگاہ ہوئے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام اور ذوالفقار علی بھٹو کی ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۱ تک چلائی ہوئی سیاسی تحریک نے سندھ کے دیہی علاقوں میں ایک بڑی تبدیلی کی بنیاد رکھی۔ اب وڈیرے کو باپ اور محافظ کی جگہ ظالم سمجھا جانے لگا۔ ان ظالموں کی بڑی تعداد نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ بھٹو کے اقتدار میں آنے کے بعد سندھ میں اہم ترقیاتی منصوبے شروع کیے گئے اور کسان طبقے کو سہولتیں اور روزگار فراہم ہوا۔ نئے اسکول اور کالج قائم ہوئے۔ دیہی سندھ کے بہت سے طلبا انجینئر اور ڈاکٹر بنے۔ دیہی سندھ کے لوگوں کو روزگار کے مواقع ملے اور دیہی اور شہری علاقوں کے لوگ ایک دوسرے پر اثرانداز ہوئے۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے سندھ کا درمیانہ طبقہ وسیع ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ طاقت حاصل کی۔ یہ تبدیلیاں جاگیرداری نظام کے لیے مہلک تھیں۔

ان وسیع اور اچانک تبدیلیوں کے نتیجے میں تنازعات کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ بھٹو دور میں یہ اختلافات دو عوامل کی وجہ سے دب گئے تھے۔ پہلا یہ کہ ان تبدیلیوں کے طویل مدّتی مضمرات ان سے متاثر ہونے والوں کی پوری طرح سمجھ میں نہیں آئے تھے، اور دوسرا یہ کہ حکومت میں شامل جاگیردار ان تبدیلیوں کو اپنی نگرانی میں پروان چڑھا رہے تھے۔ ۱۹۷۷ میں ضیاالحق کے مارشل لا نافذ کرنے کے بعد سے یہ عوامل کارگر نہیں رہ گئے۔ جولائی میں فوج کے اقتدار پر قبضہ کرنے اور اکتوبر میں اعلان کردہ انتخابات کو ملتوی کرنے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اب وڈیرے ریاستی انتظامیہ کو انتخابات میں مطلوبہ نتائج فراہم کرنے کے اہل نہیں رہے تھے اور، چند ایک کو چھوڑ کر، اپنے ہاریوں کے سیاسی یرغمال بن چکے تھے۔

مارشل لا کے تحت سندھ کے وڈیرے اپنی سیاسی قوت اور ہاریوں پر کنٹرول کھو بیٹھے تھے اور انھیں ریاستی انتظامیہ سے نئے رشتے قائم کرنے کی جستجو تھی۔ مارشل لا سے سندھ کا درمیانہ طبقہ بھی متاثر ہوا تھا کیوں کہ اسے ریاست کی سرپرستی حاصل نہیں رہی تھی۔ ۱۹۶۰ کے عشرے کے وسط میں شروع ہونے والی تبدیلیاں اپنے راستے پر آگے بڑھ رہی تھیں، لیکن سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے

باعث مختلف طبقوں اور انتظامیہ کے درمیان عملی رابطہ مفقود تھا چناں چہ انتظامیہ نے ان تبدیلیوں کو سمونے کے لیے اپنے نظام میں کوئی ترمیم نہ کی۔ عوام کا ریاست سے فاصلہ بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ناکارکردگی، بدعنوانی، بےروزگاری اور لاقانونیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹۸۳ کی بحالیِ جمہوریت کی تحریک اس کشیدگی کا نقطۂ عروج تھی۔ اس تحریک میں جاگیردار اور درمیانہ طبقوں نے مل کر حصّہ لیا، اور جوں جوں تحریک آگے بڑھتی گئی یہ بات ظاہر ہوتی گئی کہ درمیانہ طبقے کو توقع سے زیادہ سیاسی حمایت حاصل ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ اس تصادم کی شدت سب سے زیادہ مورو اور قاضی احمد کے پھیلتے ہوئے مدنی قصبوں میں، یا پھر دادو اور میہڑ جیسے روایتی طور پر پس ماندہ مقامات پر نظر آئی جہاں معاشرتی تبدیلی کی رفتار سب سے زیادہ تیز تھی۔ اس تحریک سے ریاستی انتظامیہ میں بدامنی پر قابو پانے کی صلاحیت کا فقدان کھل کر سامنے آگیا؛ اس کے اقدامات اُن علاقوں میں بھی بےاثر ثابت ہوئے جہاں کے جاگیرداروں کی حمایت اس کے ساتھ تھی۔ اس کے بعد سندھ کے کچھ علاقوں میں فوجی ایکشن ہوا جس نے متعدد سیاسی کارکنوں کو جنگلوں میں ڈاکوؤں کے ساتھ پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ڈاکوؤں کو بھی سیاسی طور پر متحرک کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں یا تو ان کے ہاتھوں مارے گئے یا خود بھی ڈاکو بن گئے۔

انتظامیہ کی بےاثری، درمیانہ طبقے کی بڑھتی ہوئی طاقت اور بدامنی کی صورتِ حال نے سندھ کے وڈیروں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا اور ان کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے لیے مسلح محافظ پہلے سے زیادہ تعداد میں رکھیں۔ چوں کہ انتظامیہ کی بےاثری ثابت ہو چکی تھی، دیہی زندگی کے روایتی تنازعات اب اسلحے کے زور پر طے کیے جانے لگے۔ بعض علاقوں میں آبپاشی کی نہروں سے پانی لینے کا مروّجہ وارو (باری) کا نظام ختم ہو گیا اور زیادہ بندوقوں کے مالک زمیندار اپنی من مانی کرنے لگے۔ اس طرح زمین داروں کے درمیان اسلحے کی دوڑ شروع ہو گئی۔ اسلحے کی یہ بڑھتی ہوئی طلب افغان جنگ کے لیے فراہم کیے ہوئے ہتھیاروں نے پوری کی اور اس طرح افغانی تعلق سے دستیاب ہونے والی کلاشنکوفیں سندھ میں عام نظر آنے لگیں۔ بہت سے مسلح گروہ جو زمین داروں نے اپنی حفاظت کے لیے قائم کیے تھے، ڈکیتیوں میں ملوث ہو کر آبادی کو دہشت زدہ کرنے لگے۔ صورتِ حال یہاں تک بگڑ گئی کہ صوبائی اسمبلی کے مقامی ارکان کی گاڑیوں کے آگے پیچھے مسلح محافظوں سے بھری جیپیں چلتی دکھائی دینے لگیں۔

ان حالات میں سرکاری اہلکاروں کے لیے محصولات وصول کرنا مشکل ہو گیا۔ عام خیال یہ ہو گیا کہ سرکاری اہلکاروں نے سندھ کی نئی طاقت یعنی ڈاکوؤں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے ہیں۔ چھوٹے زمیندار، تاجر اور پیشہ ور افراد جو اسلحے کے ذریعے اپنی حفاظت کرنے سے قاصر تھے، اغوا کر لیے جاتے اور انھیں تاوان لے کر چھوڑا جاتا۔ نتیجتاً وہ اس علاقے سے نقل مکانی کرنے لگے۔ تاہم، کسانوں کے لیے کہیں جانا ناممکن ہے۔ جاگیردارانہ نظام جو ان کے اور ریاست کے درمیان ایک رابطے کی حیثیت رکھتا تھا، اپنی یہ حیثیت کھو چکا ہے۔ چناں چہ پرانے اداروں کے ختم ہونے سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر

کرنے کے لیے متعدد دیہات میں لوگوں نے ایسی تنظیمیں بنائی ہیں اور انھیں فلاح و بہبود کی تنظیموں کے طور پر رجسٹر کرایا ہے۔ ان کے منتخب عہدے دار اسکولوں اور ڈسپنسریوں کے قیام، سڑکوں اور پُلوں کی تعمیر اور پانی اور نکاس کی سہولتوں کی فراہمی کے لیے مقامی سرکاری محکموں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ وہ غیر سرکاری تنظیموں اور پیشہ ور لوگوں سے رابطہ قائم کرکے تکنیکی مشورے اور اعانت حاصل کرتے ہیں اور گاؤں میں اور اس کے ارد گرد امن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض تنظیموں نے اپنے طور پر علاج اور تعلیم کے ادارے قائم کیے ہیں۔ چند مقامات پر انھوں نے یونین کاؤنسلوں کے انتخابات میں علاقے کے وڈیروں کو شکست بھی دی ہے۔

یہ دیہی تنظیمیں ابھی تعداد میں کم ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہونا ناگزیر ہے، کیوں کہ فی الوقت سندھ کی معاشرتی تبدیلیوں کے اظہار کا کوئی اور طریقہ دستیاب نہیں۔ انھیں اس کا پورا شعور ہے کہ ان کی کامیابی کی کلید یونین کاؤنسلوں پر اقتدار حاصل کرنا ہے۔

اس اثنا میں سندھ کی صورتِ حال مسلسل خراب ہوتی چلی جائے گی جب تک جاگیرداری نظام کے خاتمے کو اداروں کی شکل نہیں دی جاتی اور اقتصادی اور معاشی تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نئے طبقوں کو ان کی قوت کے مطابق سیاسی عمل میں شامل نہیں کیا جاتا۔

***

شہری مراکز میں تبدیلیاں

ملک کے بڑے اور چھوٹے شہری مراکز میں بھی تبدیلیوں کی رفتار دیہی علاقوں سے مختلف نہیں تھی۔ ۱۹۵۱ میں پاکستان کی کل آبادی کے ۱۸ فیصد (۶۵ لاکھ) لوگ شہروں میں رہتے تھے۔ ۱۹۹۱ میں آبادی کے شہری تناسب کا تخمینہ ۳۰ فیصد (چار کروڑ) تک پہنچ چکا ہے، اور ۲۰۱۱ میں اس کے ۵۰ فیصد (۹ کروڑ ۸۴ لاکھ) تک جا پہنچنے کی توقع ہے۔ تاہم، ایک طرف پینے کے پانی کی فراہمی، گندے پانی کے نکاس، کوڑے کرکٹ (solid waste) کو اٹھانے کے بندوبست، ٹرانسپورٹ، تعلیم اور علاج کی سہولتوں، اور دوسری طرف مکان بنانے کے لیے زمین، قرضے اور تکنیکی معاونت کی سطح فراہمی میں شہری آبادی کے بڑھنے کی رفتار سے اضافہ نہیں ہوا۔ شہروں میں کم وسائل رکھنے والے طبقے کی (جو شہری آبادی کا ۸۰ فیصد ہے) بڑی اکثریت کی رہائش، ٹرانسپورٹ، تعلیم اور علاج کی ضروریات دلّالوں اور تاجروں پر مشتمل غیر رسمی سیکٹر پوری کرتا ہے۔ یہ غیر رسمی سیکٹر چھوٹے کاروبار کے لیے (گراں شرحِ سود پر) قرضے بھی دیتا ہے اور (سرکاری اور غیر سرکاری) رسمی سیکٹر کے مقابلے میں زیادہ روزگار بھی فراہم کرتا ہے۔

۱۹۷۷ میں سندھ اور پنجاب کے بڑے اور چھوٹے شہری مراکز کے اسی غیر رسمی سیکٹر کی تائید کی وجہ سے پی این اے پہیا جام ہڑتالیں کرانے میں کامیاب ہوا تھا جس کے نتیجے میں آخر کار بھٹو کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا تھا۔ اس سیکٹر کی جیا مخالف تحریکوں سے عدم دلچسپی کی وجہ سے فوج گیارہ سال تک اقتدار میں رہی۔ پاکستان کی سیاسی جماعتوں کو ـــ اگر وہ جمہوری اداروں کے فروغ میں دلچسپی رکھتی ہیں ـــ اس طبقے کے معاشرتی پس منظر اور سیاسی میلان کو سمجھنا ہو گا اور اس کے تقاضوں کو اپنے سیاسی عمل میں جگہ دینی ہو گی، یا پھر ایک ایسا قابلِ عمل متبادل پیدا کرنا ہو گا جو ملک کی معیشت میں وہ کردار ادا کر سکے جو یہ غیر رسمی سیکٹر ادا کرتا ہے۔

آڑھتیوں، دلالوں، چھوٹے تاجروں وغیرہ پر مشتمل یہ طبقہ جاگیر داری نظام کے (جو کچھ عرصہ پہلے تک پاکستان کی سماجی اقتصادیات کو کنٹرول کرتا تھا) کاریگروں اور دیہی تاجروں سے اُبھرا ہے۔ اس نو زائیدہ طبقے کے افراد کی شعور، تعلیم اور ہُنر کی سطح دیہی اور شہری پرولتاریہ سے بلند ہے۔ اس طبقے کے افراد پیداواری عمل اور طریقوں میں امکانی تبدیلیوں سے آگاہ ہیں اور انھیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ صلاحیت انھیں بیسویں صدی سے منسلک کر کے ان کے لیے تیز رفتار سماجی اور معاشی ترقی کو ممکن بنا دیتی ہے۔ یہ تمام خصوصیات انھیں اُسی جاگیرداری نظام کے مقابل لا کھڑا کرتی ہیں جس سے ان کا ظہور ہوا تھا۔ اگرچہ اس طبقے کے افراد ابھی تک محنت کش طبقے کے مخالف نہیں ہیں، لیکن یہ بات وہ کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ محنت کش طبقہ منظم ہو جائے کیوں کہ اس طرح ان دونوں کے درمیان غیر مساوی رشتہ متاثر ہو گا اور اُن کے لیے پرولتاریہ کا معاشی استحصال دشوار ہو گا۔

اب تک اس طبقے نے سیاست میں براہ راست حصّہ نہیں لیا ہے لیکن وہ قومی سطح کی سیاسی تحریکوں کے لاحقے کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس طبقے کے افراد مقامی معاشرتی زندگی میں سرگرم ہیں اور اُن ہزاروں سماجی بہبود کی تنظیموں اور کاروباری تنظیموں کے وجود میں آنے کے ذمے دار ہیں جو ملک کی ضلعی اور بلدیاتی سطح کی سیاست میں حصّہ لیتی ہیں۔ اس طبقے نے بلدیاتی انتخابات میں بھرپور حصّہ لیا ہے اور اکثر اپنے علاقے کے جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کے نمائندوں کو شکست دی ہے۔ اب تقریباً تمام ضلعی اور بلدیاتی کاؤنسلیں اور ٹاؤن کمیٹیاں ان کے کنٹرول میں ہیں۔

بلدیاتی اداروں کے یہ منتخب نمائندے زیادہ تر 'کاروباری' ہیں اور ملک کی پارلیمانی جمہوریت سے ناخوش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پس منظر میں چلے گئے ہیں اور قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین، جن میں سے بیشتر جاگیردار یا مغرب نواز لبرل افراد ہیں، اقتدار میں ہیں۔ نو زائیدہ طبقے کے افراد اعتماد، قومی سطح کی بصیرت اور سرمائے کی کمی کے باعث قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ نہیں لے پاتے۔ قومی سیاست میں اظہار کا موقع نہ پانے کے باعث یہ طبقہ ممکنہ طور پر پاکستان کی پارلیمانی جمہوریت کا سب سے طاقت ور مخالف ہے۔

اس طبقے کو پاکستانی جمہوریت کے سانچے میں ڈھالنے کا واحد طریقہ اسے بااختیار بنانا ہے۔ معاشرے میں ہونے والی ہمہ گیر اور وسیع تبدیلیوں کا تقاضا ہے کہ ضلعی انتظامیہ کے فرائض اس طبقے کے منتخب نمائندوں کے سپرد کیے جائیں اور کاؤنسلیں اپنے محصولات وصول کرنے اور استعمال کرنے میں آزاد ہوں۔ اسی طرح ان تبدیلیوں کے پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ شہری علاقوں میں مقامی انتظامیہ، ترقیاتی اداروں، ریونیو کے محکموں، پولیس وغیرہ کو شہروں کی منتخب میونسپل کمیٹیوں اور کارپوریشنوں کا ماتحت بنایا جائے۔ ملکی سطح پر یہ ضروری ہے کہ اس طبقے کی معاشی اور معاشرتی سرگرمیوں کو سہولت اور ترقی دینے کی پالیسیاں اور قوانین بنائے جائیں۔ مختصر یہ کہ وقت کا تقاضا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں آ چکنے والی ان تبدیلیوں کو تسلیم کیا جائے اور قومی سیاسی نظام اور اداروں کا حصہ بنایا جائے۔ البتہ اب تک اس کے آثار نظر نہیں آتے۔ ریاست کے اداروں کا رویہ ان تبدیلیوں کی راہ روکنے کا رہا ہے، جس سے تشدد اور غیرجمہوری رجحانات کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ اس رویّے کی دو واضح مثالیں قومی مردم شماری اور بلدیاتی انتخابات کے مسلسل التوا سے ملتی ہیں۔ گزشتہ مردم شماریوں کے نتائج اور آبادیاتی رجحانات (demographic trends) پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگلی مردم شماری (جسے ۱۹۹۱ میں ہونا تھا اور اب تک نہیں ہوئی ہے) کے نتائج سے پاکستان کے، بالخصوص صوبہ پنجاب کے، شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان اسمبلیوں کے حلقوں کی تقسیم وسیع پیمانے پر تبدیل ہوگی جس سے قومی اور صوبائی سطح کی سیاست پر جاگیردار طبقے کی گرفت کمزور ہو جائے گی۔ اس کا ایک اور اہم نتیجہ سالانہ ترقیاتی پلان (Annual Development Plan) میں بنیادی تبدیلی کی صورت میں برآمد ہوگا، اور ترقیاتی رقمیں، جو اب تک قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے کنٹرول میں رہتی ہیں، بڑی حد تک بلدیاتی اداروں کی تحویل میں چلی جائیں گی۔

***

پاکستان کے بڑے شہروں میں نئی معاشرے کی ان تبدیلیوں کے مظاہر واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس وقت شہری آبادی کی اکثریت غیررسمی، کچی آبادیوں میں رہتی ہے۔ یہ آبادیاں کسی سرکاری منصوبہ بندی کے بغیر بنی ہیں اور انھیں شہری سہولتیں ـــ پینے کا پانی، گندے پانی کا نکاس، بجلی، ٹرانسپورٹ، کوڑے کرکٹ کے انتظام، تعلیم، علاج، قرضہ وغیرہ ـــ سرکاری یا پرائیویٹ رسمی سیکٹر کی طرف سے فراہم نہیں کی گئی ہیں۔ مافیا کے انداز میں کام کرنے والا ایک غیررسمی سیکٹر کم آمدنی والے اس شہری طبقے کو رہائشی زمین، مکان بنانے اور چھوٹا کاروبار کرنے کے لیے سودی قرضے، ٹرانسپورٹ اور روزگار فراہم کرتا ہے، جب کہ صحت اور تعلیم کی خدمات ایک غیرمعیاری پرائیویٹ سیکٹر کی طرف سے مہیا ہوتی ہیں۔ جائزوں کے مطابق ۷۰ فیصد شہری آبادی سے صابطہ

(unregularised) سیکٹروں میں کام کرتی ہے جہاں کم از کم اُجرت اور لیبر قوانین و ضوابط کا اطلاق نہیں ہوتا۔ پاکستان کی شہری آبادی میں اضافے کی شرح ۴.۸ فیصد سالانہ تصور کی جاتی ہے، مگر غیر رسمی سیکٹر ۹ فیصد سالانہ کی شرح سے ترقی کر رہا ہے اور یہ شرح بھی مسلسل بڑھ رہی ہے۔

شہری علاقوں میں ہونے والا یہ اضافہ ایک اہم معاشرتی انقلاب ہے جس کے باعث برادری اور قبیلے کے روایتی تعلقات کی جگہ مقامی سطح کے جدید رشتے پیدا ہو رہے ہیں۔ معاشی دباؤ اور شہری کلچر نے عورتوں کو، خاص طور پر کچی آبادیوں میں، گھروں کے باہر کام کرنے پر مائل کر دیا ہے۔ ایک عوامیت پسند کلچر اشراف کے کلچر کی جگہ لے رہا ہے۔ کچی آبادیوں سے آنے والے کاؤنسلر میونسپل اداروں میں اہم طاقت کے طور پر اُبھر رہے ہیں۔ دوسری طرف حکومت، سیاسی جماعتیں اور مافیا ان تبدیلیوں کا ساتھ دینے اور اپنے طرزِ عمل میں ان تبدیلیوں کے لحاظ سے ترمیم کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ پس ماندہ بستیوں میں رہنےوالوں کی دوسری نسل (اور بعض صورتوں میں تیسری نسل) جوان ہو چکی ہے۔ یہ نسل اپنے جاگیردارانہ ماضی سے تعلق ختم کر چکی ہے اور شہری مراکز پر اپنا دعویٰ رکھتی ہے۔ موجودہ نظام ان نئے شہری تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اگر اس صورتِ حال کی مناسبت سے نئے ادارے قائم نہیں ہوئے تو انارکی پھیلا کرے گی۔

***

ریاست کی ناکامی

پاکستانی معاشرے میں آنے والی یہ اہم تبدیلیاں صرف نچلی سطحوں پر ظاہر ہوئی ہیں۔ اہلِ اقتدار طبقوں، ریاستی اداروں، دانش وروں، سیاست دانوں، سیاسی پارٹیوں وغیرہ نے ان ہمہ گیر معاشرتی تبدیلیوں کو سمجھنے اور ایسی سرگرمیوں میں سمونے کی کوشش نہیں کی ہے۔ نتیجتاً معاشرے کی بدلی ہوئی حقیقت اور ریاست کے روایتی ڈھانچے کے درمیان ایک بڑی خلیج پیدا ہو گئی ہے جو روز بروز وسیع ہوتی جا رہی ہے۔

پاکستان کے عوام میں اس سرگرمی سے بیزاری بڑھتی جا رہی ہے جو ملک میں سیاست کے نام پر جاری ہے۔ سیاسی حلقوں میں رجعت پسندی اور استحصال کے خلاف جدوجہد کی جگہ اثر و رسوخ استعمال کر کے ذاتی فوائد اور عمدہ عہدے حاصل کرنے کی کوششوں نے لے لی ہے، جبکہ رجعت پسندی اور استحصال پہلے ہی کی طرح موجود ہیں۔ دانش ور حلقوں میں ملک کے سماجی اور اقتصادی مسائل کی بحث کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے اور اس کے بجائے اسلام آباد کے نئے حکمرانوں کی ذاتی زندگیوں اور سرگرمیوں کے بارے میں گپ شپ نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ جمہوری دور کے آغاز کی تسکین اور توقعات ہوا ہو

چکی ہیں اور حکمرانوں کے طور طریقے مارشل لا دور کی یاد دلانے لگے ہیں۔ عوام کی بڑھتی ہوئی بے کلی اور بیزاری کا سبب ملک کے معاشرتی حقائق اور سیاسی سرگرمی کے درمیان بہت بڑی خلیج ہے۔ سیاسی مبصر اس خلیج کے وجود کے مختلف اسباب بیان کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ منتخب حکومت کے پاس ناکافی اختیارات ہیں اور اس کے باوجود اسے یوں ظاہر کرنا پڑ رہا ہے جیسے اسے تمام اختیارات حاصل ہوں۔ مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ منتخب حکومت کو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے پر کون مجبور کر رہا ہے۔ بعض لوگ اس صورتِ حال کا سبب حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز شخصیات کی ناتجربہ کاری اور خام کاری کو ٹھہراتے ہیں جس کے باعث انہیں بیوروکریسی پر قابو پانے میں مشکل ہو رہی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ منتخب حکومت اپنی کمزوری کے باعث جان بوجھ کر ایسے فیصلے کرنے سے گریز کر رہی ہے جو طاقتور مفادات رکھنے والے حلقوں کی برہمی کا سبب بنیں۔

موجودہ سیاسی حالات کا فوری سبب کچھ بھی بیان کیا جائے، ایک بات یقینی ہے۔ اس صورتِ حال کی جڑیں مارشل لا کے گیارہ سالہ دور، اس دور میں بحالیِ جمہوریت کی تحریک کی نوعیت اور نتائج، اور جنرل ضیا کی موت کے بعد انتخابات کرانے اور منتخب حکومت کو جزوی اختیارات سونپنے کے فیصلے کی وجوہ میں تلاش کرنی ہوں گی۔ روایتی طور پر پاکستان کی فوجی اور سول بیوروکریسی کو جاگیردارانہ نظام کی حمایت اور اعانت حاصل رہی ہے، اور ان قوتوں کے اتحاد سے وہ شے ظہور میں آئی جسے اسٹیبلشمنٹ کہا جاتا ہے۔ چوں کہ دیہی آبادی غالب اکثریت رکھتی تھی اس لیے شہری علاقوں میں اٹھنے والی اختلافی آوازوں کو آسانی سے دبا لیا جاتا رہا۔ ۱۹۷۰ کے انتخابات کے نتیجے میں ایک نئی صورتِ حال سامنے آئی جب دو مقبولیت پسند (populist) پارٹیاں ـــ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی ـــ منتخب ہوئیں۔ عوامی لیگ اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان مفاہمت نہ ہو پانے کے باعث ۱۹۷۱ میں پاکستان کا اکثریتی صوبہ علیحدہ ہو گیا۔ البتہ نئے پاکستان میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت پسندانہ سیاست نے اسٹیبلشمنٹ کو قانونی اور اخلاقی جواز کا وہ پردہ فراہم کرنے کی ذمےداری قبول کر لی جس کے پیچھے فوجی اور سول بیوروکریسی اور جاگیردارانہ نظام کا یہ اتحاد اپنے اختیارات کا استعمال پوری طرح جاری رکھ سکے۔ کسی مقبولیت پسند سیاسی قوت اور روایتی طور پر قدامت پسند (اور ملکی وسائل کے بڑے حصے پر قابض) اسٹیبلشمنٹ کے درمیان مفاہمت بہترین حالات میں بھی زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتی۔ جولائی ۱۹۷۷ میں لگائے جانے والے مارشل لا کو، زیادہ سامنے کے عناصر سے قطعِ نظر، اس تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

جنرل ضیا کے گیارہ سالہ دورِ حکومت میں پاکستان کی سیاست اسٹیبلشمنٹ اور مقبولیت پسند سیاسی قوت کے درمیان ایک متواتر کش مکش کے سوا کچھ نہیں تھی۔ مقبولیت پسند قوت حکومت کا تختہ الٹنے کے درپے تھی، جبکہ اسٹیبلشمنٹ اس قوت کو غیراہم بنا کر اپنے آپ کو جائز حکومت ثابت کرنے کے لیے کوشاں تھی۔ دونوں فریق اپنا اصل مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہے، اور اس کش مکش کے ہر قدم

پر دونوں کو اپنے اپنے اصل موقف میں تھوڑی بہت ترمیم کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۸ میں جونیجو حکومت کی برطرفی کے ساتھ یہ تعطل اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ ۱۹۷۷ کے بعد کی سیاست میں جنرل ضیا کے ذاتی کردار کے باعث اس تعطل کا کوئی حل نکالنا ناممکن تھا، چناں چہ اگست ۱۹۸۸ کے ہوائی حادثے نے یہ موقع فراہم کیا کہ ۱۹۷۱ کے بعد کے پاکستان کی ان دو بڑی قوتوں کے درمیان کسی طرح کا تصفیہ ہو سکے۔ اسٹیبلشمنٹ اور مقبولیت پسند سیاسی قوت کے درمیان اس مفاہمت کی تفصیلات کے بارے میں صرف قیاس آرائی کی جاسکتی ہے، لیکن اس مفاہمت کے نتیجے میں ان دونوں قوتوں کے درمیان تعطل کو تسلیم کر کے ملک کے سیاسی نظام کا حصہ بنایا گیا اور نومبر ۱۹۸۸ کے انتخابات کے ذریعے اسے قانونی حیثیت دے دی گئی۔ اس مفاہمت میں دونوں قوتوں کو اپنی طاقت اور کمزوری کے اسی تناسب سے حصہ دیا گیا ہے جس کے باعث یہ تعطل پیدا ہوا تھا۔ تاہم، ان دونوں قوتوں کے درمیان یہ رشتہ جامد نہیں ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کو کمزور کر کے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے مسلسل کوشاں ہیں۔ آنے والے برسوں میں پاکستان کی ملکی سیاست کے خدوخال متعین کرنے میں یہی کش مکش سب سے زیادہ اہم عنصر رہے گی۔

مارشل لا کے گیارہ سالہ دور میں ان دونوں قوتوں کو اپنا اپنا مقصد حاصل کرنے میں جو ناکامی ہوئی اس کے اسباب پر نظر ڈالنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گزشتہ چند عشروں کے دوران پاکستانی معاشرے میں آنے والی ان اہم تبدیلیوں کے باعث جن کا خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے، جاگیرداری نظام اسٹیبلشمنٹ کی موثر اعانت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔ ملک کی شہری آبادی میں نمایاں اضافہ ہو گیا ہے اور اسی تناسب سے دیہی علاقوں کی قوت میں کمی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ زراعت کے پیداواری طریقوں میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث دیہی علاقوں میں بھی کاریگروں، چھوٹے تاجروں اور دلالوں پر مشتمل ایک درمیانہ طبقہ وجود میں آ چکا ہے۔ ان معاشرتی تبدیلیوں کے باعث مجلس شوریٰ میں نامزد ہونے اور غیر جماعتی انتخابات میں منتخب ہونے والے جاگیردار اسٹیبلشمنٹ کو وہ موثر حمایت فراہم نہیں کر سکے جو روایتی طور پر ان کا خاصہ رہا ہے۔ مقبولیت پسند قوت کی ناکامی کی وجوہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہیں۔ اس قوت کی قیادت ایسے افراد کے ہاتھوں میں تھی جن کے مادی اور طبقاتی مفادات اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ جلد از جلد کسی قابلِ عمل مفاہمت پر پہنچنے کا تقاضا کرتے تھے، اور اگر اسٹیبلشمنٹ کی بعض کلیدی شخصیات نے بھٹو کے مقدمے اور سزائے موت کے سلسلے میں ذاتی طور پر نمایاں کردار ادا نہ کیا ہوتا تو یہ مفاہمت، جو ۱۹۸۸ میں ہوئی، بہت پہلے ہو چکی ہوتی۔ دوسری وجہ مقبولیت پسند قوت میں اتحاد کی کمی تھی، اور اس عدم اتحاد کو ہوا دینے کے سلسلے میں اسٹیبلشمنٹ نے بہت کوششیں اور بہت رقم خرچ کی۔ یہ کوششیں اس حد تک تھیں کہ ہم نے اسلام آباد کی فوجی حکومت کو علاقائی قوم پرستوں تک کی حمایت کرتے ہوئے دیکھا۔ ان دونوں وجوہ نے کسی وسیع تر جمہوری اتحاد کے قیام کی راہ مسدود کر دی اور ایم آر ڈی اپنے ابتدائی چار نکاتی ایجنڈے سے آگے کبھی نہ جا سکی۔ چناں چہ ضیا حکومت کے خلاف

تحریک صرف انتخابات کے مطالبے تک محدود رہی اور ملک کے معاشی مسائل کبھی اس ایجنڈے کا حصہ نہ بن سکے۔ اس پس منظر میں یہ تعجب کی بات نہیں کہ پاکستان میں گیارہ سالہ آمریت مخالف تحریک نے ہیومن رائٹس کمیشن اور ویمن ایکشن فورم جیسی تنظیمیں تو ضرور دیں لیکن وہ مزدوروں، کسانوں اور چھوٹے تاجروں کو سیاسی طور پر منظم اور متحرک کرنے میں ناکام رہی۔ اور یہ بھی فطری بات تھی کہ جب ۱۹۸۸ میں مقبولیت پسند قوت اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان مفاہمت کا موقع آیا تو اس کے نکات انہیں مسائل تک محدود رہے جو بحالیِ جمہوریت کی تحریک کے ایجنڈے میں شامل رہے تھے، اور معاشی مسائل کو ترجیح حاصل نہ ہو سکی۔

اس مفاہمت کی ترجیحات سے قطع نظر، اس وقت پاکستان کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ بنیادی طور پر معاشی نوعیت ہی کے مسائل ہیں۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ ضروریات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جبکہ وسائل تیزی سے کم ہو رہے ہیں۔ ہر سال قومی آمدنی میں سے کیے جانے والے ترقیاتی اخراجات کا تناسب کم ہو رہا ہے اور اسٹیبلشمنٹ پر کیے جانے والے غیر ترقیاتی اخراجات بڑھ رہے ہیں۔ ۱۹۷۷ میں محصولات کا ۲۹ فیصد حصہ ترقیاتی اخراجات کے لیے رکھا گیا تھا، جبکہ ۱۹۸۷ میں یہ شرح گھٹ کر صرف ۱۳ فیصد رہ گئی۔ اسٹیبلشمنٹ کی ان ترجیحات کے پیشِ نظر ملک میں آنے والی ہمہ گیر معاشرتی تبدیلیوں کو سیاسی نظام کا حصہ بنانا ناممکن ہے، اور اس صورتِ حال کا نتیجہ سماجی انارکی میں اضافے اور انتظامیہ کے رفتہ رفتہ غیر موثر ہوتے چلے جانے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ یہی ترجیحات ہماری خارجہ پالیسی اور قرض دینے والے ممالک سے ہمارے تعلقات کی نوعیت کو بھی متعین کرتی ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے اسٹیبلشمنٹ سے مفاہمت کر کے خود کو پاکستانی عوام کی سیاسی رہنمائی کرنے اور ملک میں آنے والی معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں کو اداروں کی شکل دینے کے عمل سے دست کش کر لیا ہے۔ شاید اس پارٹی کے پاس اس کے سوا کوئی راستا بھی نہیں تھا۔ پیپلز پارٹی کی قیادت، بشمول اراکینِ پارلیمنٹ، خود کو ان فوائد سے محروم کرنے کو ہرگز تیار نہیں جو اقتدار میں آنے سے حاصل ہوتے ہیں، خواہ یہ اقتدار جزوی ہی کیوں نہ ہو۔

***

سندھ کے شہروں کی صورتِ حال

کراچی اور حیدر آباد کی موجودہ صورتِ حال کا عمرانیات اور معاشیات کے ماہروں، سیاسی لیڈروں اور حکومتی کمیشنوں نے اپنے اپنے طور پر تجزیہ کیا ہے۔ ان تجزیوں کے نتائج مختلف ہیں۔ سب سے زیادہ

عام تصور یہ ہے کہ کراچی کے تنازعے کا باعث شہری سہولتوں ـــــ مثلاً ٹرانسپورٹ، پانی، رہائشی زمین، مکانوں کے لیے قرضے، نکاسیِ آب، علاج اور تعلیم ـــــ کا فقدان ہے۔ اس تجربے میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ اگر حکومت یہ سہولتیں فراہم کر سکے تو یہ تنازعہ اور لسانی نسلی نوعیت کے دیگر مسائل ختم ہو جائیں گے۔

ایک اَور خیال یہ ہے کہ کراچی اور حیدر آباد میں بے چینی اور بدامنی کا بڑا سبب بے روزگاری ہے جو شمالی صوبوں کے لوگوں کے نقلِ مکانی کر کے ان شہروں میں آنے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس تنازعے کا باعث پنجابی غلبہ رکھنے والی انتظامیہ اور پولیس کو بھی ٹھہرایا جاتا ہے۔ سیاسی لیڈروں کا کہنا ہے کہ کراچی اور حیدر آباد کی شورش مارشل لا کے گیارہ برسوں کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ تصادم کی یہ فضا کچھ شر پسندوں کی پیدا کی ہوئی ہے اور کراچی اور حیدر آباد کی زیادہ تر آبادی امن پسند شہریوں اور نیک مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہ گروہ ان شر پسندوں کو بیرونی ایجنٹ سمجھتا ہے۔

اگر حکومت کی جاری کی ہوئی سالانہ رپورٹ (Yearbook)، مردم شماری کی رپورٹوں، اعداد و شمار اور غیر جانبدار ماہرین کی ریسرچ پر اعتبار کیا جائے تو سندھ کے شہروں کی عمومی صورتِ حال بہتر ہوئی ہے۔ ۷۲-۱۹۷۱ کے مقابلے میں بے روزگاری کم ہے، ٹرانسپورٹ کی سہولتیں موجود ہیں اور لوگوں کو بس یا ٹیکسی رکشا کے لیے، دس سال پہلے کے برعکس، اب گھنٹوں انتظار نہیں کرنا پڑتا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ کچی آبادیاں ـــــ جہاں کراچی کے ۴۰ فیصد سے زیادہ شہری رہتے ہیں ـــــ ریگولرائزیشن کا حق تسلیم کرا چکی ہیں۔ اسکول جانے والے بچوں کی تعداد ۱۹۷۰ کے عشرے کے مقابلے میں بڑھی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹروں، نرسوں اور اسپتالوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ مکانوں میں پانی، بجلی اور نکاسیِ آب کی سہولتیں بہتر ہوئی ہیں اور پختہ سڑکیں تعمیر ہوئی ہیں۔

اگرچہ کراچی اور حیدر آباد کے بہت سے علاقوں میں صورتِ حال آج کے مقابلے میں پہلے کہیں زیادہ خراب تھی مگر احتجاج کی کوئی لہر نہیں اٹھتی تھی۔ بجلی کی معطلی، ٹرانسپورٹ کی کمی، کچی آبادیوں کے ڈھائے جانے، پانی کی شدید قلت یا انتظامیہ کے پروردہ غنڈوں کے مظالم کے خلاف کوئی خاص ردِ عمل نہیں تھا۔ کراچی اور حیدر آباد میں احتجاج ملک گیر سیاسی تحریکوں کے دوران قومی سطح کے مسائل پر ہوا کرتا تھا۔ ان تحریکوں میں قومی سطح کے لیڈر (اکثر معاوضہ یافتہ کارکنوں کے ذریعے جو علاقے کے دادا گیر کہلاتے تھے) عوام کو سڑکوں پر لے آتے تھے، اس ہجوم کا اتحاد تحریک کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا تھا۔ مگر آج ہجوم اپنے لیڈر خود پیدا کرنے لگا ہے اور لیڈر شپ تبدیل ہو جانے کے بعد بھی متحد رہتا ہے۔ عوامی احتجاج سے نمٹنے کے لیے حکومت کے روایتی طریقے، جو ۱۹۸۰ کے عشرے تک نہایت کارآمد تھے، موجودہ شورش کو غیر موثر بنانے میں قطعی ناکام ہو چکے ہیں۔ اس تبدیلی کے پس منظر کو بہت احتیاط کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

کراچی میں ہونے والے شہری تشدد کی وجوہ دنیا کے بہت سے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ شہروں میں پائے جانے والے تشدد کے اسباب سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ شہروں کی آبادی میں تیز رفتار اضافہ، شہری باشندوں کی ایک نئی، نوجوان نسل، شہری انتظامیہ کی نااہلی اور بدعنوانی، اور اس کے نتیجے میں ایک بہت بڑی آبادی کی بنیادی شہری سہولتوں سے محرومی۔ شورش پیدا کرنے والے ان اسباب کو ایک دوسرے سے الگ رکھ کر نہیں سمجھا جاسکتا، کیوں کہ یہ تمام ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ مثلاً کراچی کے موجودہ تنازعات کو سمجھنے کے لیے ۱۹۴۰، ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کے عشروں میں نقل مکانی کر کے شہر میں آنے والی آبادیوں کی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ۱۹۴۷ اور ۱۹۴۹ کے درمیانی عرصے میں اردو بولنے والے چھ لاکھ مہاجر تقسیمِ ہند کے نتیجے میں شہر میں آئے، جس کے باعث نہ صرف شہر کی زبان اور کلچر بدل کر رہ گیا بلکہ پہلے سے مقیم آبادی پیش منظر سے مٹ گئی۔ ۱۹۵۰ کے عشرے کے آخر اور ۱۹۶۰ کے پورے عشرے میں سبز انقلاب کے نتیجے میں شہر میں آنے والوں کی ایک اَور بڑی لہر پیدا ہوئی جو شہر کے مزدور طبقے میں شامل ہوئے۔ یہ لوگ پنجابی اور پشتو بولتے تھے اور ان کی سیاسی وفاداریاں سندھ کی مقامی آبادی کے بجائے اپنے آبائی صوبوں کے ساتھ تھیں۔ شہری زندگی کے دباؤ سے ان تمام آبادیوں کے باہم اختلاط کے مظاہر دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کے مظاہر سے مشابہ ہیں۔ اس اختلاط سے مختلف قسم کے تناؤ پیدا ہوئے جن کی نوعیت طبقاتی اور معاشی ہونے کے علاوہ لسانی، نسلی اور ثقافتی بھی تھی۔ کراچی کی صورتِ حال کا ایک خاص عنصر یہ ہے کہ نقل مکانی کر کے شہر میں آنے والوں کی دوسری نسل اب جوان ہو چکی ہے۔ یہ نسل کراچی ہی کو اپنا شہر اور شہر کی سیاست اور انتظام میں شمولیت کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ شہر کی انتظامی ایجنسیاں شہر میں آنے والوں کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ تخمینے کے مطابق شہر کی آبادی کا تقریباً نصف حصہ کچی آبادیوں میں رہتا ہے جو کسی سرکاری منصوبہ بندی کے بغیر غیررسمی سیکٹر کے ہاتھوں وجود میں آئی ہیں۔ اس صدی کے آخر تک ان کا تناسب ۷۰ فیصد تک جا پہنچنے کی توقع ہے۔ ان کچی آبادیوں میں رہنے والے رہائشی رہیں، پانی، نکاس کے نظام، تعلیم، روزگار اور علاج کی سہولتوں کے سلسلے میں شہری انتظامیہ کی توجہ اور اعانت سے محروم ہیں اور ان تمام شعبوں میں غیررسمی سیکٹر پر انحصار کرتے ہیں جس کا دائرۂ اثر، اور نتیجتاً اس کی طاقت، شہری انتظامیہ کے مقابلے میں مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ شہری انتظامی ایجنسیاں نااہل ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت بدعنوان بھی ہیں اور غیررسمی سیکٹر کے کارندوں کے ساتھ سرکاری اہلکاروں کے تعاون نے شہر میں جبری رشوت اور بھتے کی وصولی کا ایک سخت استحصالی نظام قائم کر رکھا ہے جس کی گرفت شہر کی غریب اور نچلی درمیانہ آمدنی کے باشندوں کے لیے روز بروز ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے۔

۱۹۹۵ کے غیر سرکاری تخمینے کے مطابق سندھ کی شہری آبادی صوبے کی آبادی کا ۴۸.۰۵ فیصد حصہ ہے۔ سندھ کی آبادی کا تقریباً ۶.۰۴ فیصد حصہ کراچی اور حیدر آباد میں رہتا ہے۔ ملک کی کل دیہی (زرعی) پیداوار کے ۶۸ فیصد حصے کی کھپت شہری علاقوں میں ہوتی ہے، جبکہ صوبہ سندھ کی کل دیہی پیداوار کا ۷۷ فیصد حصہ شہری آبادی استعمال کرتی ہے۔ بینکوں میں جمع کی جانے والی رقم کا ۸۷ فیصد حصہ شہری علاقوں سے، اور شہری علاقوں سے جمع کرائی جانے والی رقم کا ۷۰ فیصد صرف کراچی شہر سے آتا ہے۔

صوبہ سندھ کا ٹرانسپورٹ کا نظام پچھلے بیس سال میں انقلابی طور پر تبدیل ہو چکا ہے۔ بار برداری کے لیے اونٹ گاڑیوں، گدھا گاڑیوں اور بیل گاڑیوں کی جگہ سوزوکی اور ڈاٹسن پک اَپ اور لوگوں کے سفر کرنے کے لیے بسوں نے لے لی ہے۔ ان میں سے بیشتر گاڑیاں صوبے کے شہری مراکز میں رہنے والوں کی ملکیت میں اور وہی ان کو چلانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اسی طرح صوبے کی زرعی پیداوار کے لیے کیمیائی کھاد ایک لازمی جُز بن گئی ہے، اگرچہ یہ کھاد دیہی علاقوں میں تیار کی جاتی ہے، اس صنعت کی تکنیکی مہارت، انتظام اور فروخت وغیرہ کا انحصار شہری علاقوں پر ہے۔ زرعی پیداوار میں مشینوں کے استعمال نے بھی اس پیداواری عمل کا شہری علاقوں پر انحصار بڑھا دیا ہے۔

شہری اور درآمد کردہ مصنوعات ــــ مثلاً کپڑوں، جوتوں، چائے، سگریٹ، الیکٹرونکس کی مصنوعات وغیرہ ــــ کی دیہات میں فروخت کے ذریعے ہر سال ۴ ارب روپے شہروں میں آتے ہیں، اور دیہی رہنے والے شہری صنعت کار خرید رہے ہیں۔

***

شہریوں کی نئی نسل

ان تمام حقائق سے، خصوصاً سندھ میں، جو تصویر اُبھرتی ہے، اس کی عکاسی حکومت کے ترقیاتی پروگراموں، ریاست کے انتظامی طریقوں، یا نرمی سیاسی جماعتوں کے رویے، پروگرام اور تنظیمی ساخت سے نہیں ہوتی۔ پاکستان کے موجودہ سیاسی بحران کا یہ ایک بڑا سبب ہے۔ کراچی اور حیدر آباد میں پائی جانے والی شورش اور سندھ کے قصبوں میں جاگیردارانہ کلچر سے تصادم (لسانی مسئلے سے قطعِ نظر) ان معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں کی علامت ہیں۔ اس اضطرابی تحریک کے ہراول دستے میں ۱۴ سے ۳۰ سال تک کی عمر کے لوگ شامل ہیں۔ اس نسل کے لوگ ماضی، اس کی لطیفیات، رویوں اور سوچ سے اپنا تعلق توڑ کر تیزی سے جدید شہری تصورات اپناتے جا رہے ہیں۔

کراچی کی تقریباً ۳۶ فیصد آبادی ۱۴ سے ۳۰ سال تک عمر کی اسی نسل پر مشتمل ہے۔ اس نسل کے ۸۰ فیصد لوگ کراچی ہی میں پیدا ہوئے ہیں، اور ان میں سے بیشتر کے والدین کی نوجوانی کا زمانہ کراچی میں گزرا ہے۔ اس عمر کے ۷۲ فیصد افراد خواندہ ہیں، جبکہ کراچی میں مجموعی طور پر خواندگی کی شرح ۵۵ فیصد اور پورے پاکستان میں تقریباً ۲۶ فیصد ہے۔ اس نسل میں لڑکیوں کی خواندگی کی شرح لڑکوں سے صرف ۶ فیصد کم ہے، جبکہ عورتوں اور مردوں میں خواندگی کی شرح کا فرق کراچی میں ۱۲ فیصد (لاہور میں ۱۵ فیصد) اور پورے ملک میں یہ فرق تقریباً ۱۹ فیصد ہے۔ کراچی کی اس خواندہ نئی نسل کے تقریباً ۲۸ فیصد افراد میٹرک پاس اور ۲۲ فیصد سے زیادہ گریجویٹ ہیں۔ اس نسل کا جاگیرداری نظام اور اس کی معیشت اور ثقافت سے کوئی تعلق نہیں ہے ـــ ان لوگوں نے جاگیرداروں اور ان کے نظام کو صرف ٹیلی وژن پر یا فلموں میں دیکھا ہے۔

اس نئی نسل کی لفظیات بدل چکی ہیں۔ ۱۴ سے ۳۰ سال تک کے اس گروپ میں کوئی خود کو تابعدار یا ـ تابعدار نہیں کہتا، ان میں سے کسی کے مائی باپ نہیں ہیں (لیاری کے علاقے میں بھی نہیں)، یہ لوگ مصاحب یا مرید نہیں ہیں۔ سفارش، جسے روایتی طور پر ایک معاشرتی اعزاز سمجھا جاتا ہے، ان کی لفظیات میں ایک گندا لفظ ہے۔ وہ اپنے لیڈروں کو صاحب، حضور یا سائیں نہیں بلکہ بھائی اور چاچا کہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محبوب واضح طور پر صنفِ مخالف سے تعلق رکھتا ہے۔

دوسری طرف جن انتظامی ایجنسیوں، خصوصاً نفاذِ قانون کی ایجنسیوں، سے اس نسل کے افراد کا سر قدم پر سابقہ پڑتا ہے، اُن کے اہلکار تابعدار اور تابعدار ہیں، اُن کے مائی باپ بھی ہیں اور وہ سفارش کو اعزاز سمجھتے ہیں۔ اس طرح جنگ کی صف بندی قطعی طور پر واضح ہو گئی ہے۔

ماضی میں سرکاری انتظامیہ امن و امان قائم رکھنے کے لیے محلّے کے معززوں اور عزت داروں کو ملا کر ان سے اس کے برقرار رہنے کی ضمانت حاصل کر لیا کرتی تھی۔ لسانی اور نسلی طور پر ہم آہنگ علاقوں میں (مثلاً کراچی کی ابتدائی کچی آبادیوں میں) پنچائت یا برادری کے بزرگ، اور نئی مخلوط آبادیوں میں زمین پر قبضہ کر کے ان آبادیوں کے باشندوں کو پلاٹ فراہم کرنے والے لوگ اس سلسلے میں موثر ثابت ہوتے تھے۔ کراچی کے مشرقی علاقے کی غریب بستیوں میں ۸۷-۱۹۸۶ کی کشیدگی سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ روایتی معززوں اور عزت داروں کا علاقے کے نوجوانوں پر کنٹرول باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اُن کی بزرگی اور مقام کو اسی طرح حقارت سے دیکھا جاتا ہے جیسے زمینوں کے قبضہ گیر اور ڈویلپر استحصالی اور سرکاری انتظامیہ کے دلّال سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں تک پنچائتوں اور برادریوں کا تعلق ہے، وہ کراچی کے مقامی لوگوں کے لیے بہت عرصہ ہوا ختم ہو چکی ہیں۔ البتہ شمالی علاقوں سے آنے والوں میں قبائلی نظم و ضبط، برادری کے بزرگ اور جرگہ جیسے ادارے اب تک موجود ہیں۔

کراچی میں ۱۴ سے ۳۰ برس تک کے نوجوانوں کی اکثریت صنعتی مزدوروں یا یومیہ اُجرت حاصل کرنے والوں پر نہیں بلکہ سفید کالر ورکروں اور ہنرمند کاریگروں پر مشتمل ہے جن کا تعلق

ٹرانسپورٹ انڈسٹری یا سروس سیکٹر سے ہے۔ اس نسل کے افراد کی ایک بڑی تعداد کا اپنا ذاتی روزگار ہے، جس میں دکان دار، چھوٹی مصنوعات بنانے والے اور کنسٹرکٹر شامل ہیں۔ وہ بستیاں جہاں یہ لوگ رہتے ہیں، ۱۹۶۰ کے عشرے کی ابتدائی کچی آبادیوں اور رہائشی محلوں کی طرح طبقاتی طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ڈاکٹر، بینک ملازم، یومیہ اُجرت پر کام کرنے والے، مزدور اور صنعتی کاریگر سب ایک ہی گلی میں رہتے ہیں، کیوں کہ مکان بنانے کے لیے باقاعدہ پلاٹ کی قیمت نچلی درمیانہ آمدنی کے ان خاندانوں کی استطاعت سے باہر ہے۔

مختلف طبقوں اور پیشوں کے ایک دوسرے پر انحصار ہونے کی بدولت ان محلوں میں ہر قسم کی بے شمار تنظیمیں قائم ہوئی ہیں۔ ان میں سماجی بہبود کی تنظیمیں، لائبریریاں، اسپورٹس اور ہیلتھ کلب، ڈرامیٹک سوسائٹیاں، نعت خواں گروپ، تعلیمی ادارے، تاجروں اور کاریگروں کی تنظیمیں اور ۱۹۸۰ کے عشرے کے نصفِ آخر کی منشیات مخالف تنظیمیں شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر تنظیموں کا انتظام نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔

شہر کے نچلی درمیانہ آمدنی والے علاقوں میں سیاسی طنزیہ ڈرامے اور ورائٹی پروگرام ہوتے ہیں، یہ ڈرامے وغیرہ اپنے مواد، پیشکش اور مکالموں میں کراچی کی متمول سوسائٹیوں کے سنجیدہ اور فکرافروز ڈراموں سے مختلف ہیں۔ پاپ سنگر لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد ان تنظیموں سے نکلی ہے، اسی طرح کامیڈین اور اداکار بھی ان تنظیموں سے آئے ہیں۔ کچی آبادیوں میں اسپورٹس کلب میں جنھوں نے اپنے قلیل وسائل کے باوجود قومی سطح کے کھلاڑیوں کی کوچ کی حیثیت سے خدمات حاصل کیں اور بعض دفعہ قومی کھلاڑیوں پر مشتمل فٹ بال اور ہاکی ٹیموں کو شکست دی۔ اس گروپ میں موسیقار، قوّال، شاعر اور پیشہ ور مقرر بھی شامل ہیں۔

ان تنظیموں سے نکلنے والے کھلاڑیوں اور آرٹسٹوں کو حکومت کی سرپرستی حاصل نہیں ہے، جہاں جہ ان کی سرکاری میڈیا تک رسائی یا کھیلوں کی قومی ٹیموں میں شمولیت تقریباً ناممکن ہے۔ ان تنظیموں کی تعلیمی سوسائٹیوں کو، خواہ وہ متعدد اسکولوں کو چلا رہی ہوں، حکومت کی طرف سے کوئی اعانت نہیں ملتی۔ اس کے اسباب بتاتے ہوئے کراچی میں رہنے والے ایک ٹیچر حامد حسین نے کہا ہم نچلی درمیانہ آمدنی والے طبقے کے لوگ ہیں۔ ہمارا جاگیرداروں یا سرمایہ داروں سے، یا کلفٹن، سوسائٹی یا ڈیفنس میں رہنے والے ان کے خدمت گاروں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پاکستان پر حکمرانی یہی لوگ کرتے ہیں۔ اگر ہم ان کے منظورِ نظر ہوتے تو ہماری بھی سرپرستی کی جاتی۔ صرف ہمارے درمیان سے اٹھنے والی قیادت ہی ہمیں ہمارے حقوق دلوا سکتی ہے۔

آرٹسٹوں، کھلاڑیوں اور مدرّسوں کے علاوہ وہ طالب علم بھی دل شکستہ ہیں جو امتحانوں میں عمدہ نتائج حاصل کرنے کے باوجود پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلے حاصل نہیں کر سکتے، اور اسی طرح وہ گریجویٹ بھی جو کوٹا سسٹم کے باعث بے روزگار ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ کوٹا سسٹم کچھ عرصے کے لیے ہمارے

سندھی نوجوانوں کو درکار ہے۔ ایک بےروزگار انجینئر کمال زیدی کہتا ہے، لیکن اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ داخلہ یا ملازمت جاگیردار کے لڑکے کو دینی ہے اور ہاری کے لڑکے کو نہیں، تو ہماری قربانی بےکار گئی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہمارے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ سرکاری ادارے، خاص طور پر پولیس، باصلاحیت اور ایماندار ہوں۔ ہم نہ امیروں کی طرح انہیں رشوت دے سکتے ہیں نہ اپنے تعلقات کے ذریعے ان پر دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ اگر ہماری مساجد کی ہم جیسے لوگوں نے نہیں کی تو حالات کبھی تبدیل نہیں ہوں گے۔ دیہی علاقوں کے لوگ اپنی دیہی اقدار کے ساتھ شہری معاشرے کا نظم و نسق چلانے کے اہل نہیں ہیں۔ تجربے نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔

کراچی کے فعال لوگوں میں ایسے نوجوانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو محلہ تنظیموں سے منسلک رہے ہیں۔ انہوں نے کسی نہ کسی شکل میں اپنے علاقے اور اپنے معاشرے کی ترقی کے لیے جدوجہد کی ہے۔ انہوں نے پولیس کو منشیات مخالف تنظیموں کو کچل کر ختم کرتے دیکھا ہے۔ انہوں نے سرکاری اداروں کی بدعنوانی، نااہلی اور ظلم کا سامنا کیا ہے اور اس کے پیچھے اصل طاقتوں کو پہچانا ہے۔ یہاں تک کہ کراچی کی روایتی تاجر سوسائٹیوں کے نوجوانوں نے بھی اپنے قدامت پرست والدین کے خلاف بغاوت کی ہے اور رسوم کا حصہ بن گئے ہیں۔ مقامی انتظامیہ کے ساتھ ان کی جنگ نہ صرف طاقت کے حصول کی بلکہ اقدار کی جنگ بھی ہے۔

لیاقت آباد کے ایک نوجوان کی نظم اس صورتِ حال کو بہت اچھی طرح پیش کرتی ہے

وردی والے دیہاتی درندے نے ہم کو روکا
اور پوچھا کہ کون ہے موٹرسائیکل پر
پیچھے بیٹھی ہوئی
میرا خون کھولا
جی چاہا کہ ایسا خنجر اس کے پیٹ میں ڈبو کر
اس کی آنتوں کا ہار اس کی گردن میں ٹانگوں
پر تیرے ہاتھ کے اشارے نے مجھ کو روکا
اور میں نے کہا میری بہن ہے
ذلت کے آنسو بہاتا میں گھر کو لوٹا

کرفیو، پولیس کے بہیمانہ رویے، ملاحوار گرفتاریوں اور تشدد نے نوجوانوں اور انتظامیہ کے درمیان تصادم کو بڑھا دیا ہے۔ تاہم ناظم آباد کی ایک نوعمر شاعرہ کرفیو لگنے کا خیرمقدم کرتی ہے۔ اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر وہ کہتی ہے

میں تمہاری ماں سے باتیں کر رہی تھی
اور تم گلی میں میرا انتظار
کر رہے تھے
تمہارے گھر رکنے کا بہانہ مل گیا

کراچی کی یہ مضطرب نئی نسل ملک بھر میں آج تک سڑکوں پر آنے والے ہجوموں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور باشعور ہے۔ یہ ہجوم اپنے لیڈر، نظریہ ساز اور حکمت عملی کے ماہر خود پیدا کر رہا ہے۔ ۱۹۸۰ کے عشرے کے آخری برسوں میں شہر کے مختلف علاقوں میں اُبھرنے والی امن کمیٹیوں اور محلہ کمیٹیوں کے رہنماؤں کے بیانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ہجوم اپنے مسائل کو قومی اور طبقاتی مسائل کے تناظر میں دیکھنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔

اس ہجوم کا سب سے متشدد حصہ ایم کیو ایم کی لیڈرشپ کی حمایت کرتا ہے۔ ایم کیو ایم کے وجود میں آنے سے جہاں ایک طرف کراچی، حیدر آباد اور صوبے کے چھوٹے شہروں کے مہاجر نوجوانوں کو تشخص کا احساس ملا ہے، وہیں دوسری طرف اس سے شہروں کی آبادی لسانی گروہوں میں تقسیم بھی ہو گئی ہے۔ ایم کیو ایم کے حامیوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ تقسیم پہلے سے موجود تھی کیوں کہ شمال سے نقل مکانی کر کے آنے والوں کا ریاستی انتظامیہ سے رشتہ مقامی آبادی کے رشتے سے مختلف ہے۔ شہری آبادی میں مزید تقسیم ایم کیو ایم کی مہاجر کی تعریف سے پیدا ہوئی۔ ایم کیو ایم نے مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والوں کو ـــــ جن کی بڑی تعداد اردو بولتی ہے اور معاشرتی اور ثقافتی طور پر دوسرے مہاجروں سے مختلف نہیں ـــــ علیحدہ کر دیا۔ ایم کیو ایم کی تعریف کے مطابق مہاجر وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کے non-agreed علاقوں سے آئے ہیں۔ اس تعریف کے باعث شہری تحریکیں کمزور پڑ گئی ہیں کیوں کہ مشرقی پنجاب سے آنے والوں کی ایک بڑی تعداد سندھ میں موجود ہے۔

دیہی سندھ کی سیاست پر سندھی قوم پرستی کا غلبہ ہے اور اس بات سے قطع نظر کہ سندھی بولنے والا نوجوان کس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے، مکمل صوبائی خود مختاری اور اپنی ثقافت، تاریخ اور زبان سے اس کی وابستگی مقدم ہے۔ بھٹو حکومت کی پالیسیوں کے نتیجے میں ایک خاصا بڑا سندھی بولنے والا درمیانہ طبقہ اُبھر آیا جس کا سندھ کے چھوٹے شہروں میں مہاجر اور پنجابی مفادات سے تصادم ہوا۔ ۱۹۸۳ میں بحالیِ جمہوریت کی تحریک کی ناکامی کے بعد اس درمیانہ طبقے کو احساس ہوا کہ شہر کے مہاجر باشندوں کی شمولیت کے بغیر کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

تاہم، پنجاب سے آنے والے تیس لاکھ کے لگ بھگ آبادکار بھی سندھ میں رہ رہے ہیں۔ وہ صرف آبادکار ہی نہیں بلکہ کنٹریکٹر، تاجر اور ہنرمند کاریگر ہیں اور زرعی پیداوار کی ضروریات پوری کرنے والی مصنوعات بھی فراہم کرتے ہیں۔ سندھ کے کئی ضلعوں میں دیہی معیشت کا ان پر بہت زیادہ انحصار

ہے۔ ایم کیو ایم کی مہاجر کی تعریف انہیں ایم کیو ایم سے باہر رکھتی ہے، اور یوں آدھا تمھارا آدھا ہمارا کا نعرہ لگانا ممکن ہو جاتا ہے۔ اسی باعث مہاجر کی کوئی ایسی تعریف جس میں سندھ کے مشرقی پنجابی بھی شامل ہوں، سندھی قوم پرستوں کو بھی قبول نہیں ہے۔

***

سندھ میں ہونے والا تاریخی عمل انوکھا نہیں ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں دنیا کے بیشتر بڑے شہر آبادی میں کثیر اضافے کے بعد اس دور سے گزرے ہیں۔ پرانا شہری نظام، جو اپنی اصل میں جاگیردارانہ تھا، اپنے فرسودہ اور بوسیدہ اداروں کی وجہ سے نئے شہری مسائل اور رجحانوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا۔ جن ریاستوں میں حکومتوں نے ان تبدیلیوں کو سمجھا اور ان کی طرف مثبت توجہ دی وہاں پرانے ریاستی نظام میں وقت کے تقاضے کے مطابق ترامیم کی گئیں اور وہ جاری رہ سکا۔ جہاں ان تبدیلیوں کو نظرانداز کرنے یا دبانے کی کوشش کی گئی وہاں نہ صرف شہروں سے پرانا نظام اکھاڑ پھینکا گیا بلکہ پورے ملک کی سیاست مکمل طور پر تبدیل ہو گئی۔

سندھ کی شہری تحریک اس وقت لسانی اور نسلی تصادم کا شکار ہے، پھر بھی کراچی کے شورش زدہ علاقوں میں اس کا حل تلاش کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان میں سے ایک تجویز، جس کی بہت پذیرائی ہوئی ہے، یہ ہے کہ کراچی میں ۱۰۰ کی جگہ ۳۰۰ منتخب کاؤنسلر ہونے چاہییں، شہر کی حکومت میونسپل کاؤنسل کے پاس ہونی چاہیے اور شہر کے تمام ترقیاتی اور انتظامی اداروں اور پولیس کو اس کے ماتحت ہونا چاہیے۔

اگر ہمارے محلے کے منتخب لوگوں کے پاس اقتدار ہو تو ہم انہیں اپنی فلاح و بہبود کے کام کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں، نذیر احمد کہتا ہے۔ وہ ایک موٹر مکینک ہے اور محمود آباد میں رہتا ہے۔ ہم تمام بدعنوانیوں اور بااثر لوگوں کو اکھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔ کسی پنجابی تھانے دار کی جگہ مہاجر تھانے دار کو لگا دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تھانے دار ہمیں، اور اُس کا ایس پی ہمارے نمائندوں کو، جواب دہ ہو۔

جو لوگ یہ حل پیش کر رہے ہیں اُنھیں یہ اندازہ نہیں ہے کہ اتنی بڑی بنیادی تبدیلی حکومت کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو گی، کیوں کہ اس طرح محلّوں کو بے پناہ طاقت حاصل ہو گی اور بیوروکریسی کو ان کے ماتحت آنا پڑے گا۔ مزید یہ کہ یہ عمل صرف کراچی تک محدود نہیں رہے گا۔

کراچی اور حیدر آباد کی شہری تحریک کو اس کے مخالفین نے کامیابی کے ساتھ لسانی بنیادوں پر تقسیم کر کے فی الوقت غیر موثر کر دیا ہے۔ لیکن جب اسی طرح کی تحریک مستقبل قریب میں پنجاب کے شہری مراکز میں شروع ہو گی (جیسا کہ آبادیاتی اعداد و شمار واضح طور پر پیش گوئی کرتے ہیں) تو اُسے

غیر مؤثر کرنا دشوار ہوگا۔

***

شہری انتظام میں مافیاؤں کا دخل

کراچی میں رہائشی علاقے قائم کرنے کے لیے زمین کی ڈویلپمنٹ ـــــ زمین کی نقشہ بندی، اس کی پلاٹوں میں تقسیم، پانی اور نکاسی کی سہولتوں کے لیے بنیادی تعمیرات، پلاٹوں کی فروخت وغیرہ کا کام ـــــ ادارۂ ترقیات کراچی (KDA) کے پاس ہے۔ کے ڈی کی ڈویلپ کی ہوئی زمین، اس کے حد سے بڑھے ہوئے اخراجات کے باعث، ہمیشہ مقدار میں نچلی درمیانہ آمدنی والے طبقے کی ضرورت سے کم اور قیمت میں اس طبقے کی قوتِ خرید سے باہر رہی ہے۔ نتیجتاً کے ڈی اے کے فروخت کیے ہوئے پلاٹ درمیانہ طبقے کے قبضے میں چلے جاتے ہیں اور سرمایہ کاری اور سٹے (speculation) کی نذر ہو جاتے ہیں، جب کہ نچلے درمیانہ طبقے کے لوگوں کو کچی بستیوں میں، ملکیت کے تحفظ کے بغیر، رہنا پڑتا ہے۔

موقع شناس سرکاری افسروں نے اس صورت حال کو جلد از جلد امیر بن جانے کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے سرکاری زمینوں پر قبضہ کر کے ان کے چھوٹے چھوٹے پلاٹ کم آمدنی والے افراد کے ہاتھ فروخت کرنے والے قبضہ گیروں اور دلّالوں کی ہمت افزائی اور پشت پناہی کی۔ یہ دلال افسروں کو زمین کی فروخت میں ان کا حصہ دینے کے علاوہ اس قسم کی نئی بستیوں میں عمدہ موقعے کے پلاٹ بھی ان کے لیے مخصوص رکھتے، اور بستیوں کے آباد ہو جانے اور قیمت بڑھ جانے کے بعد یہ افسر ان پلاٹوں کو فروخت کر کے بہت دولت کماتے۔

پلاٹ خریدنے والے کم آمدنی والے لوگوں کے ان پلاٹوں پر منتقل ہونے کے بعد بھی ان کی ضروریات دلّالوں کے ذریعے پوری ہوتیں۔ دلال نئی آبادی کے لیے پانی کے ٹینکر جاری کرانے، ٹرانسپورٹ شروع کرانے اور بے دخلی سے محفوظ رکھنے کے لیے حکام سے معاملت کرتا۔ ان خدمات کے عوض وہ آبادی کے باشندوں سے بھتا وصول کرتا جس کا بڑا حصہ سرکاری افسروں اور پولیس کو دیا جاتا۔ اس طرح دلالوں نے سہولتوں اور تحفظ کی طلبگار کچی آبادیوں اور حکومت کے درمیان رابطہ بن کر سیاسی طاقت حاصل کر لی۔ ۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ کے عشروں میں بسنے والی آبادیاں ان دلّالوں کے ہاتھوں میں رہیں؛ ان کی ڈویلپمنٹ انھیں کے ہاتھوں ہوئی اور بیشتر دلال ان علاقوں سے کاؤنسلر منتخب ہوئے۔

۱۹۷۰ کے عشرے میں مرکز اور سندھ میں پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی۔ شہر کی بیوروکریسی کے بجائے دلّالوں کی پشت پناہی کا کام بڑی حد تک پارٹی کے مقامی رہنماؤں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بہت سے قبضہ گیر اور دلال خود برسرِ اقتدار پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ نئی غیر قانونی

کچی آبادیوں کو ڈویلپ کرنے کے لیے سرکاری وسائل ــــ گاڑیاں، بُل ڈوزر اور آلات ــــ استعمال کیے گئے۔

زمین حاصل کرنے کے بعد کم آمدنی والے طبقے کا دوسرا اہم مسئلہ مکان بنانے کے رقم کا انتظام کرنے کا ہوتا تھا۔ زمین کا قانونی قبضہ نہ رکھنے کے باعث انہیں کسی سرکاری ادارے سے قرض کی سہولت نہ مل سکتی تھی۔ یہاں بھی غیررسمی سیکٹر ان کی مدد کرتا۔ ٹھلے والے ــــ سیمنٹ کے بلاک وغیرہ بنانے والے ــــ انہیں قرض پر تعمیراتی سامان فراہم کرتے۔ اس قرض کی وصولی کی ضمانت کے لیے سماجی دباؤ کو استعمال کیا جاتا۔ مکان بنانے یا کاروبار کرنے کے لیے نقد رقم سودخوروں سے قرض لی جاتی؛ ان قرضوں پر سود کی شرح ۲۰ سے ۳۰ فیصد ماہانہ ہوتی۔ سودخور ایسے مقروضوں کو کرائے کے غنڈوں کے ذریعے قابو میں رکھتے۔

کچی آبادیوں کے اس ڈرامے کے کردار ــــ قبضہ گیر، دلال، پولیس والے، سرکاری افسر، ٹھلے والے، سودخور اور غنڈے ــــ مختلف لسانی گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لینڈ مافیا میں اکثریت مہاجروں اور پنجابیوں کی تھی۔

کراچی میں بھی ملکیت کی پبلک ٹرانسپورٹ میں ایوب حکومت کے دور میں اضافہ ہوا۔ کراچی میں آنے والے پٹھان ایوب خان کے اہم سیاسی حمایتی تھے اس لیے بسوں کے بیشتر روٹ پرمٹ انہیں دیے گئے، گو مہاجروں اور پنجابیوں کو بھی روٹ پرمٹ ملے۔ اُس زمانے میں ڈرائیوروں اور کلینروں کی بڑی تعداد بھی انہیں دونوں لسانی گروہوں سے آتی تھی، مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد کم ہوتی چلی گئی اور پٹھانوں نے ان کی جگہ لے لی۔ بسوں کے مالکان اس کی وجوہیں بتاتے ہیں ان میں پٹھانوں کی کم اُجرت پر زیادہ دیر تک کام کرنے پر آمادگی، ٹریڈ یونینوں اور سوداکاری کی ایسوسی ایشنوں سے عدم دل چسپی، مالی معاملات میں دیانت داری اور مالک سے وفاداری شامل ہیں۔ بسوں کے ڈرائیور اور کلینر مالکان کے تنخواہ دار ملازم ہوتے تھے اور بسوں کی مرمت وغیرہ کی ذمے داری مالکان پر ہوتی تھی۔

منی بسیں کراچی میں بھٹو دور کے ابتدائی برسوں میں متعارف ہوئیں۔ ان کے روٹ پرمٹ سیاسی رشوت کے طور پر بالخصوص غیرپٹھان افراد کو دیے گئے؛ تاہم ان میں سے بیشتر نے یہ پرمٹ پٹھانوں کے ہاتھ بیچ دیے۔ منی بسیں بھی ابتدا میں تنخواہ دار ڈرائیوروں سے چلوائی جاتی تھیں۔ بعد میں رفتہ رفتہ یہ نظام قائم ہوا کہ روٹ پرمٹ رکھنے والا شخص ڈرائیور کو منی بس خریدنے کے لیے قرض دے دیتا اور سود کی بہت اونچی شرح پر ماہانہ قسطوں میں یہ قرض وصول کرتا۔ پرمٹ کے مالک کے لیے اس نظام کا فائدہ یہ تھا کہ اسے مالی معاملات پر ڈرائیور اور کلینر سے بحث نہ کرنی پڑتی اور وہ دھوکا کھانے کے خطرے سے محفوظ رہتا۔ اس کے علاوہ سود کی بدولت اس کی آمدنی بھی بہت بڑھ گئی۔ تنخواہ دار ڈرائیوروں کی جگہ سودی قرضے سے منی بس حاصل کر کے چلانے والے ڈرائیوروں نے لے لی ــــ اس طرح کراچی کا منی بس مافیا وجود میں آیا۔ اس مافیا کے سرکردہ لوگ، قرض فراہم کرنے والے، ڈرائیور اور کلینر پٹھان تھے۔

تاہم، ابتدا میں اس مافیا کی طاقت محدود تھی، کیوں کہ پبلک ٹرانسپورٹ اور پرائیویٹ بس کمپنیاں شہر کی ضروریات کے خاصے بڑے حصے کو پورا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود، اگرچہ مزید منی بسوں کی گنجائش موجود تھی، لیکن ٹرانسپورٹروں کی جانب سے اتنی بڑی مقدار میں قرض دستیاب نہ تھا۔ محکمے کے مطابق ۱۹۷۳ سے ۱۹۷۹ تک کے سات سال میں سودخور ٹرانسپورٹروں نے صرف ۶۰۰ منی بسوں کے لیے قرضے دیے، اور ان قرضوں کی مجموعی رقم صرف نو کروڑ روپے تھی۔

چوں کہ اُس وقت تک منی بس والے شہر کا پہیا جام کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور مالی دشواری کی وجہ سے منی بسوں کی تعداد بڑھانے سے قاصر تھے، اس لیے انتظامیہ کے لیے کسی خطرے کا باعث نہ تھے؛ اور ریاستی اداروں سے اُن کا رشتہ ان کی اسی حیثیت کے مطابق متعین ہوتا تھا۔ جہاں تک اُس وقت اموات کی شرح اور حادثات کا تعلق ہے تو اس وقت تیز رفتاری اتنی عام نہ تھی جتنی اب ہے، حادثات بھی کم ہوتے تھے کیوں کہ غالباً ڈرائیونگ لائسنس اتنی آسانی سے خریدے نہیں جاسکتے تھے جیسے آج خریدے جاسکتے ہیں؛ ٹریفک قوانین کی پابندی آج کل کے مقابلے میں بہتر تھی اور مسافروں سے بدسلوکی نہیں کی جاتی تھی۔

۱۹۷۰ کے عشرے کے آخری اور ۱۹۸۰ کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں کراچی کی معیشت میں ہیروئن کا پیسہ داخل ہو گیا اور اس نے ان تمام حالات کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اس دولت کے بل پر زمینوں کی قبضہ گیری، غیر قانونی ڈویلپمنٹ اور فروخت ایک نئے انداز میں شروع ہوئی؛ غیر سرکاری بینکاری (سودخوروں کے قرضوں) کا نیا نظام وجود میں آیا، اور ٹرانسپورٹ مافیا نے شہر کی سڑکوں پر کنٹرول حاصل کر لیا۔

اب کراچی میں بسنے والی کچی آبادیاں پرانی کچی آبادیوں سے مختلف ہیں۔ زمینوں پر سرکاری افسروں کی شراکت کے بغیر قبضہ کیا جانے لگا ہے اور افسروں کے لیے عمدہ پلاٹ محفوظ رکھنے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب افسران کو اس سرگرمی میں رخنہ نہ ڈالنے کے لیے مقررہ رقم پیشگی ادا کر دی جاتی ہے۔ اس طرح انتظامیہ کے اہلکار اب زمین کی غیر قانونی آبادکاری میں غالب حصےدار نہیں رہے بلکہ ان دلالوں کے ملازم بن چکے ہیں جن کو انھیں کی پشت پناہی سے معاشی اور سیاسی طاقت حاصل ہوئی تھی۔ آج کل قبضہ شدہ زمین پر پلاٹوں کی فروخت شروع ہونے سے پہلے آنے والی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک مسلح گروہ زمین کے سرحدی پلاٹوں پر قبضہ کر لیتا ہے۔ چند علاقوں میں قبضہ گیر پلاٹوں کو فروخت کرنے کے بجائے کرائے پر دینے لگے ہیں۔ ان نئی آبادیوں میں مکان بنانے کے لیے قرض نسبتاً کم شرحِ سود پر مل جاتا ہے۔ بادسندگان کی جائیداد یا دکان مسلح غنڈے چھین لیتے ہیں یا انھیں قرض ادا نہ کر پانے کی صورت میں بیگار کرنی پڑتی ہے۔ پرانی آبادیوں پر بھی کنٹرول کے لیے جنگ ہو رہی ہے۔ ان آبادیوں کی بیرونی سرحدوں پر واقع مکان آبادی سے باہر کے لوگ خرید رہے ہیں۔ مکان کے مالک کو جائیداد کی دگنی چوگنی قیمت پیش کی جاتی ہے، اور اگر وہ اس پر بھی مکان بیچنے پر

آمادہ نہ ہو تو طاقت کا استعمال ہوتا ہے۔ اورنگی میں سارس چوک اور میٹرو سینما کے درمیانی علاقے اور علی گڑھ کالونی کے وسط میں ایک اہم محلے کو باہر کے لوگوں نے خرید لیا۔ ان کچی آبادیوں کے رہنے والے، جو باقاعدہ قرار دی جانے والی تھیں، یہ سمجھتے ہیں کہ یہ باہر کے لوگ اور دلال انتظامیہ کے ساتھ مل کر ریگولرائزیشن کے عمل کو معطل کرانے کے ذمے دار ہیں تاکہ ان آبادیوں کے باشندے قانونی تحفظ سے محروم رہیں۔

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ کراچی میں سالانہ ۱۶ ہزار ۸ سو پلاٹ غیر قانونی طور پر قبضہ کر کے ڈویلپ کیے جاتے ہیں۔ اگر انتظامیہ کو رشوت دینے، غنڈوں کو بسانے اور مکان کی تعمیر کے لیے قرض فراہم کرنے کے اخراجات ایک ہزار روپے فی پلاٹ بھی رکھے جائیں تو مجموعی رقم ۱۶ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے بنتی ہے۔

ٹرانسپورٹ مافیا اور حکومت کے درمیان بھی رشتہ تبدیل ہوا ہے۔ کراچی کی سڑکوں پر ۱۹۷۸ سے لے کر ۱۹۸۷ تک نو سال کی مدت میں پانچ ہزار منی بسوں کا اضافہ ہوا۔ صرف ۱۹۷۹ میں کمیٹی کے چند ٹرانسپورٹروں نے منی بسیں چلانے والوں کو ڈیڑھ ارب روپے قرض دیے تھے۔ ان منی بسوں کی قانونی ملکیت قرض ادا ہو جانے تک ٹرانسپورٹر کے نام رہتی ہے۔ حادثے وغیرہ کی صورت میں گاڑی کی مرمت کے اخراجات ڈرائیور خود برداشت کرتا ہے۔ اگر وہ گرفتار ہو جائے تو ٹرانسپورٹر اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے اُسے چھڑاتا ہے اور اس کا معاوضہ نقد یا کسی اَور صورت میں وصول کرتا ہے۔ بعض صورتوں میں ان منی بسوں کو چلانے کے لیے بیگار کے مزدور (bonded labourers) بھی شہر میں لائے گئے ہیں۔

لینڈ مافیا اور اس کے شریکوں کے موجودہ طریقِ عمل اور ٹرانسپورٹ میں اچانک اور بے تحاشا اضافے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ان دونوں سرگرمیوں میں کثیر سرمایہ لگایا گیا ہے۔ یہ سرمایہ منشیات کے کاروبار سے حاصل ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ دونوں سرگرمیاں پٹھانوں کے ہاتھ میں ہیں بلکہ، ماضی کے برعکس، زمین کی قبضہ گیری کے ڈرامے کے کردار بھی اب بیشتر صوبہ سرحد سے آتے ہیں۔

ہر ڈرگ مافیا کا پہلا مقصد سیاسی طور پر طاقت حاصل کرنا ہوتا ہے تاکہ حکومت اس کے خلاف قدم نہ اٹھا سکے۔ سیاسی طاقت حاصل کرنے کا سب سے موثر طریقہ کم آمدنی والے علاقوں پر ــــ جہاں شہری انتظامیہ کی گرفت سب سے کمزور ہوتی ہے ــــ قبضہ کرنا ہے۔ اسلحے کی اسمگلنگ اور فروخت کے ذریعے عدم استحکام پیدا کرنا بھی ڈرگ مافیا کی اسٹریٹیجی کا حصہ ہوتا ہے۔ کراچی کی نئی کچی آبادیاں اس مافیا کے قبضے میں ہیں اور پرانی کچی بستیوں پر قبضے کی جنگ جاری ہے۔ اس کے علاوہ شہر میں ہونے والی ہر بد امنی کے بعد ہتھیاروں کی تعداد مسلسل بڑھتی رہی ہے۔

شہر کی انتظامیہ ان مافیاؤں کا مقابلہ کرنے کی سکت یا ارادہ نہیں رکھتی۔ یہ بات نہ صرف انتظامیہ

کے عمومی رویے سے، بلکہ بعض مخصوص واقعات سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ نومبر ۱۹۸۵ میں ٹرانسپورٹروں نے حکومت کو یہ مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ حادثے میں کسی شخص کے ہلاک ہونے کی صورت میں ڈرائیوروں پر محض دفعہ ۳۰۴ (الف) ___ یعنی حادثاتی موت ___ کے تحت مقدمہ درج کیا جائے، خواہ حادثے کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ اُسی سال کے شروع میں لیاری میں منشیات کے خلاف مہم چلانے پر پولیس کی فائرنگ اور آنسو گیس سے دو سو پُرامن مظاہرین زخمی ہوئے تھے اور منشیات کے خلاف مہم کا ایک کارکن عبدالواحد گولی لگنے سے ہلاک ہوا تھا۔ تحقیقاتی ٹریبونل نے اس کی تحقیقات مکمل کر لی تھی لیکن اس رپورٹ کو کبھی ظاہر نہیں کیا گیا۔ اس دوران منشیات کے خلاف تحریک چلانے والوں کو پولیس کی دھمکیاں ملنے اور بعض کو قید کیے جانے سے تحریک کا زور ٹوٹ گیا۔ کچی آبادیوں میں کام کرنے والے سماجی کارکنوں اور فلاح و بہبود کی تنظیموں کا تجربہ ہے کہ اس کام کے دوران منشیات یا اسلحے کے مسائل اٹھائے جائیں تو پولیس کی مداخلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کارکنوں کو دھمکیاں دی جاتی ہیں اور بہت سوں کو سبق سکھانے کے لیے حوالات میں بند بھی کیا گیا ہے۔

چوں کہ افیون کی کاشت صوبہ سرحد میں ہوتی ہے اور ہتھیار افغان جنگ کے سلسلے میں ملک میں داخل ہوتے ہیں، اس لیے یہ تعجب کی بات نہیں کہ ڈرگ مافیا کے بیشتر لوگ پٹھان ہیں۔ جہاں تک کراچی کی بعض پٹھان بستیاں مافیا کی سرگرمیوں کے مرکز بن چکی ہیں۔ ان میں سے کئی بستیاں ٹرانسپورٹ کے کاروبار کی پیداوار ہیں اور اس باعث شہر کے کئی اہم علاقوں میں داخلے کے راستے پر واقع ہیں۔ ۱۹۸۰ کی دہائی کے آخری برسوں میں پرانی کچی آبادیوں کی سرحدوں پر بسا کر مافیا نے انھیں اپنے لیے اور محفوظ کر لیا۔ کراچی میں داخلے کے ایک راستے سُپر ہائی وے پر سہراب گوٹھ اور دوسرے راستے نیشنل ہائی وے پر قائد آباد کو اپنے قابو میں کر کے اس مافیا نے ان دونوں سڑکوں پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ تاہم، اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ پاکستانی ڈرگ مافیا کو منشیات کی بین الاقوامی مارکیٹ سے منسلک کرنے والے بیشتر افراد غیر پٹھان ہیں۔ اس سلسلے کے اہم ناموں میں متعدد مہاجروں کے نام بھی لیے جاتے ہیں۔

ہر سال اربوں ڈالر مالیت کی ہیروئن کراچی سے گزر کر بیرونِ ملک جاتی ہے۔ اس طرح مافیا کا کراچی شہر اور اس کی انتظامیہ پر کنٹرول حاصل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس مافیا کو بین الاقوامی مافیا کی مدد بھی حاصل ہے۔ یہ سب کو علم ہے کہ امریکا کے ڈرگ مافیا کو لاطینی امریکا کے کئی ممالک میں سیاسی عدم استحکام پیدا کرنے اور امریکی مفادات کے فروغ کے لیے استعمال کیا گیا۔

مافیا کے اعمال سے سب سے بُری طرح متاثر ہونے والے کراچی کے پٹھان ہیں۔ شہری انتظامیہ سے ان کا رابطہ ہمیشہ دلالوں کی وساطت سے ہوتا ہے۔ کراچی میں زمین کی کھدائی کرنے والے مزدور تقریباً تمام پٹھان ہیں، اور ان میں سے بیشتر بیگار کرنے کے لیے صوبہ سرحد سے لائے گئے ہیں۔ تعمیراتی مزدور اُس ٹھیکیدار کو بھتا دیتے ہیں جو انھیں کام دلواتا ہے تاکہ وہ انھیں پولیس سے محفوظ رکھے اور دوسرے معاملات میں ان کی مدد کرے۔ یہاں تک کہ بوٹ پالش کرنے والوں کے بھی ٹھیکیدار ہیں جو

انہیں پولیس سے بچانے کے لیے باقاعدگی سے بھتا وصول کرتے ہیں۔ اس بات کا پورا امکان موجود ہے کہ جرائم کی دنیا کے یہ ٹھیکے دار اور دلال (پٹھان اور غیر پٹھان دونوں) مافیا کے ہاتھوں استعمال ہو رہے ہوں۔

پٹھان برادری کے اس بد ماحول کی ذمے دار کراچی کی بدعنوان اور غیر موثر انتظامیہ ہے۔ سرحد کے کسی گاؤں سے آنے والا پٹھان مزدور شہر کے انتظام، کام حاصل کرنے اور انصاف پانے کے طریقوں میں اپنے لیے گنجائش نہیں دیکھتا۔ کراچی میں قیام کے ابتدائی دنوں میں اسے رہائش کی دقت کا بھی سامنا ہوتا ہے۔ پٹھان قبائلی روابط اور ٹھیکے داری کا نظام اسے اس اجنبی اور مخاصمانہ شہر میں تحفظ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی مثالیں شاذونادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں کہ کسی پٹھان نے انصاف حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کیا ہو یا کسی تنازعے کو نمٹانے کے لیے کسی ریاستی ادارے کی یا پولیس کی مدد حاصل کی ہو۔ یہ تمام تنازعات ٹھیکے داروں کی یا جرگے کی وساطت سے طے کیے جاتے ہیں۔

کراچی کے مقامی باشندوں کی صورتِ حال پٹھانوں سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے پاس کوئی روایتی نسلی یا قبائلی تنظیم نہیں ہے جس سے وہ خود کو وابستہ کر سکیں۔ برادری کا جو نظام وہ ہندوستان سے یا پاکستان کے دیہی علاقوں سے ساتھ لائے تھے، شہری زندگی کے دباؤ کے باعث ختم ہو چکا ہے۔ ان کی فی کس اوسط آمدنی باقی پاکستانیوں کے مقابلے میں ڈیڑھ گنا ہے اور خواندگی کی شرح بھی زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں اب ان باشندوں کی دوسری نسل جوان ہو چکی ہے، جس میں کسی شہر میں نئے آ کر بسنے والوں کی سی مفاہمت پسندی اور قوت برداشت موجود نہیں ہے۔ اس نسل کے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے کچھ حقوق ہیں اور وہ ان حقوق کے لیے جدوجہد کرنے پر آمادہ ہیں۔ انفرادی طور پر شہر کی انتظامیہ سے روز کا واسطہ پڑنے کے باعث وہ انتظامی اہلکاروں کی بدعنوانی اور نااہلی سے واقف ہو چکے ہیں۔ انتظامیہ کے خلاف بغاوت کرنے پر انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس بغاوت سے مافیا کے مفادات کو بھی ٹھیس پہنچ رہی ہے۔ غیر مسلح اور غیر منظم ہونے کے باعث وہ بہت جلد خاموش کر دیے جاتے ہیں اور حالات جوں کے توں برقرار رہتے ہیں۔

شہری سہولتوں کے اس فقدان اور مافیا کے مفادات کے علاوہ ایک اہم عنصر بے روزگاری میں اضافے کا بھی ہے۔ مارشل لا دور میں نو سال تک سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے باعث شہر کی سیاسی قوتیں باقی ملک سے کٹ کر رہ گئیں۔ کراچی کی کچی آبادیوں میں اس بات کا شعور بڑھتا جا رہا ہے کہ انتظامیہ کی بے اثری اور مافیا کے پھیلاؤ کے درمیان گہرا تعلق موجود ہے۔ یہ احساس بھی شدید ہو رہا ہے کہ ملک کے ۲۵ فیصد محصولات کراچی شہر سے جمع کیے جاتے ہیں جب کہ ان محصولات کا صرف ڈیڑھ فیصد حصہ کراچی پر خرچ کیا جاتا ہے۔

کراچی کی پٹھان اور غیر پٹھان آبادی کی صورتِ حال، مافیا کے کردار اور انتظامیہ کی ناکارکردگی کے پیشِ نظر اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ۱۹۸۰ کے عشرے کے آخری برسوں میں کراچی کے

لسانی تصادم میں اضافہ ہوا۔ کئی سیاسی گروہوں نے مختلف بیانات میں ایم کیو ایم کو اس لسانی تصادم کا ذمےدار ٹھہرایا۔ تاہم، ایم کیو ایم اور کراچی میں برسوں سے جاری شورش کے درمیاں تفریق کرنا ضروری ہے۔ ایم کیو ایم کے مطالبات محدود نوعیت کے ہیں وہ درمیانہ طبقے کے مہاجروں کے مفادات کا تحفظ چاہتی ہے، الگ مہاجر شناخت کی بات کرتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے کوٹا سسٹم کی مخالفت کرتی ہے اور سندھ کی آبادی میں مزید غیر فطری تبدیلیوں کو روکنا چاہتی ہے۔ ایم کیو ایم ایک منظم جماعت ہے اور اس کی مرکزی لیڈرشپ موجود ہے۔ دوسری طرف شہری شورش ناکافی سہولتوں، غیر موثر انتظامیہ اور مافیا کی طاقت کے خلاف ہے۔ اس کی کوئی مرکزی لیڈرشپ نہیں ہے اور اس کی اسٹریٹ پاور وہ کچی آبادیاں ہیں جن پر ابھی مافیا کا قبضہ نہیں ہوا ہے۔ ایم کیو ایم شہری بےاطمینانی اور شورش کی قیادت کرنے کے لیے کوشاں نظر نہیں آتی اور اپنے طبقاتی مزاج کی وجہ سے وہ شاید ہی ایسا کرے۔

***

بلدیاتی ادارے ــــــ اختیار اور بےاختیاری

۱۹۸۷ میں سندھ کے بلدیاتی اداروں کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ایم کیو ایم کو کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن، اور شہر کی چار میں سے تین رورل کاؤنسلوں، کا کنٹرول حاصل ہو گیا۔ اس کے علاوہ اسے حیدرآباد میونسپل کارپوریشن میں بھی مطلق اکثریت حاصل ہوئی۔ مگر یہ کنٹرول ایم کیو ایم کو وہ اختیار نہیں بخش سکتا تھا جس کے ذریعے وہ ان شہروں کے انتظام میں کوئی تبدیلی لا سکتی، اور نہ ہی اس انتخابی کامیابی سے ایم کیو ایم کو ان شہروں کے ترقیاتی پروگراموں پر نمایاں طور پر اثرانداز ہونے کا موقع مل سکتا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ۱۹۷۹ کے لوکل گورنمنٹ آرڈیننس نے شہروں کی میونسپل کارپوریشنوں کو مکمل طور پر صوبائی بیوروکریسی کے ماتحت کر دیا ہے۔

تاہم، اس انتخابی کامیابی کی سیاسی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ سندھ کے شہری علاقوں کی مہاجر آبادی نے نہ صرف نوجوان قیادت پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا بلکہ اس نظریے پر بھی اثبات کی مُہر لگائی کہ وہ خود کو الگ قومیت سمجھتی ہے۔ اس اثبات نے مہاجر تشدد پسندی کے ساتھ مل کر کراچی اور حیدرآباد کے بیشتر غیر مہاجر گروہوں میں تشویش پیدا کر دی۔ سندھی قوم پرست بھی، جو شروع میں ایم کیو ایم کے لیے ہمدردانہ جذبہ رکھتے تھے، اس صورت حال سے خطرہ محسوس کرنے لگے۔ اور اس طرح سندھ کے متعدد سیاسی اور لسانی گروہوں کے مابین نئے رشتے اور رابطے قائم کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔

۱۹۷۹ کا لوکل گورنمنٹ آرڈیننس منتخب میونسپل کاؤنسلوں اور صوبائی حکومت کے درمیاں

تعلق کو متعین کرتا ہے۔ اس قانون کی دفعہ ۲۷ کے تحت صوبائی حکومت کو شہری انتظامیہ کے مالی امور میں بالادستی حاصل ہے۔ صوبائی حکومت کارپوریشنوں کو ان تمام ٹیکسوں، محصولوں، چنگیوں اور فیسوں کو، جو کارپوریشنیں عائد کرنے کی مجاز ہیں، گھٹانے، بڑھانے، معطل یا موقوف کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ صوبائی حکومت کارپوریشنوں کے منظور کردہ بجٹ میں ترمیم کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے۔

کراچی اور حیدر آباد کے شہری علاقوں کی منصوبہ بندی کی ذمہ داری منتخب میونسپل کارپوریشنوں پر نہیں بلکہ کراچی اور حیدر آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹیوں پر ہے۔ ان دونوں اداروں کو سرکاری ٹیکنوکریٹ چلاتے ہیں جو کسی بھی طرح ان شہروں کے بلدیاتی اداروں کو نہیں بلکہ صوبائی حکومت کو جواب دہ ہیں۔ اس طرح محصولات جمع کرنے اور خرچ کرنے کا اختیار نہ رکھنے اور شہری علاقوں کی ترقیاتی منصوبہ بندی میں شرکت سے محروم ہونے کے باعث ایم کیو ایم کی حمایت یافتہ منتخب حکومتیں ان دونوں شہروں کے عظیم مسائل سے نمٹنے سے مکمل طور پر قاصر تھیں۔ حکومت کے وسیع اختیارات کے پیشِ نظر یہ بات قابلِ فہم ہے کہ کراچی اور حیدر آباد کے منتخب میئروں سے ان شہروں کے کمشنروں نے حلف لیا تھا۔

یہ منتخب کاؤنسلیں بہرحال حکومت کے خلاف احتجاج کر سکتی تھیں اور آرڈیننس میں دیے گئے منتخب بلدیاتی اداروں کے اختیارات میں اضافے کا مطالبہ اٹھا سکتی تھیں۔ لیکن اس امکان سے نمٹنے کے لیے بھی آرڈیننس میں متعدد دفعات موجود ہیں۔ دفعہ ۵۳ کے تحت صوبائی حکومت کو کارپوریشنوں کی عمومی نگرانی کا اختیار حاصل ہے تاکہ ان کی کارروائیاں آرڈیننس سے تجاوز نہ کریں۔ بصورتِ دیگر حکومت ایسے احکام جاری کر سکتی ہے جن سے کارپوریشنوں کے اقدامات آرڈیننس کے دائرے میں رہیں۔ اس دفعہ کے تحت صوبائی حکومت کارپوریشن کی کسی بھی ایسی کارروائی کو معطل کر سکتی ہے جو اس کے خیال میں آرڈیننس سے مطابقت نہ رکھتی ہو، اور کارپوریشن کو حکومت کے تجویز کردہ احکام پر عمل کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ اگر حکومت یہ سمجھتی ہو کہ کارپوریشن آرڈیننس میں دیے گئے فرائض ادا کرنے میں ناکام رہی یا اپنی مالی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکی، تو وہ دفعہ ۵۸ کے تحت کارپوریشن کو چھ ماہ کے لیے معطل کر سکتی ہے۔ تاہم اگر منتخب کاؤنسلوں کے احتجاج کو اسٹریٹ پاور کی حمایت حاصل ہو تو وہ، خاص طور پر کراچی جیسے باشعور اور پُراشتعال شہر میں، بہت بڑی طاقت بن سکتی ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں منتخب اداروں کی سرکشی کے اثرات کو کم رکھنے کی غرض سے حکومت نے کراچی کو چار خودمختار رونل میونسپل کارپوریشنوں میں تقسیم کر دیا جن میں سے ہر ایک کے انتظامیہ، مالیات، انجینئرنگ، صحت اور دوسرے شعبے الگ الگ ہیں۔ اگرچہ ان میں سے تین رونل کاؤنسلوں میں ایم کیو ایم کی اکثریت تھی، حکومت کے اہلکاروں کا خیال تھا کہ ایم کیو ایم کی اکثریت والی شہری کاؤنسل کی نسبت ان رونل کاؤنسلوں سے الگ الگ نمٹنا زیادہ آسان ہوگا۔ شہر کو اس طرح چار انتظامی حصوں میں تقسیم کر دینے کے اقدام سے بلدیہ کراچی کا اتحاد آنے والے وقتوں کے لیے بھی بہت کمزور ہو کر رہ گیا ہے۔ اس اتحاد پر

ایک اَور صرف رو مل کاؤنسلوں کے مابین مالی ناراری نے بھی لگائی ہے، کیوں کہ ایک کاؤنسل کے دائرۂ اختیار میں بندرگاہ اور سائٹ کا صنعتی علاقہ ہونے کی وجہ سے اسے آکٹرائے کی مد میں بہت آمدنی ہو گی، جب کہ دوسری کاؤنسل کی آمدنی بہت کم ہو گی۔ اس کے علاوہ نکاس اور پانی کی لائنیں ایک دوسرے سے متصل علاقوں میں جاتی ہیں جو مختلف کاؤنسلوں کے انتظام میں ہیں، اور اس بنا پر تنازعات پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

اس آرڈیننس کے تحت، ملک کی دیگر میٹروپولیٹن کارپوریشنوں کی طرح، کراچی اور حیدرآباد کی کارپوریشنوں کے ذمے چند مخصوص کام ہیں، جن میں کوڑے کرکٹ کی صفائی، سڑکوں کی مرمت اور درستی، اور میونسپل حدود میں آنے والی کچی آبادیوں کو مستقل کرنے اور رہیں اور جائیداد کا انتظام کرنے کے کام شامل ہیں۔ ان کاموں کو موثر طریقے پر انجام دینے کے لیے شہر میں رہائشی زمین کی ڈویلپمنٹ کے نظام کا درست ہونا ضروری ہے، اور یہ کارپوریشنوں کے نہیں بلکہ ڈویلپمنٹ اتھارٹیوں کے دائرہ اختیار میں ہے۔ کارپوریشنوں کی کم اہم سرگرمیوں میں پارکوں، چڑیاگھروں، ڈسپنسریوں، فائر بریگیڈوں اور محدود تعداد میں اسکولوں کا قیام اور انتظام شامل ہیں۔ ٹرانسپورٹ اور ٹریفک مینجمنٹ جیسے اہم کام، جن کا شہر کی بدامنی سے خاص تعلق رہا ہے، کارپوریشنوں کے اختیار سے باہر ہیں۔

***

ایم کیو ایم ایسی نچلے درمیانہ طبقے کی لیڈرشپ اور شہری عوام کی حمایت کے ساتھ بہتر شہری سہولتوں کی فراہمی کے لیے ایک اہم سیاسی لابی کا کردار ادا کر سکتی تھی۔ لیکن اسے شہر میں بدامنی کی صورتِ حال اور شہری آبادی کے کئی لسانی گروہوں اور صوبائی حکومت کے اہلکاروں میں ایم کیو ایم مخالف جذبات کا بھی سامنا تھا۔ اس کے علاوہ رو مل کارپوریشنوں کو مناسب طور پر ملازمین کی فراہمی اور ان کی سرگرمیوں کے شروع ہونے کے لیے خاصا وقت درکار تھا۔ ان تمام مسائل کی موجودگی میں، اور میونسپل کارپوریشنوں کے ٹھیکیداروں اور اعلیٰ افسروں کے عدم تعاون کے پیشِ نظر، یہ صاف دکھائی دیتا تھا کہ ایم کیو ایم کے منتخب کاؤنسلر ایسے کام پر حاوی نہ ہو سکیں گے، نتیجتاً ترقیاتی بجٹ کا بڑا حصہ استعمال ہوئے بغیر ضائع ہو جائے گا اور یا تو ایم کیو ایم کے کاؤنسلروں کو سیاسی حکمت عملی کے تحت استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑے گا یا ان کی جگہ غیر منتخب نامزد کاؤنسلر مقرر کیے جائیں گے۔

1981 کی مردم شماری کے مطابق کراچی کی آبادی میں کل ۵۴ فیصد مہاجر، ۱۴ فیصد پنجابی بولنے والے (جن کی اکثریت مشرقی پنجاب سے ترکِ وطن کر کے آنے والوں پر مشتمل ہے)، ۱۱ فیصد سندھی اور بلوچ، ۱۱ فیصد میمن، کچھی، بوہری اور گجراتی بولنے والی دوسری برادریاں، اور ۱۰ فیصد پٹھان ہیں۔ بلوچیوں اور سندھیوں کی اکثریت اندرونِ شہر رہتی ہے اور شہری پرولتاریہ کا حصہ ہے۔

مشرقی سماج کے تارکین وطن اور کراچی کے رہنے والے، تجارت پیشہ، کاریگر اور سفید کالر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا طبقاتی پس منظر ویسا ہی ہے جیسا ایم کیو ایم کی لیڈر شپ کا ہے، اور انہیں بھی روزگار اور تعلیم کے انہیں مسائل کا سامنا ہے جن سے مہاجروں کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس طرح یہ طبقے ایم کیو ایم کے پروگرام کو سمجھتے ہیں اور اس سے ہمدردی بھی رکھتے ہیں، انہیں صرف مہاجر قومیت کے تصور سے اختلاف ہے۔ ایم کیو ایم کے ابھرنے کے باعث یہ گروہ خود کو شہری سیاست کے بڑے دھارے سے علیحدہ محسوس کرنے لگے اور سے اتحاد کی تلاش میں سرگرم ہو گئے جو انہیں برابری کی سطح پر اپنے ساتھ شامل کرے اور ان کے مفادات کا تحفظ کرے۔

بلدیاتی انتخابات میں ایم کیو ایم کی کامیابی کا سب سے نمایاں اثر سندھی قوم پرستوں سے اس کے رشتے پر پڑا۔ ایم کیو ایم نے یہ موقف اختیار کیا کہ سندھی اور مہاجر سندھ میں دو مختلف قومیتیں ہیں۔ ایم کیو ایم کے برخلاف، جو مہاجروں کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتی ہے، کوئی بھی سندھی قوم پرست گروپ سندھیوں کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جیسے سندھ محاذ کو چھوڑ کر باقی تمام قوم پرست بڑی غیر صوبائی پارٹیوں کا حصہ ہیں۔ ابتدا میں جیسے سندھ کی ایم کیو ایم کے ساتھ دوستی سندھیوں میں نامقبول بھی نہیں رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۸۳ کی تحریک کی ناکامی کے بعد یہ خیال زور پکڑ گیا تھا کہ مرکز کے خلاف سندھ میں کوئی بھی تحریک مہاجر اکثریت کے شہری علاقوں کی شرکت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

سندھ کی آبادی میں اتفاقِ رائے پیدا کرنے کے لیے ایم کیو ایم اور سندھی قوم پرستوں کے درمیان مکالمہ ضروری ہے۔ اس سلسلے میں چار مسائل کو حل کرنا ہو گا

(۱) مہاجر قومیت کا تصور سندھیوں کے لیے ناقابل تسلیم ہے کیوں کہ اس سے سندھ کی تقسیم کے عمل کو تقویت ملتی ہے۔ یہ تصور ملکی سطح کی پارٹیوں کو بھی منظور نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس طرح دوسری ثقافتی اقلیتیں بھی خود کو قومیت تسلیم کرانے کا مطالبہ کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایم کیو ایم شہری درمیانہ طبقے کی تنظیم ہے اور ایسے سیاسی ماحول میں کام کر رہی ہے جس پر جاگیردار طبقے اور اس کے حواریوں کا مکمل غلبہ ہے، یہ موجودہ سیاسی اسٹیبلشمنٹ ایم کیو ایم کو اپنے لیے ایک خطرے کے طور پر دیکھتی ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلوں کا ہے۔ ایم کیو ایم مہاجر آبادی کے تناسب سے ملازمتوں اور داخلوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سندھی آبادی ویٹیج (کوٹا سسٹم) کے موجودہ نظام کے فوائد سے محروم ہو جائے گی۔

(۳) اردو اور سندھی زبانوں کا تعلیمی اداروں اور انتظامیہ میں استعمال تیسرا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ شاید سب سے زیادہ آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔

(۴) چوتھا مسئلہ بنگلادیش سے محصورین کی واپسی کا ہے جس کی ایم کیو ایم حمایت کرتی ہے اور

سندھی مخالف ہیں۔

سندھی قوم پرست ایم کیو ایم سے مکالمے کے سلسلے میں کسی جلدی میں نہیں ہیں۔ ان کا اندازہ ہے کہ حالات ابھی ان کے حق میں ہیں۔ کاٹھور کے ایک سندھی کاؤنسلر نے، ۱۹۸۷ کے بلدیاتی انتخابات کے بعد، اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا "سندھ میں اتفاق رائے ہو جائے گا، مگر اس سے پہلے ایم کیو ایم کو مرکز کی طرف سے اچھی طرح مار پڑنی چاہیے جیسا کہ ہمارے ساتھ ۱۹۸۳ میں ہوا تھا۔ پہلے انہیں اکیلے جدوجہد کرنی ہوگی، اس کے بعد ایم کیو ایم اور سندھی قوم پرستوں میں معاہدہ ہو سکتا ہے۔

***

صوبائی اور قومی سیاست کا تناظر

نومبر ۱۹۸۸ کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں پاکستان کے عوام نے ان قومی پارٹیوں کے حق میں ووٹ دیا جنہوں نے ۱۹۷۳ کے آئین کی بحالی، پارٹی کی بنیاد پر الیکشن اور بنیادی انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کی تھی۔ بقیہ پاکستان میں ووٹنگ کے رجحان کے برخلاف، سندھ کی اردو بولنے والی آبادی نے مقامی اور لسانی تنظیم ایم کیو ایم کو ووٹ دیا۔ کراچی اور حیدر آباد میں ایم کیو ایم کی مکمل کامیابی اور دیہی سندھ میں پیپلز پارٹی کی اکثریت نے صوبے کو دو مختلف حصوں میں بانٹ دیا۔ ایم کیو ایم کے ابھرنے کی اصل وجوہ کا کئی طرح سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھ کی مہاجر آبادی بتدریج پاکستان کے سیاسی دھارے سے کٹ گئی ہے۔ جاگیردارانہ پس منظر رکھنے کے باعث ایم کیو ایم مرکز پرست سیاسی پارٹیوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس پارٹی میں چھوٹے تاجر، سفید کالر ورکر اور کسی حد تک اردو بولنے والی پرولتاریہ شامل ہے۔ مگر ایم کیو ایم بائیں بازو کی پارٹیوں کا بھی ساتھ نہیں دے سکتی جنہوں نے ماضی میں پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ تقسیم کے بعد کی نسل، جو کراچی اور حیدر آباد کے شہری ماحول میں جوان ہوئی ہے، ان رجعت پسند پارٹیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہے جن کی ان کے والدین نے حمایت کی تھی۔

اگرچہ سندھ کی اردو بولنے والی آبادی تجارت اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں ترقی کر رہی تھی، یہ بات شدت سے محسوس کی جا رہی تھی کہ فوج، ملکی سیاست اور بیورو کریسی میں اس آبادی کی شمولیت دشوار ہو گئی ہے؛ اور پاکستان میں اصل اقتدار انہیں اداروں کے پاس ہے۔ ایم کیو ایم خوف اور علیحدگی کی اسی فضا میں وجود میں آئی۔ اس نے اس مسئلے کو مہاجروں کے لیے ایک الگ مضبوط پلیٹ فارم مہیا کر کے طے کیا ہے۔ اس پلیٹ فارم سے اس نے مہاجر قومیت کے تسلیم کیے جانے کی آواز بلند کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ صوبائی اور ملکی سطح پر مہاجروں کی متناسب نمائندگی کا مطالبہ کیا ہے۔ ایم کیو ایم کی سب

سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس نے ایسے مسائل اور ان کے حل کو بڑے صوبائی اور قومی مسائل کے ساتھ منسلک نہیں کیا۔

پاکستان کا آئین سوائے پاکستانی قومیت کے کسی اَور قومیت کو تسلیم نہیں کرتا اور ایم کیو ایم کے سوا باقی تمام قومیتوں پر اصرار کرنے والی پارٹیوں کو الیکشن میں شکست ہوئی ہے۔ پاکستان کے آئین میں ترمیم کیے بغیر مہاجر قومیت کا تسلیم کیا جانا یا مہاجر اکثریت کے ایک نئے صوبے کا قیام ناممکن ہے۔ مستقبل قریب میں ایسی کوئی آئینی ترمیم خارج از امکان نظر آتی ہے۔ ایسی کسی ترمیم کی غیر موجودگی میں صوبائی اور ملکی سطح پر ایم کیو ایم کی متناسب نمائندگی کی تجویز بھی ناقابلِ عمل ہے۔

جہاں تک کوٹا سسٹم کے خاتمے کا تعلق ہے، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سندھ کی آبادی کا ۴۸ فیصد حصہ شہروں میں رہتا ہے۔ شہری آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ اردو بولنے والوں (یا مہاجروں) پر مشتمل ہے۔ دیہی سندھ کی آبادی کے ۸۹ فیصد لوگ سندھی، بلوچی اور سرائیکی بولنے والے ہیں۔ مہاجروں کی اکثریت تعلیم یافتہ ہے اور سندھ کی دیہی آبادی کی طرح جاگیرداروں کے تابع نہیں ہے۔ کوٹا سسٹم کا خاتمہ سندھیوں کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا۔ ان کے موقف کو نہ صرف ان کی ووٹنگ پاور کی حمایت حاصل ہے، بلکہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ سندھ میں جاگیرداری نظام کے ہوتے ہوئے بھی ایک درمیانہ طبقہ اُبھر رہا ہے۔ یہ طبقہ پیشہ ورانہ ملازمتوں میں مہاجروں کی اجارہ داری کے لیے ایک چیلنج ہے، اگرچہ اس نے اب تک مہاجروں کو تجارت کے شعبے میں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچایا ہے۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں ایم کیو ایم کی اپنے حلقے میں کامیابی نے کئی اہم سوالات پیدا کیے: متشدد مہاجروں کو قومیت اور متناسب نمائندگی دلانے میں ناکامی کی صورت میں ایم کیو ایم کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا ایم کیو ایم کی لیڈرشپ میں شامل عملیت پسند ورارتیں اور غیر اہم معادات حاصل کر کے خاموش بیٹھ جائیں گے؟ کیا ایم کیو ایم کے متشدد حمایتی ایسی جدوجہد کراچی اور حیدرآباد کی سڑکوں پر جاری رکھیں گے اور اس طرح مہاجروں اور سندھیوں کے درمیان خطرناک تفریق میں اضافہ کریں گے؟ کیا اس طرح کی تفریق کے بڑھنے سے مرکز کو صوبائی امور میں مداخلت کا موقع نہیں ملے گا اور صوبائی خودمختاری کی امنگوں کی حوصلہ شکنی نہیں ہوگی؟ اگر ایم کیو ایم نے اپنے مطالبات ترک کر کے پاکستان، بالخصوص سندھ، کے بڑے مسائل کے حل کے لیے متبادل حکمت عملی اختیار کی تو کیا مہاجروں کی آبادی ایم کیو ایم سے بددل ہو جائے گی؟ اس طرح کے سوالات پیدا نہ ہوتے، اگر ایم کیو ایم نے کوٹا سسٹم کے مسئلے کو دیہی سندھ کی پس ماندہ صورتِ حال کے ایک لازمی حصے کے طور پر دیکھا ہوتا اور یہ کہا ہوتا کہ شہری علاقوں میں سہولتوں اور ملازمتوں کے فقدان کی وجوہ وہی ہیں جو دیہی علاقوں میں بیماری، بے روزگاری اور زرعی انفرااسٹرکچر کے انحطاط کی ذمے دار ہیں۔

سندھ کے مہاجر مسئلے کا حل، جس کے ذریعے صوبے میں تفریق کی فضا ختم ہو سکے، ایم کیو ایم کے نہیں بلکہ حکومت کے پاس ہے۔ بڑی حد تک یہ مسائل پورے پاکستان میں موثر لوکل گورنمنٹ کے ادارے قائم کر کے حل کیے جا سکتے ہیں۔

***

حل کی تلاش

نئے معاشرتی معاہدے (سیو سوشل کانٹریکٹ) کے تحت ملدیاتی اداروں کی تشکیلِ نو کی جائے گی اور انہیں بہتر بنایا جائے گا۔ ڈویژنوں کو مرحلہ وار ختم کیا جائے گا اور اقتدار براہ راست نچلی سطحوں پر منتقل کیا جائے گا۔
(وزیرِ اعظم بے نظیر بھٹو۔ منشور ۱۹۹۳ تبدیلی کے لیے ایک ایجنڈا۔)

کراچی کی صورتِ حال کے دو مرکزی کرداروں کے درمیان کسی تصفیے کی امیدیں کم از کم فی الوقت باقی نہیں رہی ہیں۔ حکومت نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ وہ دہشت گردوں کے ساتھ گفت و شنید نہیں کرے گی۔ تاہم، کراچی کی بیش تر آبادی نے ان دہشت گردوں کے حق میں ووٹ دیا ہے اور سیاسی عمل سے بے دخلی انہیں اور زیادہ ان دہشت گردوں کی بانہوں میں دھکیل رہی ہے۔ کراچی کے غیر مہاجر بھی، خاص طور پر نچلی آمدنی والے علاقوں میں رہنے والے جو گزشتہ دو سال سے قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کے محاصرے میں ہیں، ایم کیو ایم کو اصل مسئلے کے طور پر نہیں دیکھتے۔ فرقہ وارانہ یا لسانی کشیدگی کی جگہ ان علاقوں میں محلے کی سطح پر ایک جتی پیدا ہوئی ہے اور ان میں یہ احساس بھی نمایاں ہوا ہے کہ جس انداز میں برسرِ اقتدار پارٹی کی قیادت کراچی کو دیکھتی ہے اور شہر پر حکومت کر رہی ہے، وہ سراسر غلط ہے۔ سالہا سال کی حکومتی بدعنوانیوں، استحصال، جور و ستم اور مافیا کی جانب سے (جس کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اسے حکومت کی سرپرستی حاصل ہے) شہری سہولتوں کی وصولی کے باعث ان علاقوں میں رہنے والوں کے درمیان تعلقات مضبوط ہوئے ہیں۔

دہشت گردوں کے خلاف حکومت کی مہم اور برسرِ اقتدار پارٹی کے ترجمانوں کے کراچی کے بارے میں متضاد بیانات نے حکومت کی جانب سے کیے گئے فیصلوں کے اعتبار کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ ان میں سے ایک فیصلہ رینجرز کو کراچی میں دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے بے انتہا اختیارات دینا ہے۔ جن علاقوں میں رینجرز نے آپریشن کیے ہیں، وہاں کے باشندے رینجرز کی بربریت، لوٹ مار اور مسلمہ قانونی اصولوں کی خلاف ورزی کی شکایت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس آپریشن کے

نتیجے میں ممکنہ دہشت گردوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک غیر جانبدار کمیٹی بنائی جائے جو ان الزامات کی تحقیق کرنے کے بعد بداعمالی کا ارتکاب کرنے والے رہنماؤں کو سخت سزا دے۔ مگر ہم سب جانتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ حکومت کے دوسرے فیصلے کے ذریعے اسپیشل کورٹس ایکٹ ۱۹۹۲ میں ترمیم کر دی گئی ہے۔ اس ترمیم کی رو سے کسی ملزم کے پولیس کی تحویل میں دیے ہوئے اقبالی بیان کو سزا کے لیے کافی شہادت سمجھا جائے گا۔ ہماری قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں جس طریقے سے کام کرتی ہیں، اور جتنے لوگ ہر سال پولیس کے تشدد سے ہلاک ہو جاتے ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے یہ ترمیم زیادہ بڑے پیمانے پر بدعنوانی، لوگوں کو ہراساں کرنے اور سیاسی مقصد کے لیے دھاندلی کی کھلی چھوٹ دینے کے مترادف ہے۔ کراچی کے نچلی آمدنی والے علاقوں کے لوگ اس ترمیم کے مفہوم اور اس کے اثرات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ان کا سوال یہ ہے کیا برسرِاقتدار پارٹی ان حلقوں کے حقوق کے بارے میں سوچنا گوارا نہیں کرے گی جہاں سے اسے معلوم ہے کہ اسے کبھی ووٹ نہیں ملیں گے؟

ان غریب علاقوں میں رہنے والے لوگ بتاتے ہیں کہ برسرِاقتدار پارٹی کے افراد کراچی میں ہلاکتوں کے منصوبے کا ذمے دار ڈرگ مافیا اور بیرونی ایجنٹوں کو ٹھہراتے ہیں۔ لیکن منشیات کے اڈے اب بھی ان علاقوں میں موجود ہیں اور پولیس بدستور ان کی سرپرستی کر رہی ہے۔ ان اڈوں کے چلانے والوں میں سے کوئی شخص گرفتار نہیں کیا گیا۔ اور گرفتار کیے جانے والے افراد میں سے کسی پر بیرونی ایجنٹ ہونے کی فردِ جرم عائد نہیں کی گئی ہے۔ یہ بات بھی بار بار سننے میں آتی رہی ہے کہ پولیس اپنی تحقیقات کے مطابق ایم کیو ایم (حقیقی) اور سپاہِ صحابہ کو ہلاکتوں کا ملزم ٹھہراتی ہے، جبکہ رینجرز کی تحقیقات میں ایم کیو ایم (الطاف گروپ) کو ملزم ٹھہرایا جاتا ہے۔ لوگ ان تحقیقات کو انتظامیہ کے مختلف گروپوں کے درمیان مفادات کے تصادم کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

برسرِاقتدار پارٹی کی اعلیٰ ترین قیادت نے کہا تھا کہ کراچی کی صورتِ حال ڈیڑھ سال میں معمول پر آ جائے گی۔ کراچی کی صورتِ حال یہ ہے کہ پانی، نکاسِ آب، سڑکوں، ٹرانسپورٹ، تعلیم، صحت، روزگار اور جرائم کے مسائل تیزی سے بڑھ رہے ہیں، اور اسی رفتار سے ان سہولتوں کا انتظام کرنے کی ذمے دار ایجنسیوں کی نااہلی اور بدعنوانی بھی بڑھ رہی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ توانائی کے بحران پر قابو پا لیا جائے گا؛ مگر بجلی کی پیداوار بذاتِ خود اچھی حکومت، روزگار، جان اور عزت کے تحفظ اور طبعی اور معاشرتی طور پر قابلِ عمل انفرااسٹرکچر کا بدل نہیں ہو سکتی۔

کراچی کی آبادی اور برسرِاقتدار پارٹی کے درمیان ایک بامعنی مکالمہ روز بروز دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی صورت پیدا کی جا رہی ہے کہ اگر دباؤ کے تحت اس قائم ہو بھی جائے تو کسی بھی بحران کے موقعے پر اسے تباہ کیا جا سکے۔ کراچی کی صورتِ حال کو سندھ کے تناظر میں دیکھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے، اور یہ بات برسرِاقتدار پارٹی اور حزبِ اختلاف کے نمائندوں اور پریس پر بھی صادق آتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی دیہی علاقوں سے امرِواقع میں (de facto) علیحدگی ہو چکی ہے۔ سیاسی طور پر اس سے بڑا کوئی اور المیہ نہیں ہو سکتا، اور اس کے نتیجے میں لسانی فسادات اور خوں ریزی کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

کراچی کے لوگ شہر کے بحران اور اس کو سیاسی عمل سے الگ کر دیے جانے پر بڑے پیمانے پر ردِعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس موضوع پر بے شمار ریلیاں، میٹنگیں، سیمینار اور ورکشاپ ہو چکی ہیں؛ ان میں سے کچھ شہر کی بیرونی سرحدوں پر واقع کچی آبادیوں کے شیڈوں میں، کچھ غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کے دفتروں میں اور کچھ پنج ستارہ ہوٹلوں میں ہوئی ہیں۔ ان کا اہتمام کرنے والوں میں زندگی کے تمام شعبوں کے لوگ (مختلف، اور اکثر اوقات متصادم، سیاسی رجحانات اور لسانی پس منظر رکھنے والے) شامل ہیں۔ ان کے منتظمین نے پیشہ ور ماہرین، تاجروں، محلہ اور کمیونٹی انجمنوں، مذہبی تنظیموں اور خواتین کے گروپوں کو اپنے ساتھ ملایا ہے۔ ان تمام اجلاسوں میں ـــــ خواہ وہ کچی آبادیوں میں منعقد ہوئے ہوں یا پنج ستارہ ہوٹلوں میں ـــــ ایک مطالبہ مشترک تھا کہ بلدیاتی انتخابات فوراً کرائے جائیں اور منتخب کاؤنسلروں کو کراچی کی بحالی کے منصوبوں اور ترقیاتی پروگراموں میں موثر طور پر شریک کیا جائے۔ اس شہر سے وابستگی کے احساس کا اتنی شدت سے اظہار اس سے پہلے کبھی نہیں کیا گیا ہے، اور پاکستان کے کسی بھی شہر میں صورتِ حال کو بہتر بنانے کی خواہش کی اتنی دل سوز وکالت بھی اس سے پہلے کبھی نہیں کی گئی۔

تاہم، اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ بلدیاتی انتخابات اپنے طور پر کراچی کے بحران کا حل نہیں ہیں، اور انتخابات کے دوران اور اس کے فوراً بعد پیدا ہونے والے احساسِ مسرت کا خاتمہ مایوسی پر ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ نظام میں بلدیاتی اداروں کو شہری حکومت (city government) کے طور پر کام کرنے کے لیے ضروری اختیارات نہیں دیے گئے ہیں۔ منتخب بلدیاتی ادارے صرف اس صورت میں موثر طور پر اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں جب ان کا صوبائی ترقیاتی ایجنسیوں اور صوبائی بیوروکریسی کے ساتھ اعتماد کا رشتہ ہو، یہ ادارے اپنے محصولات وصول اور خرچ کرنے پر اختیار رکھتے ہوں اور انہیں صوبے میں برسرِاقتدار پارٹی کا تعاون حاصل ہو۔ سندھ کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ ایک ناممکن مطالبہ ہے۔ بالفرضِ محال اگر باہمی اعتماد کی یہ فضا پیدا بھی ہو جائے تو اس امر کی ضمانت نہیں ہے کہ وہ پائیدار بھی ثابت ہو گی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ بلدیاتی اداروں کے پاس تکنیکی اور انتظامی پیشہ ورانہ صلاحیت موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود کراچی کے شہریوں کا مطالبہ بالکل جائز ہے، کیوں کہ موثر لوکل گورنمنٹ کی غیر موجودگی میں، اور باشندوں کی عملی شراکت کے بغیر، شہر میں واقع ہونے والی معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں کو اداروں کی صورت نہیں دی جا سکتی۔

شہر کی موجودہ طبعی، معاشرتی اور اقتصادی صورتِ حال کے بارے میں کراچی کے باشندوں کی اس تشویش کو ضائع نہیں ہونے دیا جانا چاہیے، ورنہ معاشرے میں مزید تشدد اور انتشار پیدا ہو گا۔ اگر حکومت

شہریوں کے اس حد تک تعمیری استعمال کرنے سے قاصر ہے تو کراچی کے باشندوں کو خود عملی قدم اٹھانا چاہیے۔ غیر سرکاری تنظیمیں، پیشہ ورانہ انجمنیں، کمیونٹی گروپ اور تاجر برادری کے نمائندے ایک ثقافتی ایجنڈے پر متفق ہو سکتے ہیں۔ وہ شہر کے معاملے سے دل چسپی رکھنے والے تمام گروپوں کی ایک وسیع الاساس (broad-based) تنظیم قائم کر سکتے ہیں، اور موثر شہری حکومت قائم کرنے کے لیے انتظامیہ پر اجتماعی دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ ایسے مطالبے کو حقیقت پسندانہ اور قابلِ عمل بنانے کے لیے انھیں ایک کمیٹی بنانی چاہیے جس کے ارکین کو ان کی خدمات کے لیے معاوضہ ادا کیا جائے۔ اس کمیٹی کو یہ ذمےداری سونپی جائے کہ تمام پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوئے عملی تجاویز پیش کرے۔ ان تجاویز میں کراچی میں موثر شہری حکومت قائم ہونے کے نتیجے میں ملک اور صوبے کی سیاست پر پڑنے والے اثرات کو مدِنظر رکھنا خاص طور پر ضروری ہوگا۔ ان تجاویز کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی جائے اور کراچی سے منتخب ہونے والے قومی اور صوبائی اسمبلی کے ارکان اور منتخب یا نامزد کاؤنسلروں کو ان سے واضح طور پر آگاہ کیا جائے، تاکہ ان کو شہر کے تمام بلدیاتی، صوبائی اور قومی انتخابات میں ایک اہم نکتے کے طور پر پیش کیا جائے۔ شہری حکومت فوراً یا آسانی سے حاصل نہیں ہوگی۔ اس عرصے میں شہریوں کو (منتخب یا نامزد) کاؤنسلروں اور عوام کے درمیان رابطے کو مضبوط کرنا ہوگا اور اپنے محلوں میں شراکتی ترقیاتی ماڈل کے اصولوں کو اختیار کرنا ہوگا؛ کراچی میں ایسے ماڈل کے کامیابی سے چلنے کی ایک مثال اورنگی پائلٹ پروجیکٹ ہے۔

مندرجہ بالا ایجنڈے کے دو حصے ہیں۔ تبدیلی ہمیشہ اُس وقت آتی ہے جب سیاست داں، انٹرسٹ گروپ اور شہری عوام کسی متفقہ نتیجے پر پہنچتے اور قابلِ عمل متبادل دریافت کرتے ہیں۔ یہ متبادل ہمیشہ شہر کے انٹرسٹ گروپ اور عوام پہلے دریافت کرتے ہیں، اور وہی اس کے نفاذ پر اصرار کرتے ہیں۔ کسی تبدیل شدہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے موثر ادارے اور موزوں انتظامی اقدام ہمیشہ معاشرے کے معاشی اور اقتصادی رجحانات کو سمجھنے اور ان کا ساتھ دینے کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ کراچی میں ایک بڑا معاشرتی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ کراچی کے باشندوں اور ان کے نمائندوں کا فرض ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کی مطابقت میں موزوں ادارے قائم کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ ان معاشرتی تبدیلیوں کا ساتھ دینے سے پہلوتہی کرنے کا نتیجہ مزید انتشار اور خون خرابے کی صورت میں برآمد ہوگا۔

کراچی کی صورتِ حال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان میں سے اکثر تحریریں پیش گوئی اور ماضی کے ماتم پر مشتمل ہیں۔ متعدد تحریروں میں معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی صورتِ حال کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ چند ایک تحریروں میں شہری انتظامی ایجنسیوں، عدالتی نظام اور بلدیاتی اداروں کی تشکیلِ نو سے متعلق تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ کراچی کے مسائل کے مختلف عناصر کا احاطہ کرتے ہوئے صورتِ حال کا واضح جائزہ لیا جائے۔ اس طرح کے جائزے سے تین اہم امور سامنے آتے ہیں۔

(۱) کراچی کے باشندے ملک کے سیاسی عمل سے مکمل طور پر علیحدہ کر دیے گئے ہیں اور اقتدار

کے مراکز میں کسی بھی سطح کی رسائی نہیں رکھتے۔ کئی منتخب رہنما جیل میں ہیں اور جس سیاسی پارٹی کو انھوں نے ووٹ دیے تھے اسے برسرِ اقتدار پارٹی ظلم و استبداد کا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔

(۲) کراچی کی انتظامیہ بدعنوان، نااہل اور بے بس ہے۔ شہری ایجنسیاں اور ان کے ملازمین ٹھیکے داروں اور لینڈ مافیا کے خدمت گزار بن چکے ہیں۔ شہر کے ترقیاتی ادارے بدعنوان سیاست دانوں، زمین کے قبضہ گیروں، ڈویلپروں اور ان کے حواریوں کے مفادات کی خدمت کرتے ہیں۔ متعدد قومی اور بین الاقوامی کنسلٹنٹ شہر کی ترقی کے لیے عظیم الشان منصوبے تیار کرتے ہیں جو شہر کی حقیقی صورت حال سے قطعی مطابقت نہیں رکھتے۔ نتیجتاً یا تو ایسے منصوبوں پر کبھی عمل نہیں ہوتا، یا انھیں ادھورا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کو مدتوں سے سیاسی مخالفین پر ظلم و تشدد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے، چناں چہ وہ کسی کو جواب دہ نہیں رہ گئی ہیں۔ یہ بے بس شہریوں سے جبراً بھتے بٹورنے اور پورے پورے محلوں کو یرغمال بنانے کے علاوہ وہ نہ صرف تمام مجرمانہ سرگرمیوں کو تحفظ دیتی ہیں بلکہ ان میں پوری طرح ملوث ہیں۔ کراچی کے شہری ان ایجنسیوں سے خوف کھاتے اور نفرت کرتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایجنسیوں میں مختلف سطحوں پر سفارش کی بنیاد پر ملازم رکھے گئے افراد متعین ہیں جو اپنے عہدے کے لیے ضروری قابلیت نہیں رکھتے۔ چوں کہ ان کا تقرر سیاسی بنیاد پر کیا گیا ہے، اس لیے وہ کسی نظم و ضبط کے پابند نہیں ہیں۔

(۳) شہر کے اونچے طبقوں، تاجروں، پیشہ ور ماہروں اور دانش وروں کا شہر کے مسائل گرفتہ علاقوں اور ان میں رہنے والے شہریوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ درحقیقت کراچی کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی منظر نے مختلف طبقوں کے درمیان اس قسم کے رابطوں کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ اسی لیے یہ اونچے طبقے، جو کسی بھی شہر کے لیے ایک اثاثہ اور شہر کے مسائل کے حل کا وسیلہ ہوتے ہیں، کراچی کے بحران کے حل کے لیے محض نیک اندیشی (مگر بے معنی) امن ریلیاں اور سیمینار منعقد کرنے اور سفید جھنڈے لے کر جلوس نکالنے ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ قانون کے احترام اور اخلاق کی عدم موجودگی میں یہ طبقے بھی رشوت اور تعلقات کے ذریعے اپنے مالی مفادات کا دفاع کرنے پر مجبور ہیں اور اس طرح درحقیقت نہ صرف جرائم اور استحصال کے نظام کا سہارا بن چکے ہیں بلکہ سیاسی مار مار اور ظلم و جبر کے عمل میں ایک فریق بھی ہیں۔

***

کوئی بھی شہر، خواہ وہ معاشرتی اور آبادیاتی طور پر کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو، پُرامن نہیں رہ سکتا اگر اسے سیاسی عمل سے علیحدہ اور اقتدار کے مرکزوں تک رسائی سے محروم کر دیا جائے، اگر اس کی انتظامیہ اور شہری ایجنسیاں بدعنوان اور نااہل ہوں اور اگر اس کے اہلِ رائے باشندے بے بس اور تنہا رہ جائیں۔

ایسی صورت میں انتہا پسند — جو ہر سیاسی نظریے یا رجحان کی بیرونی سرحد پر موجود ہوتے ہیں — حالات کے رخ کو کنٹرول کرنے لگتے ہیں۔ تاریخ میں کئی شہروں میں اسی طرح ہوا ہے اور حالیہ زمانے میں متعدد لاطینی امریکی، ایشیائی اور افریقی شہر انہیں حالات سے گزرے ہیں۔

کراچی میں انتشار کا عمل قیام پاکستان کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ تاہم، شہر کی موجودہ صورت حال ۱۹۸۰ کے عشرے سے شروع ہوئی ہے۔ افغان جنگ کے دوران کراچی منشیات اور اسلحے کے مافیا کا علاقائی ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ مافیا نے جلد ہی شہر کی معیشت اور سیاست میں اپنی اہم جگہ بنا لی اور اس طرح انتظامی امور میں بھی دخیل ہو گیا۔ اہلِ اقتدار افراد اور اداروں نے مافیا کی بڑے پیمانے پر سرپرستی کی۔ انہیں دنوں میں مارشل لا حکومت نے شہر کے تمام انتہا پسند سیاسی، مذہبی اور لسانی گروہوں کو اسلحہ اور سرمایہ فراہم کیا تاکہ انہیں حکومت کی مخالف کسی شورش کو دبانے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ رشوتیں اور ملازمتیں دے کر سیاسی وفاداریاں خریدی گئیں۔ اگرچہ یہ عمل کراچی یا پاکستان کے لیے نیا نہیں تھا، مگر ۱۹۸۰ کے عشرے میں اس طریقِ کار کو باقاعدہ رواج سا دے دیا گیا، اور جس سے شہری زندگی کا ہر پہلو متاثر ہوا۔ اس عمل نے سیاسی تشدد اور ظالمانہ دھاندلیوں کے کلچر کو مستحکم کیا، اور کراچی کی انتظامی اور شہری ایجنسیاں اس عمل کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کرتی رہیں۔ بدقسمتی سے یہ عمل مارشل لا کے خاتمے کے بعد بھی جاری رہا اور نہ صرف کراچی کی انتظامیہ بلکہ شہر کے ڈرامے کے تمام سیاسی اداکار اپنا اپنا کردار ضیاالحق کے دور میں تیار کردہ مسودے کے مطابق انجام دیتے رہے۔ حکومتی ایجنسیوں اور پیپلز پارٹی کا کردار ایم کیو ایم (الطاف گروپ) اور ایم کیو ایم (حقیقی) کی تقسیم اور تصادم کی صورت میں واضح ہے۔ ایم کیو ایم کی جانب سے جام صادق کی حکومت کی غیر اصولی حمایت اسی ڈرامے کا دوسرا حصہ ہے۔ مراعات دینے کے لیے کراچی کے سرکاری شہری محکموں کو غیر ضروری ملازمین سے بھر دینا بھی اسی کی ایک مثال ہے۔

مارشل لا کے خاتمے کے بعد بھی مہاجر تشخص کے ابھرنے اور نتیجتاً سندھ کے دو حصوں میں بٹ جانے سے پیدا ہونے والے مسائل پر کسی جانب سے کوئی اصولی اور حقیقت پسندانہ موقف اختیار نہیں کیا گیا؛ تمام پارٹیوں (بشمول ایم کیو ایم) نے موقع پرستی کا رویہ اختیار کیے رکھا۔ مسائل کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے اور انتہا پسندانہ موقف دونوں جانب اس قدر سخت ہو چکے ہیں کہ لوگوں نے اب اس پر اعتراض کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ مسائل کے حل کے سلسلے میں کراچی کے باشندوں کی آخری امیدیں دہشت گردوں کے خلاف آرمی ایکشن سے ختم ہو گئیں۔ کراچی کے غریب اور نچلی درمیانہ آمدنی کے تمام علاقوں نے (اپنی آبادی کے لسانی پس منظر سے قطع نظر) اس ایکشن کے نتیجے میں تکلیف اٹھائی ہے، اور بہت سوں کی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ جس بے حسی کے ساتھ یہ ایکشن شروع کیا گیا اور بعد میں پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے کراچی کے بارے میں جس قسم کے بیانات دیے ہیں، ان کے نتیجے میں کراچی کے سیاسی میدان میں کٹر انتہا پسندوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ کراچی کی

صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے مستحکم اقدامات کی ضرورت ہے جو صرف اسی وقت کیے جا سکتے ہیں جب تمام متعلقہ پارٹیوں کے قائدین کراچی اور پاکستان کے مجموعی مفاد کی خاطر ادنیٰ ذاتی اور پارٹی مفادات سے بلند ہو سکیں۔

(۱) سب سے پہلے پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان مکالمے کے لیے ایک سازگار فضا قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ابتدائی اقدامات حکومت کو کرنے ہوں گے اور ایم کیو ایم کو ان کا فراخ دلی کے ساتھ جواب دینا ہوگا۔ اگر اس کے لیے ایم کیو ایم کے رہنماؤں کے خلاف مقدمات کا واپس لینا ضروری ہو تو حکومت کو اس پہلو پر بھی ہمدردی سے غور کرنا چاہیے۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوگا (اور یقیناً آخری مرتبہ بھی نہیں) کہ دہشت گرد اور مجرم قرار دیے جانے والوں سے کوئی جائز حکومت مذاکرات کا آغاز کرے۔ ان مذاکرات میں پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کی لیڈرشپ سندھ میں شہری دیہی تفریق ختم کرنے، یا بصورت دیگر اسے تسلیم کر کے باقاعدہ ادارے کی صورت دینے پر اپنی توجہ مرکوز کرے۔ واضح رہے کہ اس کا مطلب لازمی طور پر سندھ کی تقسیم نہیں ہے، بلکہ بلدیاتی اداروں کو زیادہ اختیارات اور خودمختاری دے کر بھی ایسا کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو فیصلے کیے جائیں وہ سیاسی طور پر حقیقت پسندانہ، انتظامی اعتبار سے قابلِ عمل اور اقتصادی اور آبادیاتی لحاظ سے پائیدار اور خود کفیل ہوں۔

(۲) کراچی کی انتظامیہ کو بامقصد بنایا جائے اور اس کی تشکیلِ نو کی جائے کیوں کہ اس کے بغیر پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان کوئی بھی معاہدہ کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ حکومت کو چاہیے کہ چیف سیکرٹری، کمشنر، انسپکٹر جنرل پولیس، کے ڈی اے کے ڈائرکٹر جنرل اور کے ایم سی کے سربراہ کو کم از کم پانچ سال کے لیے مقرر کرے۔ ان افسروں کا تقرر ایم کیو ایم کی رضامندی سے کیا جانا چاہیے۔ یہ سب ایک ٹیم کی صورت میں کام کریں اور انھیں کراچی کی انتظامیہ اور شہری ایجنسیوں کی مکمل تشکیلِ نو کا مکمل طور پر ذمے دار بنایا جائے۔ اس ضرورت کے تحت انھیں وسیع اختیارات دینے ہوں گے۔ وہ اپنا ماتحت عملہ خود منتخب کرنے اور نااہل ملازمین کو برطرف کرنے کے مجاز ہوں۔ حکومت اور ایم کیو ایم دونوں ان افسروں کو دھمکانے یا ان پر دباؤ ڈالنے سے باز رہنے کی ضمانت فراہم کریں۔ ان افسروں کی اعانت کے لیے ہر سطح پر شہر کی بنیادی صورتِ حال کا تجربہ اور ادراک رکھنے والی غیر سرکاری تنظیموں، کمیونٹی کے نمائندوں اور ان ماہرین پر مشتمل شہری کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ ان تمام اقدامات کی نگرانی ایک غیر جانبدار کمیٹی کرے اور وہی ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے معاہدے کے نفاذ کی بھی نگرانی کرے۔ اس طرح جواب دہی، نگرانی اور شفافیت کا نظام وجود میں آ سکتا ہے جس میں شہر کے باشندے نہ صرف شریک ہوں گے بلکہ اس کو کنٹرول بھی کریں گے۔

(۳) بلدیاتی اداروں کے انتخابات شہری انتظامیہ کی تشکیلِ نو کے فوراً بعد — اور بحالی کا عمل شروع ہونے کے ۱۸ ماہ کے اندر اندر — منعقد کرا دیے جائیں۔

(۴) بلدیاتی اداروں کے ڈھانچے میں مناسب تبدیلی کی جائے۔ لوکل گورنمنٹ کو ترقیاتی منصوبے تیار اور نافذ کرنے اور محصولات جمع کرنے کا اختیار دیا جائے اور امن و امان قائم رکھنے کے عمل میں ایک فریق کے طور پر شریک کیا جائے۔ منتخب کاؤنسلوں کے ادارے کو زیادہ مستحکم بنایا جائے اور انہیں ایسے علاقوں میں شہری سہولتوں کی منصوبہ بندی کرنے اور عمل میں لانے کا براہِ راست یا بالواسطہ ذمہ دار بنایا جائے۔

اگر کراچی کی صورتِ حال کے تمام فریق دیانت داری سے اس بدقسمت شہر کو پُرامن بنانے کی خواہش رکھتے ہیں تو انہیں اس قابلِ عمل ایجنڈے کو مکمل طور پر نافذ کرنا ہوگا۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان کوئی مفاہمت شہر کی انتظامیہ کو نئی شکل دیئے بغیر شہر کے مسائل حل نہیں کر سکے گی۔ حکومت کی جانب سے غیر قانونی تارکینِ وطن پر سختی یا محلہ کمیٹیوں کو اسلحہ دینے کی کوششیں نہ صرف ناکام ہوں گی بلکہ ان اقدامات سے صورتِ حال اَور زیادہ بگڑ جائے گی۔ اوّل الذکر اقدام کے نتیجے میں بے بس شہریوں سے بڑے پیمانے پر جبری رشوت کی وصولی کا عمل تیز ہوگا جو ان میں اَور زیادہ احساسِ بے گانگی پیدا کرے گا۔ دوسرے اقدام سے بیشتر صورتوں میں محلے کی سطح پر نئے مافیا وجود میں آئیں گے جنہیں قانون نافذ کرنے والی بدعنوان ایجنسیوں کی سرپرستی حاصل ہوگی۔ بلدیاتی انتخابات کا انعقاد ہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے کراچی کے لوگ اقتدار میں شراکت حاصل کر سکتے ہیں۔

کراچی جیسی صورتِ حال کئی اعتبار سے پاکستان میں ہر جگہ موجود ہے۔ سیاسی عمل سے کاٹ دی گئی آبادیاں اور بدعنوان اَور نااہل انتظامیہ ہر جگہ موجود ہے۔ بحران کے موقعے پر ہر جگہ کراچی جیسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ کراچی کی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے مندرجہ بالا اقدامات کامیاب ہو کر پورے پاکستان کے لیے مثال بن سکتے ہیں۔ جو کوئی اس ملک کے زوال سے پہلے ان اقدامات پر عمل کرا سکے، اسے تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔

***

بحران کی شدّت

'کراچی آتش فشانوں میں گھرا ہوا ہے۔
اختر حمید خان (۱۹۸۴ میں کراچی کی کچی آبادیوں سے متعلق ایک بیان۔)

کراچی کی صورتِ حال کی رپورٹوں کے مطابق گزشتہ ڈیڑھ سال کے عرصے میں بیسیوں افراد پولیس کی حراست میں مارے گئے، بہت سے افراد نام نہاد پولیس مقابلوں میں ہلاک کیے گئے اور ۱۲ سے ۷۰ سال تک کی عمر کے پچاس ہزار سے زائد افراد کو قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے زدوکوب کیا اور ان

کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر انہیں تھانوں اور میدانوں میں لے جایا گیا جہاں نقاب پوش مخبروں سے ان کی شناخت کرائی گئی۔ ان کارروائیوں میں اکثر لوگوں کو (ان کی عمر سے قطع نظر) اپنی قمیصیں اتارنے کا حکم دیا گیا اور ان کی آنکھوں پر انہیں قمیصوں سے پٹی باندھی گئی۔ حراست میں لیے جانے والے متعدد افراد کا کہنا ہے کہ کئی گھنٹوں تک ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی رہیں اور اس دوران ان کو نہ پانی اور کھانا ملا اور نہ رفع حاجت کے لیے جانے دیا گیا۔ کئی لوگوں نے اپنی شلوار میں پیشاب کر دیا۔ اس کے علاوہ کراچی میں پولیس والے بھی سیکڑوں کی تعداد میں مارے گئے۔

محاصرے میں آنے والے تمام علاقوں سے ایک جیسی خبریں موصول ہوئی ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے لات مار کر گھر کا دروازہ توڑ دیتے ہیں، وہ مکینوں کو گالیاں بکتے اور ذلیل کرتے ہیں، اور بہت سے موقعوں پر گھر کے افراد کے ساتھ ساتھ قیمتی اشیا بھی لے جاتے ہیں۔ کئی لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے گھر کے افراد کو رہا کرانے کے لیے قانون نافذ کرنے والوں کو پانچ ہزار سے پچاس ہزار روپے تک رشوت کے طور پر ادا کیے ہیں۔ حراست کے دوران ان لوگوں پر اتنا تشدد کیا گیا کہ ان میں سے کم ہی اپنے پیروں پر چل کر گھر واپس پہنچ سکے۔ کئی افراد جنہوں نے قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں یا ان کے دلالوں کو رشوت دی ہے، بتاتے ہیں کہ یہ رقم انہوں نے اپنی قیمتی اشیا (زیادہ تر زیورات) فروخت کر کے، اپنا مکان گروی رکھ کر یا ۱۰ سے ۱۵ فیصد ماہانہ کی شرح پر پیشہ ور سودخوروں سے قرض لے کر ادا کی ــــ انہیں نہیں معلوم کہ وہ یہ قرض کس طرح ادا کریں گے۔

اس کے علاوہ ایسے گرفتار شدہ رشتے داروں کا پتا لگانا بھی سخت دشوار کام ہے۔ کئی کئی دن دلالوں سے گفت و شنید میں گزر جاتے ہیں (یہ دلال قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں اور لوگوں کے درمیان رابطہ کرانے کے لیے اچانک نمودار ہو جاتے ہیں اور اپنی خدمات کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں)۔ گھر والوں کو انتظامیہ اور اس کے دلالوں کی طرف سے بار بار بتایا جاتا ہے کہ ان کے گھر کے زیرِ حراست فرد کے دہشت گرد ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہے اور اسے موت کی سزا ملے گی؛ ان خبروں کی وجہ سے تاوان کی رقم بڑھ جاتی ہے۔ شہریوں کا کہنا ہے کہ رشوت کی رقم کا تعین زیرِ حراست فرد کی لسانی شناخت، اور اس کے رشتے داروں کی مالی حالت اور انتظامیہ یا حکومت کے حامی سیاست دانوں تک رسائی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

محاصرہ اٹھنے کے بعد علاقے میں متعدد ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔ اسلحہ بردار افراد، جو کبھی کبھی اپنا چہرہ ڈھانکے ہوتے ہیں، لوگوں کے گھروں میں داخل ہو جاتے ہیں اور اسلحے کے زور پر قیمتی اشیا یا رقم لوٹ لیتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان ڈکیتیوں میں پولیس ملوث ہوتی ہے کیوں کہ دوسرے تمام مشتبہ افراد علاقے سے بھاگ چکے ہوتے ہیں۔ لوگ خوف کے باعث ان واقعات کی رپورٹیں درج نہیں کراتے۔ اگر ان محاصروں کا مقصد لوگوں کو بے انتہا خوف زدہ کرنا اور ان کے دلوں سے شہر کی انتظامیہ پر رہے سہے اعتبار کو ختم کرنا ہے تو بلاشبہ یہ مقصد مکمل طور پر حاصل ہوا ہے۔

جن علاقوں میں محاصرے کیے گئے ہیں وہ غریب اور مزدور پیشہ طبقوں کے علاقے ہیں۔ ان باشندوں کا قومی اسمبلی میں کوئی نمائندہ نہیں ہے، ان کے صوبائی اسمبلی کے رکن اور کاؤنسلر یا تو قید میں ہیں یا روپوش ہیں، پاکستان کے دوسرے علاقوں کے باشندوں کے برخلاف، ان کی کوئی برادری یا کوئی چودھری نہیں ہے، نہ جرگے یا پنچایت کی طرح کا کوئی ادارہ ہے جو ان کے اور حکومتی ایجنسیوں کے درمیان رابطے کا کام انجام دے سکے۔

پولیس اور رینجروں کی کارروائیوں کی وجہ سے ان علاقوں کے متمول اور نسبتاً بااثر باشندے، جو ان حالات میں رابطے کا کام کر سکتے تھے، ان علاقوں کو چھوڑ چکے ہیں یا چھوڑنے والے ہیں۔ ان علاقوں میں مکانوں کی قیمتیں تیزی سے گری ہیں (حسنہ برانس علاقوں میں مکانوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے) اور ان میں سے بعض علاقوں میں ۳۰ فیصد کے قریب مکان خالی پڑے ہیں۔ اثرورسوخ رکھنے والے باشندوں کے چلے جانے سے ان علاقوں کے رہنے والے پولیس کے خوف زدہ کر کے جبری رشوت وصول کرنے، مافیا کے استحصال، کے ایم سی، کے ڈی اے اور کے ای ایس سی کی بے حسی اور بدعنوانی، اور دلالوں اور ٹھیکے داروں کی غنڈا گردیوں کے مقابل خود کو بالکل بے مدافعت سمجھنے لگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اب تو کوئی فریاد سننے والا بھی نہیں رہا۔

کراچی میں حکومت سے وابستہ یا غیروابستہ کچھ حلقے پولیس اور رینجروں کی کارروائیوں کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کارروائیوں کی وجہ سے سیاسی دہشت گردی کی کمر ٹوٹ گئی ہے اور انہیں جاری رکھ کر دہشت گردی کا مکمل خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جن علاقوں میں محاصرے کیے جا رہے ہیں وہاں دہشت گردوں کی حمایت کی جاتی ہے، چنانچہ ان علاقوں کو اس بات کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اس کے علاوہ بعض لوگ ایسے ہیں جو ماورائے عدالت ہلاکتوں (extra-judicial killings) کو بھی درگزر کرنے کو تیار ہیں۔ ان کی دلیل ہے کہ اگر قانونی تقاضوں کا خیال رکھا جائے تو استغاثے کی نااہلی اور بدعنوانی، اور زیرِحراست مجرم گروہوں اور سیاسی اسٹیبلشمنٹ سے قریبی رابطوں، کی وجہ سے بیشتر گرفتارشدہ ملزم عدالتوں سے بری ہو جائیں گے۔ وہ اپنی بات کی شہادت میں کئی نظیریں بھی پیش کرتے ہیں۔

تاہم، اس طرح کی رائے رکھنے والے افراد دو اہم نکتوں کو نظرانداز کر رہے ہیں: (۱) پاکستان کے سیاسی اور انتظامی کلچر اور کراچی میں انارکی کی صورتِ حال کے پیشِ نظر لوگوں کو قتل کرنے کی آزادی کا لازماً سیاسی انتقام لینے کی غرض سے استعمال ہوگا اور اس کے نتیجے میں مروجہ عدالتی اور انتظامی طریقِ کار کو پسِ پشت ڈال کر لوگوں کا بدترین استحصال کیا جائے گا۔ اخباری رپورٹوں اور شہر کے مضافاتی (peri-urban) علاقوں سے ملنے والی خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کرنے کی آزادی کا بےروک ٹوک استعمال بڑھ رہا ہے۔ اگر یہ خبریں درست ہیں، اور اگر یہ عمل جاری رہتا ہے، تو تاریخ یہی کہتی ہے کہ اس کے ردِعمل میں اہم سیاسی تغیر یا انقلاب رونما ہوتا ہے۔

(۴) کراچی کی صورتِ حال کی بنیادی وجوہ صرف مہاجر حلقوں میں احساسِ محرومی، ایک موثر شہری حکومت کی عدم موجودگی، مہاجر نوجوانوں کا جنون اور سادہ لوحی اور مہاجر لیڈرشپ کی شرانگیز گر سپر مین جیسی خصوصیات نہیں ہیں۔ نہ ہی اس کا سبب محض بے رحم ڈکٹیٹر اور سیاست داں، افغان جنگ کی باقیات یا شہر میں موجود مختلف مافیاؤں کی ہوسِ زر اور اندھی قوت ہے۔

یہ درست ہے کہ یہ تمام عوامل کراچی کی صورتِ حال پر اثرانداز ہوئے ہیں۔ لیکن اس صورتِ حال کی بنیادی وجہ شہری سرمایہ دارانہ کلچر کا پاکستان میں رائج طرزِ حکومت (جو اقربا پروری، بدعنوانی، تعصب اور استحصال پر مبنی ہے) سے تصادم ہے۔ یہ تصادم اس گہرے احساسِ علیحدگی سے پیدا ہوا ہے جو شہر کے نچلے درمیانہ اور مزدور طبقے میں موجود ہے۔ یہ علیحدگی کا احساس پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی پھیل رہا ہے، مگر اب تک کہیں اور اس احساس کا سیاسی شکل میں اظہار نہیں ہوا ہے۔ اس احساسِ علیحدگی کو ختم کرنے کے لیے کراچی کے مہاجر اور غیر مہاجر نوجوان ہر اُس قیادت کا ساتھ دینے کو آمادہ ہوں گے جو حکومت کے روایتی طرزِ عمل سے، یا خود حکومت سے، جنگ کرے گی۔ ایم کیو ایم کی لسانی شناخت کے باعث زیادہ تر غیر مہاجر اس سے اپنا تعلق قائم نہیں کر سکے؛ اس کے باوجود یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ کراچی کی غیر مہاجر آبادی نے ایم کیو ایم کے خلاف پولیس اور رینجرز کی کارروائیوں کی حمایت نہیں کی ہے۔

ایس ایچ او بہادر علی کے قتل کے واقعے سے حکومت اور کراچی کے نچلے درمیانہ طبقے کے درمیان فاصلے کی بخوبی نشان دہی ہوتی ہے۔ مئی ۱۹۹۴ میں تیموریہ تھانے کے ایس ایچ او بہادر علی اور چار سپاہیوں کے دہشت گردوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے بعد وزیراعظم پاکستان اور وزیراعلیٰ سندھ نے مقتول پولیس اہلکاروں کو خراجِ تحسین پیش کیا اور ان کے خاندانوں کو خاطر خواہ معاوضہ دیا، جب کہ مذکورہ تھانے کی حدود میں واقع محلوں میں شہریوں نے مٹھائی بانٹ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

کراچی ماسٹر پلان کے سروے کے مطابق شہر میں نچلے درمیانہ طبقے کی آبادی، جو ۱۹۷۳ میں کراچی کی کل آبادی کا ۱۴ فیصد تھی، ۱۹۸۹ میں شہر کی آبادی کے ۳۱ فیصد تک پہنچ چکی تھی۔ ۱۹۷۳ میں شہر میں نچلی درمیانہ آمدنی والے گھروں کی تعداد ۷۰ ہزار تھی جب کہ ۱۹۸۰ میں یہ تعداد دو لاکھ اور ۱۹۸۹ میں پانچ لاکھ کو عبور کر چکی تھی۔ ان طبقوں کی محرومیاں اور ان کا سیاسی اظہار شہر کی کچی آبادیوں سے اپنی قوت حاصل کرتا ہے۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ کراچی میں (سرکاری شمار کے مطابق) ۴۰ فیصد سے (غیر سرکاری شمار کے مطابق) ۵۰ فیصد تک شہری کچی آبادیوں میں رہتے ہیں۔ گزشتہ عشرے میں کچی آبادیاں ۹ فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھی ہیں جب کہ شہر کی آبادی میں مجموعی اضافے کی شرح ۴.۸ فیصد سالانہ رہی ہے۔ ان میں سب سے پرانی کچی آبادیوں کے بیشتر مکین مہاجر ہیں جبکہ بعد میں قائم ہونے والی کچی آبادیوں کے مکینوں میں ملک کے شمالی علاقوں سے آنے والے لوگ بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں۔

کچی آبادیاں اس لیے وجود میں آئی ہیں کہ حکومت نچلے درمیانہ اور مزدور طبقے کو معقول قیمت پر اور جائز طریقے سے رہائشی زمین فراہم نہیں کر سکتی۔ ان کے لیے واحد راستا دلالوں سے (جن کو بدعنوان سرکاری افسروں کی پشت پناہی حاصل ہے) غیرقانونی طور پر ڈویلپ کی ہوئی زمین خریدنے کا ہے۔ کچی آبادیوں میں ابتدائی پانچ سے دس سال تک ہر قسم کا استحصال ہوتا ہے۔ اس رقم کا بڑا حصہ جو کچی آبادیوں کے باشندے دلالوں کو ادا کرتے ہیں، پولیس اور متعلقہ حکومتی ایجنسیوں کے اہلکاروں کو پہنچتا ہے۔ تاہم، اتنا وقت گزرنے پر بھی پولیس کے دلالوں کے ہاتھوں جبری وصولی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ جب کچی آبادی میں کوئی شخص اپنی زمین کے گرد پکی دیوار اٹھاتا ہے یا مکان میں لیٹرین بنواتا ہے، تھانے کے دلال فوراً وصولی کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ جب کوئی اپنے مکان کو پکا کراتا ہے، خاص طور پر جب کنکریٹ کی چھت ڈالی جا رہی ہوتی ہے، تھانے کے دلال دوبارہ آ کر رقم وصول کرتے ہیں۔ جب بھی علاقے کے تھانے کو رقم کی ضرورت ہوتی ہے، نئی کچی آبادیوں کو ڈھا دینے کی دھمکی دی جاتی ہے، اور اس دھمکی کو مزید موثر بنانے کے لیے چند مکان ڈھا بھی دیے جاتے ہیں۔ آبادی کے باشندے پھر پیسے جمع کرتے ہیں اور دلال کے حوالے کرتے ہیں۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ابتدائی پانچ برسوں میں کچی آبادیوں کے غریب مکین کم از کم پندرہ سے بیس ہزار روپے تک مختلف ایجنسیوں کے دلالوں کو رشوت کے طور پر ادا کرتے ہیں تاکہ اُس زمین پر سکون سے رہ سکیں جس کے لیے انھوں نے تین ہزار سے پندرہ ہزار روپے تک ادا کیے ہیں۔

یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ بجلی کے کنکشن کا ڈیمانڈ نوٹ حاصل کرنے کے لیے کچی آبادیوں کے باشندوں کو ساڑھے تین ہزار روپے رشوت دینی پڑتی ہے۔ ڈیمانڈ نوٹ مل جانے کے بعد بعض اوقات دس ہزار روپے تک کنکشن دینے کے لیے رشوت کے طور پر طلب کیے جاتے ہیں۔ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ رشوت دینے کے بعد بھی چار سال تک کنکشن نہیں دیا گیا۔ یہ بھی عام ہے کہ کنکشن دینے کے بعد اسے منقطع کر دیا گیا اور لوگوں کو کے ای ایس سی اور تھانے کے دلالوں نے مجبور کیا کہ وہ کنڈا سسٹم کے تحت چوری کی ہوئی بجلی حاصل کریں۔ اس کے لیے انھیں مستقل بھتا ادا کرنا پڑتا ہے اور اکثر انھیں کنڈے ہٹانے کا خوف دلا کر ان سے مزید رقم وصول کی جاتی ہے۔

ایک عام طریقہ یہ بھی ہے کہ علاقے میں پانی کی فراہمی منقطع کر دی جاتی ہے اور پھر باشندوں سے پانی بحال کرنے کے لیے رقم وصول کی جاتی ہے۔ سندھ کچی آبادی اتھارٹی (SKAA) کے لیے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے کیے ہوئے ایک سروے سے ظاہر ہوتا ہے کہ غریب آبادیوں کے لیے مختص پانی اکثر زیادہ آمدنی والے علاقوں کو فراہم کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مون سون کے دنوں میں خوش حال علاقوں میں جمع ہونے والے بارش کے پانی کا رخ نشیبی کچی آبادیوں کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔

ان آبادیوں کے رہنے والے اپنے مسائل سے بخوبی واقف ہیں، مگر ان مسائل کے حل کے لیے ان کی متواتر کوششیں اس لیے ناکام رہتی ہیں کہ انھیں اقتدار کے مرکزوں تک کسی بھی سطح پر رسائی حاصل

نہیں ہے۔ اُن دنوں میں جب لوگوں کی نمائندگی منتخب کاؤنسلروں کے ذریعے ہو رہی تھی، صورتِ حال میں تھوڑی سی بہتری آئی تھی۔

نچلی آمدنی والے طبقوں کے لیے ایک اہم پیش رفت حکومت کا کچی آبادی ریگولرائزیشن اینڈ امپروومنٹ پروگرام ہے۔ تاہم یہاں بھی رشوت ستانی کا زور ہے۔ سوائے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے تحت چلنے والی اسکیموں کے، جائز طریقوں سے لیز کا حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ لیز دلالوں کے ذریعے تقریباً سات ہزار روپے ادا کر کے حاصل کی جاتی ہے، جبکہ اس کی سرکاری قیمت دو ہزار سے تین ہزار روپے تک ہے۔ اس کے علاوہ ریگولرائزیشن پروگرام کے دوران سیاست داں اور حکومت کے اہلکار پولیس کی حمایت سے لوگوں کو اچھے مقامات پر سے ہوئے اپنے مکانوں سے دست بردار ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی طرح رفاہی پلاٹوں پر قبضہ کر لیا جاتا ہے اور آخرکار ان قبضوں کو سیاست دانوں، سرکاری اہلکاروں اور مفادات رکھنے والے مقامی گروہوں کے گٹھ جوڑ سے ریگولرائز کر دیا جاتا ہے۔

کچی آبادیوں میں کسی بھی قسم کا کاروبار قائم کرنے اور جاری رکھنے کے لیے پولیس کو بھتا دینا پڑتا ہے۔ افراطِ زر کی شرح کے ساتھ ساتھ بھتے کی رقم میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ نچلی آمدنی میں ایک چھوٹے کھوکھے سے روزانہ تیس سے سو روپے تک بھتا لیا جاتا ہے۔ ایک حالیہ سروے سے معلوم ہوا ہے کہ صرف صدر کے علاقے میں پولیس اور سرکاری انتظامیہ دکان داروں، ناکروں اور ٹرانسپورٹروں سے گیارہ کروڑ روپے ماہانہ بھتا وصول کرتی ہے۔

شہر کی زیادہ غریب کچی آبادیوں میں وڈیو ہال، جوئے کے اڈے اور جسم فروشی کے خفیہ اڈے قائم ہیں۔ ان کے چلانے والوں کا اصرار ہے کہ درحقیقت قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں اس کاروبار میں شریک ہیں۔ ان کے دعوے کی تصدیق ڈرگ مافیا کو حاصل ہونے والی پولیس کی حمایت سے ہوتی ہے جس کے بارے میں اخباروں میں گاہے گاہے رپورٹیں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ کس طرح منشیات کے خلاف مہم چلانے والے کارکنوں کو قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے ہلاک کر دیا۔

نچلی درمیانہ آمدنی والے افراد کو اپنا کاروبار بڑھانے کے لیے قرضوں اور تکنیکی امداد تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ ان کو کھلے بازار میں سرگرم پیشہ ور سودخوروں سے ۱۰ سے ۱۵ فیصد ماہانہ کی شرح پر قرض لینا پڑتا ہے۔ اس طرح ان کی کاروباری سرگرمیاں محدود ہو جاتی ہیں اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کا استحصال ہوتا ہے۔ کراچی ماسٹر پلان کے سروے کے مطابق شہر میں ۷۵ فیصد روزگار غیر رسمی سیکٹر فراہم کرتا ہے۔ اس کی تصدیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ صرف اورنگی میں چالیس ہزار چھوٹے تجارتی اور صنعتی یونٹ قائم ہیں۔

اس استحصالی صورتِ حال کا کراچی کے بالائی طبقے کو بخوبی علم ہے۔ کراچی میں ایک برانڈ نیو کار شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بغیر نمبر پلیٹ کے چلائی جا سکتی ہے، مگر کوئی شخص موٹرسائیکل پر، خواہ اس کے کاغذات درست اور مکمل ہی ہوں، بغیر پولیس کو رشوت دیے سفر نہیں کر

سکتا۔ بہت سے دفتروں میں جہاں شام کو دیر تک کام ہوتا ہے، موٹر سائیکلوں پر آنے جانے والے ملازمین گھر واپس جانے کے بجائے دفتر میں سو رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، کیوں کہ رات کو سفر کرنے کی صورت میں انھیں پولیس کو پچاس روپے سے دو سو روپے تک رشوت دینی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی، خاتون دوست یا خاتون رشتہ دار کے ساتھ موٹر سائیکل پر سفر کر رہا ہو تو رشوت کی رقم اور زیادہ ہو جاتی ہے کیوں کہ رشوت ادا نہ کرنے کی صورت میں تھانے لے جانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور عموماً اپنی آمدنی کا ایک تہائی حصہ پولیس کو بھتے کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ باہر سے کراچی آنے والے غریب لوگ جو مختلف اشیاے صرف فروخت کرنے کے لیے لے کر آتے ہیں، انھیں پولیس کو کثیر رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ ٹرک ڈرائیوروں، ٹھیلے پر چلنے والی سوزوکیوں اور پرانی گاڑیوں سے بھی بھتا وصول کیا جا رہا ہے۔

کراچی کی کچی آبادیوں میں ایک غیر سرکاری تنظیم کے تحت ہونے والی میٹنگ میں لوگوں کو اپنے بچوں کو کام پر بھیجنے کے بجائے اسکول میں داخل کرنے کی ترغیب دلائی گئی تھی۔ ایک باشندے نے کہا "اگر ہم انھیں اسکول جانے دیں تو پولیس اور سرکاری اداروں کا منہ کیسے بھریں گے؟" کچی آبادیوں اور نچلے درمیانہ طبقے کے لوگوں کا ایمان ہے کہ ان سے ہتھیائی ہوئی رقموں ہی کی وجہ سے سیاست دانوں کے خاندانوں اور سرکاری اہلکاروں کی دولت کی ریل پیل قائم ہے۔

کراچی میں کوئی سیاسی مسئلہ پیدا نہ ہوتا اگر نچلی اور درمیانہ آمدنی والے طبقوں اور مزدور پیشہ لوگوں نے ایسے استحصال کو خاموشی سے گوارا کر لیا ہوتا۔ تاہم، ایسا نہیں ہوا۔ یہ لوگ اپنی معاشی اور معاشرتی ترقی کے لیے متواتر جدوجہد کر رہے ہیں۔ شہر میں ایم کیو ایم کے وسیع ووٹ بینک کے موجود ہونے کے دو اسباب ہیں۔ اول، قومی سیاسی پارٹیوں کی لیڈرشپ، ایم کیو ایم کے برخلاف، درمیانہ یا محنت کش طبقے سے تعلق نہیں رکھتی اور نہ واضح طور پر ان لوگوں کے مسائل حل کرنے سے کوئی دل چسپی رکھتی ہے۔ دوم، مناسب شہری اداروں کی عدم موجودگی۔ اس عدم موجودگی کے نتیجے میں کیے جانے والے استحصال نے لوگوں کے درمیان لسانی اور نسلی بنیاد پر اتحاد کو مضبوط بنا دیا ہے۔

***

حل کہاں سے آئے گا؟

دہشت گردوں کے خلاف حالیہ مہم یا حکومت اور ایم کیو ایم کے درمیان مذاکرات کا جو بھی نتیجہ نکلے، کراچی میں طویل المدّت اس شہر میں رونما ہونے والے معاشرتی انقلاب کو سیاسی طور پر مستحکم کیے

بغیر حاصل نہیں ہو گا۔ یہ معاشرتی تبدیلیاں اُس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتیں جب تک اس شہر کے دانش ور شہر کی ترقیات اور ایک موثر لوکل گورنمنٹ کے لیے ایک تفصیلی خاکہ تیار نہ کریں۔ اس خاکے کی تیاری کے بعد انھیں ان سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کی حمایت حاصل کرنی ہو گی جو اس شہر کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہیں۔ انھیں اس سلسلے میں کراچی کی بے شمار کمیونٹی انجمنوں اور غیر سرکاری تنظیموں سے بھی رابطہ قائم کرنا ہو گا۔ انھیں اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سیاسی طریقِ کار کے تحت جدوجہد کرنی ہو گی اور اس تحریک سے حاصل ہونے والے نتائج کی احتیاط کے ساتھ نگہداشت کرنی ہو گی تاکہ انارکی کی دوسری بڑھتی لہر کو روکا جا سکے۔ یہ کام شروع کرنے سے پہلے اس بات کو تسلیم کرنا لازمی ہے کہ کراچی میں شہری منصوبہ بندی اور انتظام کا مروجہ طریقِ کار شاید محاصروں اور ماورائے عدالت قتل کی وارداتوں سے بھی بڑھ کر انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے، اور یہ طریقِ حکومت اور شہر کے نچلے درمیانہ اور مزدور طبقے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

کراچی کی موجودہ صورتِ حال پاکستان میں پیش آنے والے بڑے بحران کا پیش خیمہ ہے۔ سرمایہ دارانہ زراعت، شہری آبادی میں اضافے اور شرحِ خواندگی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ پرانے طبقاتی رشتے تبدیل ہو چکے ہیں۔ لسانی گروہ اور نسلی برادریاں جنھیں تاریخ نے ایک خاص مقصد پورا کرنے کے لیے چنا تھا، اب اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ گروہوں اور برادریوں سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس نئی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے نئے ادارے اب تک وجود میں نہیں آئے ہیں اور قدیم ادارے غیر متعلق، غیر موثر اور مکمل طور پر بدعنوان ہو چکے ہیں۔

***

کسی معاشرے کی سماجی اور اقتصادی حقیقتوں کا ریاست کے فرسودہ ڈھانچے اور انتظامی کلچر کے ساتھ تصادم، جو پاکستان میں پیش آ رہا ہے، کوئی انوکھی بات نہیں۔ تاریخ میں اس قسم کا شدید ترین تصادم اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں پیش آ چکا ہے۔ تب بھی اس تصادم کا حل ـــــ خواہ وہ اصلاحات کی صورت میں ہو یا انقلاب کی شکل میں ـــــ بیوروکریسی، طاقت ور طبقوں یا اسٹیبلشمنٹ سے وابستہ سیاست دانوں کے ہاتھوں نہیں نکلا تھا، اور آج پاکستان میں بھی اُن سے موجودہ تصادم کا کوئی حل نکالنے کی توقع کرنا نادانی ہو گی۔

تبدیل شدہ معاشرتی اور اقتصادی حقائق کو اداروں کی شکل دینے کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام ہمیشہ دانش ور طبقے، پیشہ ور ماہرین کی انجمنوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں نے کیا ہے۔ ادیب اور مفکر سماجی ناانصافیوں، معاشی محرومیوں اور غیر موزوں ریاستی اداروں کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتے ہیں معاشرے کو لاحق روگ کے اسباب تلاش کرتے ہیں اور ان اسباب کی بنیاد پر کسی ممکنہ حل کی سمت ہو ید

کرتے ہیں۔ پیشہ ور ماہرین کی انجمنیں اپنی کارکردگی کو عوام کے نقطۂ نظر سے پرکھتی ہیں اور صحت، قانون، انجینئرنگ، منصوبہ سازی اور دوسرے میدانوں میں ایسے متبادل طریقے وضع کرتی ہیں جو معاشرے کے حالات سے ہم آہنگ ہوں۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے اپنے تدریسی اور تحقیقی طریق کار میں تبدیلیاں لاتے ہیں تاکہ ایسے تعلیم یافتہ افراد پیدا کر سکیں جو سماجی شعور رکھتے ہوں۔ یہ ادارے معاشرے کے مسائل کو جانچے، سمجھنے اور ان کے حقائق کو احتیاط سے اعداد و شمار کی صورت میں متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور معاشرتی اور طبعی ماحول میں تبدیلیوں کی ضرورت اور نوعیت کو واضح کرتے ہیں۔ ادیبوں، پیشہ ور ماہروں اور تعلیمی اداروں کی اس سرگرمی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بصیرت کو (جسے حقائق، اعداد و شمار اور ممکنہ تبدیلیوں کے حقیقت پسندانہ جائزے کا مضبوط سہارا حاصل ہوتا ہے) معاشرے کے اُبھرتے ہوئے طبقوں تک پہنچایا جاتا ہے جو اپنی نئی قائم شدہ کاروباری یا سیاسی تنظیموں کے ذریعے اصلاحات کے لیے دباؤ ڈالتے ہیں یا دوسری صورت میں انقلاب لانے کے لیے کام کرتے ہیں۔ اصلاحات کے لیے دباؤ ڈالنے کا طریقہ صرف اُس وقت کارآمد ثابت ہوسکتا ہے جب وہ نہ صرف مسائل کی درست نشان دہی کر سکے بلکہ ان کا ٹھوس حل بھی تجویز کر سکے جو خواہشات سے نہیں بلکہ حقائق سے مطابقت رکھتا ہو۔ جذبات اور نعرے بازی سے نہ کبھی اصلاحات ہوئی ہیں اور نہ کہیں انقلاب آیا ہے۔ جن معاشروں میں دانش ور طبقے کا لوگوں سے رابطہ برقرار رہا اور وہ ان کی زندگی اور ان کو درپیش سماجی اور سیاسی حالات کا اپنے معاشرے کی تاریخ کی روشنی میں مطالعہ کرتا رہا، وہاں یہ طبقہ معاشرے میں تبدیلی لانے کا مثبت کردار انجام دے سکا۔

تیسری دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں کی طرح پاکستان کے دانش ور بھی یہ مثبت کردار انجام نہیں دے رہے ہیں۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں جن کو سمجھنا زیادہ دشوار نہیں۔ لیکن ان کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا زاویۂ نظر ان کے اپنے معاشرے کی معروضی حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا اور نہ یہ حقیقت ان کی تخلیقی اور علمی دل چسپی کا محور ہے۔ رفتہ رفتہ ان کا رشتہ اپنے معاشرے کی حقیقت سے بالکل کٹ گیا ہے اور وہ ذہنی طور پر دنیا کے اُن ترقی یافتہ معاشروں سے وابستہ ہو گئے ہیں جن کے خدوخال مناسب اور حقیقت پسندانہ تبدیلیوں کے بغیر ہمارے معاشرے کی حقیقت سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتے۔

یہی معاملہ پاکستان میں بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں اور دانش وروں کا بھی رہا ہے۔ ان کے تجزیوں کی بنیاد بھی اِس معاشرے کے معروضی حالات نہیں بلکہ ریاست اور ترقی کے بارے میں ایسے نظریات پر رہی ہے جنھیں روس اور چین میں وہاں کے معروضی حالات اور حقائق کی بنیاد پر وضع کیا گیا تھا جو ہمارے معاشرے کے حالات اور حقائق سے بہت مختلف تھے۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بائیں بازو کے سیاست دانوں کے معاشرے کے علم کی بنیاد وجدان پر ہو تو ہو، معروضی حقائق کے مطالعے اور تجزیے پر بالکل نہیں ہے، ہمارے پیشہ ور ماہرین آبادی کی ایک

ست چھوٹی اقلیت کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں، اور ہمارے تعلیمی اور تحقیقی ادارے ایسے موضوعات پر کام کرتے ہیں جن کا پاکستانی معاشرے کو درپیش مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ مونرالد کر روپے کی مثال یہ ہے کہ اقتصادی تحقیق کے میدان میں زرمبادلہ کی شرحوں اور ٹیکسوں کی پالیسیوں پر بے شمار مقالے تیار کیے جاتے ہیں لیکن غیر رسمی سیکٹر کو، جس پر ہماری آبادی کی اکثریت کے معاش کا انحصار ہے، ان میں سے کسی تحقیق میں شامل نہیں کیا جاتا اور نہ اس سکٹر کو الگ سے کسی تحقیق کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح انجینئرنگ کے میدان میں ٹیکنولوجی، طریق کار، اسٹینڈرڈز وغیرہ میں نئی تحقیق کے ذریعے تبدیلیاں کر کے انہیں ارزاں قیمت پر عام لوگوں تک پہنچانے کا کام نہیں کیا گیا۔ یہ فہرست نہایت طویل ہے اور اس میں طب، قانون، تعلیم، بین الاقوامی تعلقات، منصوبہ سازی اور باقی تمام شعبے شامل ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عوامی سطح پر قائم کی جانے والی کاروباری اور فلاحی تنظیموں، شہریوں کی انجمنوں اور اسٹیبلشمنٹ سے تعلق نہ رکھنے والے سیاست دانوں کو ان کی مطلوبہ معلومات ان تعلیمی اور تحقیقی اداروں سے دستیاب نہیں ہوتیں، اور ان اداروں کی تحقیق کی بنیاد پر وضع کی ہوئی سرکاری پالیسیاں ہمارے عوام کی اکثریت سے غیر متعلق ہوتی ہیں۔

پاکستان کے دانش ور طبقے کی اس ناکامی سے قطع نظر، پاکستانی معاشرے کے عوامی رویوں میں تبدیلی کے اشارے صاف نظر آنے لگے ہیں۔ اگر ایک طرف ترقی یافتہ دنیا سے وابستگی رکھنے والے مقامی دانش وروں کی تعداد، اور مقامی حالات سے ان کی اجنبیت، بڑھ رہی ہے تو دوسری طرف خواندہ نوجوانوں کی قائم کی ہوئی غیر سرکاری اور فلاحی تنظیموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اکاد کا اعلیٰ تعلیم کے اداروں نے بھی ایسے کام کو وسیع تر معاشرتی اور معاشی مسائل سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں شروع کی ہیں۔ انسانی حقوق، قیدیوں کی امداد، دیہی اور شہری آبادیوں اور چھوٹا کاروبار کرنے والے افراد کو تکنیکی امداد کی فراہمی وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو کسی قدر منظم اور باقاعدہ شکل میں پیش منظر پر نمودار ہونے لگے ہیں، اور ان پر سابقہ عشروں والی سوشلسٹ، لبرل یا سیکولر روایت کا غلبہ نہیں ہے۔ یہ احساس روز بروز قوی ہوتا جا رہا ہے کہ موجودہ ریاستی ڈھانچا کوئی مثبت کردار ادا کرنے کا اہل نہیں اور نہ اس سے کوئی امید کی جا سکتی ہے؛ اور یہ کہ پاکستان کی تبدیل شدہ حقیقت کے مطابق نئے متبادل ڈھانچے کو مضبوط بنانا لازمی ہے۔ یہ احساس اتنا شدید ہوتا جا رہا ہے کہ اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے 'سرکاری' دانش ور تک شراکتی جمہوریت، لوگوں کو بااختیار بنانے، اور اختیارات کی مرکزیت کو ختم کرنے جیسی اصطلاحات اپنی گفتگو میں استعمال کرنے لگے ہیں؛ حکومت کو قرض دینے والے بین الاقوامی ادارے بھی، اپنے مفادات کے پیشِ نظر، یہی لفظیات استعمال کر رہے ہیں۔ تاہم، مثبت تبدیلیوں کے ان اشاروں کے ساتھ ساتھ غیر حل شدہ سارے کی تمام مریضانہ علامات ــــ یعنی تشدد، انارکی، مذہبی انتہاپسندی ــــ بھی روز بروز سنگین ہوتی جا رہی ہیں۔

پاکستانی حالات کا جائزہ لینے والا کوئی کم فہم سیاسی مبصر بھی صاف دیکھ سکتا ہے کہ معاشرے کی حقیقت اور ریاستی ڈھانچے کے درمیان موجود، اور مسلسل بڑھتی ہوئی، خلیج کے پیشِ نظر تبدیلی کا آنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ حالیہ رجحانات کو دیکھتے ہوئے اس تبدیلی کا مطلب صوبوں، بلدیاتی اداروں اور عوامی تنظیموں کو زیادہ بااختیار اور خودمختار بنانا ہے۔ اسے ممکن بنانے کے لیے قانونی اور مالیاتی نظام میں ہمہ گیر تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ اب سوال یہ نہیں ہے کہ ایسا ہو گا یا نہیں، بلکہ یہ کہ ایسا کب اور کس طریقے سے ہو گا؟ یہ تبدیلی کس راستے سے آئے گی اور پاکستان کے مختلف طبقوں اور گروہوں پر اس کے اثرات کس نوعیت کے ہوں گے؟

اگر ہمارے دانش وروں نے تیز رفتاری کے ساتھ عوام کی زندگی، ان کے مسائل اور ان کے اندازِ فکر سے مطابقت پیدا نہیں کی اور ایک جدید اور جمہوری ریاست کا روشن خیال تصور رائج نہ کیا تو وہ ان نازک سوالات کا عملی جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ ایسی صورت میں تبدیلی تشدد کے ذریعے سے آئے گی اور اس پر فسطائیت اور مذہبی یا کسی اور قسم کی انتہاپسندی کا غلبہ ہو گا۔ اس کے برعکس اگر ہمارے دانش ور ملک بھر میں مقامی سطح پر تبدیلی اور فلاح کے لیے کام کرنے والے سماجی کارکنوں اور عوامی تنظیموں کے ساتھ اتحاد پیدا کر سکے تو تبدیلی بتدریج اصلاحات کے ذریعے بھی آ سکتی ہے اور تشدد اور انارکی کی شدت کو کم کیا جا سکتا ہے۔

وقت دونوں صورتوں میں، اب بہت کم رہ گیا ہے۔

**

ضمیمہ ۱

کراچی ـــ چند اہم حقائق

آئندہ صفحات میں کراچی کے بارے میں کچھ اہم حقائق اعداد و شمار کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں اور ان کی مختصر وضاحتیں بھی درج کر دی گئی ہیں۔

ان اعداد و شمار کے بارے میں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ آبادی سے متعلق ۱۹۸۱ کے بعد کے اعداد و شمار کسی سرکاری مردم شماری کے نتائج پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ مردم شماری نہ صرف کسی ملک کی آبادی سے متعلق رجحانات کا درست اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے بلکہ حکومتی سطح پر ہوش مندانہ منصوبہ بندی کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ اس اہم کام کو ملتوی کرتے چلے جانے کے فیصلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں حقائق کا سامنا کرنے کی اہلیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس اہلیت کا فقدان بجائے خود ملک کو درپیش بحران کی شدت میں اضافہ کر رہا ہے کیوں کہ مسائل کا درست تناظر میں جائزہ لیے بغیر ان کے حل کی طرف قدم بڑھانا ممکن نہیں ہے۔

Table 1	Percentage of Urban Population in Selected Regions of the World 1950 - 2000				
Region	1950	1986	2000	Annual Growth Rate 1990 - 2000	
				Urban	Rural
Europe	56%	73%	79%	1.2%	-0.9%
North America	64%	74%	78%	1.2%	-1.0%
(Former) Soviet Union	39%	71%	74%	1.4%	-1.1%
Latin America	41%	65%	77%	3.1%	0.8%
China	12%	32%	40%	3.2%	0.8%
Africa	15%	30%	42%	4.6%	1.7%
South Asia	15%	24%	35%	4.9%	1.1%
Source United Nations Population Division					
Dr Mehtab Karim "The Challenges of Urban Growth A Case Study of Karachi					

اوپر دیے ہوئے ۱۹۵۰ سے ۲۰۰۰ تک کے آبادیاتی اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے خطے دیہی معاشرے سے شہری معاشرے میں منتقل ہونے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ ترقی یافتہ خطے اپنے تاریخی ارتقا اور صنعتی ترقی کے باعث رفتہ رفتہ غالب طور پر شہری معاشرے بن چکے ہیں اور وہاں دیہی آبادی کے تناسب میں مسلسل کمی ہو رہی ہے۔ دوسری جانب ترقی پذیر، یا کم ترقی یافتہ، خطوں میں یہ تبدیلی دیر سے شروع ہوئی ہے اور نہایت تیز رفتار سے جاری ہے۔ جنوبی ایشیا میں شہری آبادی، جو ۱۹۵۰ میں کل آبادی کا صرف ۱۵ فیصد تھی، ۱۹۸۶ میں ۲۴ فیصد تک جا پہنچی اور، اضافے کی تیز رفتار کے پیشِ نظر، ۲۰۰۰ تک ۳۵ فیصد ہو جائے گی۔ اس تبدیلی کی رفتار جنوبی ایشیا میں، افریقا کو چھوڑ کر، تمام خطوں کے مقابلے میں زیادہ تیز ہے۔

Table 2	Percentage of Urban Population in South Asian Countries 1950 - 2000				
Country	**1950**	**1960**	**1970**	**1980**	**1990**	**2000**
Bangladesh	4 4%	5 2%	7 6%	11 2%	16 1%	22 2%
India	16 8%	17 9%	19 7%	22 3%	25 9%	34 1%
Nepal	2 3%	3 1%	3 9%	4 4%	6 6%	9 8%
Pakistan	17.5%	22.1%	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
Sri Lanka	14 4%	17 9%	21 9%	26 6%	32 9%	40 1%
Source United Nations Population Division						
Dr Mehtab Karim "The Challenges of Urban Growth A Case Study of Karachi"						

۱۹۵۰ سے ۲۰۰۰ تک کی چند دہائیوں کے یہ اعداد و شمار جنوبی ایشیا کے ممالک میں دیہی معاشرے کے شہری معاشرے میں تبدیل ہونے کی صورت حال کا موازنہ پیش کرتے ہیں۔ اس موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی کل آبادی میں شہری آبادی کا تناسب پورے خطے میں سب سے زیادہ رہا ہے۔ پاکستان کی شہری آبادی، جو ۱۹۵۰ میں ملک کی کل آبادی کے ۱۷.۵ فیصد کے برابر تھی، ۱۹۹۰ میں ۳۲.۶ فیصد ہو گئی اور، تخمینے کے مطابق، ۲۰۰۰ میں ۳۴.۱ فیصد تک پہنچ جائے گی۔ جنوبی ایشیا کے دیگر ملکوں سے تقابل کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان سب سے زیادہ تیز رفتار سے اس تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ تاہم، جیسا کہ پچھلے صفحات میں پیش کیے گئے تجزیاتی مضامین نشاں دہی کرتے ہیں، پاکستان کا ریاستی ڈھانچا اس تیز رفتار تبدیلی کو تسلیم کرنے اور ملکی نظام میں سمونے میں ناکام رہا ہے جس کے باعث معاشرے میں شدید تناؤ پیدا ہو گیا ہے۔

Table 3	Percentage of Urban Population in Provinces of Pakistan 1981		
Province	**Population**	**Urban**	**Rural**
Balochistan	4,332,000	15 6%	84 4%
NWFP	11,061,000	15 2%	84 8%
Punjab	47,292,000	27 4%	72 6%
Sindh	19,029,000	43.4%	56.6%
Source Census Of Population 1981			
Dr Mehtab Karim, "The Challenges of Urban Growth A Case Study of Karachi			

پاکستان کے چاروں صوبوں میں دیہی اور شہری آبادی کا یہ موازنہ، جس کی بنیاد ۱۹۸۱ کی سرکاری مردم شماری پر ہے، ظاہر کرتا ہے کہ صوبہ سندھ میں شہری آبادی کا تناسب باقی تمام صوبوں سے زیادہ ہے۔ یہاں ۱۹۸۱ میں شہری آبادی صوبے کی کل آبادی کے ۴۳.۴ فیصد کے برابر تھی۔ ۱۹۸۱ کے بعد سے کوئی مردم شماری نہیں ہوئی ہے، تاہم گزشتہ آبادیاتی رجحانات کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ شرح اب مزید بڑھ چکی ہوگی۔ یہ حقیقت اپنے مضمرات کے لحاظ سے نہایت اہم ہے اور صوبے کی سماجی، معاشی اور سیاسی صورتِ حال کو سمجھنے میں بہت مدد دے سکتی ہے۔

Table 4	Comparative Profiles of Five Big Cities of Pakistan Karachi, Hyderabad, Faisalabad, Lahore and Peshawar						
			Karachi	Hyderabad	Faisalabad	Lahore	Peshawar
Population:		1951	[illegible]	241,801	187,185	859,221	151,435
		1961	[illegible]	434,537	435 117	1 317,119	218,697
		1972	[illegible]	628,631	839,621	2,198,890	272,697
		1981	[illegible]	751,529	1,121 629	2 988,486	566,248
		1988	[illegible]	980,000	1 520,000	3,870,000	770,000
Population as a Percentage of Pakistan's Population		1988	[illegible]	0 93%	1 4%	3 7%	0 73%
Population as a Percentage of Pakistan's Urban Population		1988	21.4%	2 9%	4 5%	11 5%	2 3%
Annual Growth	1972	1981	[illegible]	2 0%	3 6%	3 7%	8 4%
	1981	1988	[illegible]	2 6%	4 6%	3 8%	3 3%
Population Density		1981	[illegible]	66	190	160	NA
Household Size		1972	[illegible]	5 98	8 51	6 19	5 9
		1981	[illegible]	7	6 7	6 9	6 9
Employment.							
Labour Force Participation % (1981)		Total	[illegible]	23 6%	26 3%	26 4%	25 3%
		Female	[illegible]	1 9%	2 6%	2 5%	2 6%
Civilian Labour Force (CLF)		1981	[illegible]	219 466	324 637	788 746	150 055
Unemployment (% of CLF)		1981	[illegible]	2 6%	5 6%	8 9%	3 4%
Land:							
Publicly Owned			80%		17%	14%	
Privately Owned			20%		83%	86%	
Housing:							
Units per 1000 Persons			156	143	153	151	145
Persons per Unit			6 7	7 5	6 9	6 8	7 4
Persons per Room			3 1	3 8	3 5	2 9	3
Owner Ocuupied Houses			57%	77 4%	83 12%	67 8%	64 73%
Population in Slums			50%	60%	60%	50%	50%
Katchi Abadis							
Population (% of City Population)			37%	25%	60%	21%	2%
Area (Hactares)			6,106	566	243	570	
Services and Infrastucture:							
Piped Water Supply 1980							
Individual Connections (% of Units)			46%	63%	31%	65%	36%
Average Daily Piped Water Supply (Litre per Capita)			90	246	187	225	332
Sewrage 1980 (% of Units)			[illegible]	27%	28%	30%	15%
Electricity 1980 (% of Units)			[illegible]	81%	79%	86%	86%
Health and Education.							
Hospital Beds per 1000 Persons			1 4	2 85	0 79	2 03	4 37
Infant Mortality below 10 years (Number per 1000 Live Births)			[illegible]	126	128	108	112
School Enrolment Rate		Total	41.1%	21 1%	21 9%	25 8%	23 9%
		Female	[illegible]	18 9%	20 1%	24 6%	19 7%
Literacy Rate		1972	[illegible]	42 2%	36 1%	44 1%	34 6%
		1981	[illegible]	41 2%	46 2%	53 4%	36 0%
Female Literacy Rate		1972	[illegible]	32 2%	24 7%	35 6%	
		1981	[illegible]	33 0%	36 4%	46 4%	23 3%
Arif Hasan, "Seven Reports on Housing							

پاکستان کے پانچ بڑے شہروں ــــ کراچی، حیدر آباد، فیصل آباد، لاہور اور پشاور ــــ کا یہ تقابل ان شہروں کے متعدد اہم حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ کراچی ملک کا سب سے بڑا شہر ہے، یہ حقیقت آبادی کے اعداد و شمار سے عیاں ہے۔ ۱۹۸۸ کے تخمینے کے مطابق ملک کی مجموعی آبادی کے ۶.۸ فیصد اور ملک کی شہری آبادی کے ۳.۱۲ فیصد باشندے کراچی میں رہتے ہیں۔ آبادی میں اضافے کی رفتار بھی کراچی میں باقی شہروں کی بہ نسبت زیادہ ہے، جس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ملک کے دیگر علاقوں سے لوگ بڑی تعداد میں کراچی آ کر آباد ہوتے ہیں۔ دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی کرنے کا یہ عمل ملک کے باقی شہروں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ چناں چہ دوسرے شہر بھی تبدیلی کے اسی عمل سے گزر رہے ہیں جو کراچی میں پیش آ رہا ہے۔ تجزیاتی مضامین میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس عمل کو سمجھے، تسلیم کرنے اور اس کی بنیاد پر حقیقت پسندانہ پالیسیاں وضع کرنے کی کوشش جلد شروع نہ کی گئی تو دوسرے شہر بھی کراچی کی طرح انتشار اور تشدد کی لپیٹ میں آ سکتے ہیں۔

روزگار کے اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ شہری آبادی کی لیبر فورس میں شمولیت کے لحاظ سے پانچوں شہر کم و بیش یکساں ہیں، لیکن شہری لیبر فورس میں بے روزگاری کی شرح لاہور اور کراچی میں باقی شہروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

زمین کی ملکیت سے متعلق اعداد و شمار سے یہ اہم حقیقت سامنے آتی ہے کہ کراچی میں ۸۰ فیصد زمین سرکاری ملکیت میں ہے اور اس اعتبار سے یہ شہر پنجاب کے دونوں شہروں ــــ فیصل آباد اور لاہور ــــ سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس کا ایک اہم نتیجہ، جیسا کہ کچی آبادیوں کے موضوع پر لکھے گئے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے، یہ ہے کہ دلالوں کے ہاتھوں وجود میں آنے والی کچی آبادیاں کراچی میں سرکاری ملکیت کی زمین پر قائم ہوتی رہی ہیں اور سرکاری اہلکار اس عمل میں غیر قانونی طور پر شریک رہے ہیں۔ اس کا ایک ضمنی مطلب یہ بھی ہے کہ کراچی میں بڑھتی ہوئی آبادی کو بسانے کے لیے حکومت کے پاس طبعی وسائل موجود ہیں، لیکن ناقص سرکاری پالیسیوں کے باعث یہ کام غیر رسمی سیکٹر کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔ فیصل آباد اور لاہور میں زمین کی ملکیت کے اعداد و شمار واضح کرتے ہیں کہ وہاں دیہات سے شہروں میں آنے والے لوگوں کی رہائشی ضروریات پوری کرنے کے لیے زمینوں کے مالک خود اپنی زمین کو ــــ جو بیشتر شہر کے مضافات میں واقع زرعی زمین ہوتی ہے ــــ غیر رسمی طور پر رہائشی پلاٹوں میں تقسیم کر کے فروخت کرتے ہیں۔ زرعی زمین کی مالیت زیادہ ہونے کے باعث ان شہروں کی کچی آبادیوں میں پلاٹ چھوٹے اور گلیاں تنگ ہوتی ہیں جس کا وہاں رہنے والوں کی زندگی پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ البتہ یہ عمل، کراچی کے برعکس، غیر رسمی اور بے ضابطہ ہونے کے باوجود غیر قانونی نہیں ہے چناں چہ پلاٹ خریدنے والوں کو ملکیت کا قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

کراچی کی ۵۰ فیصد آبادی پسماندہ بستیوں (slums) میں رہتی ہے۔ باقی شہروں میں بھی یہ تناسب اس سے کم نہیں ہے، بلکہ حیدر آباد اور فیصل آباد میں یہ تناسب ۶۰ فیصد ہے۔ کراچی کے ۳۷ فیصد باشندے کچی آبادیوں میں رہتے ہیں جو ۶ ۱۰۵ ہیکٹیئر رقبے پر پھیلی ہوئی ہیں۔ لاہور کی پسماندہ بستیاں بیشتر اندرونِ شہر کے قدیم محلوں میں واقع ہیں جہاں رہائشی حالات سخت ... ب ہیں۔

شہری انفرااسٹرکچر اور سہولتوں کے اعداد و شمار کراچی میں پانی کی شدید قلت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ شہر پانی کے کسی قدرتی منبعے کے قریب واقع نہیں ہے جو شہریوں کی پانی کی ضرورت کو پورا کر سکے۔ پائپ کے ذریعے فراہم کیے جانے والے پانی کے کنکشن ۶۴ فیصد مکانوں کو میسر ہیں، اور یہ شرح فیصل آباد اور پشاور سے زیادہ مگر لاہور اور حیدرآباد سے کم ہے۔ پائپ کے ذریعے فراہم کیے جانے والے پانی کی مقدار کراچی میں باقی چاروں شہروں سے کم یعنی صرف ۹۰ لیٹر فی کس روزانہ ہے۔ سیوریج یعنی گندے پانی کے نکاس کے باقاعدہ نظام سے منسلک مکانوں کا تناسب کراچی میں باقی شہروں سے زیادہ یعنی ۵۳ فیصد ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے وقت کراچی ملک کا واحد شہر تھا جہاں نکاس کا ایک جدید اور مکمل نظام موجود تھا۔ بعد میں یہ خصوصیت برقرار نہیں رکھی جا سکی جس سے شہری انتظام کی خراب ہوتی ہوئی صورت حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم، باقی شہروں میں نکاس کا نظام جدید خطوط پر کبھی قائم نہیں کیا گیا۔ بجلی کا کنکشن کراچی میں ۶۶ فیصد مکانوں کو میسر ہے، اور یہ شرح باقی شہروں کے مقابلے میں کم ہے۔ اس سے نہ صرف شہر میں ترقیاتی کام کی سست رفتاری کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ شہریوں کی بہت بڑی تعداد کنڈا سسٹم پر انحصار کرنے، یعنی چوری کی ہوئی بجلی خریدنے، پر مجبور ہے۔

صحت سے متعلق اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ کراچی میں آبادی کی مناسبت سے علاج کی سہولتیں بہت کم ہیں۔ اسپتالوں میں بستروں کی تعداد ۱ء۴۰ بستر فی ہزار افراد ہے اور یہ شرح صرف فیصل آباد کے مقابلے میں بہتر ہے۔

تعلیم کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسکول میں داخلہ لینے والے بچوں کی تعداد کا تناسب باقی چاروں شہروں سے زیادہ ہے، اور یہ بات بچیوں کے بارے میں بھی درست ہے۔ مردانہ اور زنانہ شرح خواندگی کے لحاظ سے بھی کراچی باقی شہروں سے کہیں آگے ہے۔

Table 5	Population Growth in Karachi and Pakistan 1901 - 1988				
	Karachi			Pakistan	
Year	Population	Increase in 20 years	Annual Growth Rate	Increase in 20 years	Annual Growth Rate
1901	117,000	-	-		-
1921	217,000	85%	3 1%	27%	1 3%
1941	387,000	75%	3 0%	34%	1 5%
1961	1,917,000	400%	8 4%	52%	2 1%
1981	5,208,000	175%	5 0%	96%	3 0%
1988	7,950,000	-	6 0%		3 0%

Source Census of Population 1901 1981

Dr Mehtab Karim "The Challenges of Urban Growth A Case Study of Karachi

آبادی میں اضافے کے یہ اعداد و شمار ۱۹۰۱ سے ۱۹۸۸ تک کے عرصے میں کراچی اور پاکستان کی آبادی میں اضافے کا موازنہ کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کراچی میں آبادی کے بڑھنے کی رفتار ملک کی مجموعی آبادی میں اضافے کی شرح سے سب زیادہ رہی ہے۔

Table 6	Age Profile of Population			
	Karachi, Rest of Sindh and Other Provinces			
	Below 15	15-29	30-39	40 & above
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
Rest of Sindh	47%	23%	11%	19%
Balochistan	49%	22%	11%	18%
NWFP	48%	23%	10%	19%
Punjab	45%	24%	10%	21%
Source. Census of Population, 1901 1981				
Dr Mehtab Karim "The Challenges of Urban Growth A Case Study of Karachi"				

کراچی کی آبادی کی ۴۱ فیصد تعداد ۱۵ سے ۳۹ سال تک کے باشندوں پر مشتمل ہے۔ تجزیے میں بتایا گیا ہے کہ ۱۳ سے ۳۰ برس تک کے باشندے کراچی کی کل آبادی کا ۳۹ فیصد حصہ ہیں۔ عارف حسن نے اپنے مضمون میں شہری آبادی کے اس حصے کی خصوصیات کو بہت خوبی سے بیان کیا ہے اور شہر کی زندگی میں اس حقیقت کی اہمیت واضح کی ہے۔

Table 7	Karachi's Population by Place of Birth		
	Census Year		
	1921	1961	1981
Total Population	217 000	1,917,000	5,208,000
Total Number of Migrants	101 000	1 154 000	1,700,000
Percentage of Migrants	47%	60%	33%
Place of Birth of Migrants			
Sindh (Exluding Karachi)	14%	2%	5%
Balochistan	14%	2%	1%
Punjab	8%	12%	25%
NWFP	4%	8%	17%
Kashmir, Frontier Region & Northern Areas		2%	1%
India and Other Countries	60%	74%	51%
Source: Census of Population 1981			
Mrs Shireen Rehmatullah, Ethnic Strife in Karachi"			

کراچی اپنے مخصوص محلِ وقوع اور تجارتی سرگرمیوں کے باعث نقل مکانی کرنے والوں کے لیے شروع ہی سے پُرکشش رہا ہے۔ اوپر دیے گئے اعداد و شمار واضح کرتے ہیں کہ باہر سے آکر بسنے والوں کی تعداد کا شہر کی آبادی میں تناسب ۱۹۲۱ میں ۴۷ فیصد تھا جو ۱۹۶۱ میں ۶۰ فیصد تک جا پہنچا۔ تاہم، ۱۹۸۱ کی مردم شماری کی رو سے کراچی کی آبادی میں صرف ۳۳ فیصد افراد ایسے تھے جو باہر سے آئے تھے۔ باقی تمام باشندے کراچی ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

نقلِ مکانی کر کے شہر میں آباد ہونے والوں میں موجودہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے افراد کی تعداد کا تناسب ۱۹۲۱ میں ۶۰ فیصد تھا جو ۱۹۶۱ تک بڑھ کر ۷۴ فیصد ہو گیا جس کا سبب ۱۹۴۷ میں تقسیمِ ہند کے وقت ہونے والی اجتماعی ہجرت تھی۔ تاہم، ۱۹۶۰ کے عشرے میں پاکستان کے دوسرے علاقوں سے لوگ بڑی تعداد میں کراچی آکر آباد ہونے لگے جس کے باعث ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے وقت ہندوستان میں پیدا ہونے والے کراچی کے شہریوں کا تناسب (نقلِ مکانی کرنے والوں کی کل تعداد کا) ۵۱ فیصد رہ گیا تھا۔ دوسری طرف کراچی سے باہر پیدا ہونے والے شہریوں میں پنجاب سے تعلق رکھنے والوں کا تناسب، جو ۱۹۶۱ میں ۸ فیصد تھا، ۱۹۸۱ میں ۲۵ فیصد ہو گیا۔ اسی طرح صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے افراد کے تناسب میں بھی اضافہ ہوا۔ نقل مکانی کر کے کراچی میں آباد ہونے والے لوگوں میں ۱۴ فیصد افراد ۱۹۲۱ کی مردم شماری کی رو سے سندھ کے دیگر علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ شرح ۱۹۶۱ میں کم ہو کر ۲ فیصد رہ گئی اور ۱۹۸۱ میں بڑھ کر ۵ فیصد ہو گئی۔

ان اعداد و شمار سے ایک اہم نکتہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے وقت شہر کے ۶۷ فیصد باشندے کراچی ہی میں پیدا ہوئے تھے خواہ ان کے والدین کا تعلق کسی بھی مقام سے رہا ہو۔ ان باشندوں نے کراچی شہر ہی میں آنکھ کھولی ہے چناں چہ ان کے مزاج میں دیہی اثرات بہت کم ہیں۔

Table 6	Population by Language - Karachi and Other Areas of Pakistan 1981					
Area	Urdu	Punjabi	Pushto	Sindhi	Balochi	Other
Pakistan	7 60%	48 17%	13 14%	11 77%	3 01%	16 27%
Balochistan	1 37%	2 24%	25 07%	8 29%	36 31%	26 71%
NWFP	0 83%	1 10%	68 30%	0 05%	0 04%	29 68%
Punjab	4 27%	78 68%	0 76%	0 08%	0 57%	45 32%
Islamabad	11 23%	81 72%	4 16%	0 18%	0 16%	2 54%
Sindh	22 64%	7 69%	3 06%	52 40%	4 51%	9 71%
Karachi	54%	14%	10%	7%	4%	11%
Source Census of Pakistan 1981						
Mrs Shireen Rehmatullah, "Ethnic Strife in Karachi						

مادری زبان کے اعتبار سے کی جانے والی اس تقسیم کی رو سے ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے وقت کراچی کے ۵۴ فیصد افراد کی مادری زبان اردو تھی۔ یہ شرح اس سے پہلے بہت زیادہ تھی اور اس کے کم ہونے کا رجحان واضح کرتا ہے کہ شہر کی آبادی میں ایسے لوگوں کی تعداد کا تناسب متواتر کم ہو رہا ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ ملک کے دیگر علاقوں سے نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد کی شرح مسلسل بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۸۱ میں اردو بولنے والے مہاجر پورے پاکستان کی آبادی کا ۷۰۶ فیصد اور صوبہ سندھ کی آبادی کا ۲۲۰۶۴ فیصد تھے۔ دیگر لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے سندھ اور خصوصاً کراچی میں داخل ہونے کے رجحان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر کی آبادی میں اردو بولنے والے مہاجروں کی اکثریت ختم ہو چکی ہے، گو وہ اب بھی شہر کا سب سے بڑا لسانی گروہ ہیں۔

سندھ سے باہر جس شہر میں اردو لسانی گروہ کا تناسب سب سے زیادہ ہے وہ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد ہے جہاں وہ ۱۹۸۱ میں کل آبادی کا ۱۱۰۲۳ فیصد حصہ ہے۔

مادری زبان سے قطع نظر، کراچی شہر کی غالب زبان اب بھی اردو ہے، کیوں کہ تاریخی اور معاشرتی عوامل کے زیر اثر ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ باہمی رابطے کے لیے اردو ہی کو اختیار کرتے ہیں۔ [illegible] کی تاریخ کے عنوان سے پیش کیے گئے متن سے کوئی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کراچی کے [illegible] جن کی زبان اردو نہیں ہے، اپنا اظہار اس زبان میں بہت عمدگی سے کرتے ہیں۔

Table 9	Population Growth Trends				
	Selected Megacities of the World				
City	Population			Rank	
	1994	2015	Increase	1994	2015
Tokyo	26,500,000	28,500,000	7 5%	1	1
New York	16,300,000	17,600,000	8 0%	2	11
Sao Paulo	16,100,000	20,800,000	29 2%	3	6
Mexico City	15,500,000	18,800,000	21 3%	4	10
Shanghai	14,700,000	23,400,000	59 2%	5	4
Bombay	14,500,000	27,400,000	89 0%	6	2
Calcutta	11 500,000	17 600,000	53 0%	9	12
Seoul	11,500,000	13 100,000	13 9%	10	18
Jakarta	11,000,000	21,200,000	92 7%	11	5
Karachi	**9,500,000**	**20,600,000**	**116.8%**	**18**	**7**
Istanbul	7,500,000	12,300,000	64 0%	23	20
London	7,300,000	7,300,000	0 0%	25	37
Source United Nations Population Division 1994					
Dr Mehtab Karim "Violence in Karachi A Global View					

اوپر دیے گئے اعداد و شمار کراچی کی آبادی میں اضافے کے رجحان کو دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کے تقابل میں پیش کرتے ہیں۔ اس تخمینے کے مطابق کراچی اپنی آبادی کے لحاظ سے ١٩٩٤ میں دنیا کا ١٨واں بڑا شہر تھا اور اگر آبادی میں اضافے کا یہ رجحان برقرار رہا تو ٢٠١٥ میں دنیا کا ساتواں بڑا شہر بن جائے گا۔ تخمینے کے مطابق بیس برس کے اس عرصے میں کراچی کی آبادی میں ١١٦.٧ فیصد اضافہ ہوگا اور اس مدت کے خاتمے پر اس شہر کے باشندوں کی کل تعداد دو کروڑ چھ لاکھ ہو جائے گی۔ آبادی میں اضافے کی یہ شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

Table 10	Population Distribution by Distance to Central Business District (CBD)					
	Karachi 1971 - 1987					
						C
Distance to CBD	1971		1981		1987	
(km)	Population	% Distance	Population	% Distance	Population	% Distance
0 - 5	999,801	30 3%	1,318,937	27 9%	1,401,063	18 8%
5 1 10	1,088 588	33 0%	1,124,913	23 8%	2,085,778	28 0%
10 1 15	472,732	14 3%	910,065	19 3%	1 832,009	24 6%
15 1 20	411,198	12 4%	882,492	18 7%	1,273,400	17 1%
20.1 25	311,009	9 4%	425,115	9 0%	701,426	9 4%
25 1 30	13,335	0 4%	36,784	0 8%	80,665	1 1%
Over 30	6,157	0 2%	26,341	0 6%	69 322	0 9%
Total	3,302,820	100%	4,724,647	100%	7,443,663	100%
Source Central Statistical Office Karachi Metropolitan Transportation Study						1981 1988
Arif Hasan, "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements.						

اوپر دیے گئے اعداد و شمار ۱۹۷۱، ۱۹۸۱ اور ۱۹۸۷ میں کراچی کی آبادی کے جغرافیائی پھیلاؤ کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس عرصے میں شہر کے مرکزی تجارتی علاقے سے پانچ کلومیٹر تک کے فاصلے پر رہنے والوں کی تعداد کا تناسب ۳۰.۳ فیصد سے کم ہو کر ۱۸.۸ فیصد رہ گیا۔ ۱۹۸۷ میں شہر کے ۶۹.۷ فیصد لوگ مرکز شہر سے پانچ سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر رہتے تھے جبکہ ۱۹۷۲ میں یہ تعداد ۵۹.۷ فیصد کے برابر تھی۔ اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی بیشتر آبادی کو مرکز شہر تک پہنچنے کے لیے، جہاں روزگار کی بیشتر جگہیں واقع ہیں، زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔

Table 11	Ownership of Land Karachi 1988	
Owner	**Area (Acres)**	**%**
Karachi Development Authority (KDA)	124,676	29 3%
Cantonment Board	18,596	4 4%
Karachi Municipal Corporation (KMC)	24,189	5 7%
Defence Housing Authority (DHA)	16,567	3 9%
Pakistan Steel	19,461	4 6%
Port Qasim	12,961	3 0%
Karachi Port Trust (KPT)	15,259	3 6%
Pakistan Railways	3,119	0 7%
Government of Pakistan	4,051	1 0%
Government of Sindh	137,687	32 4%
Sindh Industrial Trading Estate (SITE)	5,380	1 3%
Cooperative Housing Societies	15 721	3 7%
Private	27,862	6 5%
Total	425,529	100 0%
Source Master Plan & Environment Control Unit, KDA.		
Arif Hasan "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements		

زمین کی ملکیت کے اس اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ کراچی کی ۶۱.۷ فیصد زمین حکومت سندھ یا اس کے ادارے کے ڈی اے کے تصرف میں ہے۔ شہر کے بلدیاتی ادارے کے ایم سی کی ملکیت میں صرف ۵.۷ فیصد زمین ہے۔

Table 12	Urban Land Conversion by Distance to CBD Karachi 1970 - 1985	
Distance to CBD (km)	Land Developed (Acres)	Percentage of Total Increase
0 - 5	2,078	3 7%
5 1 - 10	5,034	9 0%
10 1 - 15	11 609	20 9%
15 1 - 20	11 589	20 8%
20 1 - 25	5,855	10 5%
25 1 - 30	3,165	5 7%
Over 30	16,309	29 3%
Total	55,639	100 0%

Source Master Plan & Environment Control Unit, KDA.
Arif Hasan "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements

اں اعداد و شمار میں مرکزِ شہر سے فاصلے کے اعتبار سے زمین کے شہری استعمال میں آنے کے عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۹۷۰ سے ۱۹۸۵ تک کے عرصے میں زمین کے استعمال میں یہ تبدیلی زیادہ تر اس علاقے میں ہوئی جو مرکزِ شہر سے پانچ سے بیس کلومیٹر دور واقع ہے۔ مرکز سے ۳۰ کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر واقع زمین کے اعداد و شمار کا تعلق پپری سے ہے جہاں پاکستان اسٹیل واقع ہے اور اس سے ملحق تعمیرات ہوئی ہیں۔ مرکزِ شہر سے پانچ کلومیٹر تک کے فاصلے پر سب سے کم زمین شہری استعمال میں آئی۔

Table 13	Urbanised Land by Distance to CBD			
	Karachi 1970 - 1985			
Distance to CBD	1970		1985	
	Urbanised	%	Urbanised	%
(km)	Acres	Urbanised	Acres	Urbanised
0 - 5	7,612	58 6%	9,690	74 6%
5 1 - 10	14,562	31 5%	19,596	42 4%
10 1 - 15	6,610	11 5%	18,219	31 6%
15 1 - 20	8,981	11 5%	20,570	26 4%
20 1 - 25	5,482	6 2%	11,337	12 8%
25 1 - 30	1,223	2 4%	4,386	8 5%
Over 30	1,924	1 6%	18,309	5 1%
Total	46,394		102,107	
Source Master Plan & Environment Control Unit KDA.				
Arif Hasan "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements				

اوپر دیے گئے اعداد و شمار سے زمین کے اس رقبے کا اندازہ ہوتا ہے جو ۱۹۷۰ اور ۱۹۸۵ میں شہری استعمال میں آچکی تھی۔ اس سے ایک اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ ۱۹۷۰ میں مرکزِ شہر سے پانچ کلومیٹر تک کے فاصلے پر واقع ۴۱.۴ فیصد زمین استعمال میں نہیں آئی تھی اور ۱۹۸۵ تک بھی ۲۵.۴ فیصد زمین استعمال نہیں ہوئی تھی۔ اس زمین کی مالیت بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور شہری پالیسیوں کے موجودہ رجحان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے کم آمدنی والے باشندوں کی رہائش یا سہولت کے لیے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ انہیں مرکز سے دور آباد ہونا پڑے گا اور اپنے روزگار کی جگہوں تک پہنچنے کے لیے روزانہ زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ چنانچہ شہر میں ٹرانسپورٹ کے مسائل میں بھی شدت پیدا ہوتی جائے گی۔

Table 14	Residential Land Conversion		
	by Distance to CBD		
	Katchi Abadis and Planned Areas		
	Karachi 1970 - 1988		
Distance to CBD (km)	Land Converted (Acres)		Katchi Abadis as a Percentage of Total
	Katchi Abadis	Planned Areas	
0 - 5	100	641	13 5%
5 1 - 10	700	2,716	20 5%
10 1 - 15	4,700	2,219	67 9%
Over 15	1,000	7,604	11 6%
Total	6,500	13,180	33 0%
Source Karachi Land & Housing Market Study, 1989			
Arif Hasan, "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements "			

اس اعداد و شمار میں مرکزِ شہر سے مختلف فاصلوں پر واقع اُس زمین کے رقبے کا جائزہ لیا گیا ہے جو ۱۹۷۰ سے ۱۹۸۸ تک کراچی کے شہریوں کی رہائشی ضروریات کے لیے استعمال ہوئی۔ مرکز سے پانچ کلومیٹر تک کے فاصلے پر واقع ۷۴۱ ایکڑ زمین رہائشی استعمال میں آئی جس میں کچی آبادیوں کے حصے میں آنے والی زمین صرف ۱۰۰ ایکڑ یعنی ۱۳.۵ فیصد، تھی۔ کچی آبادیوں کے لیے استعمال کی جانے والی بیشتر زمین مرکزِ شہر سے بہت دور واقع ہے، اور اس بات کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے کہ کچی آبادیوں کے باشندے کم آمدنی والے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ٹرانسپورٹ پر زیادہ رقم خرچ نہیں کر سکتے۔

Table 15	Distribution of Katchi Abadis by Distance to CBD					
	Karachi 1970 -1988					
Distance to CBD	1970		1988		Change	
	Area	%	Area	%	Area	%
(km)	(Acres)	Distance	(Acres)	Distance	(Acres)	Distance
0 5	2,700	41 5%	2,800	21 5%	100	1 5%
5 1 - 10	3 100	47 7%	3 800	29 2%	700	10 8%
10 1 - 15	400	6 2%	5,100	39 2%	4 700	72 3%
Over 15	300	4 6%	1,300	10 2%	1,000	15 4%
Total	6,500	100%	13,000	100%	6,500	100%
Source: van der Linden; UNCHS Karachi Master Plan 1986-2000, PADCO						
Arif Hasan, "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements						

اوپر دیے گئے اعداد و شمار مرکزِ شہر سے کچی آبادیوں کے فاصلے کو ظاہر کرتے ہیں۔ ۱۹۷۰ میں کچی آبادیوں کے ۸۲.۶ فیصد باشندے مرکز سے دس کلومیٹر تک کے فاصلے پر رہتے تھے جبکہ ۱۹۸۸ میں ان کی تعداد کم ہو کر ۵۰.۷ فیصد رہ گئی۔ ۱۹۷۰ میں کچی آبادیوں کے صرف ۶.۲ فیصد باشندے مرکز سے دس سے پندرہ کلومیٹر دور مقیم تھے جبکہ ۱۹۸۸ میں یہ تناسب بڑھ کر ۳۹.۲ فیصد ہو گیا۔ شہر کے خوش حال لوگ مرکز سے کم فاصلے پر رہتے ہیں، اور یہ رجحان دنیا کے دوسرے شہروں کے رجحان کے برعکس ہے جہاں خوش حال لوگوں کی آبادیاں شہر کے مضافات میں واقع ہوتی ہیں کیوں کہ ان کے پاس ذاتی ٹرانسپورٹ ہوتی ہے۔

اس انتخاب میں شامل تحریروں میں واضح کیا گیا ہے کہ شہر کی آبادی بہت تیزی سے ایک دوسرے سے جغرافیائی اعتبار سے دور دور واقع طبقاتی محلوں میں بٹتی جا رہی ہے جس کا ایک دوسرے سے سماجی تعلق نہایت کمزور ہو گیا ہے۔ شہر کے خوش حال لوگوں کو، جو مرکز کے نزدیک مقیم ہیں، مضافات میں واقع کم آمدنی والے علاقوں کو دیکھنے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے، چناں چہ وہ کچی آبادیوں کے باشندوں کے سماجی حالات سے اکثر بے خبر رہتے ہیں۔

کتابیات

انگریزی

Abbot, J , *Sind A Reinterpretation of the Unhappy Valley,* 1924
Advani, A B , *Annexation of Sind,* 1933
Advani, A B , "The Early British in Sind", in *Journal of Sind Historical Society,* Vol-1, Part 2, 1934
Ahmad, Kazi S , "A Geographical Study of the Refugee Problem", in *Pakistan Geographical Review,* Vol 10, No 2, 1955
Ahmed, S Haroon, Ed , *Contemporary Conflicts,* Karachi Pakistan Psychiatric Society Sindh Chapter, 1991
Ahsanullah, *The Goths of Karachi A Study of Urban Villages,* Karachi Karachi Geographers Association, 1967
Ahsanullah & Izzatullah, *The Port of Karachi,* Karachi Karachi Geographers Association, 1954
Aitken, E H , *Gazetteer of the Province of Sind,* Karachi Mercantile Steam Press, 1907
Ajwani, L H , Ed , *The Golden Jubilee Book of the D J Sind College,* Karachi, 1939
Alavi, Humza, "The Politics of Ethnicity in India and Pakistan", in *Sociology in Developing Societies,* (Ed Humza Alavi & Ohn Haries)
Ali, Dr Mubarak, *A Social and Cultural History of Sindh , Based on the accounts of the European travellers who visited Sindh,* Lahore Book Traders,1987
Ali, Dr Mubarak, *Sindh Observed, Selections from the Journal of Sind Historical Society,* Lahore Gautam Publishers, 1993
Ali, Dr Mubarak, *Sindh Analysed,* Lahore, 1993
Ali, Syed Mansoor, *Informal System of Solid Waste Recycling Preliminary Findings in Karachi,* (Prepared for Water Engineering & Development Centre, Department of Civil Engineering, Loughborough University of Technology, England) 1993
All India Industrial Exhibition Guide Book, Karachi Karachi Municipal Corporation, 1939
Allen, Rev I N , *Diary of a March through Sind and Afghanistan,* 1843
Amin, Mohamed, Duncan Willets & Brian Tetley, *Karachi,*

Karachi Pak American Commercial Ltd , 1986 (Coffee table book)
Andrews, W P , *The Indus and Its Provinces, Thier Political & Commercial Importance, Considered in Connection with Improved Means of Communication,*
London William H Allen & Co , 1857
Anonymous, *Draft History of the Port Trust,* 1905
Anonymous, *A Guide to Karachi* (79 pages with b/w plates)
Bailie, A F , *Kurrachee Past, Present and Future,*
1890, Reprinted Karachi Oxford University Press
Bease, George, *The Sind Directory,* Bombay Bombay Gazetteer Press, 1862
Bellasis, A F , *An Account of the Kurrachee Municipality,* 1860
Bhojwani, T J , *Municipal Post War Construction Schemes,* 1944
Bilgrami, S A R , *The Pakistan Yearbook & Who's Who 1949,*
Karachi Kitabistan, 1949
Billimoria, N M , *Town Planning Scheme Karachi No 2,* 1936
Billimoria, N M , "Major General E T Marston", in *Journal of Sind Historical Society,* Vol-III, Part 3, 1936
Billimoria, N M , "Alexander Hamilton s Description of Sind", in *Journal of Sind Historical Society,* Vol-IV, Part 4, 1939
Billimoria, N M , "Life of Charles Masson & Masson's Notes on Kurrachee", in *Journal of Sind Historical Society,* Vol-IV, Part 3, 1940
Billimoria, N M , *Annual Report on Public Instruction in Sind,* 1943
Billimoria, N M , "Census Reports of Sind for 1931 & 1941 A Comparison" in *Journal of Sind Historical Society,* Vol-VI, Part 4, 1943
Brow, D B , *The Port of Karachi Outline History 1843-1945,* 1945
Brunton, John, *The Diary of John Brunton*
Complete title "John Brunton's Book, Being the Memories of John Brunton Engineer, from a manuscript in his own hand written for his grandchildren and now first printed,"
Cambridge Cambridge University Press, 1939
Burton, Richard F , *Scinde The Unhappy Valley,* 1851
Burton, Richard F , *Scinde and the Races that Inhabit the Valley of the Indus,*
London, 1851, Reprinted Karachi Indus Publications, 1988
Burton, Richard F , *Sind Revisited,* Reprinted Karachi, 1992
Byron, Fraewell, *Burton A Biography of Richard Francis Burton,*
London Longman, Green & Co , 1964
Carless, *Memoirs on the Bay, Harbour and Port of Kurrachee,* 1838
Chablani, H C , *The Separation of Sind from the Bombay Presidency A Rejoinder to Khan Bahadur Mahomed Ayoob S Khuhro's* "A Story of the Sufferings of Sind,"
Karachi Koh-i-Noor Printing Works, 1931
Chablani, S P , *Economic Conditions in Sind,*
Bombay Longman, Green & Company, 1951
Chano, Saheb Khan, *The Movement for Separation of Sind from the Bombay Presidency, 1847-1937,*
(Ph D thesis for the University of Sindh) 1983

Chaudhry, Amir Nazir, *Social Revitalisation, Case Study Saddar, Karachi,*
(B Arch thesis for Dawood College of Engineering & Technology
Karachi) 1990

Cory, A , *The Sind Gazette*, 1893

Cory, A , *Minutes on the Administration of the Municipality from 1891 to 1894*, Karachi, 1894

Crow, N , *Account of the Country of Sind,* 1799

D'Souza, *Goan Society in Transition*, Bombay, 1975

Dadachanji, F K , *Parsis Ancient and Modern,*
Karachi Published by the author, 2nd edition, 1986

Dalal, T B , *A Quarter Century of Karachi Cotton Trade,* 1940

Del Hoste, L F , *Memoir on Sind,*
Bombay Secret & Political Department Report No 571, 1832

De Verteuil, F J , *Fifty Wasted Years*, 1938

Dhalla, Dastur Dr Maneckji Nusserwanji,
The Saga of a Soul An Autobiography,
Translated from Gujarati by Gool & Behram Sohrab Rustamji,
Karachi Dastur Dr Dhalla Memorial Institute, 1975

Eastwick, E B , *A Glance at Sind before Napier, or Dry Leaves from Young Egypt,*
1849, Reprinted Karachi Indus Publications, 1989

Elliot, H M , *The History of India as told by its own Historians*, 1867

Ellis, *Memoir on the State and Resources of Scinde*, 1809

Ellis, B H , *Report on Education in Scinde,*
Bombay Educational Society Press, 1856

Feldman, Robert, *Karachi through a Hundred Years (1860-1960)*,
Karachi Oxford University Press, 1960

Furber, Holen, *John Company at Work,*
Cambridge Cambridge University Press, 1951

Gidumal, Dayaram, *Life and Life-work of B M Malabari*

Golden Jubilee Book of Sindh Madressatul Islam,
Karachi, 1935

Haider, Dr Azimusshan, *A History of Karachi,*
Sub-titled "With Special Reference to Educational, Demographic and Commercial Development, 1839-1900 "
(Ph D thesis for the University of Karachi)
Karachi Pubilshed by the author, 1974

Haig, M R , *The Indus Delta Country,*
London Kegan Paul & Co , 1894

Harrison, H E L T , & G W Jog, *A Handbook of Karachi,*
Karachi Educational Printing Press, 1933

Hart, S V G , *Town and Port of Kurrachee*, 1840

Hasan, Arif, *Seven Reports on Housing,*
Karachi Orangi Pilot Project-Research & Training Institute, 1992

Hasan, Arif, *Manual for Rehabilitation Programmes for Informal Settlements Based on the Orangi Pilot Project Model,*

Karachi Orangi Pilot Project-Research & Training Institute, 1992
Hasan, Arif *Scaling-up of the OPP's Low-cost Sanitation Programme*,
Karachi Orangi Pilot Project-Research & Training Institute, 1992
Hasan, Arif, *Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements*,
(Prepared for the International Institute for Environment & Development U K) 1992
Hasan, Arif *Karachi Master Plan 1986-2000 Report of the Evaluation Committee*,
(Prepared for United Nations Development Programme) 1994
Hasan, Arif *Coastal Environmental Management Plan for Pakistan Environmental Profile of Coastal Communities*,
1989
Hasan, Arif, *Evaluation of the Community Development Work at Rehri Carried out by the Coastal Ecosystem Unit IUCN*
1993
Hasan Khalid Shamsul, *Sindh's Fight for Pakistan*,
Karachi Shamsul Hasan Foundation, 1992
Homji, H B M *O Whither Parsis?*,
Karachi Published by the author, 1978
Hotchand, Seth Naomal, *Memoirs of Seth Naomal Hotchand, CSI, of Karachi (1804-1878)*
Complete title A Forgotten Chapter of Indian History, as told by Seth Naomal Hotchand, CSI, of Karachi (1804-1878), Written by Himself and Translated by His Grandson Rao Bahadur Alumal Trikamdas Bhojwani, BA, Edited with an Introduction by Sir H Evan M James, KCIE, CSI, Commissioner of Sind, 1891-1899 Printed for Private Circulation only "
Exeter William Pollard & Co Ltd , 1915
Hughes A W , *A Gazetteer of the Province of Scinde*, 1874
Humphrey, J *Story of the Sind Club*, Karachi, 1946
Husain, Saleha Bilal, *In Karachi*, (A collection of newspaper columns),
Karachi Institute of Social Sciences, 1990
Husain Commander (Retd) Syed Mazhar, *Indus Delta in Retrospect*,
Karachi Published by the author 1990
Hussain, Akmal, "The Karachi Riots of December 1986 Crisis of State and Civil Society in Pakistan," in Das, Veena, Ed , *Mirrors of Violence Communities, Riots and Survivors in South Asia*, New Delhi Oxford University Press, 1990
Hussain, Mohammad, *Economic History of Hyderabad, W Pakistan*,
Hyderabad Sind University Press, 1956
In the Land of the Sindhi and the Baluchi A Report on Catholic Activities in Sind and Baluchistan, 1935-1947,
Karachi, 1947
Jafri, Dr S M H , *The Flora of Karachi (Coastal West Pakistan)*,
Karachi The Book Corporation, 1966
Jamshed Nusserwanji Mehta A Memorial,

Karachi Jamshed Nusserwanji Memorial Committee, 1954
Jilani, M S , *Resettlement of Displaced Persons in Pakistan*
(Ph D dissertation, Department of Sociology, University of Chicago)
1962
Katrak, Sohrab H K , *Karachi that was the Capital of Sind,*
Karachi Published by the author, 1957
Kennedy, R H , *Narrative of the Campaign of the Army of Indus*
1840
Khamisani, Ameena, *Sind's Contribution to English,*
Jamshoro Institute of Sindhology, 1975
Khan, H H Aga, *The Memoirs of Aga Khan*
London Cassel & Company, 1954
Khan, Ansar Zahid, *History and Culture of Sindh,*
Karachi Royal Book Company, 1980
Khan, Mohammad Zafar Ahmad, *The Development of a Pre-industrial City An Economic Geography of Karachi,*
(Ph D Thesis London University) 1970
Khan, Mohammad Zafar Ahmad, *Karachi An Urban Development Profile*
Karachi Karachi Geographers Association Publication 8 1970
Khosla G D *Stern Reckonings A Survey of the Events Leading Up To and Following the Partition of India,*
Delhi Oxford University Press 1989 (1st Edition 1949)
Khuhro, Hamida, *The Making of Modern Sind British Policy and Social Change in the Nineteenth Century,*
Karachi Indus Publications, 1978
Khuhro, Hamida Ed , *Sind Through the Centuries,*
Karachi Oxford University Press, 1981
Khuhro, Hamida, Ed *Documents on Separation of Sindh from the Bombay Presidency,*
Islamabad National Institue of Historical & Cultural Research, 1982
Khuhro, M A , *A Story of the Sufferings of Sind*
Karachi Published by the author, Bharat Printing Press 1930
Khuhro, M A *A Convincing Case for Separation of Sind*
Karachi Navalrai fatehchand Bharat Printing Press, 1933
Kincaid, C A , *Forty-four Years of Public Service,* 1934
Kincaid, Dennis, *British Social Life in India (1608-1937)*
1939
Kool, Maarten L , Dik Verboom and Jan J van der Linden
Squatter Settlements in Pakistan,
Sub-titled "The Impacts of Upgrading",
Lahore Vanguard Books (Pvt) Ltd , 1988
Kulke, Eckehard, *The Parsis in India A Minority as Agents of Social Change,* Bombay Vikas Publishing House, 19—
Lalji, Haridas, *Silver Jubilee of Buyers and Shippers Chamber,* 1941
Lambrick, H T , *Sind A General Introduction,*
Hyderabad Sindhi Adabi Board, 1964

Lambrick H T *Sir Charles Napier and Sind*
Oxford Clarendon Press 1952
Latif Nargis *Karachi O Karachi*, (A collection of newspaper columns),
Karachi Published by the author 1989
Life History of Sir Jehangir Kothari,
Bombay Times of India Press
Linden Jan van der & Frits Selier, *Karachi Migrants Housing and Housing Policy*
Lahore Vanguard Books (Pvt) Ltd, 1991
Lupton, S, *Karachi Handbook*, 1920 edition
Karachi The Daily Gazette Press Ltd Caxton House, 1920
Malkani, Kewalram Rattanmal, *The Sindh Story*
New Delhi Allied Publishers Private Limited 1984
Mariwala C L "The First Railway in Sind in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-I, Part 2 1934
Mariwala C L Karachi Town and its Trade and Taxation in the First Half of the 19th Century, in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-IV, 1940
Mariwala C L, 'Two Great Occasions in British History in Sind", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-V Part 1, 1940
Mariwala C L 'Origin of the Karachi Municipality', in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-V, Part 2, 1941
Mariwala C L 'Treaty and Travels in Sind 1810-1820 in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-VI, Part 2, 1942
Mariwala, C L, 'British Administration in Sind in 1799 in *Journal of Sind Historical Society* Vol-VI, Part 1, 1943
Mariwala, C L, *Essays on British Policy towards Sind upto the First Afghan War 1839*,
Bombay 1947 Reprinted Karachi Indus Publications, 1982
Mehta, Jamshed N R *Karachi Municipality*, Karachi, 1925
Mehta, Jamshed N R, *Separation of Sind*, Karachi 1928
Mehta, Jamshed N R, *Karachi Extension* Karachi 1929
Melvillia, J, *Scinde 1848 Administrative Report by the Order of House of Commons* 1854
Merriman R D, "The Indian Navy A Review of Activities in Sind from 1615 to 1863', in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-VI, Part 3, 1943
Mirams A E, *Report on the Development of Karachi*, Bombay, 1923
Mirchandani, B D "Crow's Account of Sind in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-I, Part 2, 1934
Moinuddin, *Sindh Land of Legends*,
Karachi National Book Foundation, 1975
Morris, Jan, *Stones of Empire The Buildings of British India*,
London Penguin Books, 1994 (1st edition OUP, 1983)
Mughul, M Yakub Ed, *Studies on Sind*, Jamshoro University of Sindh, 1988
Napier, William, *History of Sir Charles Napier's Administration of Scinde and Campaign in the Cuthee Hills*,
London Chapman & Hall 1851

Napier, William, *The Life and Opinions of Sir Charles Napier*, (4 vol)
London John Murray, 1857
Neill J Martin Bladen, *Recollections of Four Years Service in the East with 40th Regiment*,
London Richard Bentley, 1845
Nientied, Peter, *Redevelopment in Karachi's Inner City The Lines Area Project*
(Preliminary report prepared for Department of Development Sociology, Free University, Amsterdam) 1984
Outram, J , *The Conquest of Sind A Commentary*, (2 Vol),
Reprinted Karachi Indus Publications, 1978
Overview of Children in Armed Conflicts in Sindh,
(A report prepared by Raasta Development Consultants, Karachi for UNICEF) 1995
Panhwar, M H , (Comp) *Source Material on Sindh*,
Jamshoro Institute of Sindhology, 1977
Patel, D N , *Karachi Guide & Directory for 1915*,
Karachi, 1915
Pirzada, D A , *Hatim A Alavi A Pillar in the Pakistan Movement*,
Karachi Mehran Publishers, 1994
Pithawala Maneck B Historical Geography of Sind", in *Journal of Sind Historical Society* Vol-I, Part 2&3, 1934
Pithawala, Maneck B , *Sind's Changing Map An Album Containing 51 Old and Rare Maps of Sind with Critical and Explanatory Notes or them*,
Karachi Published by the author, 1938
Pithawala, Maneck B , *Greater Karachi*, Karachi, 1938
Pithawala, Maneck B *Problems of Greater Karachi*, Karachi 1939
Pithawala, Maneck B , & Martin Kaye, *Geology and Geography of Karachi and its Neighbourhood* Karachi, 1946
Pithawala, Maneck B , *An Introduction to Karachi, Its Environs and Hinterland*, Karachi The Times Press, 1949 (or 1950)
Pithawala, Maneck B , *Historical Geography of Sind*,
Jamshoro Institute of Sindhology, 1978 (1st edition 1936)
Postans, T , *Personal Observations on Scinde*,
London 1843, Reprinted Karachi Indus Publications, 1973
Pottinger, H , *Travels in Baloochistan and Scinde*,
London, 1816, Reprinted Karachi Indus Publications, 1986
Preedy Capt , *Selections from the Pre-Mutiny Records of the Commissioner in Sind*, Karachi The Commissioner's Press, 1931
Quadri, Syed Munir Zia, *Jungshahi An Urban Profile*,
Karachi Karachi Georaphers Association Publication 2, 1966
Rahman, Mushtaqur, *Land and Life in Sindh, Pakistan*,
Lahore Ferozsons Ltd , 1993
Raza, M Hanif, *Karachi The Show Window of Sind*,
Karachi Editions Mistiques, 2nd edition 1984, (1st edition 1970)
Rehmatullah, Shireen, *Ethnic Conflict in Karachi*,

Islamabad National Council of Social Welfare, 1988
Report of the Christian Research Centre,
Karachi, 1973
Rizvi, Taher, *Parsis A People of Book*
Calcutta Imperial Art Cottage, 1928
Ross, D *The Land of Five Rivers in Sind,*
Sub-titled "Sketches Historical and Descriptive "
London Chapman & Hall, 1883
Rubie C B & B D Shanker, *A History of the Sindh Cricket Tournament and Karachi Cricket in General,*
Karachi Edwin Forster & Co , Caxton House, 1928
Rustamji Behram Sohrab H J , *Karachi 1939-1947,*
Karachi Kitabistan Ltd, 1952
Sayed G M *Struggle for New Sind A Brief Description of Provincial Autonomy in Sind During a Decade* (1937-1947),
Karachi Sind Observers Press, 1949
Shafi Mian Ahmad *Haji Sir Abdoola Haroon A Biography*
Karachi Herald Press
Shaheed, Farida, "The Pathan Mohajir Conflicts 1985-6 A National Perspective," in Das Veena, Ed , *Mirrors of Violence Communities Riots and Survivors in South Asia,* New Delhi Oxford University Press 1990
Shaikh, Abdul Hamid, *Informal Sector Housing Study of Goths in Karachi* (B Arch thesis for Dawood College of Engineering & Technology Karachi) 1990
Shaikh, Muhammad Ali, *Sindh Madressah A Journey through Time,*
Karachi Sindh Madressatul Islam, 1995
Sidhwa R K , *The Corporation of the City of Karachi* 1939
Smith, N H *Correspondence between the Envoy of Sind and the Officers of Mir Gholam Ali Talpur of Karachi* 1809
Smyth *Gazetteer of the Province of Sind* Vol I-B, 1919
Soomro Faiz Mohammad, *Cultural History of Sind*
Karachi National Book Foundation, 1977
Soomro Muhammad Qasim, *Muslim Politics in Sindh (1938-1947)*
Jamshoro Pakistan Study Centre University of Sindh 1989
Sorley, H T , *Gazetteer of West Pakistan The Former Province of Sind*
Karachi West Pakistan Government Press, 1968
Souvenir of Golden Jubilee of the Karachi Goan Association, 1886-1936,
Karachi, 1936
Souvenir of Sind Multan Baluchistan Federation of Theosophical Society,
Karachi Theosophical Society, 1943
Souvenir Volume of the Karachi Goan Association, 1886-1956,
Karachi, 1956
State of Human Rights in 1995,
Lahore Human Rights Commission of Pakistan, 1996
Street Children of Karachi, (Report of a Study by the Institute of Social

Research & Development, Karachı conducted for UNICEF) 1990
Tahılramanı, Persram V *Why the Exodus from Sınd?*
Taraporewalla, E H , *The Karachı Resıdentıal & Mercantıle Dırectory for 1938-39,*
Karachı The Daıly Gazette Press, 1930
Temple, B , *The Karachı Hand-book and Dırectory,*
Karachı, 1914
Temple, R , *Men and Events of My Tıme ın Indıa,* 1882
Thomas, R Hughes, *Selectıons form the Records of the Bombay Government* Bombay Government of Bombay, 1855
Thomas, R Hughes, Ed , *Memoırs on Sınd,*
New Delhı Low Prıced Publıcatıons, 1993 (1st edıtıon 1855)
Walker, J , *Kurrachee Harbour ın Scınde,* 1856
Webb, Montague de P *The Karachı Hand-book and Dırectory 1921,*
Karachı, 1922
Webb Montague de P , *The Karachı Who s Who and Why*
Karachı The Daıly Gazette Press, 1932
Wılton, J H *Scenes ın a Soldıer s Lıfe,* 1848
Wrıght, Theodore P , 'Centre-Perıphery Relatıons and Ethnıc Conflıct ın Pakıstan Sındhıs Muhajırs and Punjabıs ,
ın *Comparatıve Polıtıcs* Sprıng 1991
Young, Keıth, *Sınd ın the Fortıes* Reprınted Karachı Indus Publıcatıons 1994
Zaıdı, S Akbar Ed , *Regıonal Imbalances & the Natıonal Questıon ın Pakıstan,* Lahore Vanguard Books (Pvt) Ltd 1992
Zarrın-Qulam", "Post Offıces ın Sınd ın *Journal of Sınd Hıstorıcal Socıety*
Vol-V, Part 4, 1942

اردو

آ کیمیف، وی ایف، سندھ تاریخ کے آئینے میں (ار ۱۹۱۸ تا ۱۹۸۵) ، ترجمہ ڈاکٹر محمود صادق وغیرہ،
کراچی ماوکا، مکتبۂ دانیال، ۱۹۸۹-
احمد، شہمار، (مرتب)، کراچی کیوں جلتا ہے؟ ، (اسٹرویور)، کراچی ورکنگ ووس پبلیکیشنز، ۱۹۸۷-
احمد، پروفیسر عزیزالدین، کیا ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں؟ (پاکستان میں قومیتی مسئلے کا تجزیہ) ،
لاہور مکتبۂ فکرودانش، ۱۹۸۸-
اسلم، پروفیسر محمد، حقائق کراچی ، لاہور ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، ۱۹۹۱-
اطہر، خالد، (مرتب)، سفرِ زندگی ایم کیو ایم کی کہانی، الطاف حسین کی زبانی ،
لاہور جنگ پبلشرز، ۱۹۸۸-
عشو، محمد موسیٰ، پاکستان میں قومیتوں کے مسائل اور اس کا حل

(سندھ کے موجودہ حالات کے پس منظر میں) ، حیدر آباد سندھ نیشنل اکیڈمی ۱۹۸۴ء۔
بیگ، میرزا عبدالقادر، کراچی کا تاریخی مقدمہ ، لکھنو اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۵ء۔
پرکاش، سری، پاکستان قیام اور ابتدائی حالات ، ترجمہ محمد حمایت الحسن، لاہور تخلیقات، ۱۹۹۳ء۔
چوہدری، زاہد، مسائل لیاقت تضاد اور سماجی معاشی تضاد ، (پاکستان کی سیاسی تاریخ ، جلد ۴)،
لاہور، ادارہ مطالعہ تاریخ، ۱۹۹۰ء۔
چوہدری، زاہد، سندھ مسئلہ خود مختاری کا آغاز ، (پاکستان کی سیاسی تاریخ ، جلد ۶)۔
لاہور ادارہ مطالعہ تاریخ، ۱۹۹۴ء۔
حال، فرحت شیر، کتاب سے کلاشنکوف تک ، کراچی پاکستانی ادب پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔
دعویٰ جواب دعویٰ ایم کیو ایم، حکومت سپریم کورٹ میں ، لاہور جنگ پبلشرز، ۱۹۹۵ء۔
رائے، حنیف، (مدیر)، ہفت روزہ نصرت لاہور (مہاجرین نمبر)، ۵ جولائی ۱۹۵۹ء۔
زرداری، ڈاکٹر محمد لائق، غدار سندھ (برطانوی فتح سندھ کے کردار) ،
مورو سندھ ہسٹاریکل اینڈ کلچرل سوسائٹی، ۱۹۹۳ء۔
رشید، جمال، سندھ دوراہے پر ، کراچی پاکستانی ادب پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔
رضویہ، محمودہ، ملکہ مشرق ، کراچی
علی، ڈاکٹر مبارک، سندھ خاموشی کی آواز ، لاہور فکشن ہاؤس، ۱۹۹۴ء۔
سلیم، احمد، (مرتب)، سلگتا ہوا سندھ ، لاہور جنگ پبلشرز، ۱۹۹۰ء۔
شیریں، رب، اغوا برائے تاوان ، کراچی مطبوعات محمود، ۱۹۹۱ء۔
صدیقی، احمد حسین، گوہر بحیرۂ عرب (کراچی) ، کراچی محمد حسین اکیڈمی، ۱۹۹۵ء۔
مرزا، محمود، آج کا سندھ — پاکستان کی یکجہتی کے مسائل ، لاہور پروگریسو پبلشرز، ۱۹۸۶ء۔
مظہر، شہزاد، سندھ کے لسانی مسائل ، لاہور فکشن ہاؤس، ۱۹۹۳ء۔
ناصر، حمید، (مدیر و مولف)، وادی ملیر ، کراچی حمید ناصر، ۱۹۸۷ء۔
ناصر، حمید، (مدیر و مولف)، وادی لیاری ، کراچی حمید ناصر، ۱۹۹۲ء۔
یوسف، اقبال، کراچی پیپرز ، کراچی رکتاب، ۱۹۹۵ء۔

سندھی

ایاز، شیخ، ساہیوال جیل جی ڈائری (ساہیوال جیل کی ڈائری)، حیدر آباد سیوفیلڈس پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء۔
ڈوڈیجا، لوک رام، منھنجو وطن منھنجا ماڻھو (میرا وطن میرے لوگ)،
حیدر آباد سیوفیلڈس پبلی کیشنز ۱۹۶۳ء۔
راشدی، پیر علی محمد، اُھے ڈینھن اُھے شینھن (وہ دن وہ شیر)،
حیدر آباد سندھی ادبی بورڈ، جلد اول ۱۹۶۶ء، جلد دوم ۱۹۸۰ء۔

راشدی، سید حسام الدین، ہُوڈُو تھی ہُوڈُسو، حیدرآباد سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۷۷۔
سید، جی ایم، جنب گذاریم جن سین، (دو جلدوں میں)، حیدرآباد سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۷۹۔
علی، میر امداد، مس کراچی، حیدرآباد: پرھ پُھٹی اشاعت گھر، ۱۹۷۰۔
کلپنا، موہن، کھہ، عشق، ادب (بھوک، عشق، ادب)، حیدرآباد سہنی پبلی کیشنز، ۱۹۸۱۔
گیا بھدانی، سوبھو، 'تاریخ جا وساریل ورق (تاریخ کے بھلائے ہوئے اوراق)، حیدرآباد سندھی ساہت گھر،
۱۹۹۲۔
طالبانی، رئیس کریم بخش خان، کینجھی کتاب، (جلد اول)، حیدرآباد: سیو فیلڈس پبلی کیشنز، ۱۹۹۴۔
موت چند، سیٹھ ماؤں مل، 'یادگیریوں (یادداشتیں)، ترجمہ محمد حنیف صدیقی،
حیدرآباد، سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۶۸۔

***

aaj

an urdu journal of literature and ideas

Published quarterly from Karachi, *aaj* presents each time a selection of contemporary writings from many languages of the world, translated in Urdu, as well as some ground-breaking Urdu writings of today At the end of each regular issue a special section - a small anthology in itself - is devoted to a particular writer or subject The special issues of *aaj* published so far have presented selections of Arabic, Persian and Hindi short stories, selected fiction of Gabriel Garcia Marquez, writings from different parts of the world covering the tragedy of Bosnia, and, recently, the "Story of Karachi" in two volumes - a third volume is to be published shortly

Subscription

Pakistan

Rs 300 (one year), Rs 500 (two years)
Please send the subscription through cheque/pay order/draft drawn in favour of
"Quarterly Aaj, Karachi"
to the following address

Managing Editor, aaj,
A-16, Safari Heights,
Gulistan-e-Jauhar, Karachi 75290
Tel (021) 811-3474
e-mail aaj@biruni erum com pk

Outside Pakistan

Individuls US$ 25 (one year), US$ 45 (two years)
Institutions US$ 40 (one year), US$ 70 (two years)
Please send the subscription in US dollars to

Dr Muhammad Umar Memon,
5417, Regent Street
Madison, WI 53705, USA
Tel (608) 233-2942
Fax (608) 265-3538
e-mail mumemon@factstaff wisc edu

Subscription includes registered air mail charges

شمارہ ۱ خزاں ۱۹۸۹

تاراشنکر بنرجی ستیہ جیت رے اسد محمد خاں

محمد خالد اختر ڈونلڈ بارتھیلم ولیم سیرویاں

افضال احمد سید ذی شان ساحل نسرین انجم بھٹی سعید الدین

نیر مسعود فروغ فرخ زاد ماما مقدم

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۲ سرما ۱۹۹۰

نجیب محفوظ لیو تالستائی کیم مورو

مظہر علی سید فہمیدہ ریاض عذرا عباس

احمد فواد محمد خالد اختر اکرام اللہ

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۳ بہار ۱۹۹۰

اتالو کلوینو امین مالوف محمد عمر میمن

محمد سلیم الرحمٰن جیک لنڈن محمد انور خالد

ریسا الیاس محمد خالد اختر تادیوش روزے وچ

زگنیو ہربرٹ وسلاوا شمبورسکا الیگزانڈر واٹ

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۴. گرما ۱۹۹۰

وجے دان دیتھا انور خاں حسن منظر

محمد سلیم الرحمٰن شمس الرحمٰن شمس الحق

فہمیدہ ریاض کی طویل تحریر زندہ بہار ـــ ایک سفر کی روداد

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۵ ۔ خزاں ۱۹۹۰

سوچہر خسرو شاہی — بابا مقدم — جمال میر صادقی
ثروت حسین — دی شان ساحل — اوکتاویو پاز — یہودا امیخائی
خولیس بارنز — فاروق خالد — محمد خالد اختر — علی امام نقوی
ایک مختصر انتخاب ـــ خورخے لوئس بورخیس
(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۶ : سرما ۱۹۹۱

اے بی یہوشوا — صلاح الدین محمود — فہمیدہ ریاض
نیر مسعود — یانِس رِتسوس — اطول شماس — اسمار احمد
ولاس سارنگ ـــ چار کہانیاں
(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۷ : بہار ۱۹۹۱

خصوصی شمارہ ـــ گابرئیل گارسیا مارکیز
(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۸ ۔ گرما خزاں ۱۹۹۱

سوح داس — ضمیر الدین احمد — نیر مسعود — اکرام اللہ
خالدہ حسین — نگا نور یارا — افتخار جالب — اوسیپ ماندلستام
افضال احمد سید — عذرا عباس — سیری ہیں — دی شان ساحل
گریگور فان ریزوری ـــ ناول کا ایک باب
(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۹ : سرما ۱۹۹۲

خصوصی شمارہ

مصر، جنوبی افریقا، مور میتی، رمانوے، ہندوستان،
امریکا، میکسیکو، انگلستان، آئرلینڈ اور اٹلی کے ادیبوں کی کہانیاں
(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۰ : بہار ۱۹۹۲

معاصر اردو فکشن : تیرہ کہانیاں اور ایک ناول

نیر مسعود — اسد محمد خاں — حسن منظر

مسعود اشعر — انور خاں — قمر احسن

فہمیدہ ریاض کا مکمل ناول — 'گوداوری'

صغیر ملال — منتخب کہانیاں

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۱ : گرما ۱۹۹۲

محمد خالد اختر — اسد محمد خاں — نیر مسعود

فہمیدہ ریاض — افضال احمد سید — میروسلاو ہولب — سیمون دُبووار

ژاں ژینے کا مکمل کھیل 'خادمائیں'

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۲ : سرما ۱۹۹۳

پریم چند — گابریل گارسیا مارکیز — ٹیڈ ہیوز — فہمیدہ ریاض

ضمیر الدین احمد — ذی شان ساحل — سعید الدین — محسن خاں

آئزک باشیوس سنگر — منتخب کہانیاں

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۳ : بہار ۱۹۹۳

خصوصی شمارہ — عربی کہانیاں

توفیق الحکیم — عبدالسلام العجیلی — زکریا تامر — محمد زفزاف

علیفہ رفعت — حنان شیخ — بہا طاہر — محمود دیاب — ابراہیم الکونی

یوسف ادریس — یوسف شارونی — ادوار الخراط — طیب صالح

جمیل حوری — محمد خضیر — غسان کنفانی

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۱۴ : گرما حزاں ۱۹۹۳

وریلی شوکیش محمد خالد اختر افضال احمد سید افتخار جالب

محمد انور خالد سیر مسعود اسد محمد خاں

مصطفیٰ ارباب سیموں دُبووار امار رتی

ریشارد کاپوشسکی کی مکمل کتاب شہنشاہ

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۵ . سرما بہار ۱۹۹۴

خصوصی شمارہ ــــ فارسی کہانیاں

صادق ہدایت ماما مقدم بزرگ علوی جلال آلِ احمد

غلام حسین ساعدی جمال میر صادقی غلام حسین نظری

اسماعیل فصیح فریدوں تنکابنی سیمیں دانشور ابراہیم گلستان

نادر ابراہیمی محسن دامادی محمود دولت آبادی

نسیم خاکسار امین فقیری منیرو روانی پور فریدہ رازی

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۱۶ : گرما ۱۹۹۴

گابریئل گارسیا مارکیز فہمیدہ ریاض رگھوویر سہائے

ثروت حسین سیر مسعود حسن منظر سید محمد اشرف

اکرام اللہ مظہر علی سید سیموں دُبووار

وسے تیندولکر کا مکمل کھیل خاموش! یہ عدالت ہے

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۷ : خزاں ۱۹۹۴

خصوصی شمارہ ــــ سرائیوو سرائیوو

بوسنیا سے متعلق تحریروں کا ایک انتخاب

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۸ : سرما ۱۹۹۵

خصوصی شمارہ ــــ ہندی کہانیاں

امرکانت   رام کمار   اُشا پریم ودا   راجندر یادو

کاشی ناتھ سنگھ   موہن راکیش   بھیشم ساہنی

نرمل ورما   شانی   اصغر وجاہت   منو بھنڈاری

راجی سیٹھ   سودیش دیپک   گووند مشر   عبدل بسم اللہ

شری لال شکل   گیان رنجن   اُدے پرکاش

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۱۹ : بہار گرما ۱۹۹۵

نیر مسعود   ذی شان ساحل   حسن منظر   افضال احمد سید

محمد انور خالد   افتخار جالب   سعید الدین   ثروت زہرا

آصف فرخی   انور خان   نکہت حسن   امیتاو گھوش   ایوان کلیما

فہمیدہ ریاض   اُدے پرکاش   گریس اوگوٹ   حوماتھس ٹرائٹل

رولڈ ڈال ــــ منتخب کہانیاں

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

آج کی کتابیں

افضال احمد سید

چھینی ہوئی تاریخ (نظمیں)

(دستیاب نہیں ہے)

خیمۂ سیاہ (غزلیں)

قیمت چالیس روپے

دو زبانوں میں سزائے موت (نظمیں)

قیمت ساٹھ روپے

ذی شان ساحل

چڑیوں کا شور (نظمیں)

قیمت چالیس روپے

کہر آلود آسماں کے ستارے (نظمیں)

قیمت ساٹھ روپے

کراچی اور دوسری نظمیں

قیمت سو روپے

ضمیر نیازی

صحافت پابندِ سلاسل

انگریزی کتاب The Press in Chains کا اردو ترجمہ

قیمت سو روپے

محمد عمر میمن

گم شدہ خطوط

اور دیگر تراجم

قیمت اسی روپے

گابریئل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

(آج، شمارہ ۷، بہار ۱۹۹۱، کتاب کی صورت میں)

لاطینی امریکا کے ملک کولومبیا سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب
کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب

دو مکمل ناول
"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد"
تیرہ منتخب کہانیاں
"تنہائی کے سو سال" اور "وبا کے دنوں میں محبت" کے منتخب ابواب
مارکیز کی نوبیل انعام پیش کیے جانے کے موقعے کی تقریر اور ایک اہم مضمون
کولومبیا کا مستقبل
مارکیز کے فن پر دو مغربی نقادوں کے مضامین
اپنی زندگی، فن اور خیالات پر مارکیز کی ایک طویل گفتگو
مارکیز کی شخصیت اور حالات زندگی کے بارے میں
اس کے ایک ہم وطن دوست ادیب کی ایک طویل تحریر

قیمت - [illegible] روپے